تحریکِ آزادئ ہند

اور

مُسلمان

حصّہ اوّل

(مشتمل بر مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ اوّل و دوم و مسئلہ قومیت)
مسلمانانِ ہند کی جدید تاریخ پر اسلامی نقطۂ نظر سے نقد و تبصرہ، اور
آزادی کی تحریک میں اُن کے صحیح مقام کی تشریح و توضیح

تالیف: سیّد ابُوالاعلیٰ مودُودیؒ

ترتیب: خورشید احمد

اِسلامک پبلیکیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

۱۳۔ای، شاہ عالم مارکیٹ، لاہور (پاکستان)

مندرجات

حصّہ دوم

اصلاح کا راستہ

حصہ سوم

حصّہ چہارم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

از: مرتب

مسلمان اور غلامی ـــــ یہ دونوں چیزیں ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتیں۔ مسلمان کے لیے یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ غلامی کی فضا میں اپنے دین کے تقاضوں کو پورا کر سکے۔ اسلام پر اسی وقت پوری طرح عمل ہو سکتا ہے جب انسان ساری بندشوں کو توڑ کر صرف خدا کا مطیع ہو جائے۔ اسلام غلبہ اور حکمرانی کے لیے آیا ہے، دوسروں کی چاکری اور باطل نظاموں کے تحت جزوی اصلاحات کے لیے نہیں آیا۔

هو الذی ارسل رسوله بالهدیٰ ودین الحق
لیظهره علی الدین کله ولو کره المشرکون۔

(الصف: ۹)

وہی ہے ذات باری تعالیٰ جس نے بھیجا اپنا رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہدایت اور دین حق کے ساتھ تاکہ اس دین کو دنیا کے تمام ادیان پر غالب کر دے خواہ یہ مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار گزرے۔

اسلام نے مسلمانوں کا مزاج یہ بنایا ہے کہ طاغوت کی حکومت، خواہ وہ کسی

رنگ میں ہو، کھل کر اس کی مخالفت کی جائے۔ اسے کبھی ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہ کیا جائے اور خدا کی حاکمیت کو سیاسی حیثیت سے عملاً قائم کرنے اور اس کے قانون کو زندگی کے ہر شعبے میں جاری و ساری کرنے کی کوشش کی جائے۔ مسلمانوں کی پوری تاریخ میں یہی کشمکش اور کوشش نظر آتی ہے۔

برِصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کے سامنے یہ مسئلہ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں بہت نمایاں ہو کر اُبھرا۔ سلطنتِ مغلیہ کے ختم ہونے تک صورتِ حال یہ تھی کہ گو مجموعی طور پر ملک کا نظامِ اجتماعی اسلام کے مطابق نہ تھا لیکن ایک طرف مسلم معاشرہ میں ہماری ثقافت کی روایات بڑی مضبوطی سے جاگزیں تھیں، اور دوسری طرف ساری خرابیوں کے باوجود ملک کا قانون شریعتِ اسلامی پر مبنی تھا۔ اس لیے مسلمانوں کی کوششوں کا محور مزید اصلاح و تبدیلی اور نظامِ اجتماعی کے بگاڑ کو دُور کرنا تھا۔ برطانوی سامراج کی آمد نے مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کو ختم کر دیا اور نئے حکمرانوں کی تمام قوت اسی کام پر صرف ہوئی کہ مسلمانوں کی ملّی زندگی میں نظریاتی نقطۂ نظر سے جو بگاڑ آ چکا تھا اس کو بڑھائیں اور اسے اس کی انتہا تک پہنچا دیں تاکہ مسلمان سیاسی، معاشی، ذہنی، مذہبی، اخلاقی، ثقافتی غرض ہر حیثیت سے غلام بن جائیں اور ان کا جداگانہ وجود باقی نہ رہے۔

مسلمانوں نے اس نئی حیثیت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ زندہ رہنا چاہتے تھے لیکن مسلمان کی حیثیت سے، محض ہندوستان میں بسنے والی ایک مخلوق کی حیثیت سے نہیں۔ انہوں نے آزادی کی کوشش کی۔ سید احمد شہیدؒ نے جہاد کا اعلان کیا اور تحریکِ مجاہدین نے آخری دم تک اعدائے اسلام کا مقابلہ کیا۔ فرائضی تحریک نے مشرقی ہند میں جہاد کا علم بلند کیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی مسلمانوں ہی کے خون سے سینچی گئی اور اس طرح اپنی تمام خرابیوں اور کمزوریوں کے باوجود مسلمانوں نے اسلام سے [illegible] مزاج کا بار بار اظہار کیا کہ وہ غیر اللہ کی غلامی کو قبول نہیں کر سکتا اور طاغوت [illegible] کیساتھ کوئی سمجھوتہ نہیں کر سکتا۔

انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں "سمجھوتہ بندی" کی روش کو خاصی تقویت حاصل ہوئی۔ مسلمانوں کی حیثیت ایک ہاری ہوئی فوج کی سی تھی اور جو لوگ ذہناً مغرب سے شکست کھا چکے تھے انہوں نے جدید تہذیب و تمدن سے سمجھوتہ کرنے اور اس کے رنگ میں اپنے کو رنگنے ہی کی روش کی طرف مسلمانوں کو بلایا۔ لیکن بحیثیت مجموعی قوم نے اس راستہ کو اختیار نہ کیا اور پورے معاشرہ میں ایک کشمکش جاری رہی۔ ایک دوسرے گروہ نے نئے تقاضوں اور نئے حالات سے کُلی طور پر صرفِ نظر کیا اور اپنے کو ماضی کے حسین نظاروں میں گم رکھا۔ لیکن یہ روش بھی چلنے والی نہ تھی بیسویں صدی کے شروع ہی سے حالات نے ایک ایسا رُخ اختیار کیا جس میں ملکی معاملات میں مسلمانوں کی شرکت لابدی ہو گئی۔ نئی تحریکات اُبھریں۔ سیاسی اسٹیج پر بڑی گہما گہمی ہوئی۔ پُرانی دوستیاں ٹوٹیں اور نئی دشمنیاں پیدا ہوئیں۔ وقتی اور ہنگامی طور پر بڑے بڑے کارنامے بھی انجام دیے گئے۔ لیکن ابھی تک مسلمانوں کے سامنے وہ راہ واضح نہ ہوئی تھی جو ایک طرف انہیں غلامی سے نجات دلاتے اور آزادی کے وسیع میدانوں کو ان کے لیے مسخر کرے، اور دوسری طرف ان کے رشتہ کو ان کے دین اور ان کی ثقافت و تہذیب سے مستحکم تر کرتے ان تاریخی تقاضوں کو بر آنے کا موقع دے جن کے اظہار کے لیے ملتِ اسلامیہ ہند کا اجتماعی ضمیر بے چین تھا۔ سیاست کی زمام کار بڑی حد تک ان لوگوں کے ہاتھوں میں تھی جو ملت کے مزاج اور دین کے تقاضوں کا پورا شعور نہیں رکھتے تھے۔ علماء جو ایک مدت سے قوم کی قیادت کر رہے تھے اب آہستہ آہستہ ان میں سے اکثر اس مقام سے ریٹائر ہو رہے تھے اور نئے حالات اور نئے مسائل کے حقیقی فہم کا کوئی ثبوت نہیں فراہم کر رہے تھے۔ اس دو گونہ عدم مطابقت کی وجہ سے قوم کے ہاتھ وہ راہ نہیں آ رہی تھی جسے اس کی روح تلاش کر رہی تھی۔

ان حالات میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے احیائے اسلام کی جد و جہد کا آغاز کیا۔ ایک طرف موصوف نے ۱۹۳۲ء میں اسلام کی بنیادی تعلیمات کو عقلی

دلائل کے ساتھ پیش کیا اور ذہنوں سے شکوک کے اُن کانٹوں کو نکالا جو الحاد، بے دینی اور اشتراکیت کی یلغار نے پیوست کر دیئے تھے۔ پھر انہوں نے ان تمدنی، معاشرتی اور معاشی مسائل کا حل بھی اسلام کی روشنی میں بتایا جو سوچنے سمجھنے والے طبقات کو پریشان کیے ہوئے تھے۔ تعمیر افکار کے اس عمل کے ساتھ ساتھ مولانا مودودی صاحب نے ملت کو ان اجتماعی مسائل کا احساس بھی دلایا جن کے نرغہ میں وہ گھر گئی تھی، ان خرابیوں کی نشاندہی بھی کی جو اس کی سیاسی جدوجہد کو کمزور تر کر رہی تھیں اور ان خطوط کو بھی واضح کیا جن پر اپنی اجتماعی جدوجہد کو منظم کر کے وہ آزادی اور اسلام دونوں کو حاصل کر سکتی تھی۔ یہ کام ابھی ایک تدریجی رفتار کیساتھ جاری تھا کہ ہندوستان میں یکایک حالات نے پلٹا کھایا اور وہ منزل بالکل قریب نظر آنے لگی جہاں سے اقتدار برطانوی سامراج سے ہندو قوم پرستی کیطرف منتقل ہونیوالا تھا۔ اس پر قسط وار مضامین مولانا مودودی صاحب نے ۱۹۳۷ء میں لکھنے شروع کیے اور ۱۹۳۹ء کے آغاز تک ترجمان القرآن میں مسلسل شائع ہوتے رہے۔ اس کے بعد یہی مضامین "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" کے عنوان سے دو جلدوں میں شائع ہوئے اور اس کتاب کے نو دس ایڈیشن تقسیم ملک سے قبل نکل چکے تھے۔ بلاشبہ اس کتاب نے ایک نسل کو متاثر کیا، متحدہ قومیت کے طلسم کو چاک کیا اور اسلامی قومیت کے احساس کو پختہ کر کے اسے ایک سیاسی نصب العین کی شکل دی۔

(۲)

برطانوی ہند کے مسلمانوں کو انگریز کی غلامی کے دور میں جو سب سے بڑا خطرہ پیش آیا وہ "متحدہ قومیت" کا تھا۔ یہ خطرہ ۱۹۲۵ء میں تحریک خلافت کے غیر مؤثر ہو جانے کے بعد سے شدید تر صورت اختیار کرتا چلا گیا۔ مسلمانوں کا حال یہ تھا کہ ہر میدان میں شکست پر شکست کھانے سے ان پر شدید مایوسی کا غلبہ تھا۔ کوئی قومی تنظیم باقی نہیں رہی تھی۔ قومی لیڈر ایک ایک کر کے یا تھک گئے تھے، یا اللہ کو پیارے ہو گئے تھے، اور یا پھر قوم کا اعتماد کھو بیٹھے تھے۔ نت نئے فتنے اُبھر رہے تھے اور کوئی نہ تھا جو ان کا مقابلہ کرے۔ ان حالات میں کانگریس نے مسلمانوں کو نرم نوالہ سمجھ کر نگل لینا چاہا اور اس غرض کے لیے متحدہ قومیت کی تحریک کو تیز تر کر دیا۔ علمی میدان

میں مغرب کی پیروی میں سیاسی فکر کی بناء پر متحدہ قومیت کے تصور کو پیش کیا جارہا تھا اور کوئی اس سیلاب کا مقابلہ کرنے والا نہ تھا۔ رابطہ عوام (Mass Contact) کے نام پر مسلمانوں کو ان کی اپنی تنظیمات سے کاٹ کر کانگریس میں ضم کرنے کی سعی بڑے وسیع پیمانے پر ہو رہی تھی۔ پھر مسلم نام رکھنے والے اہل علم روٹی کے مسئلہ کو سب سے اہم مسئلہ قرار دے کر اشتراکیت کی تبلیغ بالکل کھلے بندوں اور جمعیت العلماء کے اخبارات تک کے ذریعہ کر رہے تھے۔ علماء کا ایک بڑا طبقہ انگریز کی مخالفت میں متحدہ قومیت تک کی تائید پر اتر آیا تھا۔ ان حالات میں صاف نظر آرہا تھا کہ ملت اسلامیہ ہند کی کشتی ڈانواں ڈول ہے اور اگر حالات کو بدلنے کی فوری کوشش نہ کی گئی تو اس کشتی کو بچانا ممکن نہ رہے گا۔

یہ ہے وہ پس منظر جس میں زیر نظر مضامین لکھے گئے۔ ان میں بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کا اصل مسئلہ کیا ہے، ان کے زوال کے اسباب کیا ہیں، ان کی حقیقی کمزوریاں کیا ہیں، ان کو بے جا استعمال کرنے کی کیا کوششیں ہو رہی ہیں، انہیں کون کون سے خطرات درپیش ہیں، اور ان خطرات کا مقابلہ وہ کیوں کر کر سکتے ہیں۔ پھر ان میں کانگریس کی متحدہ قومیت کی تحریک کا پورا پس منظر اور اس میں مسلمانوں کے لیے پوشیدہ خطرات کا مفصل جائزہ ہے۔ یہ وہ پہلی کوشش ہے جس میں متحدہ قومیت پر علمی اور عقلی تنقید کی گئی ہے اور اتنے بلند علمی معیار سے کی گئی ہے کہ آج تک اس کے پائے کی کوئی دوسری چیز ملک کے سامنے نہیں آئی۔ بلاشبہ برصغیر ہند و پاکستان سے شائع ہونے والے بیسویں صدی کے لٹریچر میں متحدہ قومیت کے بارے میں علامہ اقبال اور مولانا مودودی کی تحریرات اپنی نظیر نہیں رکھتیں۔

پھر مولانا کے ان مضامین کی یہی خصوصیت نہیں ہے کہ اپنے علمی اور منطقی طرز استدلال، تاریخی استشہاد، حسن بیان اور قوت اثر کی بنا پر یہ منفرد ہیں، بلکہ ان کا عظیم ترین کارنامہ یہ ہے کہ ان کی وجہ سے اسلامی تصور قومیت نے

ایک سیاسی نصب العین کی شکل اختیار کی اور مسلمانوں کے سامنے ایک جداگانہ قوم ہونے اور اپنی جداگانہ قومیت اور تہذیب کو محفوظ رکھنے اور ترقی دینے کے لیے اپنی آزاد مملکت قائم کرنے کا جذبہ پیدا ہوا۔ اور بالآخر قیام پاکستان پر منتج ہوا۔

تحریک پاکستان کی بنیاد دو قومی نظریہ پر تھی۔ اس تصور کو پیش کرنے، کھرے نکھارنے اور فروغ دینے میں مولانا مودودی صاحب کی تحریرات کا حصّہ کیا تھا، اسے اُس شخص کی زبان سے سُنیئے جو قائدِ اعظم اور خان لیاقت علی خان کا دستِ راست تھا ـــــــ یعنی آل انڈیا مسلم لیگ کے جائنٹ سیکرٹری، اُس کی مجلسِ عمل (Committee of Action) اور مرکزی پارلیمانی بورڈ کے سیکرٹری، جناب ظفر احمد انصاری صاحب۔ وہ لکھتے ہیں:

"اس موضوع پر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے "مسئلہ قومیت" کے عنوان سے ایک سلسلۂ مضامین لکھا جو اپنے دلائل کی محکمی، زورِ استدلال اور زورِ بیان کے باعث مسلمانوں میں بہت مقبول ہوا اور جس کا چرچا بہت تھوڑے عرصے میں اور بڑی تیزی کے ساتھ مسلمانوں میں ہوگیا۔ اِس اہم بحث کی ضرب متحدہ قومیت کے نظریہ پر پڑی اور مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کا احساس بڑی تیزی کے ساتھ پھیلنے لگا۔ قومیت کے مسئلہ پر یہ بحث محض ایک نظری بحث نہ تھی بلکہ اس کی ضرب کانگریس اور جمعیت العلمائے ہند کے پورے موقف پر پڑتی تھی۔ ہندوؤں کی سب سے خطرناک چال یہی تھی کہ مسلمانوں کے دلوں سے اُن کی جداگانہ قومیت کا احساس کسی طرح ختم کر کے ان کے ملّی وجود کی جڑیں کھوکھلی کر دی جائیں۔ خود مسلم لیگ نے اس بات کی کوشش کی کہ اس بحث کا مذہبی پہلو زیادہ سے زیادہ نمایاں کیا جائے

تاکہ عوام کانگریس کے کھیل کو سمجھ سکیں اور اپنے دین وایمان کے تقاضوں کو پورا کرنے کی طرف متوجہ ہوں[1]۔"

آگے چل کر مولانا انصاری صاحب یوں لکھتے ہیں:

"دراصل پاکستان کی قرارداد سے پہلے ہی مختلف گوشوں سے "حکومتِ الٰہیہ"، "مسلم ہندوستان" اور "خلافتِ ربانی" وغیرہ کی آوازیں اُٹھنے لگی تھیں۔ علامہ اقبال نے ایک "مسلم ہندوستان" کا تصور پیش کیا تھا ——— مودودی صاحب کے لٹریچر نے حکومتِ الٰہیہ کی آواز بلند کی تھی۔ چوہدری افضل حق نے اسلامی حکومت کا نعرہ بلند کیا تھا۔ مولانا آزاد سبحانی نے خلافتِ ربانی کا تصور پیش کیا تھا۔ جگہ جگہ سے اس آواز کا اُٹھنا اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ مسلمان اپنے مخصوص طرزِ فکر کی حکومت قائم کرنے کی ضرورت پوری شدت سے محسوس کر رہے تھے اور حالات کے تقاضے کے طور پر ان کے عوام خفتہ اُبھر کر سامنے آ رہے تھے[2]۔"

علامہ اقبال مرحوم مولانا مودودی کی ان تحریرات سے بے حد متاثر تھے۔ بقول میاں محمد شفیع مدیر اقدام علامہ موصوف "ترجمان القرآن" کے ان مضامین کو پڑھوا کر سنتے تھے۔ اِنہی سے متاثر ہو کر علامہ اقبال نے مولانا مودودی کو حیدر آباد دکن چھوڑ کر پنجاب آنے کی دعوت دی اور اسی دعوت پر مولانا ۱۹۳۸ء میں پنجاب آ گئے۔ میاں محمد شفیع صاحب "لاہور کی ڈائری" میں لکھتے ہیں:

---

[1] تحریک پاکستان اور معارف ——— نظریہ پاکستان نمبر ——— چراغ راہ، صفحہ ۲۴۲۔

[2] ایضاً صفحہ ۲۴۳۔

"مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی تو در حقیقت نیشنلسٹ مسلمانوں کی ضد تھے اور میں یہاں پوری ذمہ داری کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ میں نے حضرت علامہ اقبالؒ کی زبان سے کم و بیش اس قسم کے الفاظ سُنے تھے کہ "مودودی ان کانگریسی مسلمانوں کی خبر لیں گے"۔ جہاں علامہ اقبالؒ بالکل واضح طور سے آزاد اور مدنی کے نقاد تھے وہاں وہ مولانا کا "ترجمان القرآن" جستہ جستہ مقامات سے پڑھوا کر سُننے کے عادی تھے۔ اور اس امر کے متعلق تو میں سو فی صدی ذمہ داری سے یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ علامہ نے مولانا مودودی کو ایک خط کے ذریعے حیدر آباد دکن کے بجائے پنجاب کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنانے کی دعوت دی تھی بلکہ وہ خط انہوں نے مجھ سے ہی لکھوایا تھا۔[۱]"

مارشل لاء حکومت کے قائم کردہ دستوری کمیشن کے مشیر اور کمپنی لاء کمیشن کے صدر سید شریف الدین پیرزادہ صاحب اپنی تازہ ترین کتاب "ارتقائے پاکستان" (Evolution of Pakistan) میں لکھتے ہیں:

"مولانا مودودی نے "ترجمان القرآن" کے ایک سلسلۂ مضامین کے ذریعے جو ۱۹۳۸ء اور ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئے کانگریس کے چہرے سے نقاب اُتاری اور مسلمانوں کو متنبہ کیا۔ موصوف نے برصغیر میں مسلمانوں کی تاریخ کا جائزہ لیا، کانگریس کی لادینیت کی قلعی کھولی اور یہ ثابت کیا کہ ہندوستان کے مخصوص حالات میں اس کے لیے جمہوریت ناموزوں ہے۔ اس لیے کہ اس میں مسلمانوں کو ایک ووٹ اور ہندوؤں کو چار ووٹ ملیں گے۔

---

[۱] "لاہور کی ڈائری" ہفت روزہ "اقدام" لاہور - ۹ر جون ۶۳ء

اُنہوں نے ہندوؤں کے قومی استعمار کی بھی مذمت کی اور اس رائے کا اظہار کیا کہ محض مخلوط انتخاب یا اسمبلیوں میں کچھ زیادہ نمائندگی (Weightage) اور ملازمتوں میں ایک شرح کا تعین مسلمان قوم کے سیاسی مسائل کا حل نہیں ہے۔ جو تجویز اُنہوں نے پیش کی اس میں تین متبادل صورتوں کی نشاندہی کی گئی تھی[1]۔"

اِن صورتوں میں آخری صورت تقسیم ملک کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ سیّد شریف الدین پیرزادہ صاحب ارتقائے پاکستان کے سلسلہ میں جس نتیجہ پر پہنچے ہیں اس میں اِس امر کا اظہار کرتے ہیں کہ:

" وہ تجاویز اور مشورے جو سر عبداللہ ہارون، ڈاکٹر لطیف، سر سکندر حیات، " ایک پنجابی "، سیّد ظفر الحسن، ڈاکٹر قادری، مولانا مودودی، چودھری خلیق الزّمان وغیرہ نے دیئے، وہ ایک معنی میں پاکستان تک پہنچنے والی سڑک کے سنگہائے میل ہیں[2]۔"

ہمیں اپنی بات کو ثابت کرنے کے لیے مندرجہ بالا اقتباسات کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن صرف ان لوگوں کی سہولت کے لیے جو اس زمانہ کی پوری تاریخ سے واقف نہیں ہیں ہم نے یہ چند تائیدی بیانات بھی شامل کر لیے ہیں۔ ان سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آزادیٔ ہند کی جدوجہد میں " مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش " اور " مسئلہ قومیت " نے کتنا اہم کردار ادا کیا ہے۔

(۳)

قیام پاکستان کے لیے مسلم لیگ نے جو جدوجہد کی اس میں مولانا مودودی صاحب نے عملاً جس وجہ سے شرکت نہیں کی وہ مسلم لیگ کے طریق کار سے مولانا کا اختلاف

---

[1] صفحہ ۱۹۰

[2] صفحہ ۲۵۸۔

تھا۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ:

(۱) اگر ہمارے پیش نظر ایک اسلامی ریاست ہے تو ضروری ہے کہ ہم قوم کو اس مقصد کے حصول کے لیے اخلاقی حیثیت سے بھی تیار کریں۔ صرف سیاسی جنگ اس کے لیے کافی نہیں ہے۔ اس کے لیے علمی، فکری، اخلاقی، تہذیبی، سیاسی، غرض ہر میدان میں کام کرنا ہوگا۔ اس کے بغیر اس مقصد کا حصول مشکل ہے۔

(ب) تحریک کی ہمہ گیر اور اس کے ہر شعبہ اور سطح کی قیادت کے انتخاب میں پوری احتیاط سے کام لینا ہوگا۔ اشتراکیوں، ملحدوں اور بے دینوں، جاگیرداروں اور زمین داروں، سب کو بلا سوچے سمجھے ایک ساتھ جمع کر دینے سے جو بھیڑ جمع ہو جاتی ہے وہ کبھی بھی قوم کی رہنمائی صحیح سمت میں نہیں کر سکتی۔ یہ تو ایک دوسرے کا گلا کاٹنے اور اپنے اپنے مقاصد کے لیے قوم کو استعمال کرنے کی کوشش کریں گے اور نتیجۃً اصل منزل کھوٹی ہو جائے گی۔

(ج) مسلمانوں کی بنیادی حیثیت ایک اصولی جماعت اور داعی گروہ کی ہے اور کسی قیمت پر بھی یہ حیثیت متاثر نہیں ہونی چاہیے۔

طریق کار کے اختلاف کو مولانا نے صاف طور پر ظاہر کر دیا تھا، چنانچہ آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عمل کے ایک خط کے جواب میں مولانا نے لکھا تھا:

" آپ حضرات ہرگز یہ گمان نہ کریں کہ میں اس کام میں کسی قسم کے اختلافات کی وجہ سے حصہ لینا نہیں چاہتا۔ دراصل میری مجبوری یہ ہے کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ حصہ لوں تو کس طرح۔ ادھوری تدابیر میرے ذہن کو بالکل اپیل نہیں کرتیں۔ اور داغ دوزی (Patch Work) سے ہی مجھ کو کبھی دلچسپی رہی ہے۔ اگر کلی تخریب اور کلی تعمیر پیش نظر ہوتی تو میں بدل وجان اس میں ہر خدمت انجام دینے کے لیے تیار تھا۔ میرے لیے یہی مناسب ہے کہ اس باب میں عملاً کوئی خدمت انجام دینے کے بجائے ایک طالب علم کی

طرح دیکھتا رہوں کہ سوچنے والے اس جزوی اصلاح و تعمیر کی کیا صورتیں
نکالتے ہیں اور کرنے والے اسے عمل میں لا کر کیا نتائج پیدا کرتے ہیں۔
اگر فی الواقع انہوں نے اس طریقہ سے کوئی بہتر نتیجہ نکال دکھایا تو وہ
میرے لیے ایک انکشاف ہوگا اور ممکن ہے کہ اس کو دیکھ کر میں
مسلکِ کلی سے مسلکِ جزئی کی طرف منتقل ہو جاؤں۔"

(ترجمان القرآن۔ جولائی۔ اکتوبر ۱۹۴۴ء)

اندیشے صحیح ثابت ہوئے

یہ تھا طریقِ کار کے بارے میں مولانا کا اختلاف اور اس کی نوعیت[1]۔ مولانا کی
رائے کے بارے میں دو آرا ہو سکتی ہیں، لیکن مستقبل کا مورخ بمشکل ہی اس بات
کو نظر انداز کر سکے گا کہ تقسیمِ ملک کے بعد پاکستان میں اسلامی نظام کو قائم کرنے کی
راہ میں جو جو مشکلات پیش آئی ہیں اور آ رہی ہیں اور آزادی کے سولہ سال کے بعد
بعد بھی ملک ابھی تک صرف اصولاً ہی ایک اسلامی ریاست ہے، عملاً حقیقی اسلامی
ریاست میں تبدیل نہیں ہو سکا ہے، بلکہ اسلامی خطوط پر تبدیل کرنے والوں کو
جس طرح جیل، قتل اور پھانسی سے سابقہ پیش آ رہا ہے اس کا پیشگی شعور مولانا
مودودی صاحب کی تحریرات میں صاف پایا جاتا ہے اور آنے والے واقعات
نے ان کے اندیشوں کی تکذیب کرنے کے بجائے توثیق کی ہے۔

(۴)

یہ تھے وہ وجوہ جن کی بنا پر مولانا نے عملاً شرکت نہیں کی لیکن علمی طور پر
وہ نظریہ پاکستان کی برابر خدمت کرتے رہے۔ اسلام کے نظامِ حیات کے

---

[1] یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ۱۹۴۶ء میں خود مسلم لیگ کیبنٹ مشن اسکیم کو قبول کر کے عملاً اس بات
کے لیے تیار ہو گئی تھی کہ پاکستان کے علاوہ بھی کسی دوسری تجویز پر عمل کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ اس
سے پوری مسلمان قوم کے مسئلہ کا حل نکل آئے۔

خدوخال واضح کرتے رہے اور تصورِ پاکستان کی بھی تائید کرتے رہے۔ جب مسلمانوں کے ایک گروہ نے کہا کہ ہندوستان کی تقسیم اور اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کو کیسے گوارا کیا جا سکتا ہے تو مولانا مودودی صاحب نے کہا:

"مسلمان ہونے کی حیثیت سے میری نگاہ میں اس سوال کی کوئی اہمیت نہیں کہ ہندوستان ایک ملک رہے یا دس ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے۔ تمام روئے زمین ایک ملک ہے۔ انسان نے اس کو ہزاروں حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ یہ اب تک کی تقسیم اگر جائز تھی تو آئندہ مزید تقسیم ہو جائے گی تو کیا بگڑ جائے گا۔ اس بت کے ٹوٹنے پر تڑپے وہ جو اسے معبود سمجھتا ہو۔ مجھے تو اگر یہاں ایک مربع میل کا رقبہ بھی ایسا مل جائے جس میں انسان پر خدا کے سوا کسی کی حاکمیت نہ ہو تو میں اس کے ایک ذرہ خاک کو تمام ہندوستان سے زیادہ قیمتی سمجھوں گا۔"[1]

جس وقت پاکستان کے مطالبہ کو اسرائیل کے مطالبہ کے مثل قرار دیا گیا تو مولانا مودودی صاحب نے اس کی پُر زور تردید کی اور لکھا:

"میرے نزدیک پاکستان کے مطالبہ پر یہودیوں کے قومی وطن کی تشبیہ چسپاں نہیں ہوتی۔ فلسطین فی الواقع یہودیوں کا قومی وطن نہیں ہے۔ یہودیوں کی اصل پوزیشن یہ نہیں ہے کہ ایک ملک واقعی ان کا قومی وطن ہے اور وہ اسے تسلیم کرانا چاہتے ہیں۔ بلکہ ان کی اصل

---

[1] سیاسی کشمکش حصہ سوم طبع ششم صفحہ ۷۶-۷۷۔

پوزیشن یہ ہے کہ ایک ملک ان کا قومی وطن نہیں ہے اور ان کا مطالبہ یہ ہے کہ ہم کو دنیا کے مختلف گوشوں سے سمیٹ کر وہاں لا بسایا جائے اور اسے بزور ہمارا قومی وطن بنا دیا جائے۔ بخلاف اس کے مطالبہ پاکستان کی بنیاد یہ ہے کہ جس علاقہ میں مسلمانوں کی اکثریت آباد ہے وہ بالفعل مسلمانوں کا قومی وطن ہے۔ مسلمانوں کا کہنا صرف یہ ہے کہ موجودہ جمہوری نظام میں ہندوستان کے دوسرے حصوں کیساتھ لگے رہنے سے ان کے قومی وطن کی سیاسی حیثیت کو جو نقصان پہنچتا ہے اس سے ان کو محفوظ رکھا جائے اور متحدہ ہندوستان کی ایک آزاد حکومت کے بجائے "ہندو ہندوستان" اور "مسلم ہندوستان" کی دو آزاد حکومتیں قائم ہوں۔ بالفاظ دیگر مسلمان یہ نہیں کہتے کہ ہمارے لیے ایک قومی وطن بنایا جائے بلکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ ہمارا قومی وطن جو بالفعل موجود ہے اس کو اپنی آزاد حکومت الگ قائم کرنے کا حق حاصل ہونا چاہیے۔

یہ چیز وہی ہے جو آج کل دنیا کی ہر قوم چاہتی ہے۔ ہم اصولاً اس بات کے مخالف ہیں کہ دنیا کی کوئی قوم کسی دوسری قوم پر سیاسی و معاشی حیثیت سے مسلط ہو۔ ہمارے نزدیک اصولاً ہر قوم کا حق ہے کہ اس کی سیاسی و معاشی باگیں اس کے اپنے ہاتھوں میں ہوں۔ اس لیے ایک قوم ہونے کی حیثیت سے اگر مسلمان یہ مطالبہ کرتے ہیں تو جس طرح دوسری قوموں کے معاملہ میں یہ مطالبہ صحیح ہے اسی طرح ان کے معاملہ میں بھی صحیح ہے[1]۔

---

[1] ترجمان القرآن - جولائی، اکتوبر ۱۹۴۲ء - و رسائل و مسائل جلد اول، صفحہ ۶۱ - ۲۶۰۔

ریفرنڈم میں پاکستان کی حمایت

صوبہ سرحد اور سلہٹ کے ریفرنڈم کے موقع پر مولانا مودودی صاحب نے پاکستان کے حق میں ووٹ ڈالنے کا مشورہ دیا اور لوگوں کو اس پر آمادہ کرنے کے لیے فرمایا:

"اگر میں صوبہ سرحد کا رہنے والا ہوتا تو استصواب رائے میں میرا ووٹ پاکستان کے حق میں پڑتا۔ اس لیے کہ جب ہندوستان کی تقسیم ہندو اور مسلم قومیت کی بنیاد پر ہو رہی ہے تو لامحالہ ہر اس علاقے کو جہاں مسلمان قوم کی اکثریت ہو اس تقسیم میں مسلم قومیت ہی کے علاقے کے ساتھ شامل ہونا چاہیے۔"[1]

اسی موقع پر پاکستان کے آئندہ نظام کے سلسلہ میں مولانا نے فرمایا:

"وہ نظام اگر فی الواقع اسلامی ہوا جیسا کہ وعدہ کیا جا رہا ہے تو ہم دل وجان سے اس کے حامی ہوں گے، اور اگر وہ غیر اسلامی نظام ہوا تو ہم اسے تبدیل کر کے اسلامی اصولوں پر ڈھالنے کی جدوجہد اسی طرح کرتے رہیں گے جس طرح موجودہ نظام میں کر رہے ہیں۔"[2]

۹، ۱۰ مئی ۱۹۴۷ء کے کل ہند اجتماع میں، ۳ جون ۴۷ء کی تجویز تقسیم سے تقریباً ایک ماہ قبل، مولانا مودودی نے خطاب عام کے اختتام پر فرمایا:

"اب یہ بات تقریباً طے شدہ ہے کہ ملک تقسیم ہو جائے گا ایک

---

[1] سہ روزہ کوثر۔ مورخہ ۵ جولائی ۱۹۴۷ء و رسائل ومسائل جلد اول صفحہ ۲۶۲۔

[2] ایضاً صفحہ ۲۶۳۔

حصّہ مسلمان اکثریت کے سپرد کیا جائے گا اور دوسرا حصّہ غیر مسلم اکثریت کے زیر اثر ہوگا۔ پہلے حصّہ میں ہم کوشش کریں گے کہ رائے عام کو ہموار کر کے اس دستور و قانون پر ریاست کی بنیاد رکھیں جسے ہم مسلمان خدائی دستور و قانون مانتے ہیں۔ غیر مسلم حضرات وہاں ہماری مخالفت کرنے کے بجائے ہمیں کام کرنے کا موقع دیں اور دیکھیں کہ ایک بے دین قومی جمہوریت کے مقابلہ میں یہ خدا پرستانہ خلافت، جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی ہدایت پر قائم ہوگی، کہاں تک خود باشندگانِ پاکستان کے لیے اور کہاں تک تمام دنیا کے لیے رحمت و برکت ثابت ہوتی ہے[1]۔

یہ تھے وہ جذبات جن کا اظہار مولانا مودودی صاحب نے تقسیم سے قبل کیا اور اس طرح علمی حیثیت سے ایک محاذ کو مضبوط تر کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ جن مقامات پر علمی اور عملی تعاون ہو سکتا تھا اس سے کبھی گریز نہیں کیا۔

اسلامی تصورِ قومیت پر ان کے مضامین مسلم لیگ کے حلقوں میں بہت بڑے پیمانے پر استعمال ہوتے رہے اور سب سے بڑھ کر جب یو۔ پی مسلم لیگ نے اسلامی نظامِ مملکت کا خاکہ تیار کرنے کے لیے علماء کی ایک کمیٹی بنائی تو مولانا مودودی صاحب نے اس کی رکنیت قبول کی اور کام میں پوری دلچسپی لی۔ حال ہی میں وہ مسودہ چھپا ہے جو اس کمیٹی سے وابستہ ایک معاونِ تحقیق مولانا محمد اسحاق سندیلوی نے بطور ابتدائی خاکہ (Working Paper) تیار کیا تھا۔ اس کے پیش لفظ میں مولانا عبدالماجد دریابادی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

---

[1] جماعت اسلامی کی دعوت، ترجمان القرآن جلد ۲۱ - عدد ۵ صفحہ ۲ - ۲۰۳ -

"غالباً ۱۹۴۰ء یا شاید اس سے بھی کچھ قبل جب مسلم لیگ کا طوطی ہندوستان میں بول رہا تھا، ارباب لیگ کو خیال پیدا ہوا کہ جس اسلامی حکومت (پاکستان) کے قیام کا مطالبہ شدّ و مد سے کیا جا رہا ہے خود اس کا نظام نامہ یا قانونِ اساسی بھی تو خالص اسلامی بنانا چاہیئے۔ اس غرض سے یو۔ پی کی صوبہ مسلم لیگ نے ایک چھوٹی سی مجلس ایسے ارکان کی مقرر کر دی جو اس کے خیال میں شریعت کے ماہرین تھے کہ یہ مجلس ایسا نظام نامہ مرتب کر کے لیگ کے سامنے پیش کرے۔ اس مجلس نظام اسلامی کے چار ممبران کے نام تو اچھی طرح یاد ہیں:

(۱) مولانا سیّد سلیمان ندوی (۲) مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

(۳) مولانا آزاد سُبحانی (۴) عبدالماجد دریا بادی[1]۔"

اس سلسلہ میں قمرالدین خان صاحب ریڈر سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک ریسرچ کے ایک حالیہ مضمون کا اقتباس بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ موصوف نے لکھا ہے کہ وہ مولانا مودودی صاحب کے ایماء پر ۱۹۴۲ء میں قائدِ اعظم سے ملے اور

"راجہ آف محمود آباد کی مدد سے گل رعنا (دہلی) میں ہماری ملاقات کا انتظام کیا گیا۔ قائدِ اعظم پینتالیس منٹ تک بڑے صبر سے میری بات سنتے رہے اور پھر کہا کہ مولانا (مودودی) کی خدمات کو وہ نہایت پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ لیکن برصغیر کے مسلمانوں کے لیے ایک آزاد ریاست کا حصول اُن کی زندگی اور کردار کی تطہیر سے زیادہ فوری اہمیّت کا حامل ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ جماعت

---

[1] پیش لفظ مولانا دریا بادی۔ اسلام کا سیاسی نظام، از مولانا محمد اسحاق سندیلوی مطبوعہ دارالمصنفین اعظم گڑھ۔

اور لیگ میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ جماعت اگر ایک اعلیٰ مقصد
کے لیے کام کر رہی ہے تو لیگ اس فوری حل طلب مسئلے کی طرف
متوجہ ہے جسے اگر حل نہ کیا جا سکا تو جماعت کا کام مکمل نہ ہو سکیگا۔[1]

یہ ہے تحریک پاکستان کے بارے میں مولانا مودودی صاحب کی اصل پوزیشن۔
افسوس ہے کہ کچھ ناعاقبت اندیش حضرات نے اصل حقائق کو جاننے اور سمجھنے کے بجائے
اپنے مخصوص مفادات کی خاطر ان کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کو اپنا وطیرہ بنا لیا ہے۔
توقع ہے کہ ہماری مندرجہ بالا گزارشات اصل حقیقت کو واضح کرنے میں مدد دیں
گی۔

(۵)

اب آخر میں ہم چند معروضات اس کتاب کے بارے میں بھی پیش کرتے
ہیں:

اس کتاب کی تاریخی اہمیت کے بارے میں دو آراء ممکن نہیں۔ لیکن یہ کتاب
ایک عرصہ سے ناپید تھی اور تحریک آزادی کے طلباء اور دوسرے عام لوگوں کو اسے حاصل
کرنے میں سخت ترین دشواریاں پیش آ رہی تھیں۔ ایک عرصہ سے اس بات کا مطالبہ
کیا جا رہا تھا کہ اسے دوبارہ شائع کیا جائے تاکہ ہمارے ماضی کا یہ آئینہ لوگوں کی آنکھوں
کے سامنے رہے۔ اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ہم یہ کتاب دوبارہ شائع
کر رہے ہیں۔

پھر تھوڑے دنوں سے مولانا مودودی صاحب پر بے بنیاد الزامات لگانے کی ایک ناپاک مہم جاری ہے۔
ان کی تحریرات کو توڑ مروڑ کر اور سیاق و سباق سے الگ کر کے ان کی طرف ایسی ایسی باتیں منسوب کی
جا رہی ہیں جن میں صداقت کا کوئی عنصر نہیں۔ ان تمام اتہامات کا بہترین

---

[1] ہفت روزہ (Thinker) مضمون The Quid-e-Azam by - Reminson[2] بابت ۲۷؍ دسمبر ۱۹۶۳ء

جواب یہ کتاب ہے ۔ ہم اصل مضامین کو پبلک کے سامنے پیش کر رہے ہیں تاکہ اسے معلوم ہو جائے کہ حق پر کون ہے اور جھوٹے الزام تراشیاں کون کر رہا ہے ۔

ہمارا اصل پروگرام تو یہ تھا کہ اشاعت نو کے وقت اس کتاب کو از سرِ نو ایڈٹ کریں گے اور وہ چیزیں اس میں سے حذف کر دیں گے جن کا تعلق محض وقتی چیزوں سے تھا ۔ لیکن الزامات کی حالیہ مہم کی وجہ سے ہم نے یہ تبدیلی نہیں کی ہے اور تمام مضامین کو اسی طرح پیش کیا جا رہا ہے جس طرح وہ اوّلاً لکھے گئے تھے ۔ البتہ اگر کسی چیز کی وضاحت کی ضرورت محسوس کی گئی ہے تو اس پر مزید حواشی کا اضافہ کر دیا ہے ۔

مرتب نے صرف اُن جملوں کو حذف کیا ہے یا ان میں کچھ تبدیلی کی ہے جن کا تعلق اصل مضمون سے نہیں بلکہ کتاب کی موجودہ شکل سے ہے ۔ اس پہلو سے چند مقامات پر ایڈیٹنگ کی گئی ہے ۔ اسی طرح حصوں کی تقسیم اور مضامین کی ترتیب بھی جدید ہے ۔ اس کتاب میں "مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش" حصّہ اوّل اور حصّہ دوم کے سارے مضامین اور "مسئلہ قومیت" میں سے تین مضمون شامل کیے گئے ہیں ۔ اسی طرح تحریک آزادیٔ ہند کے بارے میں مولانا مودودی صاحب کے بیشتر مضامین اسی ایک جلد میں آگئے ہیں ۔

کتاب کا نام بھی ہم نے نیا رکھا ہے ، اور اس کی تین وجوہ ہیں :

اوّلاً "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" کا عنوان اب ایک حد تک غیر موزوں ہو گیا ہے ۔ اس لیے کہ اس کے ابتدائی نام میں "موجودہ" سے مراد ۱۹۳۷ء اور ۱۹۲۹ء کے حالات تھے نہ کہ آج کے ۔ اس بنا پر ہم نے ضروری سمجھا کہ اس نام کے بجائے دوسرا نام رکھیں تاکہ کسی کو غلط فہمی نہ پیدا ہو ۔

ثانیاً موجودہ مجموعہ میں "مسئلہ قومیت" کے تین مضامین بھی شامل ہیں جو "مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش" میں نہ تھے بلکہ الگ رسالہ کی حیثیت سے چھپے تھے ۔

ثالثاً اب کتاب کی مستقل حیثیت کو جس نام سے زیادہ خوبی کے ساتھ ظاہر کیا جا

سکتا ہے اور جو اس کے مندرجات کی بہترین طریقے پر نشاندہی کر سکتا ہے، وہ وہی
نام ہے جو ہم نے اب دیا ہے، یعنی "تحریک آزادی ہند اور مسلمان" اس طرح یہ
نئی کتاب، ہماری تاریخی جدوجہد کے ایک باب کو پیش کرتی ہے اور اس برصغیر کی
تاریخ کا طالب علم اس سے کبھی مستغنی نہیں ہو سکتا۔

ہمیں توقع ہے کہ یہ کتاب ایک طرف بہت سی غلط فہمیوں کو دور کرے گی
اور دوسری طرف طلباء تاریخ کے لیے بڑا قیمتی اور مفید مواد پیش کرے گی۔

خورشید احمد

۱۴ رشعبان ۱۳۸۳ھ (دسمبر ۱۹۶۳ء)
۱۔ نیو کونٹنس روڈ
کراچی

حصّہ اوّل

ہم کہاں کھڑے ہیں؟

ایک تاریخی جائزہ

یہ مضامین مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے ۱۹۳۷ء میں لکھے تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب مسلمان تحریک خلافت کی ناکامی کے بعد ایک ہاری اور منتشر شدہ فوج کی مانند تھے جس کے باقی ماندہ عناصر کو ہندو سامراج، متحدہ قومیت اور آزادی وطن کے نام پر اچک لینے میں مصروف تھا۔ مسلمانوں پر سراسیمگی کی کیفیت طاری تھی اور مستقبل ان کے لیے ایک تاریک اور ہیبت ناک رات کی مانند تھا۔ اس زمانہ میں مولانا مودودی صاحب نے مسلمانوں کی تاریخ کا جائزہ لے کر ان کو بتایا کہ وہ کہاں کھڑے ہیں۔ ان کے سامنے کون کون سے مختلف راستے ہیں۔ ان کی اپنی کمزوریاں اور مسائل کیا ہیں اور بحیثیت قوم ان کی راہِ نجات کیا ہے۔ یہ مضامین مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ اوّل میں شائع ہو چکے ہیں۔

(مرتب)

تقدیم[1]

آنکھیں بند کر کے چلنا ایک شخص کے لیے جتنا مہلک ہو سکتا ہے، اس سے بہت زیادہ مہلک ایک قوم کے لیے ہوتا ہے۔ آپ کھُلے میدان میں بھی بند آنکھوں کے ساتھ چل کر ٹھوکر سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔ لیکن سڑک پر جہاں آمد و رفت کا ہجوم ہو اور زور وروں کے درمیان کشمکش ہو رہی ہو، اگر آپ آنکھیں بند کر کے چلیں گے، تو یقیناً آپ کو کسی مہلک حادثہ سے دوچار ہونا پڑے گا۔ ایسی ہی حالت ایک قوم کی بھی سمجھ لیجیے۔ معمولی حالات میں جب کہ فضا میں کوئی غیر معمولی ہنگامہ نہ ہو، اس کے لیے آنکھیں بند کر کے چلنا محض نقصان ——— جسمانی نہیں عقل و بصیرت کی آنکھیں ——— اور ذلت کا موجب ہوتا ہے مگر جب کوئی انقلاب درپیش ہو، جب قسمتوں کا فیصلہ ہو رہا ہو، جب زندگی و موت کا مسئلہ سامنے ہو، ایسے وقت میں اگر وہ آنکھیں بند کر کے چلے گی تو اُسے تباہی اور ہلاکت سے دوچار ہونا پڑے گا۔

تحریکِ خلافت کی ناکامی کے بعد سے کامل پندرہ برس تک مسلمان جس انتشارِ فکر و عمل

---

[1] یہ مضمون رمضان المبارک ۱۳۵۶ھ میں لکھا گیا۔

میں مبتلا رہے اس کو دیکھ کر دل خون ہوا جاتا تھا، مگر ہمیشہ یہی خیال لب کشائی سے روکتا رہا کہ میدان میں مجھ سے زیادہ علم اور تجربہ اور قوت واثر رکھنے والے موجود ہیں، وہ کبھی نہ کبھی حالات کی اصل خرابی کو محسوس کریں گے، اور اس کو رفع کرنے کے لیے متحد ہو کر وہ تدبیریں اختیار کریں گے، جو مسلمان ہونے کی حیثیت سے ان کو اختیار کرنی چاہیئں۔ لیکن دن پر دن گزرتے چلے گئے اور یہ اُمید بر نہ آئی، یہاں تک کہ وہ وقت آگیا جو ہندوستانی مسلمان کے لیے قسمت کے فیصلے کا آخری وقت ہے۔ دل کی آنکھوں نے صاف دیکھ لیا کہ اب اگر اس قوم نے کوئی غلط قدم اٹھایا تو سیدھی ہلاکت کے گڑھے کی طرف جائے گی اور اس کے ساتھ چشم دل ہی نے نہیں، چشم سر نے بھی یہ دیکھا کہ جن کی تدبیر و تدبر پر اس قوم کے مستقبل کا انحصار ہے وہ اب بھی حالات کو اس فراست کے ساتھ سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہے ہیں جسے "فراستِ مومن" کہا گیا ہے، اور اسی کوتاہی کی بنا پر ایسے نازک وقت میں مسلمانوں کو ان مختلف راستوں کی طرف چلا رہے ہیں جن میں سے کوئی بھی منزلِ نجات کی طرف نہیں جاتا۔ اس مرحلے پر پہنچ کر ضمیر نے آواز دی کہ یہ وقت خاموش بیٹھنے کا نہیں ہے۔ اب دین و ملت کی سب سے بڑی خدمت یہی ہے کہ مسلمانوں کو، ان کے عوام اور خواص، علماء اور زعماء، سب کو ان حقیقی خطرات کی طرف توجہ دلائی جائے، جو مسلم قوم ہونے کی حیثیت سے ہمیں درپیش ہیں، اور اس کے ساتھ انہیں یہ بھی یاد دلایا جائے کہ تمہارے لیے ہدایت کا اصلی سرچشمہ خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سیرت پاک میں ہے جسے چھوڑ کر محض اپنی فکر و تدبیر پر اعتماد کر لینا ہلاکت کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔

میرا نقطۂ نظر

میں نے ان مضامین میں اسلامی ہند کی گزشتہ تاریخ اور موجودہ حالت پر محض ایک مؤرخ یا ایک سیاسی آدمی کی حیثیت سے نہیں، بلکہ ایک مسلمان کی حیثیت سے نظر ڈالی ہے۔ اس لیے بہت ممکن ہے کہ ایک خالص تاریخی، یا سیاسی، یا

معاشی نظر رکھنے والے آدمی کو میرے بیان سے اختلاف ہو۔ لیکن میں یہ گمان نہیں کرتا کہ جو شخص میری طرح ایک مسلمان کی نظر سے حالات کو دیکھے گا، اسے میرے بیان سے اختلاف ہوگا۔ اسی طرح میں نے ہندوستان کے موجودہ حالات اور ان کی کارفرما قوتوں کا جو تجزیہ کیا ہے، اس میں بھی میرے پیشِ نظر اسلامی معیارِ تحقیق ہے، اور ان حالات میں مسلمانوں کے اصل قومی مسائل کو سمجھنے اور ان کا حل تلاش کرنے کی جو کوشش میں نے کی ہے، وہ بھی ایک مسلمان کی حیثیت سے کی ہے۔ درحقیقت اس تمام بحث میں میرے مخاطب صرف وہی لوگ ہیں جو اوّل بھی مسلمان ہیں اور آخر بھی مسلمان ہیں اور مسلمان کے سوا کچھ نہیں ہیں۔ باقی رہے وہ لوگ جو صرف "ہندوستانی" ہیں، یا پہلے "ہندوستانی" اور پھر سب کچھ ہیں، تو ان سے مجھے سروکار ہی نہیں۔ وہ ایک جہاز کے مسافر ہیں، اور میں دوسرے جہاز کا مسافر ہوں۔ ان کی منزلِ مقصود دوسری ہے اور میری منزلِ مقصود دوسری۔ ان کو صرف "ہندوستانی" ہونے کی حیثیت سے سیاسی آزادی اور معاشی استقلال درکار ہے، عام اس سے کہ مسلمان رہیں یا نہ رہیں۔ اور مجھے وہ آزادی درکار ہے جس کے ذریعہ سے میں اپنی زوال پذیر اسلامی طاقت کو سنبھال لوں، اپنی زندگی کے مسائل کو مسلمان ہونے کی حیثیت سے حل کروں، اور ہندوستان میں "مسلم قوم" کو پھر سے ایک خود مختار قوم دیکھوں۔ ان کے لیے ہندوستان کا سیاسی و معاشی استقلال بجائے خود ایک مقصد ہے اور میرے لیے وہ حصولِ مقصد کا ایک ذریعہ ہے، جو اگر حصولِ مقصد میں مددگار نہ ہو تو مجھے بجائے خود اس ذریعہ سے کوئی دلچسپی نہیں۔ پس میرے اور ان کے درمیان مقصدی اختلاف ہے۔ اس لیے ان سے بحث کرنا تو میرے نزدیک محض تضیعِ وقت ہے۔ البتہ جو لوگ اس مقصد میں مجھ سے متفق ہیں ان کو میں دعوت دیتا ہوں کہ وہ ان مضامین کو غور سے ملاحظہ فرمائیں، جو کچھ حق پائیں اسے قبول کریں، اور جس چیز میں غلطی پائیں اس کا غلط ہونا دلیل و حجت سے ثابت کر دیں، تاکہ میں بھی اپنے خیالات کی اصلاح کر دوں۔

میں جانتا ہوں کہ جو لوگ مقصد میں مجھ سے اتفاق رکھتے ہیں ان میں سے

بھی بہت سے حضرات میرے ان خیالات سے متفق نہیں ہیں، جن کا اظہار میں نے اپنے مضامین میں کیا ہے۔ مگر اس قسم کے جن حضرات نے اخبارات میں اور پرائیویٹ خطوط میں میرے مضامین پر تنقیدیں کی ہیں، ان کی تنقیدوں کو دیکھ کر میں کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکا۔ آخر انہیں اختلاف کس چیز سے ہے؟ عموماً ان کی تحریروں کو دیکھ کر تو میں نے یہ اندازہ کیا ہے کہ وہ محض سرسری نظر میں یہ دیکھ کر کہ ایک شخص ان کے طریق کار سے اختلاف کر رہا ہے، پوری طرح اس کے خیالات کو پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتے، اور تنقید لکھنی شروع کر دیتے ہیں۔ اکثر حضرات نے میرے اوپر وہ اعتراض کیے ہیں جن کا جواب میں خود ہی اپنے مضامین میں دے چکا ہوں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر انہوں نے ان مضامین کو پڑھا بھی ہے تو دل کے دروازوں کو بند کر کے پڑھا ہے۔ میں عرض کروں گا کہ یہ طریقہ اہلِ حق کے لیے مناسب نہیں ہے۔ ہم کوئی مجلسِ مناظرہ تو قائم نہیں کر رہے ہیں جس کا مقصد محض دماغی زور آزمائی ہوتا ہے، اور جس میں ہر فریق پہلے ہی سے یہ فیصلہ کر کے شریک ہوتا ہے کہ دوسرے کی بات نہ مانے گا، اور اپنی بات پر اڑا رہے گا۔ ہمارا مقصد تو اس ملّت کی حفاظت اور سربلندی ہے، جو ہم میں سے ہر ایک کو یکساں عزیز ہے۔ اس مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر جو شخص کچھ کہہ رہا ہے، اس کی بات کو کھلے دل کیساتھ سُنیئے، پوری طرح سُنیئے، ٹھنڈے دل سے اس پر غور کیجیے، اور یہ فرض نہ کر لیجیے کہ جو طریقہ آپ نے اختیار کیا ہے، وہ وحی کے ذریعہ سے نازل ہوا ہے، اس لیے اس کے خلاف جو کچھ بھی کہا جائے وہ بہرحال باطل ہی ہونا چاہیئے۔ وہ غریب آپ سے لڑنے کے لیے نہیں اُٹھا ہے، بلکہ غور و فکر کی دعوت دینے کے لیے اُٹھا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ آپ قدم اُٹھانے سے پہلے اپنی منزلِ مقصود معین کر لیں اور اس منزل کی طرف جانے کے لیے وہ راستہ معلوم کریں جو یقیناً صحیح ہو، جس کی صحت اتنی ہی یقینی ہو جتنی ہدایت ربانی کی صحت یقینی ہے۔ پس آپ جویائے حق بن کر اس کے معروضات کا مطالعہ کریں اور دورانِ مطالعہ میں صواب کو خطا سے تمیز کرتے

چلے جائیں - جو کچھ صواب نظر آئے اسے قبول کرلیں - اور جس چیز میں خطا پائیں اس کے متعلق واضح طور پر بتادیں کہ اسے کس بنا پر آپ خطا سمجھتے ہیں - آیا وہ کتاب اللہ کے خلاف ہے ؟ سُنّتِ رسول اللہ کے خلاف ہے ؟ عقل کے خلاف ہے ؟ یا کسی اور چیز کےخلاف ہے جو تمیزِ حق و باطل کی معیار ہو ؟ اس توضیح سے راقم کو بھی اپنے خیالات پر نظرِ ثانی کرنے کا موقع ملے گا اور نیک نیتی کے ساتھ مباحثہ کرکے ہم سب ایک صحیح نتیجہ پر پہنچ سکیں گے - یا اگر اختلاف باقی بھی رہا تو کم از کم غلط فہمیاں باقی نہ رہیں گی -

مَیں نے اس سلسلۂ مضامین میں جو کچھ لکھا ہے اس سے میرا مقصد مسلمانوں کے کسی گروہ کی حمایت کرنا اور کسی دوسرے گروہ کو جمہور مسلمین کے سامنے خطا کار ٹھہرانا نہیں ہے ، اس لیے تمام ناظرین سے میری استدعا ہے کہ وہ ان مضامین کو پڑھتے وقت اپنے ذہن کو گروہی تعصّبات اور بدگمانی سے محفوظ رکھیں - مَیں گروہ بندی سے ہمیشہ دامن کش رہا ہوں اور مجھے فطرتاً اس چیز سے نفرت ہے - میرا مقصد صرف یہ ہے کہ مسلمانوں کے تمام گروہ اپنے احزابی تعصّبات سے دل کو پاک کرکے خالص اسلامی نقطۂ نظر سے اپنی قوم کو اور ہندوستان کے موجودہ حالات کو دیکھیں اور اسلامی ذہنیت کیساتھ اپنے لیے راہِ نجات تلاش کریں - مَیں یقین رکھتا ہوں کہ جب ایک نظر اور ایک ہی ذہنیت کے ساتھ مشاہدہ اور تفکر کیا جائے گا ، اور نفسانیت کا شیطانی عنصر بیچ میں نہ رہے گا ، تو یہ نزاعات جو عین خانہ بربادی کے موقع پر گھر والوں کے درمیان برپا ہیں خود بخود ختم ہو جائیں گی -

---

آنے والا انقلاب اور مسلمان

ہندوستان[1] میں تیزی کے ساتھ ایک نیا انقلاب آرہا ہے جو بلحاظ اپنے اثرات اور اپنے نتائج کے ۱۸۵۷ء کے انقلاب سے بھی زیادہ شدید ہوگا۔ پھر اس سے بہت زیادہ بڑے پیمانہ پر ایک دوسرے انقلاب کا سامان تمام دنیا میں ہو رہا ہے، اور بہت ممکن ہے کہ یہ وسیع تر انقلاب اس برِصغیر پر اثر انداز ہو کر یہاں کے متوقع انقلاب کا رُخ اچانک پھیر دے اور اس کو ہماری توقعات سے بہت زیادہ پُرخطر بنا کر رہے۔

جو لوگ خس و خاشاک کی طرح ہر رَو پر بہنے کے لیے تیار ہیں، اور جن کو خدا نے اتنی سمجھ بوجھ ہی نہیں دی ہے کہ اپنے لیے زندگی کا کوئی راستہ متعین کر سکیں، ان کا ذکر تو قطعاً فضول ہے۔ انہیں غفلت میں پڑا رہنے دیجیے، زمانہ کا سیلاب جس رُخ پر بہے گا وہ آپ سے آپ اسی رُخ پر بہہ جائیں گے۔ اسی طرح اُن لوگوں سے بھی قطع نظر کیجیے جو آنے والی انقلابی قوتوں پر سمجھ بوجھ کر

---

[1] یہ مضمون محرم ۱۳۵۶ھ میں لکھا گیا تھا۔ مرتب

ایمان لاتے ہیں اور باارادہ اسی رُخ پر جانا چاہتے ہیں جس پر زمانہ کا طوفانی دریا جارہا ہے۔ اب صرف وہ لوگ رہ جاتے ہیں، جو مسلمان ہیں، مسلمان رہنا چاہتے ہیں، مسلمان مرنا چاہتے ہیں، اور یہ تمنا رکھتے ہیں کہ ہندوستان میں اسلامی تہذیب زندہ رہے اور ہماری آئندہ نسلیں محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی راہِ راست پر قائم رہیں۔ ان لوگوں کے لیے یہ وقت روا روی سے گزار دینے کا نہیں بلکہ گہری سوچ اور غایت درجہ کے غور و فکر کا ہے۔ وہ اگر اس نازک وقت میں غفلت اور بے پروائی سے کام لیں گے تو ایک جُرمِ عظیم کا ارتکاب کریں گے اور اس جُرم کی سزا صرف آخرت ہی میں نہ ملے گی بلکہ اسی دنیا کی زندگی میں ان پر چھا جائے گی۔ زمانہ کا بے درد ہاتھ ان کی آنکھوں کے سامنے تہذیبِ اسلامی کے ایک ایک نشان کو مٹائے گا اور وہ بے بسی کے ساتھ اس کو دیکھا کریں گے۔ زمانہ ان کے قومی وجود کو ملیامیٹ کرے گا۔ ایک ایک کر کے ان امتیازی حدود کو ڈھائے گا جن سے اسلام غیر اسلام سے ممیز ہوتا ہے ہر اس خصوصیت کو فنا کر دے گا جس پر مسلمان دنیا میں فخر کرتا رہا ہے۔ وہ یہ سب کچھ دیکھیں گے اور کچھ نہ کر سکیں گے۔ ان کی آنکھیں خود اپنے گھروں میں اپنی نوخیز نسلوں کو خدا پرستی سے دُور، اسلامی تہذیب سے بیگانہ اور اسلامی اخلاق سے عاری دیکھیں گی، اور آنسو تک نہ بہا سکیں گی۔ ان کی اپنی اولاد اس فوج کی سپاہی بن کر اُٹھے گی جسے اسلام اور اس کی تہذیب کے خلاف صف آرا کیا جائے گا۔ وہ اپنے جگر گوشوں کے ہاتھ سے تیر کھائیں گے اور جواب میں کوئی تیر نہ چلا سکیں گے۔

یہ انجام یقینی ہے اگر کام کے وقت کو غفلت میں کھو دیا گیا۔ انقلاب کا عمل شروع ہو چکا ہے اس کے آثار نمایاں ہو چکے ہیں، اور اب فکر و عمل کے لیے بہت ہی تھوڑا وقت باقی ہے۔

ہندوستان میں اسلام کی گزشتہ تاریخ پر ایک نظر

اسلامی ہند کی تاریخ پر جو لوگ نظر رکھتے ہیں ان سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے

کہ ا[illegible] میں اسلامی تہذیب کی بنیاد ابتدا ہی سے کمزور ہے۔ صدرِ اوّل میں اور اس سے متصل بعد کی قرنوں میں اسلامی سیلاب کی جو لہریں ہندوستان تک پہنچیں وہ زیادہ تر خس و خاشاک اور کثافتیں لے کر آئیں۔ اس لیے کہ اس زمانہ میں ہندوستان دار الاسلام کی آخری سرحدوں پر تھا اور وہ سب لوگ جو اسلام کے مرکزی اقتدار یا اصولی عقیدہ و مسلک کے خلاف بغاوت کرتے تھے، عموماً بھاگ کر اسی طرف آجاتے تھے۔ چنانچہ سندھ اور کاٹھیاوار اور گجرات وغیرہ ساحلی علاقوں میں جو گمراہیاں آج تک پائی جاتی ہیں وہ اسی زمانہ کی یادگار ہیں۔ اس کے بعد چھٹی صدی ہجری میں جب اصل دھارے نے ہندوستان کی طرف رُخ کیا تو وہ خود عجمی کثافتوں سے بہت کچھ آلودہ ہو چکا تھا۔ امراء میں روحِ جہاد اور علماء میں روحِ اجتہاد سرد ہو چکی تھی۔ ہمارے حکمران زیادہ تر وہ لوگ تھے جن کو خراج اور توسیعِ مملکت کی فکر تھی۔ اور ہمارے مذہبی پیشواؤں میں اکثریت ان حضرات کی تھی جن کی زندگی کا مقصد حکومت کے مناصب حاصل کرنا اور ہر قیمت پر اپنے مذہبی اقتدار کی حفاظت کرنا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ نہ یہاں صحیح معنوں میں کبھی اسلامی حکومت قائم ہوئی۔ نہ حکومت نے پوری طرح وہ فرائض انجام دیے جو شرعاً اس پر عائد ہوتے تھے، نہ اسلامی علوم کی تعلیم کا کوئی صحیح نظام قائم ہوا، نہ اشاعتِ اسلام کی کوئی خاص کوشش کی گئی، نہ اسلامی تہذیب کی ترویج اور اس کے حدود کی نگہداشت جیسی ہونی چاہیے ویسی ہو سکی۔ علماء اور صوفیہ کے ایک مختصر گروہ نے بلاشبہ نہایت زریں خدمات انجام دیں اور انہی کی برکت ہے کہ آج ہندوستان کے مسلمانوں میں کچھ علمِ دین اور کچھ اتباعِ شریعت پایا جاتا ہے۔ لیکن ایک قلیل گروہ ایسی حالت میں کیا کر سکتا تھا جب کہ قوم کے عوام جاہل، اور ان کے سردار اپنے فرائض سے غافل ہوں۔

اسلام کی عام کشش سے متاثر ہو کر ہندوستان کے کروڑوں آدمی مسلمان ہوئے، مگر اسلامی اصول پر ان کی تعلیم و تربیت کا کوئی انتظام نہ کیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس ملک کی اسلامی آبادی کا سوادِ اعظم ان تمام مشرکانہ اور جاہلانہ رسوم و عقائد

میں گرفتار رہا جو اسلام قبول کرنے سے پہلے ان میں رائج تھے۔

جو مسلمان باہر سے آئے تھے اُن کی حالت بھی ہندوستانی نومسلموں سے کچھ زیادہ بہتر نہ تھی۔ ان پر عجمیت پہلے ہی غالب ہو چکی تھی۔ نفس پرستی اور عیش پسندی کا گہرا رنگ ان پر چڑھ چکا تھا۔ اسلامی تعلیم و تربیت سے وہ خود پوری طرح بہرہ ور نہ تھے۔ زیادہ تر دُنیا ان کو مطلوب تھی۔ خالص دینی جذبہ ان میں سے بہت کم، بہت ہی کم لوگوں میں تھا۔ وہ یہاں آکر بہت جلدی عام باشندوں میں گھل مِل گئے۔ کچھ ان کو متاثر کیا، اور کچھ خود ان سے متاثر ہوئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں مسلمانوں کا تمدن اسلامیت، عجمیت اور ہندیت کی ایک معجونِ مرکب بن کر رہ گیا۔

عام طور پر جو طرزِ تعلیم یہاں رائج ہوا وہ اسی ڈھنگ کا تھا جسے انگریزوں نے بعد میں اختیار کیا۔ اس کا بنیادی مقصد حکومت کی خدمات کے لیے لوگوں کو تیار کرنا تھا۔ قرآن اور حدیث کے علوم جن پر اسلامی تہذیب کی بنیاد قائم ہے، یہاں کے نظامِ تعلیمی میں بہت ہی کم بار پاسکے۔

طرزِ حکومت بھی قریب قریب اسی ڈھنگ کا رہا جس کی تقلید بعد میں انگریزوں نے کی، بلکہ اپنی قومی تہذیب کی حفاظت اور ترویج اور اس کے حدود کی نگہداشت کا جتنا خیال انگریزوں نے رکھا ہے، اتنا بھی مسلمان حکمرانوں نے نہ رکھا۔ خصوصیت کے ساتھ مغل فرماں رواؤں نے اس باب میں جس سہل انگاری سے کام لیا ہے اس کی مثال تو شاید کسی حکمران قوم میں نہ مل سکے گی۔

ظاہر ہے کہ جس قوم کی تعلیم اور سیاست دونوں اپنی قومی تہذیب کی حفاظت سے دست کش ہو جائیں اس کو زوال سے کوئی قوت نہیں بچا سکتی۔

انحطاط کا آغاز اور اس کے ابتدائی آثار

گیارھویں صدی ہجری میں انحطاط اپنی آخری حدوں پر پہنچ چکا تھا۔ مگر عالمگیر کی طاقتور شخصیت اس کو روکے ہوئے تھی۔ بارھویں صدی کے ابتداء

میں جب قصر اسلامی کا یہ آخری محافظ دنیا سے رخصت ہوا تو وہ تمام کمزوریاں یکایک نمودار ہوگئیں جو اندر ہی اندر صدیوں سے پرورش پا رہی تھیں۔ تعلیم و تربیت کی خرابی اور قومی اخلاق کے اضمحلال اور نظام اجتماعی کے اختلال کا پہلا نتیجہ سیاسی زوال کی صورت میں ظاہر ہوا۔ مسلمانوں کی سیاسی جمعیت کا شیرازہ دفعتہً درہم برہم ہوگیا۔ قومی اور اجتماعی مفاد کا تصور ان کے دماغوں سے نکل گیا! انفرادیت اور خود غرضی پوری طرح ان پر مسلط ہوگئی۔ ان میں ہزاروں ہزار خائن اور غدار پیدا ہوئے جن کا ایمان کسی نہ کسی قیمت پر خریدا جا سکتا تھا اور جو اپنے ذاتی فائدے کے لیے بڑے سے بڑے قومی مفاد کو بے تکلف بیچ سکتے تھے۔ ان میں لاکھوں بندگانِ شکم پیدا ہوئے جن سے ہر دشمنِ اسلام تھوڑی سی رشوت یا حقیر سی تنخواہ دے کر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف بد سے بدتر خدمت لے سکتا تھا۔ ان کے سوادِ اعظم سے قومی غیرت اور خودداری اس طرح مٹ گئی کہ دلوں میں اس کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔ وہ دشمنوں کی غلامی پر فخر کرنے لگے۔ غیروں کے بخشے ہوئے خطابات اور مناصب میں ان کو عزت محسوس ہونے لگی۔ دین اور ملت کے نام پر جب کبھی ان سے اپیل کی گئی وہ پتھروں سے ٹکرا کر واپس آئی۔ اور جب کبھی کوئی غیرت مند شخص اقتدارِ قومی کے گرتے ہوئے قصر کو سنبھالنے کے لیے اٹھا، اس کا سر خود اس کی اپنی قوم کے بہادروں نے کاٹ کر دشمنوں کے سامنے پیش کر دیا۔

اس طرح ڈیڑھ صدی کے اندر اسلام کا اقتدار ہندوستان کی سرزمین میں بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دیا گیا۔ اور سیاسی اقتدار کے مٹتے ہی یہ قوم افلاس، غلامی، جہالت اور بداخلاقی میں مبتلا ہوگئی۔

انگریزی حکومت کے دور میں مسلمانانِ ہند کی حالت

۱۸۵۷ء کا ہنگامہ دراصل ایک سیاسی انقلاب کی تکمیل اور ایک دوسرے انقلاب کی تمہید تھا۔ جن کمزوریوں نے مسلمانوں سے سیاسی اقتدار چھینا تھا، وہ سب علیٰ حالہٖ قائم تھیں۔ اور ان پر مزید کمزوریوں کا اضافہ ہو رہا تھا۔ ان کے اندر اسلامی

تہذیب کی بُنیاد پہلے سے کمزور تھی۔ اس کمزوری نے جب حکومت کے منصب سے
ان کو ہٹا دیا اور افلاس و غلامی کی دوہری مصیبت میں وہ گرفتار ہوئے، تو دوسری
اور کمزوریاں برسرِ کار آگئیں۔

دین اور اخلاق اور تہذیب اور تمدن یہ سب چیزیں بلند تر انسانیت سے تعلق
رکھتی ہیں، اور ان کی قدر و عزت وہی لوگ کر سکتے ہیں جو حیوانیت سے بالاتر ہوں۔
پیٹ اور روٹی اور کپڑا اور آسائشِ بدن اور لذاتِ نفس وہ چیزیں ہیں جو انسان
کی حیوانی ضروریات سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور جب انسان مقامِ حیوانی سے قریب تر
ہوتا ہے تو اس کی نگاہ میں یہی چیزیں زیادہ اہم ہوتی ہیں۔ حتیٰ کہ وہ ان کی خاطر بلند تر
انسانیت کی ہر متاعِ گراں مایہ کو نہ صرف قربان کر دیتا ہے۔ بلکہ حیوانی زندگی کی
آخری حدوں پر پہنچ کر اس میں یہ احساس بھی باقی نہیں رہتا کہ میرے لیے کوئی چیز ان
چیزوں سے اعلیٰ و ارفع بھی ہو سکتی ہے۔ ہندوستان کا مسلمان جب اپنا سیاسی
اقتدار کھو رہا تھا، اس زمانہ میں اس کی انسانیت بالکل فنا نہیں ہوئی تھی، اس لیے
وہ پیٹ اور بدن پر انسانیت کی گراں قدر متاعوں کو قربان تو کر رہا تھا، مگر اس کو
یہ احساس ضرور تھا کہ یہ متاعیں گراں قدر ہیں، اور کسی نہ کسی طرح ان کی بھی حفاظت
کرنی چاہیے۔ لیکن جب وہ سیاسی اقتدار کھو چکا تو افلاس نے پیٹ اور بدن کے
سوال کو بڑھ گنا زیادہ اہم بنا دیا، اور غلامی نے غیرت اور خودداری کے تمام احساسات
کو مٹانا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی انسانیت روز بروز پست ہوتی چلی گئی،
اور حیوانیت کا اثر بڑھتا اور چڑھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ ابھی ایک صدی بھی پوری نہیں
گزری ہے اور حال یہ ہو گیا ہے کہ مسلمانوں کی ہر نسل پہلی نسل سے زیادہ نفس پرست،
بندۂ شکم اور آسائشِ بدن کی غلام بن کر اٹھ رہی ہے۔ ستر برس پہلے وہ مغربی تعلیم
کی طرف یہ کہہ کر گئے تھے کہ ہم صرف اپنی حیوانی ضروریات پوری کرنے کے لیے اُدھر
جا رہے ہیں، اپنے دین و اخلاق اور اپنی قومی تہذیب و تمدن کو ہم کھونا نہیں
چاہتے۔ اور واقعہ بھی یہ تھا کہ اس وقت تک یہ چیزیں ان کی نگاہ میں کافی اہمیت

رکھتی تھیں۔ لیکن جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا، وہ بنیادی کمزوریاں جنہوں نے ان کو حکومت کے منصب سے ہٹایا تھا ان میں پہلے سے موجود تھیں، اور وہ نئی کمزوریاں جو غلامی و افلاس کی حالت میں فطرۃً پیدا ہوتی ہیں، ان کے اندر تیزی سے پیدا ہو رہی تھیں۔ ان دونوں قسم کی کمزوریوں کی بدولت ایک طرف دین و اخلاق کی اہمیت اور قومی تہذیب و تمدّن کی قدر و عزّت روز بروز ان میں کم ہوتی چلی گئی۔ دوسری طرف خود غرضی و نفسانیت کے روز افزوں غلبہ نے ان کو ہر اس شخص کی غلامی پر آمادہ کر دیا جو ان کو کچھ مال اور جاہ اور اپنے ہم جنسوں میں کچھ سربلندی عطا کر سکتا ہو خواہ ان چیزوں کے بدلہ میں وہ انسانیت کے جس گوہرِ بے بہا کو چاہے خرید لے۔ تیسری طرف انفرادیت اور خود پرستی جو ڈھائی سو برس سے ان کی قومیت کو گھن کی طرح لگی ہوئی ہے، انتہائی حد کو پہنچ گئی۔ یہاں تک کہ اجتماعی عمل کی کوئی صلاحیت ان میں باقی نہیں رہی، اور وہ تمام صفات ان سے نکل گئیں جن کی بدولت ایک قوم کے افراد اپنے قومی مفاد کی حفاظت اور اپنے قومی وجود کی حمایت کے لیے مجتمع ہو سکتے اور مشترک جدّ و جہد کر سکتے ہیں۔

یہاں اتنا موقع نہیں کہ اس دوسرے انقلاب کے تمام پہلوؤں کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا جا سکے۔ تاہم مختصراً اس کے چند نمایاں پہلوؤں کی طرف ہم اشارہ کریں گے تاکہ ہندوستان میں اسلام کی موجودہ پوزیشن واضح طور پر سامنے آ جائے اور یہ اندازہ کیا جا سکے کہ اب جو تیسرا انقلاب سامنے آ رہا ہے، وہ ان حالات میں مسلمانوں پر کس طرح اثر انداز ہو گا۔

(۱) انگریزی حکومت کی پالیسی

جس روز سے برطانوی سامراج نے ہندوستان میں قدم رکھا ہے، اسی روز سے اس کی یہ مستقل پالیسی رہی ہے کہ مسلمانوں کا زور توڑا جائے۔ اسی غرض کے لیے مسلمان ریاستوں کو مٹایا گیا اور اس نظامِ عدل و قانون کو بدلا گیا جو صدیوں سے یہاں قائم تھا۔ اسی غرض کے لیے انتظامِ مملکت کے قریب قریب ہر شعبے میں

ایسی تدبیریں اختیار کی گئیں جن کا مآل یہ تھا کہ مسلمانوں کو معاشی حیثیت سے تباہ و برباد کر دیا جائے اور ان پر رزق کے دروازے بند کر دیے جائیں۔ چنانچہ گزشتہ ڈیڑھ سو سال کے اندر اس پالیسی کے جو نتائج ظاہر ہوئے ہیں وہ یہ ہیں کہ جو قوم کبھی اس ملک کے خزانوں کی مالک تھی وہ اب روٹیوں کو محتاج ہو چکی ہے۔ اس کو معیشت کے ذرائع سے ایک ایک کر کے محروم کر دیا گیا ہے اور اب اس کی ۹۰ فی صدی آبادی غیر مسلم سرمایہ دار کی معاشی غلامی میں مبتلا ہے۔ ساہوکار سے برطانوی سامراج کا مستقل اتحاد ہے اور برطانوی نظام عدالت اس کے لیے وہی خدمت انجام دے رہا ہے جو سود خوار پٹھان کے لیے اس کا ڈنڈا انجام دیتا ہے۔

(ب) مغربی تعلیم کا اثر

سیاسی اقتدار سے محروم ہونے کے بعد مسلمانوں میں جاہ اور عزت کی بھوک پیدا ہوئی اور معاشی وسائل سے محروم ہونے کے بعد روٹی کی بھوک۔ ان دونوں چیزوں کے حصول کا دروازہ صرف ایک ہی رکھا گیا، اور وہ مغربی تعلیم کا دروازہ تھا۔ روٹی اور عزت کے بھوکے لاکھوں کی تعداد میں ادھر لپکے۔ وہاں ہاتفِ غیب نے پکار کر کہا کہ آج روٹی اور عزت مسلمان کے لیے نہیں ہے۔ یہ چیزیں اگر چاہتے ہو تو نامسلمان بن کر آؤ۔ اپنے دل کو، اپنے دماغ کو، اپنے دین اور اخلاق کو، اپنی تہذیب اور آداب کو، اپنے اصولِ حیات اور طرزِ معاشرت کو، اپنی غیرت اور خودداری کو قربان کرو، تب روٹی کے چند ٹکڑے اور عزت کے چند کھلونے تم کو دیے جائیں گے۔ انہوں نے خیال کیا کہ بہت ہی سستے داموں بہت ہی قیمتی چیز مل رہی ہے۔ بیچو اس کباڑخانے کو۔ یہ چیزیں جو روٹی اور خطاب و منصب جیسی بے بہا چیزوں کے معاوضے میں مانگی جا رہی ہیں، آخر ہیں کس کام کی؟ انہیں تو رہن رکھ کر بنئے سے چار پیسے بھی نہیں مل سکتے۔

مسلمان جب مغربی تعلیم کی طرف گئے تو یہی کچھ سمجھ کر گئے۔ زبانوں نے گو ایسا نہیں کہا، مگر جذبات اور تخیلات تو ایسے ہی کچھ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ کم و بیش ۹۰ فیصدی لوگوں پر اس تعلیم کے وہی اثرات ہوئے جو ہم نے اوپر بیان کیے ہیں۔ اسلامی

تعلیم سے وہ قطعی کورے ہیں۔ ان میں بیشتر ایسے ہیں جو قرآن کو ناظرہ بھی نہیں پڑھ سکتے۔ اسلامی لٹریچر کی کوئی چیز ان کی نظروں سے نہیں گزرتی۔ وہ کچھ نہیں جانتے کہ اسلام کیا ہے اور مسلمان کس کو کہتے ہیں اور اسلام اور غیر اسلام میں کیا چیز مابہ الامتیاز ہے۔ خواہشاتِ نفس کو انہوں نے اپنا معبود بنا لیا ہے۔ اور یہ معبود اس مغربی تہذیب کی طرف انہیں لیے جا رہا ہے جس نے نفس کی ہر خواہش اور لذتِ نفس کی ہر طلب کو پورا کرنے کا ذمہ لے رکھا ہے۔ وہ مسلمان ہونے پر نہیں بلکہ ماڈرن ہونے پر فخر کرتے ہیں۔ وہ اہلِ فرنگ کی ایک ایک ادا پر جان نثار کرتے ہیں۔ لباس میں، معاشرت میں، کھانے اور پینے میں، میل جول اور بات چیت میں، حتیٰ کہ اپنے ناموں تک میں وہ ان کا ہو بہو چربہ بن جانا چاہتے ہیں۔ انہیں ہر اس طریقہ سے نفرت ہے جس کا حکم مذہب نے ان کو دیا ہے۔ اور ہر اس کام سے رغبت ہے جس کی طرف مغربی تہذیب انہیں بلاتی ہے۔ نماز پڑھنا ان کے ہاں معیوب ہے، اتنا معیوب کہ جو شخص نماز پڑھتا ہے ان کی سوسائٹی میں نکو بنایا جاتا ہے اور اگر بنانے کی جرأت نہیں ہوتی تو کم از کم حقارت آمیز حیرت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے کہ آخر یہ کون سی مخلوق ہے جو اب تک خدا کا نام لیے جا رہی ہے۔ بخلاف اس کے سینما جانا ان کے نزدیک نہ صرف مستحسن ہے بلکہ ایک مہذب انسان کے لوازمِ حیات میں سے ہے۔ اور جو شخص اس سے اجتناب کرتا ہے، اس پر حیرت کی جاتی ہے کہ یہ کس قسم کا تاریک خیال مُلّا ہے جو بیسویں صدی کی اس برکتِ عظمیٰ سے محروم رہنا چاہتا ہے۔ ان میں اب وہ طبقہ سرعت سے بڑھ رہا ہے جو مذہب اور خدا سے اپنی بیزاری کو چھپانے کی بھی ضرورت نہیں سمجھتا اور صاف کہنے لگا ہے کہ ہمیں اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔

یہ چیز اب تک ہمارے مردوں میں تھی، مگر اب عورتوں میں بھی پہنچ رہی ہے۔ جو طبقے ہماری سوسائٹی کے پیش رو اور مقتدا ہیں، وہ اپنی عورتوں کو کھینچ کھینچ کر باہر لا رہے ہیں۔ ان کو بھی اسلام اور اس کی تہذیب سے بیگانہ اور مغربی تہذیب اور اس

کے طور طریقوں اور اس کے تخیلات سے آراستہ کیا جا رہا ہے۔ عورت میں انفعال اور تاثر کا مادّہ فطری طور پر مردوں سے زیادہ ہوتا ہے۔ جو راستہ مردوں نے ستر برس میں طے کیا ہے، عورتیں اس کو بہت جلد طے کرلیں گی اور ان کی گودوں میں جو نسلیں پرورش پاکر اٹھیں گی ان میں شاید اسلام کا نام بھی باقی نہ رہے گا۔

(۳) قومی انتشار

خود غرضی، انفرادیت اور نفس پرستی کے غلبہ کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں سے قومیت کا احساس مٹتا جا رہا ہے اور ان کی اجتماعی طاقت فنا ہو رہی ہے۔ پندرہ سال سے ان کے اندر سخت انتشار برپا ہے۔ ان کی کوئی قومی پالیسی نہیں، کوئی ایک شخص نہیں جو ان کا لیڈر ہو، کوئی ایک جماعت نہیں جو ان کی نمائندہ ہو، کسی بڑی سے بڑی مصیبت پر بھی وہ جمع نہیں ہوسکتے، ایک بن سری فوج ہے جو راس کماری سے پشاور تک پھیلی ہوئی ہے۔ ایک ریوڑ ہے جس میں کوئی نظم نہیں۔ ایک بھیڑ ہے جس میں کوئی رابطہ نہیں۔ ہر فرد آپ ہی اپنا لیڈر اور اپنا پیرو ہے۔ انجمنیں اور جمعیتیں ہزاروں ہیں، مگر حال یہ ہے کہ ایک ہی انجمن کے ارکان باہم برسرپیکار ہو جاتے ہیں، اور علانیہ ایک دوسرے کے مقابلہ پر آجاتے ہیں۔ اوّل اوّل ان کو اپنی اُس طاقت کا گھمنڈ تھا جو کبھی ان میں پائی جاتی تھی۔ مگر ہمسایہ قوموں نے دس سال کے اندر ان کو بتا دیا کہ طاقت کس چیز کا نام ہے۔ یہ آپس میں لڑتے رہے، اور وہ منظم ہو گئیں۔ انہوں نے خود اپنے سرداروں میں سے ایک ایک کو کھینچ کر زمین پر گرا دیا، اور انہوں نے ایک سردار کی اطاعت کرکے اسے تمام ملک میں بے تاج و تخت کا بادشاہ بنا دیا ——— یہ اپنی قوتیں اپنی تخریب میں ضائع کرتے رہے اور وہ حکومت سے پیہم مقابلہ کرکے اپنا زور بڑھاتے رہے ——— انہوں نے ملک کے تازہ انتخابات[1] میں شخصی اغراض کو سامنے رکھا اور بیسیوں پارٹیاں بن کر اسمبلیوں میں پہنچے۔ انہوں نے اجتماعی اغراض کو مقدم رکھ کر تمام ملک میں منضبط جدوجہد کی اور ایک مستحکم جمعیت کی شکل میں حکومت کے ایوانوں پر قبضہ

---

[1] اشارہ ہے ۱۹۳۷ء کے انتخابات کیطرف جنکی بدولت ہندوستان کے ۸ بڑے صوبوں پر کانگریس کی حکومت قائم ہوگئی تھی۔

کر لیا۔ ان نتائج کو دیکھ کر مسلمانوں پر اب وہی اثر ہو رہا ہے جو ایک باقاعدہ فوج کو دیکھ کر ایک منتشر انبوہ پر ہوا کرتا ہے۔ ایک منظم جماعت کی کامیابیوں سے وہ مرعوب ہو گئے ہیں۔ وہ دیکھ رہے ہیں کہ حکومت کا اقتدار اب بہت جلد انگریز کے ہاتھ سے منتقل ہو کر اس نئی جماعت کے ہاتھ میں آنے والا ہے۔ لہٰذا اب وہ سمت قبلہ بدلنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ ان کے سجدوں کا رُخ وائسریگل لاج سے ہٹ کر آنند بھون کی طرف پھرنے لگا ہے، اور آج نہیں تو کل پھر کر رہے گا۔

آنیوالے انقلاب کی نوعیت

یہ ہے مسلمانوں کی موجودہ پوزیشن۔ اب دیکھئے کہ جو انقلاب آ رہا ہے وہ کس نوعیت کا ہے۔

اب تک ہندوستان کی حکومت ایک ایسی قوم کے ہاتھ میں رہی ہے جو اس ملک کی آبادی میں آٹے میں نمک کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے اثرات تو وہ ہیں جو آپ نے دیکھ لیے۔ اب جو جماعت برسر اقتدار آ رہی ہے، وہ ملک کی آبادی کا سوادِ اعظم ہے۔ گزشتہ ڈھائی سو برس میں مسلمانوں نے جو زنانہ خصوصیات اپنے اندر پیدا کی ہیں، ان کو پیش نظر رکھ کر اندازہ کیجئے کہ ان کو جدید ہندی قومیت میں جذب ہوتے کتنی دیر لگے گی۔

جدید ہندی قومیت کا لیڈر وہ شخص[1] ہے، جو مذہب کا علانیہ مخالف ہے، ہر اس قومیت کا دشمن ہے جس کی بنا کسی مذہب پر ہو۔ اس نے اپنی دہریت کو کبھی نہیں چھپایا۔ یہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں کہ وہ کمیونزم پر ایمان رکھتا ہے۔ اس امر کا بھی وہ خود اعتراف کر چکا ہے کہ میں دل اور دماغ کے اعتبار سے مکمل فرنگی ہوں۔ یہ شخص ہندوستان کی نوجوان نسل کا رہنما ہے، اور اس کے اثر سے وہ جماعت نہ صرف غیر مسلم قوموں میں بلکہ خود مسلمانوں کی نوخیز نسلوں میں بھی روز افزوں تعداد میں پیدا ہو رہی ہے جو

---

[1] اشارہ پنڈت جواہر لال نہرو کی طرف ہے ۔ مرتب

سیاسی حیثیت سے ہندوستانی وطن پرست اور اعتقادی حیثیت سے کمیونسٹ اور تہذیبی حیثیت سے مکمل فرنگی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس ڈھنگ پر جو قومیت تیار ہو رہی ہے اس سے مغلوب اور متاثر ہو کر ہندوستان کے مسلمان کتنی مدت تک اپنی قومی تہذیب کے باقی ماندہ آثار کو زندہ رکھ سکیں گے۔

مسلمانوں کے انتشار اور بدنظمی کو دیکھ کر اب ان کے مستقل قومی وجود کو تسلیم کرنے سے صاف انکار کیا جا رہا ہے۔ جن لوگوں کی عمریں عوام کی رہنمائی اور اقوام کی نبض شناسی میں گزری ہیں ان سے یہ راز کب تک چھپا رہ سکتا تھا کہ اس قوم کا شیرازۂ قومیت بڑی حد تک بکھر چکا ہے، وہ خصوصیات اس سے فنا ہو رہی ہیں جو کسی جماعت کو ایک قوم بناتی ہیں اور اب اس کے افراد کسی دوسری قومیت میں جذب ہونے کے لیے کافی حد تک مستعد ہو چکے ہیں۔ یہی چیز ہے جس کی بنا پر اب یہ اسکیم بنائی جا رہی ہے کہ مسلمانوں کی جماعتوں کو خطاب کرنے کے بجائے ان کے افراد کو خطاب کیا جائے اور ان کو جدا جدا اکائیوں کی شکل میں رفتہ رفتہ اپنی طرف کھینچا جائے[1]۔ یہ کس چیز کی تمہید ہے؟ جس شخص کو اللہ نے تھوڑی سی بصیرت بھی عطا کی ہے وہ اس کو سمجھنے میں غلطی نہیں کر سکتا۔ مسلمان انگریزی اقتدار کے زمانہ میں جس کیرکٹر کا اظہار کرتے رہے ہیں اس کو سامنے رکھ کر غور کیجیے، کیا اسمبلیوں کی نشستوں اور آئندہ معاشی اور سیاسی فائدوں کا لالچ ان کے افراد کو فوج در فوج اس طرف کھینچ کر نہ لے جائے گا جس طرف انہیں کھینچا جا رہا ہے؟ اور کیا یہ وہی سب کچھ نہ کریں گے جو انگریزی اقتدار کی غلامی میں کر چکے ہیں؟

مسلمانوں کی اصلی کمزوری کو تاڑ لیا گیا ہے۔ آپ نے سُنا کہ انہیں کھینچنے کے لیے جو صدا بلند کی جا رہی ہے وہ کون سی صدا ہے؟ وہی پیٹ اور روٹی کی ذلیل صدا جو ہمیشہ خود غرض اور شکم پرست حیوانات کو اپنی طرف کھینچتی رہی ہے۔ ان سے کہا جا رہا

---

[1] کانگریس نے ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے بعد اس پالیسی پر خصوصیت سے عمل کیا تھا۔ مرتب

ہے کہ تہذیب کیا بلا ہے؟ اور تمہاری تہذیب کی خصوصیت بجز پاجامے اور ڈاڑھی اور لوٹے کے اور ہے ہی کیا؟ اس میں آخر کون سی اہمیت ہے؟ اصل سوال تو پیٹ کا سوال ہے، اسی سوال کو حل کرنے کے لیے ہم اٹھے ہیں۔ اب اگر دہریت اور کمیونزم کا زہر بھی تھوڑا تھوڑا ہر نوالے کے ساتھ پیٹ میں اتر جاتا ہے تو اس سے گھبرانے کی کوئی وجہ نہیں جو قوم اس سے پہلے انہی نوالوں کے ساتھ الحاد اور فرنگیت کا زہر بھی اتار چکی ہے، اس کے حلق میں ویسی ہی چند اور چٹنیاں کیوں پھنسنے لگیں۔

جدید انقلابی دور کی ابتدائی علامتیں

اس نوعیت کا ہے وہ انقلاب جو اب آرہا ہے۔ مسلمانوں میں سے جو لوگ اس انقلاب کے دامن سے وابستہ ہیں ان کی زندگیاں ہمارے سامنے ہیں۔ ان کی صورتیں، ان کے لباس، ان کی بات چیت، ان کی چال ڈھال، ان کے آداب و اطوار، ان کے خیالات سب کچھ ہمارے سامنے اس مسلمان کا نمونہ پیش کر رہے ہیں جو اس آنے والے انقلاب میں پیدا ہوگا۔ ہم ابھی سے دیکھ رہے ہیں کہ مسٹروں کے بجائے شریمتیں اور مسوں کے بجائے شریمتیاں ہمارے ہاں پیدا ہونے لگی ہیں۔ گڈ مارننگ کی جگہ ہاتھ جوڑ کر نمستے کیا جانے لگا ہے۔ ہیٹ کی جگہ گاندھی کیپ لے رہی ہے، اور بعض علمائے دین فتویٰ دے رہے ہیں کہ یہ تشبّہ کی تعریف سے خارج ہے۔ غرض دماغ اور دل اور جسم سب اپنا رنگ بدل رہے ہیں، اور کُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِیْنَ[2] کی لعنت جو ان پر ستر سال پہلے نازل ہوئی تھی اب ایک دوسری شکل اختیار کر رہی ہے۔

انقلاب کی تیز رفتاری

دنیا میں انقلاب کی رفتار بہت تیز ہے اور روز بروز تیز ہوتی چلی جا رہی ہے۔ پہلے

---

[1] پنڈت جواہر لال نہرو اور دوسرے ہندو اہل قلم نے یہ اعتراضات کیے تھے۔ ان کا جواب اس کتاب میں آگے آئے گا۔ مرتب

[2] ترجمہ:۔ ہو جاؤ بندر ذلیل و خوار (البقرہ ۔ ۶۵)

جو تغیرات صدیوں میں ہوا کرتے تھے۔ اب وہ برسوں میں ہو رہے ہیں پہلے قافلے اب بیل گاڑیوں اور گھوڑوں پر سفر کیا کرتے تھے۔ اب ریل اور تار اور ٹیلیفون اور ایروپلین بھی اسپیڈ پر حرکت کر رہا ہے۔ آج وہ حالت ہے کہ

یک لحظہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد

اگر ہندوستان کے باہر کوئی اچانک واقعہ بھی پیش آیا تب بھی اس حقیقت کے رونما ہونے میں کچھ زیادہ دیر نہ لگے گی، اور کوئی عالمگیر جنگ چھڑ گئی جو تلوار کی طرح دنیا کے سر پر لٹک رہی ہے، تو غالباً فیصلہ کا وقت اور بھی زیادہ قریب آ جائیگا۔

حالات کا جائزہ اور آئندہ کے امکانات

پچھلے باب میں ہم نے محض سرسری طور پر مسلمانوں کو اس انقلاب سے آگاہ کیا تھا جو عنقریب ہندوستان میں رونما ہونے والا ہے اور جس کے آثار اب پوری طرح نمایاں ہو چکے ہیں ——— ہمارا اصل مقصد مسلمانوں کو اس آنے والے انقلاب میں اپنے قومی تشخص اور اپنی تہذیب کی حفاظت کے لیے تیار کرنا ہے۔ مگر یہ مقصد اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنی موجودہ پوزیشن اور اس جدید انقلاب کو اچھی طرح سمجھ نہ لیں، اور یہ نہ جان لیں کہ اس پوزیشن میں اس نوعیت کا انقلاب ان کی قومی تہذیب پر کس طرح اثر انداز ہوگا اور اس کے نتائج کیا ہوں گے۔

مسلمانوں کی چار بنیادی کمزوریاں

پچھلی صحبت میں ہم مسلمانوں کی موجودہ پوزیشن پر جو سرسری تبصرہ کر چکے ہیں اس سے آپ نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ اجتماعی حیثیت سے اس وقت مسلمانوں میں کس قسم کی کمزوریاں پائی جاتی ہیں۔ لیکن آگے جو کچھ ہم کو کہنا ہے اس کو پوری طرح

سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ آپ واضح طور پر اُن چار اہم ترین کمزوریوں سے واقف ہو جائیں جو مسلمانوں کی قومی طاقت کو گھن کی طرح کھا گئی ہیں اور درحقیقت انہی کی وجہ سے یہ سوال پیدا بھی ہوا ہے کہ آئندہ اس انقلاب میں کیا مسلمان اپنی اسلامی تہذیب کی حفاظت کر سکیں گے۔ ورنہ اگر یہ کمزوریاں نہ ہوتیں تو کسی مسلمان کے دماغ میں یہ سوال پیدا ہی نہیں ہو سکتا تھا۔

(۱) اسلام سے ناواقفیت

مسلمانوں کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ ان کا سوادِ اعظم اسلامی تہذیب اور اس کی اسلامی خصوصیات سے ناواقف ہے، حتیٰ کہ اس میں ان حدود کا شعور تک باقی نہیں رہا ہے جو اسلام کو غیر اسلام سے ممیز کرتی ہیں۔ اسلامی تعلیم، اسلامی تربیت اور جماعت کا ڈسپلن تقریباً مفقود ہو چکا ہے، ان کے افراد منتشر طور پر ہر قسم کے بیرونی اثرات کو قبول کر رہے ہیں، اور جماعت اپنی کمزوری کی بنا پر بتدریج ان اثرات کو اپنے اندر جذب کرتی چلی جاتی ہے۔ ان کا قومی کیرکٹر اب مردانہ کیرکٹر نہیں رہا بلکہ زنانہ کیرکٹر بن گیا ہے جس کی نمایاں خصوصیت تاثر اور انفعال ہے۔ ہر طاقتور ان کے خیالات کو بدل سکتا ہے، ان کے عقائد کو پھیر سکتا ہے، ان کی ذہنیت کو اپنے سانچے میں ڈھال سکتا ہے، ان کی زندگی کو اپنے رنگ میں رنگ سکتا ہے، ان کے اصولِ حیات میں اپنی مرضی کے مطابق جیسا چاہے تغیر و تبدل کر سکتا ہے۔ اوّل تو وہ اتنا علم ہی نہیں رکھتے کہ یہ امتیاز کر سکیں کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم کس خیال اور کس عملی طریقے کو قبول کر سکتے ہیں اور کس کو قبول نہیں کر سکتے۔ دوسرے ان کی قومی تربیت اتنی ناقص ہے کہ ان کے اندر کوئی اخلاقی طاقت ہی باقی نہیں رہی۔ جب کوئی چیز قوت کے ساتھ آتی اور گرد و پیش میں پھیل جاتی ہے، تو خواہ وہ کتنی ہی غیر اسلامی ہو، یہ اس کی گرفت سے اپنے آپ کو نہیں بچا سکتے اور غیر اسلامی جاننے کے باوجود طوعاً و کرہاً اس کے آگے سپر ڈال ہی دیتے ہیں۔ اس پر مزید یہ کہ نظامِ جماعت مدت سے زیادہ مختل ہو چکا ہے۔ ہماری سوسائٹی میں اتنی

قوت ہی نہیں رہی کہ وہ اپنے افراد کو حدودِ اسلامی کے باہر قدم رکھنے سے باز رکھ سکے، یا اپنے دائرے میں غیر اسلامی خیالات اور طریقوں کی اشاعت کو روک سکے۔ افراد کو قابو میں رکھنا تو درکنار ہماری سوسائٹی تو اب افراد کے پیچھے چل رہی ہے۔ پہلے چند سرکش افراد اسلامی قانون کے خلاف بغاوت کرتے ہیں، سوسائٹی چند روز اس پر ناک بھوں چڑھاتی ہے، پھر دیکھتے دیکھتے وہی بغاوت ساری قوم میں پھیل جاتی ہے۔

(۲) قومی انتشار اور بدنظمی

انفرادیت اور لامرکزیت کی روز افزوں ترقی نے مسلمانوں کے شیرازۂ قومیت کو پارہ پارہ کر دیا ہے، اور اجتماعی عمل کی کوئی صلاحیت اب ان میں نہیں پائی جاتی۔ شخصی اغراض اور ذاتی مفاد کی بنا پر جماعتیں بنتی ہیں اور پھر خود غرضی کی چٹان ہی سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتی ہیں۔ کوئی بڑی سے بڑی قومی مصیبت بھی آج مسلمانوں کے رہنماؤں اور ان کے قومی کارکنوں کو اتحادِ عمل اور مخلصانہ و بے غرضانہ عمل پر آمادہ نہیں کر سکتی۔ تحریکِ خلافت کی ناکامی کے بعد سے مسلسل مصیبتیں مسلمانوں پر نازل ہوئیں۔ پیہم خطرات ان کے سامنے آتے۔ مگر کوئی ایک چیز بھی ان کو اشتراکِ عمل کے لیے جمع نہ کر سکی۔ تازہ ترین واقعہ مسجد شہید گنج کا ہے جس نے اس قوم کی کمزوری کارنامیوں سے زیادہ غیروں پر فاش کر دیا۔ ان کے اندر اتنی زندگی تو ضرور باقی ہے کہ جب کوئی مصیبت پیش آتی ہے تو تڑپ اٹھتے ہیں۔ مگر وہ اخلاقی اوصاف باقی نہیں ہیں جن کی بدولت یہ قومی مفاد کی حفاظت کے لیے اجتماعی کوشش کر سکیں۔ ان میں اتنی تمیز نہیں کہ صحیح رہنما کا انتخاب کر سکیں۔ ان میں اطاعت کا مادہ نہیں کہ کسی کو رہنما تسلیم کرنے کے بعد اس کی بات کو مانیں اور اس کی ہدایت پر چلیں۔ ان میں اتنا ایثار نہیں کہ کسی بڑے مقصد کے لیے اپنے ذاتی مفاد، اپنی ذاتی راحت، اپنی آسائش، اپنے مال اور اپنی جان کی قربانی کسی حد تک بھی گوارا کر سکیں۔

(۳) نفس پرستی

افلاس، جہالت اور غلامی نے ہمارے افراد کو بے غیرت اور بندۂ نفس بنا دیا ہے۔ وہ روٹی اور عزت کے بھوکے ہو رہے ہیں۔ ان کا حال یہ ہو گیا ہے کہ جہاں کسی نے روٹی کے چند ٹکڑے اور نام و نمود کے چند کھلونے پھینکے، یہ کتوں کی طرح ان کی طرف لپکتے ہیں، اور ان کے معاوضے میں اپنے دین و ایمان، اپنے ضمیر، اپنی غیرت و شرافت، اپنی قوم و ملت کیخلاف کوئی خدمت بجالانے میں ان کو باک نہیں ہوتا۔ مسلمان کا ایمان جو کبھی سارے جہان کی دولت سے بھی زیادہ قیمتی تھا آج اتنا سستا ہو گیا ہے کہ ایک حقیر سی تنخواہ اسے خرید سکتی ہے، ایک ادنیٰ درجہ کی کرسی پر وہ قربان ہو سکتا ہے، ایک آبرو باختہ عورت کے قدموں پر وہ نثار کیا جا سکتا ہے، ایک خطاب یا ذرا سی شہرت عطا کر کے یا دو چار جے کے نعرے لگا کر اس کو خرید لیا جا سکتا ہے گزشتہ ڈیڑھ سو برس کا تجربہ بتا رہا ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف دشمنوں نے جو کچھ کرنا چاہا، اس کے لیے خود مسلمانوں ہی کی جماعت سے ایک دو نہیں ہزاروں اور لاکھوں خائن اور غدار ان کو مل گئے، جنہوں نے تقریر سے، تحریر سے، ہاتھ اور پاؤں سے، حتیٰ کہ تلوار اور بندوق تک سے اپنے مذہب اور قوم کے مقابلہ میں دشمنوں کی خدمت کی۔ یہ ناپاک اور ذلیل ترین وصف جب ہمارے افراد میں موجود ہے تو جس طرح چھ ہزار میل دور کے رہنے والوں نے اس سے فائدہ اٹھایا، اسی طرح ہم سے ایک دیوار بیچ رہنے والے بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، اور اگر ہماری فاش گوئی کسی کو بری نہ معلوم ہو تو ہم صاف کہہ دیں کہ انہوں نے اس سے فائدہ اٹھانا شروع کر دیا ہے۔ پرانی مارکیٹ میں جب سے سرد بازاری کے آثار نمایاں ہوئے ہیں، نئی مارکیٹ میں ایمان کی خرید و فروخت کا بیوپار بڑھ رہا ہے۔ ہمارے کان خود اپنی قوم کے لوگوں کی زبان سے جب کمیونزم کا پروپیگنڈا سنتے ہیں، متحدہ ہندی قومیت میں جذب ہو جانے کی دعوت سنتے ہیں، اور یہ آوازیں سنتے ہیں کہ اسلامی کلچر کوئی جداگانہ کلچر نہیں ہے تو ہمارا

حافظہ ہم کو یاد دلاتا ہے کہ کچھ اسی نوعیت کی آوازیں اُس وقت بھی بلند ہونی شروع ہوئی تھیں جب سرکارِ برطانیہ کی غلامی کا پھندا ہمارے گلوں میں پڑ رہا تھا۔

(۴) منافقت

ہماری قوم میں منافقین کی ایک بڑی جماعت شامل ہے، اور اس کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے کہ بکثرت اشخاص، تعلیم یافتہ، صاحبِ قلم، صاحبِ زبان، صاحبِ مال و زر، صاحبِ اثر اشخاص ایسے ہیں جو دل سے اسلام اور اس کی تعلیمات پر یقین نہیں رکھتے، مگر نفاق اور قطعی بے ایمانی کی راہ سے مسلمانوں کی جماعت میں شریک ہیں، یہ اسلام سے عقیدۃً اور عملاً نکل چکے ہیں، مگر اس سے برأت کا صریح اعلان نہیں کرتے، اس لیے مسلمان ان کے ناموں سے دھوکا کھا کر انہیں اپنی قوم کا آدمی سمجھتے ہیں، ان سے شادی بیاہ کرتے ہیں، ان سے معاشرت کے تعلقات رکھتے ہیں، اور ان زہریلے جانوروں کو اپنی جماعت میں چل پھر کر اور رہ بس کر زہر پھیلانے کا موقع دے رہے ہیں۔ نفاق کا خطرہ ہر زمانے میں مسلمانوں کے لیے سب سے بڑا خطرہ رہا ہے مگر اس نازک زمانہ میں تو یہ ہمارے لیے پیامِ موت ہے۔ آنکھیں کھول کر دیکھیے کہ یہ منافقین کیسا مہلک زہر ہماری قوم میں پھیلا رہے ہیں۔ یہ اسلام کا مذاق اُڑاتے ہیں۔ اس کی اساسی تعلیمات پر حملے کرتے ہیں، مسلمانوں کو دہریت اور الحاد کی طرف دعوت دیتے ہیں، ان میں بے دینی اور بے حیائی اور قانونِ اسلامی کی خلاف ورزی کو نہ صرف عملاً پھیلاتے ہیں بلکہ کھلم کھلا زبان و قلم سے اس کی تبلیغ کرتے ہیں۔ٗ ان کی تہذیب کو مٹانے کی ہر کوشش میں آپ دیکھیں گے کہ یہ دشمنوں سے چار قدم آگے ہیں۔ ہر وہ اسکیم جو اسلام اور مسلمانوں کی بیخ کنی کے لیے کہیں سے نکلی ہو اس کو مسلمانوں کی جماعت میں نافذ کرنے کی خدمت یہی ناپاک گروہ اپنے ذمہ لیتا ہے اور اسلامی قومیت کا ایک جز ہونے کی وجہ سے اس کو اپنا کام کرنے کا خوب موقع مل جاتا ہے۔

ٗ بلکہ اب تو بچشمِ بد دور مسلمانوں کے رہنما اور اسلامی تہذیب کے حافظ بھی ایسے ہی لوگ ہیں۔

یہ حالت ہے اس وقت ہماری قوم کی، اور اس حالت میں یہ ایک بڑے انقلاب کے سرے پر کھڑی ہے۔ انقلاب کی فطرت بحرانی اور طوفانی فطرت ہوتی ہے۔ وہ جب آتا ہے تو آندھی اور سیلاب کی طرح آتا ہے۔ اس کے زور کا مقابلہ اگر کچھ کر سکتی ہیں تو مضبوط جمی ہوئی چٹانیں ہی کر سکتی ہیں۔ بوسیدہ عمارتیں جو اپنی جڑ چھوڑ کر محض فضا کے سکون و جمود کی بدولت کھڑی ہوں، ان کا کسی انقلابی طوفان میں ٹھیرنا غیر ممکن ہے۔ اب جو کوئی صاحب بصیرت انسان اس وقت مسلمانوں کی حالت پر نگاہ ڈالے گا، وہ بیک نظر معلوم کرلے گا کہ ان کمزوریوں کے ساتھ یہ قوم ہرگز کسی انقلاب کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس کے لیے انقلابی دور میں اپنے قومی تشخص اور اسلامی تہذیب کے خصائص کو بچا لے جانا، اور اپنے آپ کو پامالی سے محفوظ رکھنا بہت ہی مشکل ہے۔ اول تو جہالت کی بنا پر وہ بہت سے اجنبی اثرات کو بے جانے بوجھے قبول کرلے گی۔ پھر زمانہ کی رَو اس کو بہت سی ایسی چیزوں سے متاثر کر دے گا جن کو وہ جانتی ہوگی کہ اسلامی تعلیمات کے خلاف اور اسلامی تہذیب کے منافی ہیں۔ اس طرح ایک بڑی حد تک، تو بلا مقابلہ ہی شکست واقع ہوگی۔ اس کے بعد جو تھوڑے بہت احساسات باقی رہ جائیں گے، وہ اگر کبھی شدید حملے پر بیدار بھی ہوتے، اور اس قوم نے اپنے وجود کی حفاظت کرنی بھی چاہی تو نہ کر سکے گی، کیونکہ اپنی بدنظمی اور انتشار کی بدولت اس کے لیے کوئی متحدہ جدّوجہد کرنا مشکل ہوگا، اور اسی گروہ سے ہزاروں لاکھوں خائن، غدّار اور منافق اس کے قومی وجود کو پامال کرنے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں گے۔

قومی تحریک کی حقیقت

مسلمانوں کی حالت کا جائزہ آپ لے چکے۔ اب آئندہ انقلاب کے نتائج کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے ان قوتوں کا بھی جائزہ لینا ضروری ہے جو اس انقلابی تحریک میں کام کر رہی ہیں۔

ہندوستان کی جدید وطنی حرکت دراصل نتیجہ ہے اس تصادم کا جو انگریزی

اقتدار اور ہندوستان کے درمیان گزشتہ ڈیڑھ سو سال سے ہو رہا ہے۔ یہ تصادم
محض سیاسی نہیں ہے، بلکہ فکری اور عمرانی بھی ہے، اور یہ عجیب بات ہے کہ فکری
اور عمرانی تصادم کا جو نتیجہ ہوا ہے وہ سیاسی تصادم کے نتیجہ سے بالکل برعکس ہے۔
انگریزی سیاست کے جور و استبداد اور معاشی لوٹ نے تو ہندوستان کے باشندوں کو
آزادی کا سبق دیا، اور ان میں یہ جذبہ پیدا کیا کہ بندِ غلامی کو توڑ کر پھینک دیں۔ لیکن
لیکن انگریزی علوم و فنون اور انگریزی تہذیب و تمدن نے ان کو پوری طرح مغرب
کا غلام بنا دیا، اور ان کے دماغوں پر اتنا زبردست قابو پا لیا کہ اب وہ زندگی کا کوئی
نقشہ اس نقشہ کے خلاف نہیں سوچ سکتے جو ان کے سامنے اہلِ مغرب نے پیش کیا ہے۔
وہ جس قسم کی آزادی کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں اس کی نوعیت صرف یہ ہے کہ
ہندوستان سیاسی حیثیت سے آزاد ہو، اپنے گھر کا انتظام آپ کرے، اور اپنے
وسائلِ معیشت کو خود اپنے مفاد کے لیے استعمال کرے۔ لیکن یہ آزادی حاصل کرنے
کے بعد اپنے گھر کے انتظام اور اپنی زندگی کی تعمیر کا جو نقشہ ان کے ذہن میں ہے وہ
از سرتاپا فرنگی ہے۔ ان کے پاس جتنے اجتماعی تصورات ہیں، جس قدر عمرانی اصول ہیں
سب کے سب مغرب سے حاصل کیے ہوئے ہیں۔ ان کی نظر فرنگی نظر ہے، ان
کے دماغ فرنگی دماغ ہیں، ان کی ذہنیت پوری طرح فرنگیت کے سانچے میں ڈھلی
ہوئی ہے۔ بلکہ اشتراکیت کے بحران نے ان کو یا کم از کم ان کے سب سے زیادہ
پُرجوش طبقوں کو، فرنگیوں میں سے بھی اس قوم کا متبع بنا دیا ہے جو انتہا پسندی
میں تمام فرنگی اقوام کو پیچھے چھوڑ چکی ہے۔ وہ پکے مادہ پرست ہیں۔ ان کی نگاہ میں
اخلاق و روحانیت کی کوئی قیمت نہیں۔ ان کو خدا پرستی سے نفرت ہے۔ مذہب
کو وہ شر و فساد کا ہم معنی سمجھتے ہیں۔ مذہبی اور اخلاقی قدروں کو وہ پرِکاہ کے برابر
بھی وقعت دینے کے لیے تیار نہیں۔ ان کو ہر ایسی قومیت اور ہر ایسے قومی امتیاز سے
چڑ ہے جس کی بنا مذہب پر ہو۔ وہ زیادہ سے زیادہ رواداری جو مذہب کے
ساتھ برت سکتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ اس کی عبادت گاہیں اور اپنے مراسم میں

جیسے دیں۔ باقی رہی اجتماعی زندگی تو اس میں مذہب اور مذہبیت کے ہر اثر کو مٹانا ان کا نصب العین ہے، اور ان کے نزدیک اس اثر کو مٹائے بغیر کوئی ترقی ممکن نہیں۔ ہندوستانی قومیت کا جو نقشہ ان کے پیشِ نظر ہے، اس میں مذہبی جماعتوں کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔ وہ تمام امتیازی حدود کو توڑ کر وطنیت کی بنیاد پر ایک ایسی قوم بنانا چاہتے ہیں جس کی اجتماعی زندگی ایک ہی طرز پر تعمیر ہو اور وہ طرز اپنے اصول و فروع میں خالص مغربی ہو۔

قومی تحریک میں شامل ہونے کے نتائج

چونکہ اس جماعت کے مقاصد میں سیاسی آزادی کا مقصد سب سے مقدم ہے، اور وہی اس وقت حالات کے لحاظ سے نمایاں ہو رہا ہے، اس لیے مسلمانوں کے آزادی پسند طبقے اس کی طرف کھنچ رہے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انگریزی غلامی ہندوستان کے تمام باشندوں کے لیے ایک مشترک مصیبت ہے۔ اس مصیبت سے نجات حاصل کرنے کے لیے مشترک جدوجہد کرنا ہر آئینہ معقول ہے، اور جو گروہ اس جدوجہد میں سب سے زیادہ سرگرم ہو، اس کی طرف دلوں کا مائل ہونا اور اس کے ساتھ شریکِ عمل ہو جانا بظاہر ضروری نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے علماء اور سیاسی رہنماؤں میں سے ایک بڑی جماعت اور مخلص جماعت کانگریس کی طرف جا رہی ہے اور عامۂ مسلمین کو بھی ترغیب دے رہی ہے کہ اس میں شریک ہو جائیں۔ لیکن عمل کی طرف قدم بڑھانے سے پہلے ایک مرتبہ اچھی طرح سوچ لینا چاہیے کہ اس کے نتائج کیا ہوں گے۔

مسلمانوں کی جو کمزوریاں ہم نے اوپر بیان کی ہیں وہ سب آپ کے سامنے ہیں۔ ان کو پیشِ نظر رکھ کر غور کیجیے کہ ان کمزوریوں کے ساتھ جب یہ قوم کانگریس میں شریک ہوگی اور اس کے عوام سے کانگرسی کارکنوں کا رابطہ قائم ہوگا تو آزادیٔ وطن کی تحریک کے ساتھ ساتھ اور کس کس قسم کی تحریکیں ان کے درمیان پھیلیں گی۔ کس کس طرح مسلمانوں کے عوام ان اجتماعی نظریات، ان ملحدانہ افکار اور ان

غیر اسلامی طریقوں سے متاثر ہوں گے جو اس جماعت میں شائع و ذائع ہیں۔ کس طرح اسلامی جماعت کے رگ و ریشہ میں اس فکری و عمرانی انقلاب کے عناصر پیوست ہو جائیں گے جو سیاسی انقلاب کے ساتھ ہم رشتہ ہے۔ کس طرح مسلمانوں کے اندر ایک ایسی رائے عام تیار کرنے کی کوشش کی جائے گی جو علی رغم انف علماء و زعماء جدید ترین مغربی و اشتراکی بنیادوں پر اجتماعی زندگی کی تعمیر کے ہر نقشہ کی تائید کرنے والی ہو۔ کس طرح مسلمانوں کی نمائندگی کے لیے خود مسلمانوں کی جماعت سے وہ لوگ تیار کیے جائیں گے جو اسلامی کلچر کے خلاف ہر قسم کے طریقے رائج کرنے اور ہر قسم کے قوانین وضع کرنے میں حصہ لیں گے۔ ان حالات میں آپ کے پاس کون سی قوت ہے جس سے آپ اپنی قوم کو قابو میں رکھ سکیں گے؟ آپ نے اپنے عوام کو اسلامی تہذیب کے حدود میں رکھنے کا کیا بندوبست کیا ہے؟ آپ نے ان کو غیر اسلامی اثرات سے بچانے کا کیا انتظام کیا ہے؟ آپ نے اپنے غداروں اور منافقوں کے فتنے کا کیا علاج سوچا ہے؟ آپ کے پاس یہ اطمینان کرنے کا کون سا ذریعہ ہے کہ کسی سخت وقت میں آپ اسلامی مقاصد کی خدمت کے لیے مسلمانوں کو جمع کر سکیں گے اور ان کی متحدہ طاقت آپ کی پشت پر ہو گی؟

باطل کی جگہ باطل

انگریز کے اقتدار کا خاتمہ کرنا یقیناً ضروری ہے، بلکہ فرض ہے۔ کوئی سچا مسلمان غلامی پر ہرگز راضی نہیں ہو سکتا۔ جس شخص کے دل میں ایمان ہو گا وہ ایک لمحہ کے لیے بھی یہ نہ چاہے گا کہ ہندوستان انگریز کے پنجۂ استبداد میں رہے۔ لیکن آزادی کے جوش میں یہ نہ بھول جانا چاہیے کہ انگریزی اقتدار کی مخالفت میں مسلمان کا نظریہ ایک وطن پرست کے نظریہ سے بالکل مختلف ہے۔ اگر آپ کو انگریز سے اس لیے عداوت ہے کہ وہ انگریز ہے، چھ ہزار میل دور سے آیا ہے، آپ کے وطن کا رہنے والا نہیں ہے، تو یہ اسلامی عداوت نہیں بلکہ جاہلی عداوت ہے اور اگر آپ اس سے اس لیے عداوت رکھتے ہیں کہ وہ غیر صالح ہے، ناجائز طریقے

سے حکومت کرتا ہے، عدل کے بجائے جور پھیلاتا ہے، اصلاح کی جگہ فساد کرتا ہے، تو یہ بلا شبہہ اسلامی عداوت ہے۔ لیکن اس لحاظ سے آپ کو دوستی اور دشمنی کا معیار اصول کو قرار دینا پڑے گا نہ کہ وطنیت کو۔ جو کچھ انگریز کرتا ہے، اگر وہی کچھ دوسرے کریں تو آپ محض اس بنا پر ان کی حمایت نہیں کر سکتے کہ وہ ہمارے ہم وطن ہیں۔ مسلمان کی نگاہ میں وطنی اور غیر وطنی کوئی چیز نہیں۔ وہ غیر ملک کے صہیب اور سلمان کو گلے لگا سکتا ہے مگر اپنے وطن کے ابوجہل اور ابولہب سے دوستی نہیں کر سکتا۔ پس اگر آپ مسلمان ہیں تو وطنیت کے ڈھنگ پر نہ سوچیے، حق پرستی کے ڈھنگ پر سوچیے۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے انگریزی غلامی کے جوئے کو اتار پھینکنا ضرور آپ کا فرض ہے، مگر کسی ایسی حکومت کے قیام میں مدد گار بننا آپ کے لیے ہرگز جائز نہیں جس کی بنیاد انہی اصولوں پر ہو جن پر انگریزی حکومت کی بنیاد قائم ہے، عام اس سے کہ وہ وطنی حکومت ہو یا غیر وطنی۔ آپ کا کام باطل کو مٹا کر دوسرے باطل اور بدتر باطل کو قائم کرنا نہیں ہے۔ آپ انگریزی حکومت کے خلاف ہر اس گروہ سے موالات کیجیے جو اس کو مٹانا چاہتا ہو۔ مگر یہ بتائیے کہ اس ظالم حکومت کو مٹا کر ایک عادل حکومت قائم کرنے کے لیے آپ نے کیا انتظام کیا ہے؟ کون سی طاقت آپ نے فراہم کی ہے جس سے آپ دوسری حکومت کی تشکیل حق کے اصولوں پر کرا سکیں؟ یہ نہیں تو جانے دیجیے، یہی بتا دیجیے کہ آپ نے خود اپنی قوم کو باطل کے اثرات سے بچانے کا کیا بندوبست فرمایا ہے؟

کیا آئینی ضمانتیں اور تحفظات کافی ہو سکتے ہیں؟

آپ کہتے ہیں کہ ہم اپنی تہذیب اور اپنے قومی طریقوں کی حفاظت کے لیے آئینی ضمانتیں لیں گے۔ ہم دستور اساسی میں ایسے تحفظات رکھوائیں گے جن سے اسلامی مفاد پر آنچ نہ آنے پائے۔ بلاشبہہ یہ سب کچھ آپ کر سکتے ہیں۔ مگر شاید آپ نے غور نہیں فرمایا کہ آئینی ضمانتیں اور دستور اساسی کے تحفظات اور دوسرے تمام کاغذی مواثیق صرف اسی قوم کے لیے مفید ہو سکتے ہیں جس میں ایک طاقت ور رائے عام موجود ہو جو اپنے آپ کو سمجھتی ہو، اپنی تہذیب کو جانتی ہو، اس کی خصوصیات کو

پہچانتی ہو، اس کی حفاظت کا ناقابلِ تسخیر ارادہ رکھتی ہو اور منفرداً و مجتمعاً اس کی طرف سے مدافعت کے لیے ہر وقت سینہ سپر ہو۔ یہ صفات اگر آپ کی قوم میں موجود ہیں تو آپ کو کسی آئینی ضمانت اور کسی دستوری تحفظ کی بھی ضرورت نہیں، اور اگر آپ کی قوم ان صفات سے عاری ہے تو یقین رکھیے کہ کوئی ضمانت اور کوئی تحفظ ایسی حالت میں کارآمد نہیں ہو سکتا۔ آپ دستورِ اساسی کی ضمانتوں کو زیادہ سے زیادہ خارجی حملوں کے مقابلہ میں استعمال کر سکتے ہیں۔ مگر اندرونی انقلاب کا آپ کے پاس کون سا علاج ہے؟ مثال کے طور پر فرض کیجیے کہ کل مخلوط تعلیم شروع ہوتی ہے[1] اور آپ کی قوم کے افراد خود اپنی مرضی سے دھڑا دھڑ اپنی لڑکیوں اور لڑکوں کو مخلوط مدارس میں بھیجتے ہیں۔ کون سا دستوری تحفظ اس تحریک کو اور اس کے زہریلے نتائج کو روکنے کے لیے استعمال کیا جائے گا؟ فرض کیجیے کہ سول میرج کے طریقہ پر نکاحوں کا رواج پھیلتا ہے اور آپ کی قوم خود اس تحریک سے متاثر ہو جاتی ہے، کونسی آئینی ضمانت اس کی روک تھام کر سکے گی؟ فرض کیجیے کہ آپ کی اپنی قوم میں پروپیگنڈہ کی قوت اور تعلیم کے وسائل سے ایک ایسی رائے عام تیار کر دی جاتی ہے جو قوانین اسلامی میں ترمیم و تنسیخ پر راضی ہو بلکہ مُصر ہو، آپ کی اپنی قوم کے افراد ایسے قوانین کی حمایت کے لیے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں جو اصولِ اسلام کے خلاف ہوں، خود آپ ہی کے ووٹوں کی اکثریت سے ایسی تجویزیں پاس ہو جاتی ہیں جو آپ کے تمدن کو اسلامی مناہج سے ہٹا دینے والی ہوں، وہ کون سے "بنیادی حقوق" ہیں جن کا واسطہ دے کر آپ ان چیزوں کو منسوخ کرائیں گے؟ فرض کیجیے کہ آپ کی قوم بتدریج ہمسایہ قوم کے طرزِ معاشرت، آداب و اطوار، عقائد و افکار کو قبول کرنا شروع کرتی ہے، اور اپنے قومی امتیازات کو خود بخود مٹانے لگتی ہے۔ کونسا کاغذی میثاق اس تدریجی انجذاب کی روک تھام کر سکے گا؟ آپ اس کے جواب میں یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ سب تمہارے خیالی مفروضات ہیں۔ اس

---

[1] یہ تحریر ۱۹۳۶ء کی ہے۔ چند سال بعد یہ خدشہ ایک حقیقت بن گیا۔ (مرتب)

لیے کہ جو مسلمان اس وقت وطنی تحریک میں شامل ہیں ان کے نمونے آپ کے سامنے موجود ہیں۔ دیکھ لیجیے کہ ان کا طرزِ عمل انگریز کے غلاموں سے کچھ بھی مختلف نہیں۔ وہی ذہنی غلامی، وہی زنانہ انفعال و تاثر، وہی انجذابی کیفیت یہاں بھی نمایاں ہے جو اَستانۂ فرنگ کے عاکفین و عاکفین میں نظر آتی ہے۔ پھر جب اپنی قوم کی کمزوری اور اس کی موجودہ مزاجی کیفیت کے کھلے ہوئے علائم اور آثار آپ کی آنکھیں دیکھ رہی ہیں تو آخر کس بھروسہ پر آپ ساری قوم کو دھرلے جانا چاہتے ہیں؟ فرمایئے تو سہی کہ آپ نے باطنی انقلاب اور تدریجی انجذاب کو روکنے کے لیے کون سا تحفظ کیا ہے؟

عوام کا جمود اور سیاسی جماعتوں کی بے راہ رویاں

مسلمانوں میں اس وقت زیادہ تر تین گروہ پائے جاتے ہیں۔ ایک گروہ آزادیٔ وطن کے لیے بے چین ہے اور کانگریس کی طرف کھنچ رہا ہے یا کھنچ گیا ہے۔ دوسرا گروہ اپنی قومی تہذیب اور اپنے قومی حقوق کی حفاظت کے لیے انگریز کی گود میں جانا چاہتا ہے اور آئندہ انقلاب کے خطرات سے بچنے کی یہی صورت مناسب سمجھتا ہے کہ سرکار برطانیہ کا معاون بن کر آزادی کی تحریک کو روکے۔ تیسرا گروہ عالمِ حیرت میں کھڑا ہے اور خاموشی کے ساتھ واقعات کو دیکھ رہا ہے۔

ہمارے نزدیک یہ تینوں گروہ غلطی پر ہیں۔ پہلے گروہ کی غلطی ہم نے اوپر واضح کر دی۔ دوسرے گروہ کی غلطی بھی کچھ کم خطرناک نہیں۔ یہ لوگ اپنی کمزوریوں کی اصلاح کرنے کے بجائے دوسروں کی ترقی کو روکنا چاہتے ہیں اور یہ سمجھ رہے ہیں کہ ان کے ضعف کی تلافی غیروں کے سہارے سے ہو جائے گی۔ ایسی ذلیل پالیسی دنیا میں نہ کبھی کامیاب ہوئی ہے نہ ہو سکتی ہے۔ جو قوم خود زندہ رہنے کی طاقت نہ رکھتی ہو، جس میں خود اپنے موقف پر کھڑے رہنے کا بل بوتا نہ ہو، وہ کب تک دوسروں کے سہارے جی سکتی ہے؟ کب تک کوئی سہارا اس کے لیے قائم رہ سکتا ہے؟ کب تک زمانے کے انقلابات اس کی خاطر رُکے رہ سکتے ہیں؟ انگریز قیامت تک کے لیے

ہندوستان پر حکومت کرنے کا پٹہ لکھوا کر نہیں لایا ہے۔ ہر قوم کے لیے ایک مدت ہوتی ہے۔ انگریز کے لیے بھی بہر حال ایک مدت ہے، اور وہ آج نہیں تو کل پوری ہو گی۔ اس کے بعد وہی قوم برسرِ اقتدار آئے گی جس میں ہمت اور طاقت ہو گی۔ حاکمانہ اوصاف ہوں تو وہ قوم تم ہو سکتے ہو، اور اگر تم ان سے عاری ہو تو بہر حال تمہاری قسمت میں محکومی کی ذلت اور ذلت کی موت ہی ہے۔ جو گھن کھائی ہوئی لاش کسی عصا کے سہارے پر کھڑی ہو وہ ہمیشہ کھڑی نہیں رہ سکتی۔ عصا کبھی نہ کبھی ہٹ کے رہے گا، اور لاش کبھی نہ کبھی گر کے رہے گی۔

تیسرے گروہ کی غلطی سب سے زیادہ خطرناک ہے۔ یہ دنیا ایک عرصۂ جنگ ہے جس میں تنازع للبقاء کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اس معرکہ میں ان کے لیے کوئی کامیابی نہیں جو زندہ رہنے کے لیے مقابلہ اور زحمت کی قوت نہ رکھتے ہوں۔ خصوصیت کے ساتھ ایک دَور کے خاتمہ اور دوسرے دَور کے آغاز کا وقت تو قوموں کی قسمتوں کے فیصلے کا وقت ہوتا ہے۔ ایسے وقت میں سکون اور جمود کے معنی ہلاکت اور موت کے ہیں۔ اگر تم خود ہی مر جانا چاہتے ہو تو بیٹھے رہو اور اپنی موت کی آمد کا تماشا دیکھے جاؤ۔ لیکن زندہ رہنے کی خواہش ہے تو سمجھ لو کہ اس وقت کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔ یہ سُست رفتار کا زمانہ نہیں ہے، صدیوں کے تغیرات اب مہینوں اور برسوں میں ہو جاتے ہیں۔ جس انقلاب کے سامان اس وقت ہندوستان اور ساری دنیا میں ہو رہے ہیں وہ طوفان کی سی تیزی کے ساتھ آ رہا ہے۔ اب تمہارے لیے زیادہ سے زیادہ دس پندرہ برس کی مہلت ہے۔ اگر اس مہلت میں تم نے اپنی کمزوریوں کی تلافی نہ کی اور زندگی کی طاقت اپنے اندر پیدا نہ کی تو پھر کوئی دوسری مہلت تمہیں نہ ملے گی۔ اور تم وہی سب کچھ دیکھو گے جو دوسری کمزور قومیں اس سے پہلے دیکھ چکی ہیں۔ اللہ کا کسی قوم کے ساتھ رشتہ نہیں ہے کہ وہ اس کی خاطر اپنی سُنت کو بدل ڈالے۔

جمود بہر حال ٹوٹنا چاہیے، حرکت کی ضرورت ہے اور شدید ضرورت ہے۔ مگر نری حرکت کسی کام کی نہیں۔ حکمت اور تدبر کے ساتھ حرکت ہونی چاہیے خصوصًا

نازک اوقات میں تو حرکت بلا تدبر کے معنی خود اپنے پاؤں چل کر خندق میں جا گرنے کے ہیں۔ یہ اندھے جوش اور ابلہانہ شتاب روی کا وقت نہیں۔ قدم اُٹھانے سے پہلے ٹھنڈے دل و دماغ سے کام لے کر سوچیے کہ قدم کس سمت میں اٹھانا چاہیئے؟ آپ کی منزلِ مقصود کیا ہے؟ اس کی طرف جانے کا صحیح راستہ کون سا ہے؟ اس راستہ پر چلنے کے لیے آپ کو کس سامان کی ضرورت ہے؟ کن کن مرحلوں سے بسلامت گزر جانے کے لیے کیا تدبیریں اختیار کرنی پڑیں گی؟

ہمارا سیاسی نصب العین

کسی راستہ پر چلنے سے پہلے منزلِ مقصود کا تعین ضروری ہے۔ ظاہر ہے کہ حرکت اور سفر کو بذاتِ خود تو مقصود نہیں بنایا جا سکتا۔ کم از کم ذی عقل و ہوش انسان کے لیے تو یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ وہ محض چلنے کی خاطر چلیں اور منتہائے نظر کوئی نہ ہو۔ لہذا مسلمانوں کے تمام سوچنے والے لوگوں کو سب سے پہلے یہ طے کرنا چاہیے کہ ان کا منتہائے نظر یا نصب العین کیا ہے۔ اس کے بعد طریق کار اور راہِ عمل کا انتخاب زیادہ آسان ہو جائے گا۔ کیونکہ جب وہ مقام متعین ہو جس تک ہمیں جانا ہے تو وہ راستہ بڑی آسانی سے دریافت ہو سکتا ہے جو اس مقام تک پہنچنے کا سب سے زیادہ سیدھا اور سب سے زیادہ اقرب راستہ ہو۔

عام طور پر آزاد خیال مسلمان اپنی "قوم پرستی" کی نمائش کرنے کے لیے کہتے ہیں کہ نصب العین ہندوستان کی کامل آزادی ہے۔ لیکن یہ بات عموماً بغیر سوچے سمجھے کہہ دی جاتی ہے۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہماری منزلِ مقصود محض آزادی ہی نہیں ہے بلکہ ایسی آزادی ہے جس کی وجہ سے ہندوستان میں اسلام نہ صرف قائم رہے بلکہ عزت اور طاقت والا بن جائے۔ آزادیٔ ہند ہمارے نزدیک مقصود بالذات

نہیں ہے بلکہ اصل مقصد کے لیے ایک ضروری اور ناگزیر وسیلہ ہونے کی حیثیت سے مقصود ہے۔ ہم صرف اس آزادی کے لیے لڑنا چاہتے ہیں، بلکہ صحیح تر یہ ہے کہ اپنے مذہب کی رُو سے لڑنا فرض جانتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہو کہ یہ ملک کلیتہً نہیں تو ایک بڑی حد تک دارالاسلام بن جائے۔ لیکن اگر آزادیٔ ہند کا نتیجہ یہ ہو کہ یہ جیسا دارالکفر ہے ویسا ہی رہے یا اس سے بدتر ہو جائے تو ہم بلا کسی مداہنت کے صاف صاف کہتے ہیں کہ ایسی آزادیٔ وطن پر ہزار مرتبہ لعنت ہے۔ اور اس کی راہ میں بولنا، لکھنا، روپیہ صرف کرنا، لاٹھیاں کھانا اور جیل جانا سب کچھ حرام، قطعی حرام ہے۔

یہ ایسی صاف بات ہے جس میں دو رائیں ہونے کی گنجائش ہی نہیں۔ خصوصاً جو شخص قرآن اور سنت پر نظر رکھتا ہے اور منافق نہیں ہے وہ تو اس کے برحق ہونے میں چون و چرا نہیں کر سکتا۔

ہندوستان میں آزادیٔ مسلم کا کم سے کم مرتبہ

منزلِ مقصود کا انتہائی مقام یعنی ہندوستان کو کلیتہً دارالاسلام بنانا تو اتنا بلند مقام ہے کہ آج کل کا کم ہمت مسلمان اس کا قصد کرنے کی جرأت اپنے اندر نہیں پاتا۔ خیر جانے دیجیے اس کو ــــــ اس سے فروتر درجہ میں جس مقصد کے لیے ہمیں لڑنا ہے وہ کم سے کم یہ ہے کہ ہندوستان نہ تو بیرونی کفار کے تسلط میں رہے اور نہ اندرونی کفار کے کامل تسلط میں چلا جائے، بلکہ آزاد ہو کر شبہ دارالاسلام بن جائے۔

اب آگے بڑھنے سے پہلے اس بات کو سمجھ لیجیے کہ شبہ دارالاسلام سے کیا مراد ہے۔ اگر کوئی شخص اس کے معنی یہ سمجھتا ہے کہ مسلمانوں کے سے نام رکھنے والوں کو اسمبلیوں اور کونسلوں کی نشستیں اور سرکاری عہدے مل جائیں اور ہندوستان کے معاشی ثمرات میں ان کو بھی متناسب حصہ ملے، اور آزاد ہندوستان کی تمام عمرانی ترقیات سے (خواہ وہ ترقیات کسی صورت میں ہوں) انہیں بلا امتیاز مستفید ہونے کا موقع ملتا رہے، تو ہم کہیں گے کہ وہ غلطی پر ہے۔ ہم جس کو شبہ دارالاسلام سمجھتے

ہیں، اور جو چیز درحقیقت اس نام سے موسوم ہو سکتی ہے، وہ یہ ہے کہ ہندوستان کی حکومت میں ہم محض "ہندوستانی" ہونے کی حیثیت سے نہیں بلکہ "مسلمان" ہونے کی حیثیت سے حصہ دار ہوں، اور ہمارا حصہ اس قدر طاقت ور ہو کہ

(۱) ہم اپنی قوم کی تنظیم اصولِ اسلامی کے مطابق کر سکیں۔ یعنی ہم کو حکومت کے ذریعہ سے اتنی قوت حاصل ہو کہ ہم مسلمانوں کے لیے اسلامی تعلیم و تربیت کا انتظام کر سکیں، ان کے اندر غیر اسلامی طریقوں کے رواج کو روک سکیں، ان پر اسلامی احکام جاری کر سکیں، اور اپنی قوم میں جو اصلاحات ہم خود اپنے طریق پر نافذ کرنے کی ضرورت سمجھیں ان کو خود اپنی طاقت سے نافذ کر سکیں، مثلاً زکوٰۃ کی تحصیل، اوقاف کی تنظیم، قضائے شرعی کا قیام، قوانین معاشرت کی اصلاح وغیرہ۔

(۲) ہم اس ملک کے نظم و نسق اور اس کی تمدنی و معاشی تعمیر جدید میں اپنا اثر اس طرح استعمال کر سکیں کہ وہ ہمارے اصولِ تمدن و تہذیب کے خلاف نہ ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ وسیع پیمانہ پر تمام ملک کی اجتماعی زندگی اور معاشی تنظیم اور تدبیرِ مملکت کی مشین جو شکل بھی اختیار کرے گی اس کا اثر دوسری قوموں کی طرح ہماری قوم پر بھی پڑے گا۔ اگر یہ تعمیرِ جدید اس نقشہ پر ہو جو اپنے اصول و فروع میں کلیتہً ہماری تہذیب کی ضد ہے تو ہماری زندگی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ ایسی صورت میں ہمارے لیے ناگزیر ہو جائے گا کہ یا تو ہم تمدن و معیشت کے اعتبار سے غیر مسلم بن جائیں یا پھر ہماری حیثیت اس ملک میں تمدنی و معاشی اچھوتوں کی سی ہو کر رہ جائے۔ اس نتیجہ کو صرف اسی طرح روکا جا سکتا ہے کہ ہند جدید کی تشکیل پر ہم اپنا اثر کافی قوت کے ساتھ ڈال سکیں۔

(۳) ہندوستان کی سیاسی پالیسی میں ہمارا اتنا اثر ہو کہ اس کی طاقت کسی حال میں بیرونِ ہند کی مسلمان قوموں کے خلاف استعمال نہ کی جا سکے۔

کانگریس کے "بنیادی حقوق" ہمارے منتہائے نظر نہیں ہو سکتے

یہ مقصد جس کی ہم نے توضیح کی ہے وہ کم سے کم چیز ہے جس کے لیے ہم کو لڑنا

چاہیئے۔ مدافعت کا پہلو صرف کمزور اختیار کرتے ہیں اور ان کا آخری انجام شکست ہے۔ اگر آپ اپنا مقصد صرف ان حقوق کے حصول کو بنانے ہیں جن کا اطمینان کانگریس نے اپنے "بنیادی حقوق" والے ریزولیوشن میں دلایا ہے تو آپ دھوکے میں ہیں۔ آپ کی تہذیب، زبان، پرسنل لا، اور مذہبی حقوق کا تحفظ بھی (جسے آپ کافی سمجھے بیٹھے ہیں) دراصل اس کے بغیر ممکن نہیں کہ آپ فارورڈ پالیسی اختیار کر کے حکومت کی تشکیل میں طاقت ور حصہ دار بننے کی کوشش کریں۔ اس میں اگر آپ نے غفلت کی اور حکومت کا اقتدار اُن لوگوں کے ہاتھ میں چلا گیا جو مسلمان نہیں ہیں تو یقین رکھیے کہ کوئی دستور آپ کو من حیث المسلم ہلاک ہونے سے نہ بچا سکے گا۔

انگریزی حکومت نے بھی آپ کے بہت سے حقوق تسلیم کر رکھے ہیں۔ مگر غور کیجیے وہ کیا چیز ہے جس نے آپ کو خود اپنے حقوق سے دست بردار کرا دیا؟ انگریز نے آپ سے یہ کبھی نہیں کہا کہ اپنی زبان میں لکھنا، پڑھنا، بولنا سب چھوڑ دو، زکوٰۃ نہ دو، شراب پیو، اور اپنے مذہب کے سارے احکام کو نہ صرف بالائے طاق رکھ دو، بلکہ ان کا مذاق تک اڑاؤ۔ پھر کس چیز نے آپ کی قوم کے لاکھوں کروڑوں افراد کو ایک صدی کے اندر اپنے دین و ایمان سے عملاً منحرف کر ڈالا؟ انگریز نے آپ سے کبھی یہ مطالبہ نہیں کیا تھا کہ اپنی معاشرت بدل دو، اپنا لباس بدل دو، اپنے مکانوں کے نقشے بدل دو، اپنے آداب و اخلاق بدل دو، اپنی صورتیں بگاڑ لو، اپنے بچّوں کو انگریز بناؤ، اپنی عورتوں کو میم صاحب بناؤ، اپنے تمدّن اور اپنی تہذیب کے سارے اصول چھوڑ کر پوری زندگی ہمارے نقشے پر ڈھال لو۔ پھر وہ کون سی چیز ہے جس نے آپ سے یہ سب کچھ کرا ڈالا؟ ذرا دماغ پر زور ڈال کر سوچیے، کیا اس کا سبب غیر مسلم اقتدار کے سوا اور بھی کچھ ہے؟ ڈھائی تین لاکھ انگریز چھ ہزار میل دُور سے آتے ہیں۔ آپ سے الگ تھلگ رہتے ہیں۔ قصداً آپ کے اندرونی معاملات اور آپ کے تمدّنی و معاشرتی مسائل میں دخل دینے سے پرہیز کرتے ہیں۔ پھر بھی ان کے اقتدار کا یہ اثر ہوتا ہے کہ بیرونی جبر سے نہیں، بلکہ اندرونی

انقلاب سے آپ کی کایا پلٹ جاتی ہے اور آپ خود بخود اپنے اُن بنیادی اور فطری حقوق تک سے دست بردار ہو جاتے ہیں جن کو کوئی حکومت اپنی رعایا سے نہیں چھینتی اور نہیں چھین سکتی۔ اب ذرا اندازہ لگائیے کہ اگر آزاد ہندوستان کی حکومت غیر اسلامی نقشہ پر بن گئی اور اس کا اقتدار ان ہندوستانیوں کے ہاتھ میں چلا گیا جو مسلمان نہیں ہیں، تو اس کے اثرات کیا ہوں گے؟ وہ انگریزوں کی طرح قلیل التعداد بھی نہیں، آپ سے الگ تھلگ رہنے والے بھی نہیں، اور پھر غیر ملکی بھی نہیں ہیں کہ سیاسی پالیسی ان کو تمدنی و معاشرتی مسائل میں دخل دینے سے روکے۔ ان کے اقتدار میں آپ کے اندرونی تغیّر و انقلاب کا کیا حال ہوگا اور دستورِ مملکت کی کون کون سی دفعات آپ کو اپنے حقوق کی پامالی سے روکیں گی؟

مسلمانوں کے لیے صرف ایک راستہ ہے

پس جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، مسلمانوں کے لیے ایسی آزادیٔ وطن کی خاطر لڑنا تو قطعی حرام ہے جس کا نتیجہ انگلستانی غیر مسلموں سے ہندوستانی غیر مسلموں کی طرف اقتدارِ حکومت کا انتقال ہو۔ پھر ان کے لیے یہ بھی حرام ہے کہ وہ اس انتقال کے عمل کو بیٹھے ہوئے خاموشی سے دیکھتے رہیں۔ اور ان کے لیے یہ بھی حرام ہے کہ اس انتقال کو روکنے کی خاطر انگلستانی غیر مسلموں کا اقتدار قائم رکھنے میں معاون بن جائیں۔ اسلام ہم کو ان تینوں راستوں پر جانے سے روکتا ہے۔ اب اگر ہم مسلمان رہنا چاہتے ہیں۔ اور ہندوستان میں اسلام کا وہ حشر دیکھنے کے لیے تیار نہیں جو اسپین اور سسلی میں ہو چکا ہے تو ہمارے لیے صرف ایک ہی راستہ باقی ہے، اور وہ یہ ہے کہ ہم آزادیٔ ہند کی تحریک کا رُخ حکومتِ کفر کی طرف سے حکومتِ حق کی طرف پھیرنے کی کوشش کریں۔ اور اس غرض کے لیے ایک ایسی سرفروشانہ جنگ پر کمر بستہ ہو جائیں جس کا انجام یا کامیابی ہو یا موت۔

یا تن رسد بجاناں یا جاں زتن برآید

ہم آزادیٔ ہند کے مخالف نہیں بلکہ ہر آزادی خواہ سے بڑھ کر اس کے

سلا خواہش مند ہیں۔ اور اس کے لیے جنگ کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ لیکن وطن پرست کے نصب العین سے ہمارا نصب العین مختلف ہے۔ وہ صرف ایسی آزادی چاہتا ہے جس کا نتیجہ "ہندوستانی" کی نجات ہو اور ہم وہ آزادی چاہتے ہیں جس کا نتیجہ "ہندوستانی" کے ساتھ "مسلم" کی نجات بھی ہو۔

راہِ عمل

اب ہم کو اس سوال پر غور کرنا ہے کہ ہندوستان میں اسلامی قومیت کا وہ نصب العین جس کو ہم نے پچھلے صفحات میں بیان کیا تھا کس طریقہ سے حاصل ہو سکتا ہے۔ جہاں تک ہم کو معلوم ہے اس نصب العین سے کسی "مسلم" فرد یا گروہ کو اختلاف نہیں۔ اختلاف جو کچھ بھی ہے اس امر میں ہے کہ ہمارے لیے صحیح راستہ کون سا ہے؟ اب ہمیں ان مختلف راستوں پر ایک تنقیدی نگاہ ڈالنی چاہیے جو ہمارے سامنے ہیں۔ اس کے بعد راہِ راست خود بخود واضح ہو جائے گی۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی دو حیثیتیں

ہندوستان میں ہماری دو حیثیتیں ہیں۔ ایک حیثیت ہمارے "ہندوستانی" ہونے کی ہے، اور دوسری حیثیت "مسلمان" ہونے کی۔

پہلی حیثیت میں ہم اس ملک کی تمام دوسری قوموں کے شریکِ حال ہیں۔ ملک فلاش اور فاقہ کشی میں مبتلا ہوگا تو ہم بھی مفلس اور فاقہ کش ہوں گے۔ ملک کو لوٹا جائے گا تو ہم بھی سب کے ساتھ لوٹے جائیں گے۔ ملک میں جور و ظلم کی حکومت ہوگی تو ہم بھی اسی طرح پامال ہوں گے جس طرح ہمارے اہلِ وطن ہوں گے۔

ملک پر غلامی کی وجہ سے بہ حیثیت مجموعی جتنی مصیبتیں نازل ہوں گی، جتنی لعنتیں برسیں گی، ان سب میں ہم کو برابر کا حصّہ ملے گا۔ اس لحاظ سے ملک کے جتنے سیاسی و معاشی مسائل ہیں وہ سب کے سب ہمارے اور دوسری اقوام ہند کے درمیان مشترک ہیں۔ جس طرح ان کی فلاح و بہبود ہندوستان کی آزادی کے ساتھ وابستہ ہے، اسی طرح ہماری بھی ہے۔ سب کے ساتھ ہماری بہتری بھی اس پر منحصر ہے کہ یہ ملک ظالموں کے تسلط سے آزاد ہو۔ اس کے وسائل ثروت اسی کے باشندوں کی ترقی اور بہتری پر صرف ہوں۔ اس کے بسنے والوں کو اپنے افلاس، اپنی جہالت، اپنی اخلاقی پستی، اور اپنی تمدنی پس ماندگی کا علاج کرنے میں اپنی قوتوں سے کام لینے کے پورے مواقع حاصل ہوں، اور کوئی جابر قوم ان کو اپنی ناجائز اغراض کے لیے آلہ کار بنانے پر قادر نہ رہے۔

دوسری حیثیت میں ہمارے مسائل کچھ اور ہیں جن کا تعلق صرف ہم ہی سے ہے۔ کوئی دوسری قوم ان میں ہماری شریک نہیں ہے۔ اجنبی استیلاء نے ہمارے قومی اخلاق کو، ہماری قومی تہذیب کو، ہمارے اصولِ حیات کو، ہمارے نظامِ جماعت کو زبردست نقصان پہنچایا ہے۔ ڈیڑھ سو برس کے اندر غلامی ان تمام بنیادوں کو گھن کی طرح کھا گئی ہے جن پر ہماری قومیت قائم ہے۔ تجربے نے ہم کو بتا دیا ہے اور روزِ روشن کی طرح اب ہم اس حقیقت کو دیکھ رہے ہیں کہ اگر یہ صورتِ حال زیادہ مدت تک جاری رہی تو ہندوستان کی اسلامی قومیت رفتہ رفتہ گھل گھل کر طبعی موت مر جائے گی اور یہ برائے نام ڈھانچہ جو باقی رہ گیا ہے یہ بھی نہ رہے گا۔ اس حکومت کے اثرات ہم کو اندر ہی اندر غیر مسلم بناتے جا رہے ہیں۔ ہمارے دل و دماغ کی تہوں میں وہ جڑیں سوکھتی جا رہی ہیں جن سے اسلامیت کا درخت پیدا ہوتا ہے۔ ہم کو وہ جنتیش پلایا جا رہا ہے جو ہماری ماہیت کو بدل کر خود ہمارے ہی ہاتھوں سے ہماری مسجد کو منہدم کرا دے۔ جس رفتار کے ساتھ ہم میں یہ تغیرات ہو رہے ہیں اس کو دیکھتے ہوئے ایک مبصر اندازہ لگا سکتا ہے کہ

اس عمل کی تکمیل اب بہت قریب آگئی ہے۔ زیادہ سے زیادہ تیسری چوتھی پشت تک پہنچتے پہنچتے ہمارا سوادِ اعظم خود بخود غیر مسلم بن جائے گا اور شاید گنتی کے چند نفوس اس عظیم الشان قوم کے مقبرے پر آنسو بہانے کے لیے رہ جائیں گے۔ پس ہماری قومیت کا بقاء و تحفظ اس پر منحصر ہے کہ ہم اس حکومت کے تسلط سے آزاد ہوں اور اُس نظامِ اجتماعی کو از سرِ نو قائم کریں جس کے ہٹ جانے ہی کی بدولت ہم پر مصائب نازل ہو رہے ہیں۔

آزادیٔ وطن کے دو راستے

ہماری یہ دونوں حیثیتیں باہم متلازم ہیں۔ ان کو نہ عقلاً منفک کیا جا سکتا ہے نہ عملاً۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ آزادی ان دونوں حیثیتوں سے ہماری مقصود ہے۔ اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے جتنے مسائل ہمارے اور تمام دوسرے باشندگانِ ہند کے درمیان مشترک ہیں ان کو حل کرنے کے لیے مشترک طور پر ہی جدّوجہد کرنی چاہیئے۔ اور یہ بھی سراسر درست ہے کہ مسلم ہونے کی حیثیت سے جو آزادی ہم چاہتے ہیں وہ بھی بہر طور ہمیں اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب کہ ہمیں ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے آزادی حاصل ہو جائے لیکن یہ تماثل اور توافق جو بادی النظر میں دکھائی دیتا ہے اس میں ایک بڑا دھوکا چھپا ہوا ہے۔ اور در حقیقت اسی مقام پر بہت سوں نے دھوکا کھایا ہے۔ غائر نگاہ سے آپ دیکھیں گے تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ کوئی سیدھی سڑک نہیں ہے جس پر آپ آنکھیں بند کر کے بے تکان چلے جائیں۔ ٹھیک اسی مقام پر جہاں آپ آکر ٹھیرے ہیں ایک دوراہا موجود ہے۔ دو سڑکیں بالکل مختلف سمتوں میں جا رہی ہیں اور آپ کو قدم اُٹھانے سے پہلے عقل و تمیز سے کام لے کر فیصلہ کرنے کی ضرورت ہے کہ جانا کدھر ہے؟

(۱) وطن پرستی

آزادیٔ وطن کا ایک راستہ وہ ہے جس کو ہم صرف ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے اختیار کر سکتے ہیں۔ اس راہ کے بتانے والے اور اس پر ہندوستانیوں کو چلانے والے وہ لوگ ہیں جن کے پیشِ نظر "وطنی قومیت" کا مغربی تصوّر ہے، اور اس تصوّر کی تہ میں انسانیت کا ہندو تصوّر گہرا جما ہوا ہے۔ ان کا منتہائے مقصود یہ ہے کہ ہندوستان میں مختلف قومی امتیازات جو مذہب اور تہذیب کی تفریق پر قائم ہیں مٹ جائیں اور سارا ملک ایک قوم بن جائے۔ پھر اس "قوم" کی زندگی کا جو نقشہ ان کے سامنے ہے وہ اشتراکیت اور ہندویت سے مرکب ہے، اور اس میں مسلمانوں کے اصولِ حیات کی رعایت تو درکنار، اس کے لیے کوئی ہمدردانہ نقطۂ نظر بھی ان کے پاس نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ رعایت جس کی گنجائش وہ اس "ہندی قومیت" میں نکال سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ جن معاملات کا تعلق انسان اور خدا کے مابین ہے ان میں ہر گروہ کو اعتقاد اور عمل کی آزادی حاصل رہے۔ مگر جو معاملات انسان اور انسان کے درمیان ہیں ان کو وہ خالص وطنیت کی بنیاد پر دیکھنا چاہتے ہیں۔ منظم مذہب (Organized Religion) یعنی ایسا مذہب ان کے نزدیک اصولاً قابلِ اعتراض ہے جو اپنے متبعین کو ایک مستقل قوم بناتا ہو اور اس کو تعلیم، معیشت، معاشرت، تمدّن، اخلاق اور تہذیب میں دوسرے مذاہب کے متبعین سے الگ ایک ڈھنگ اختیار کرنے اور ایک ضابطہ کی پابندی کرنے پر مجبور کرتا ہو۔ وہ ہندوستان کے موجودہ حالات کی رعایت ملحوظ رکھ کر کچھ مدّت تک اس قسم کے "منظم" مذہب کو ایک محدود اور دھندلی شکل میں باقی رکھنا گوارا کر لیں گے چنانچہ اسی گوارا کر لینے کے انداز میں انہوں نے ہندوستان کے مختلف فرقوں کو ان کی زبان اور "پرسنل لا" کے تحفظ کا یقین دلایا ہے۔ مگر وہ کسی ایسے نظام کو برداشت نہیں کر سکتے جو اس "منظم مذہب" کو مزید طاقت اور مستقل زندگی عطا کرنے والا ہو۔ بلکہ اس کے برعکس وہ ہندوستان

جدید کی تعمیر اس طرز پر کرنا چاہتے ہیں جس میں یہ "منظم مذہب" رفتہ رفتہ مضمحل ہو کر طبعی موت مر جائے اور ہندوستان کی ساری آبادی ایک ایسی قوم بن جائے جس میں سیاسی پارٹیوں اور معاشی گروہوں کی تفریق تو چاہے کتنی ہی ہو، مگر تعلیم و تہذیب، تمدن و معاشرت، اخلاق و آداب اور تمام دوسری حیثیات سے سب ایک رنگ میں رنگے ہوئے ہوں۔ اور وہ رنگ نظرۃً وہی ہونا چاہیے جو اس تحریک کے محرکوں کا رنگ ہے۔

یہ راستہ جس کی خصوصیات کو آج ایک اندھا بھی دیکھ سکتا ہے، ہم صرف اسی وقت اختیار کر سکتے ہیں جب کہ ہم اپنی مذہبی حیثیت کو قربان کرنے پر راضی ہو جائیں۔ اس راستہ پر چل کر ہم کو وہ آزادی حاصل نہیں ہو سکتی جو ہمیں مسلمان ہونے کی حیثیت سے درکار ہے۔ بلکہ اس راستے میں سرے سے ہماری یہ حیثیت ہی گم ہو جاتی ہے۔ اس کو اختیار کرنے کے معنی یہ ہیں کہ انگریزی حکومت کے ماتحت جس انقلاب کا عمل ڈیڑھ سو برس سے ہماری قوم میں ہو رہا ہے وہ ہندوستانی حکومت کے ماتحت اور زیادہ شدت و سرعت کے ساتھ پایۂ تکمیل کو پہنچے اور اس کی تکمیل میں ہم خود مددگار بنیں۔ اور وہ اتنا مکمل انقلاب ہو کہ پھر اس کے ردِ عمل کا کوئی امکان نہ رہے۔ انگریزی حکومت کے اثر سے مغربی تہذیب میں خواہ ہم کتنے ہی جذب ہو جائیں، بہر حال انگریزی قومیت میں جذب نہیں ہو سکتے۔ بہر حال ہمارا ایک الگ اجتماعی وجود باقی رہتا ہے جس کا پھر اپنی سابقہ صورت پر واپس ہونا ممکن ہے۔ لیکن یہاں تو صورتِ حال ہی دوسری ہے۔ ایک طرف ہمارے ہر امتیازی نشان حتیٰ کہ ہمارے احساسِ قومیت تک کو فرقہ پرستی (Communalism) قرار دے کر اس کے خلاف نفرت انگیز پراپیگنڈا کیا جاتا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ مستقل جماعت (Community) کی حیثیت سے ہمارا وجود ناقابلِ برداشت ہے۔ دوسری طرف ہماری قوم کے ان لوگوں کو قوم پرست (Nationalist) کہا جاتا ہے جو ہاتھ جوڑ کر نمستے کرتے ہیں، "بندے ماترم" کے نعرے لگاتے ہیں، مندروں میں پہنچ کر عبادت تک میں

حصّہ لے گزرتے ہیں، اپنی صورتوں اور لباسوں میں پورا ہندویت کا رنگ اختیار کرتے ہیں، اور مسلمان قوم کے مفاد کا نام تک لیتے ہوئے انہیں ڈر لگتا ہے کہ مبادا ان پر فرقہ پرستی (Communalism) کا الزام نہ آجائے جو ان کے نزدیک کفر کے الزام سے زیادہ بدتر ہے۔ تیسری طرف ہم سے صاف کہا جاتا ہے کہ ایک جماعت بن کر نہ آؤ، بلکہ افراد بن کر آؤ اور سیاسی پارٹیوں میں، مزدور اور سرمایہ دار کی تفریق میں، زمیندار اور کسان کی تقسیم میں، زردار اور بے زر کے تنازع میں منقسم ہو جاؤ، بالفاظِ دیگر اس رشتے کو خود ہی کاٹ دو جو مسلم اور مسلم میں ہوتا ہے اور اس رشتہ میں بندھ جاؤ جو ایک پارٹی کے مسلم اور غیر مسلم ممبروں میں ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ جو کچھ ہے اُسے سمجھنے کے لیے کچھ زیادہ عقل و فکر کی ضرورت نہیں۔ اس کا کھلا ہوا نتیجہ یہ ہے کہ تحریکِ آزادیٔ وطن کے دوران ہی میں ہمارا اجتماعی وجود فنا بھی ہو جائے، اور ہم جُدا جُدا قطروں کی شکل اختیار کر کے جدید نیشلزم کی خاک میں جذب بھی ہو جائیں۔ پھر بحیثیت مسلمان قوم کے ہم نشأۃِ ثانیہ کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے۔

جو لوگ صرف ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے آزادی چاہتے ہیں، اور جن کی نگاہ میں آزادی کے منافع اس قدر قیمتی ہیں کہ اپنی اسلامی حیثیت کو وہ بخوشی ان پر قربان کر سکتے ہیں، وہ اس راستہ پر ضرور جائیں۔ مگر ہم یہ تسلیم کرنے سے قطعی انکار کرتے ہیں کہ کوئی سچا مسلمان ایسی تحریکِ آزادیٔ وطن میں جان بوجھ کر حصّہ لینا گوارا کرے گا۔

(۲) مسلمانوں کی آزادی

آزادیٔ وطن کے لیے دوسرا راستہ صرف وہی ہو سکتا ہے جس میں کسی باشندۂ ہند کے ہندوستانی ہونے کی حیثیت اور اس کے مسلم یا ہندو یا عیسائی یا سکھ ہونے کی حیثیت میں کوئی تناقض نہ ہو، جس میں ہر گروہ کو دونوں حیثیتوں سے آزادی حاصل ہو، جس کی نوعیت یہ ہو کہ مشترک وطنی مسائل کی حد تک تو امتیازِ مذہب و ملت کا شائبہ تک نہ آنے پائے مگر جداگانہ قومی مسائل میں کوئی قوم دوسری قوم سے تعرض نہ کر سکے، اور سر

قوم کو آزاد ہندوستان کی حکومت میں اتنی طاقت حاصل ہو کہ وہ اپنے ان مسائل کو خود حل کرنے کے قابل ہو۔

جیسا کہ ہم بار بار کہہ چکے ہیں، ہندوستان کی آزادی کے لیے جنگ کرنا ہمارے لیے قطعاً ناگزیر ہے لیکن ہم جس قسم کی آزادی کے لیے لڑ سکتے ہیں، اور لڑنا فرض جانتے ہیں وہ یہی ہے۔ رہی وہ آزادی جو "وطن پرستوں" کے پیش نظر ہے، تو اس کی حمایت میں لڑنا کیا معنی، ہم تو اسے انگریزوں کی غلامی سے بھی زیادہ ملعون سمجھتے ہیں۔ ہمارے نزدیک اس کے علمبردار مسلمانوں کے لیے وہی کچھ ہیں جو کلائیو اور ولزلی تھے اور ان کے پیرو مسلمانوں کی حیثیت بھی میر جعفر اور میر صادق سے مختلف نہیں۔ گو صورتیں اور حالات مختلف ہیں، مگر دشمنی اور غداری کی نوعیت میں کوئی فرق نہیں۔[1]

کانگریس کی طرف بلانے والوں کی غلطی

اب سوال یہ ہے کہ یہ آزادی جس کو ہم اپنا مقصود بتا رہے ہیں کس طرح حاصل ہو سکتی ہے؟ مسلمانوں میں آج کل دو گروہ نمایاں ہیں جو مختلف تجویزیں پیش کر رہے ہیں۔

ایک گروہ کہتا ہے کہ آزادیٔ وطن کے لیے جو جماعت جدوجہد کر رہی ہے اس کے سامنے اپنے مطالبات پیش کرو اور جب وہ انہیں منظور کر لے تو اس کے

---

[1] بعض حضرات نے اس فقرے کی سختی کی شکایت کی ہے۔ ان کے اطمینان قلب کے لیے میں یہ ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ اس فقرے میں میرا روئے سخن ان لوگوں کی جانب نہیں جو سچے مسلمان ہیں اور محض اجتہادی غلطی میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ بلکہ میں دو قسم کے لوگوں کو میر جعفر و میر صادق سے تشبیہ دے رہا ہوں۔ ایک وہ جن کے دلوں سے درحقیقت اسلام نکل چکا ہے مگر وہ مسلمانوں کے بھیس میں رہ کر امتِ مسلمہ کی بیخ کنی کر رہے ہیں۔ دوسرے وہ جنہوں نے اپنی اغراض کو اپنا معبود بنا لیا ہے اور ہر بڑھتی ہوئی طاقت کے آگے سجدہ کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔

ساتھ شریک ہو جاؤ۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ بلا کسی شرط کے اس آزادی کی تحریک میں حصّہ لو۔

ہمارے نزدیک یہ دونوں گروہ غلطی پر ہیں۔ پہلے گروہ کی غلطی یہ ہے کہ وہ کمزوروں کی طرح بھیک مانگنا چاہتا ہے۔ بالفرض اگر اس نے مطالبہ کیا اور انہوں نے مان بھی لیا تو نتیجہ کیا نکلے گا؟ جس قوم میں خود زندہ رہنے اور اپنی زندگی اپنے بل بوتے پر قائم رکھنے کی صلاحیت نہیں اس کو دوسرے کب تک زندہ رکھ سکیں گے؟ رہا دوسرا گروہ تو وہ آزادی کے جوش میں اپنی قوم کی ان بنیادی کمزوریوں کو بھول جاتا ہے جنہیں گزشتہ صفحات میں ہم تفصیل کے ساتھ بیان کر چکے ہیں۔ اگر ثابت کر دیا جائے کہ وہ کمزوریاں واقعی نہیں ہیں، اور مسلمان درحقیقت اس قدر طاقت ور ہیں کہ جدید نیشنلزم سے ان کی قومیت اور قومی تہذیب کو کسی قسم کا خطرہ نہیں، تو ہم اپنی رائے واپس لینے کے لیے تیار ہیں۔ لیکن اگر یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا اور ہم یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ نہیں کیا جا سکتا، تو پھر صاف سُن لیجیے کہ اس مرحلہ پر مسلمانوں کو کانگریس کی طرف دعوت دینا دراصل ان کو خودکشی کا مشورہ دینا ہے۔ محض جذبات سے اپیل کر کے آپ حقائق کو نہیں بدل سکتے۔ جس مریض کی آدھی جان نکل چکی ہے اس کے سامنے سپہ سالار بن کر آنے سے پہلے آپ کو حکیم بن کر آنا چاہیے۔ پہلے اس کی نبض دیکھیے اور اس کے مرض کا علاج کیجیے پھر اس کی کمر سے تلوار بھی باندھ لیجیے گا۔ یہ کہاں کی ہوشمندی ہے کہ مریض تو بستر پر پڑا ایڑیاں رگڑ رہا ہے اور آپ اس کے سرہانے کھڑے خطبہ دے رہے ہیں کہ اُٹھ بہادر اپنی طاقت کے بل پر کھڑا ہو، باندھ کمر سے تلوار اور چل میدانِ کارزار میں!

یہ دونوں راستے جنہوں نے اختیار کیے ہیں، ان میں متعدد حضرات ایسے ہیں جن کے لیے ہمارے دل میں غایت درجہ کا احترام موجود ہے۔ ان کے خلوصِ ایمان میں ہم کو ذرّہ برابر شک نہیں۔ مگر ان کی جلالتِ شان کا پُورا پُورا ادب ملحوظ رکھتے ہوئے ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ وہ اس وقت مسلمانوں کی غلط رہنمائی کر رہے ہیں

ہیں، اور اس غلط رہنمائی کا سبب یہ ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کی موجودہ پوزیشن اور مستقبل کے امکانات پر کافی غور و خوض نہیں کیا ہے۔

چند غور طلب حقائق

ہمارے رہنماؤں کو قدم اٹھانے سے پہلے حسبِ ذیل حقائق کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے۔

(۱) مسلمانوں کی حیاتِ قومی کو برقرار رکھنے کے لیے وہ چیز بالکل ناگزیر ہے جس کو آج کل سیاسی اصطلاح میں سلطنت کے اندر ایک سلطنت کہا جاتا ہے۔ ان کی سوسائٹی جن بنیادوں پر قائم ہے وہ استوار ہی نہیں رہ سکتیں جب تک کہ خود ان کی اپنی جماعت میں کوئی قوتِ ضابطہ اور ہیئتِ حاکمہ موجود نہ ہو۔ ایسی ایک مرکزی طاقت کے بغیر کسی غیر مسلم نظامِ حکومت میں رہنے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ان کا اجتماعی نظام رفتہ رفتہ مضمحل ہو کر فنا ہو جائے اور وہ بحیثیت ایک مسلم قوم کے زندہ ہی نہ رہ سکیں۔

(۲) اٹھارہویں صدی کے سیاسی انقلاب نے ہم کو اس چیز سے محروم کر دیا اور اس کی بدولت جو اضمحلال ہماری سوسائٹی میں رونما ہوا اسے ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ ڈیڑھ سو برس تک مسلسل اور پیہم انحطاط کی طرف لے جانے کے بعد یہ انقلاب ہم کو ایک ایسے مقام پر چھوڑ رہا ہے جہاں ہماری جمعیت پراگندہ، ہمارے اخلاق تباہ، ہماری سوشل لائف ہر قسم کی بیماریوں سے زار و نزار اور ہمارے دین و اعتقاد تک کی بنیادیں متزلزل ہو چکی ہیں اور ہم موت کے کنارے پر کھڑے ہوئے ہیں۔

(۳) اب ایک دوسرے انقلاب کی ابتدا ہو رہی ہے جس میں دو قسم کے امکانات ہیں۔ اگر ہم نے اسی غفلت سے کام لیا جس سے گزشتہ انقلاب کے موقع پر کام لیا تھا، تو یہ دوسرا انقلاب بھی اسی سمت میں جائے گا جس میں پہلا انقلاب گیا تھا اور یہ اس نتیجہ کی تکمیل کر دے گا جس کی طرف ہمیں اس کا پیش رو لے جا رہا تھا۔ اور اگر ہم غیر مسلم

نظامِ حکومت کے اندر ایک مسلم نظامِ حکومت (خواہ وہ محدود پیمانہ ہی پر ہو) قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے، تو انقلاب اپنا رُخ بدل دے گا اور ہمیں اپنے نظمِ اجتماعی کو پھر سے مضبوط کر لینے کا ایک موقع ہاتھ آ جائے گا۔

(۴) سلطنت کے اندر ایک سلطنت قائم کرنا کسی سمجھوتے اور کسی میثاق کے ذریعہ سے ممکن نہیں کوئی غیر مسلم سیاسی جماعت، خواہ وہ کیسی ہی فیاض اور وسیع المشرب ہو، اس کے لیے بخوشی آمادہ نہیں ہو سکتی، نہ اس کو بحث و مباحثہ کی طاقت سے کسی دستوری قانون میں داخل کرایا جا سکتا ہے۔ اور بالفرض یہ ہو بھی جائے تو ایسی غیر معمولی چیز جس کی پشت پر کوئی طاقت وررائے عام اور منظم قوت موجود نہ ہو عملی سیاست میں نقش بر آب سے زیادہ پائیدار نہیں ہوتی۔ درحقیقت یہ چیز اگر کسی ذریعہ سے پائیدار بنیادوں پر قائم ہو سکتی ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ ہم خود اپنے نظام کی قوت اور اپنے ناقابلِ تسخیر متحدہ ارادے سے اس کو بالفعل قائم کر دیں اور یہ ایک ایسا حاصل شدہ واقعہ
بن کر ہندوستان کے آئندہ نظامِ حکومت کا جزء بن جائے جس کو کوئی طاقت واقعہ سے غیر واقعہ نہ بنا سکے۔

(۵) یہ کام اس طرح انجام نہیں پا سکتا کہ ہم سرِ دست انقلاب کو اسی رفتار پر چلنے دیں اور اس کی تکمیل ہونے کے بعد جب ہندوستان میں مکمل طور پر ایک غیر مسلم نظامِ حکومت قائم ہو جائے، اس وقت سلطنت کے اندر ایک سلطنت بنانے کی کوشش کریں۔ اس چیز کو صرف وہی شخص قابلِ عمل خیال کر سکتا ہے جس کو عملی سیاست کی ہوا تک چھو کر نہ گزری ہو۔ ایک ہوش مند آدمی تو بادنیٰ تامل یہ سمجھ لے گا کہ انقلاب کا رُخ صرف دورانِ انقلاب ہی میں بدلا جا سکتا ہے، اور سلطنت کے اندر سلطنت صرف اسی صورت میں بن سکتی ہے۔ جب کہ سلطنت کی تعمیر کے دوران میں اس کی بنا ڈال دی جائے۔

(۶) جس قسم کی تنظیم اس مقصد کے لیے درکار ہے وہ کانگریس کے فریم میں

داخل ہو کر نہیں کی جا سکتی۔ کانگریس ایک منظم جماعت ہے۔ اور ہر منظم جماعت میں یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ افراد کو اپنے دائرے میں لے کر اپنی فطرت اور اپنے مخصوص نفسیات کے مطابق ڈھال لیتی ہے۔ مسلمانوں میں اگر مضبوط اسلامی کیرکٹر اور طاقت ور اجتماعی نظم موجود ہو تو البتہ وہ کانگریس کے فریم میں داخل ہو کر اس کے نفسیات اور اصول و مقاصد میں تغیر پیدا کر سکتے ہیں۔ لیکن اس وقت وہ جن کمزوریوں میں مبتلا ہیں (جن کی تشریح پہلے کی جا چکی ہے) ان کو لیے ہوئے منتشر افراد کی صورت میں ان کا ادھر جانا تو صرف ایک ہی نتیجہ پیدا کر سکتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ہمارے جمہور پر کانگریسی نفسیات کا غلبہ ہو جائے، وہ اکابر کانگریس کی رہنمائی تسلیم کر کے ان کے اشارات پر چلنے لگیں اور اسلامی مقاصد کے لیے مسلمانوں میں ایک رائے عام تیار کرنے کے جو امکانات ابھی باقی ہیں وہ بھی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں۔ ہر شخص جس کو خدا نے دیدۂ بینا عطا کیا ہے اس بات کو بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ نیشنلسٹ قسم کے مسلمان اگر کانگریس کے اندر کوئی بڑی قوت پیدا کر لیں اور حکومت کے اقتدار میں انہیں کوئی بڑا حصہ مل جائے تب بھی وہ مسلمانوں کے لیے کچھ مفید نہ ہوں گے، بلکہ غیر مسلموں سے کچھ زیادہ ہی نقصان رساں ثابت ہوں گے۔ اس لیے کہ وہ ہر معاملہ میں پالیسی اور طریق کار تو وہی اختیار کریں گے جو ایک غیر مسلم کرے گا، مگر ایسا کرنے کے لیے ان کو اس سے زیادہ آزادی اور جرأت حاصل ہو گی جو ایک غیر مسلم کو حاصل ہو سکتی ہے اس لیے کہ بدقسمتی سے ان کے نام مسلمانوں کے سے ہوں گے۔

اسلامی جماعت کو مضبوط بنانے کیلئے ضروری تدابیر

مذکورہ بالا حقائق کو پیش نظر رکھ کر جب آپ غور کریں گے تو معلوم ہو گا کہ ہمارے لیے اب صرف ایک ہی راستہ باقی ہے، اور وہ یہ ہے کہ ہم ہندوستان کی آزادی کے لیے جنگ میں شریک ہونے سے پہلے اپنی کمزوریوں کو دُور کریں اور اپنے اندر وہ طاقت پیدا کریں جس سے ہندوستان کی آزادی کے ساتھ مسلمان کی آزادی کا

حصول بھی ممکن ہو۔ اس غرض کے لیے ہم کو اپنی قوتیں جن کاموں پر صرف کرنی چاہئیں وہ حسبِ ذیل ہیں :۔

(۱) مسلمانوں میں وسیع پیمانہ پر اصولِ اسلام اور قوانین شریعت کا علم پھیلایا جائے اور ان کے اندر کم از کم اتنی واقفیت پیدا کر دی جائے کہ وہ اسلام کے حدود کو پہچان لیں اور یہ سمجھ سکیں کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم کن خیالات اور کن عملی طریقوں کو قبول کر سکتے ہیں اور کن کو قبول نہیں کر سکتے۔ یہ نشر و تبلیغ صرف شہروں ہی میں نہیں ہونی چاہیئے بلکہ دیہات کے مسلمانوں کو شہری مسلمانوں سے زیادہ اس کی ضرورت ہے۔

(۲) علم کی اشاعت کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو عملاً احکامِ اسلامی کا متبع بنانے کی کوشش کی جائے اور خصوصیت کے ساتھ ان ارکان کو پھر سے استوار کیا جائے، جن پر ہمارے نظامِ جماعت کی بنیاد قائم ہے۔

(۳) مسلمانوں کی رائے عام کو اس طرح تربیت کیا جائے کہ وہ غیر اسلامی طریقوں کے رواج کو روکنے پر مستعد ہو جائیں، اور ان کا اجتماعی ضمیر (Social [illegible]nscience) احکامِ اسلامی کے خلاف افراد کی بغاوت کو برداشت کرنا چھوڑ دے۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ جس چیز کے استیصال پر توجہ صرف کرنے کی ضرورت ہے وہ تشبہ بالاجانب ہے، کیونکہ یہی وہ چیز ہے جو ہم کو غیروں میں جذب ہونے کے لیے تیار کرتی ہے۔

(۴) ہمیں اپنی اجتماعی قوت اتنی مضبوط کرنی چاہیئے کہ اپنی جماعت کے ان غداروں اور منافقوں کا استیصال کر سکیں جو اپنے دل کے چھپے ہوئے کفر و نفاق کی وجہ سے یا ذاتی اغراض کی خاطر اسلامی مفاد کو نقصان پہنچاتے ہیں۔

(۵) ہمیں اس امر کی کوشش کرنی چاہیئے کہ جمہور مسلمین کی قیادت کا منصب نہ انگریز کے غلاموں کو حاصل ہو سکے، نہ ہندو کے غلاموں کو، بلکہ ایک ایسی جماعت کے قبضہ میں آ جائے جو ہندوستان کی کامل آزادی کے لیے دوسری

ہمسایہ قوموں کے ساتھ اشتراکِ عمل کرنے پر تو دل سے آمادہ ہو، مگر اسلامی مفاد کو کسی حال میں قربان کرنے پر آمادہ نہ ہو۔

(۴) مسلمانوں میں اس قدر اتحادِ خیال اور اتحادِ عمل پیدا کر دیا جائے کہ وہ تنِ واحد کی طرح ہو جائیں اور ایک مرکزی طاقت کے اشاروں پر حرکت کرنے لگیں۔

اس وقت مسلمانوں کی جو حالت ہے اس کو دیکھتے ہوئے شاید بعض لوگ یہ خیال کریں گے کہ ایسا ہونا محال ہے۔ خود میرے متعدد دوستوں نے کہا کہ تم خیالی پلاؤ پکا رہے ہو۔ یہ قوم اس قدر گر چکی ہے کہ اب کوئی اعجازی قوت ہی اس کو سنبھالے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ ابھی اس قوم کو سنبھالنے کا موقع، آخری موقع باقی ہے۔ ہمارے خواص خواہ کتنے ہی بگڑ چکے ہوں، مگر ہمارے عوام میں ابھی ایمان کی دبی ہوئی ایک چنگاری موجود ہے اور وہی ہمارے لیے آخری شعاعِ اُمید ہے قبل اس کے کہ وہ بجھے، ہم اس سے بہت کچھ کام لے سکتے ہیں بشرطیکہ چند مردِ مومن ایسے اُٹھ کھڑے ہوں جو خلوصِ نیت کے ساتھ خدا کی راہ میں جہاد کرنے والے ہوں۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

کوئی شخص یہ خیال نہ کرے کہ ہم کانگریس سے تصادم چاہتے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے تو ہمارا مقصد وہی ہے جو کانگریس کا ہے۔ (یعنی ملک کی آزادی) اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس مشترک مقصد (آزادی) کے لیے ہم کو بالآخر کانگریس کے ہی ساتھ تعاون[1] کرنا ہے۔ لیکن سرِدست ہم اس سے صرف اس لیے

---

[1] یعنی غیر ملکی سامراج سے آزادی حاصل کرنے کے لیے۔ باقی رہا حصولِ آزادی کا وہ طریقہ جو کانگریس نے اختیار کیا یعنی "متحدہ قومیت" اور "قوم پرستی"، تو اسی مضمون اور اس پوری کتاب میں اس پر تنقید کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ راستہ مسلمانوں کی راہ سے کتنا مختلف اور اسلام سے دُور لے جانیوالا ہے۔ اس مضمون میں چند پیراگراف قبل مولانا فرما چکے ہیں کہ جو لوگ اس تحریک کو پروان چڑھا رہے ہیں وہ ان کے خیال میں "گاندھیو اور ولبی" اور ان کے مسلمان متبع "میر جعفر اور میر صادق" ہیں۔ (باقی صفحہ ۸۶ پر)

علیحدہ رہنا چاہتے ہیں کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے اپنے مفاد کا تحفظ کرنے کے لیے ہم کو جس اخلاقی قوت اور اجتماعی نظم کی ضرورت ہے وہ ہم میں نہیں ہے۔ سب سے پہلے ہم اپنی کمزوریوں کو دُور کرنا چاہتے ہیں اور اس غرض کے لیے ہم کو ایسی فضا درکار ہے جو مزاحمت اور تصادم سے پاک ہو۔ پس اگر کانگریس ہم سے تعرض کیے بغیر اپنا کام جاری رکھے تو ہمیں اس سے لڑنے کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ اس کے برعکس ہماری ہمدردیاں مشترک ہندوستانی مقاصد کی حد تک اس کے ساتھ رہیں گی۔ البتہ اگر وہ ہماری غیر منظم جماعت کو اپنے نظم میں جذب کرنے کی کوشش کرے گی، اور براہ راست ہمارے عوام میں "وطن پرستی" اور "اشتراکیت" کی تبلیغ شروع کر دے گی اور اس غرض کے لیے ہماری قوم کے ان منافقوں سے کام لے گی جن کی حیثیت ہماری نگاہ میں دوسری قسم کے منافقوں (یعنی انگریزی اقتدار کے ایجنٹوں) سے کچھ بھی مختلف نہیں تو اس صورت میں ہم کو مجبوراً اس سے لڑنا پڑے گا، اور اس لڑائی کا تمام تر الزام خود اسی پر عاید ہوگا۔

پنڈت جواہر لال نہرو اپنی موجودہ پالیسی کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ اپنے مسلک کی تبلیغ کرنا اور مخالف خیالات رکھنے والوں کو تبدیلِ خیال (Conversion) پر آمادہ کرنے کی کوشش کرنا ہر جماعت کا حق ہے۔ ہم کہتے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۸۵ سے) سے کچھ بھی مختلف نہیں۔ اور اس تحریک کو وہ "شدھی" کی تحریک قرار دیتے ہیں۔ کچھ لوگوں نے مولانا کے اس جملہ کو غلط معنی پہنا کر یہ جھوٹا دعویٰ کیا ہے کہ وہ "کٹر کانگریسی تھے"! جو شخص بھی اس کتاب کو پڑھے گا، وہ اس بہتان کی حقیقت سے واقف ہو جائے گا، اور اسے یہ بھی اندازہ ہو جائے گا کہ مولانا کے مخالفین بددیانتی کی کس سطح پر اُتر آتے ہیں۔ نیز یہاں یہ وضاحت بھی بے موقع نہ ہوگی کہ مولانا مودودی صاحب اپنی زندگی کے کسی دَور میں بھی ایک دن کے لیے بھی کانگریس کے ممبر نہیں رہے اور نہ اس سے کسی اور حیثیت میں وابستہ رہے۔ (مرتب)

ہیں کہ اگر آپ کو یہ حق حاصل ہے تو ہم کو بھی جوابی تبلیغ کا حق پہنچتا ہے۔ وطن پرستی اور
اشتراکیت کی تبلیغ ہماری نگاہ میں شدھی کی تبلیغ سے کچھ بھی مختلف نہیں۔ دونوں
کا نتیجہ ایک ہے اور دونوں کی مزاحمت ہمارے لیے ناگزیر ہے۔ اگر آپ اس
تصادم کے لیے تیار ہیں اور اس کو ہندوستان کے مستقبل کے لیے مفید سمجھتے ہیں
تو یہ آپ کی سخت نادانی ہے۔

حصّہ دوم

اِصلاح کا راستہ

قرآن و سُنّت کی روشنی میں مُسلمانوں کیلئے صحیح راہِ عمل

حالات کا جائزہ لینے اور راہِ عمل کی نشاندہی کرنے کے بعد مولانا مودودی صاحب نے اس سلسلۂ مضامین میں تفصیل کے ساتھ یہ بتایا کہ مسائل حاضرہ میں قرآن وسنت کی راہنمائی کیا ہے اور مسلمانوں کے ملی و قومی عزائم کیا ہو سکتے ہیں۔ ان مضامین میں مولانا محترم مسلمانوں کے قومی نصب العین کو بیان فرماتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ مسلمانوں کا اصل مسئلہ اپنی تہذیب، اپنے دین اور اپنی روایات کا تحفظ اور ان کی بنیاد پر ایک نئی زندگی کی تشکیل ہے۔ یہ مضامین بھی مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصۂ اوّل میں شائع ہو چکے ہیں۔ (مرتب)

مسائلِ حاضرہ میں قرآن اور اُسوۂ رسولؐ کی رہنمائی

اِتَّبِعُوْا مَا اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ (الاعراف ۳)

پیروی کرو اس ہدایت کی جو تمہاری طرف خدا کے پاس سے نازل کی گئی ہے۔ خدا کو چھوڑ کر دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرنے لگو۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ۔ (آلِ عمران ۳۱)

اے نبی کہہ دو اگر تم خدا کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو۔ خدا تم کو دوست بنالے گا اور تمہیں بخش دے گا۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا۔

(الاحزاب ۲۱)

تمہارے لیے یقیناً اللہ کے رسول میں عمل کا اچھا نمونہ موجود ہے

جو کوئی اللہ کی رحمت کا اُمیدوار ہو اور آخرت کے آنے کی توقع رکھتا ہو
اور اللہ کو بہت یاد رکھنے والا ہو اس کے لیے رتو پیروی کا صحیح نمونہ
وہی ہے)

جو لوگ قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہیں، یا جنہوں نے کبھی قرآن پڑھا ہے ان کی نظر سے اس کتاب پاک میں یہ آیات ضرور گزری ہوں گی۔ بہت سوں کو ان کے معانی سے بھی واقفیت ہو گی۔ خصوصاً آخری آیت سے تو کوئی وعظ اور کوئی اصلاحی خطبہ خالی نہیں ہوتا مگر آج ضرورت محسوس ہو رہی ہے کہ ایک بار پھر یہ آیات نظروں کے سامنے لائی جائیں۔ کیونکہ ایسا گمان ہوتا ہے کہ شاید ساری مسلمان قوم ان آیات کو بھول گئی ہے۔

جملاً ہر مسلمان اس بات کو جانتا اور مانتا ہے کہ بحیثیت مسلمان ہونے کے ہم کو قرآن اور اسوۂ رسول ہی کا اتباع کرنا چاہیئے اور ہمارے لیے ہدایت انہی دو چیزوں میں ہے لیکن سوال یہ ہے کہ یہ ہدایت جس کے اتباع کا حکم اس قطعیت کے ساتھ ہم کو دیا گیا ہے، آیا اس کا دائرہ صرف طہارت اور استنجا اور عبادات اور باصطلاحِ زمانۂ حال "مذہبی" معاملات ہی تک محدود ہے یا ہماری زندگی کے چھوٹے اور بڑے، دینی اور دنیوی، قومی اور ملکی تمام معاملات پر حاوی ہے؟ نیز یہ ہدایت صرف اس زمانہ اور اس ملک کے لیے تھی جس میں قرآن نازل ہوا تھا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تھے، یا درحقیقت یہ زمانی و مقامی قیود سے مبرا ہے اور اس میں ہر زمانے اور ہر ملک کے مسلمانوں کے لیے ویسی ہی سچی اور صحیح رہنمائی موجود ہے جیسی ساڑھے تیرہ سو برس پہلے کے عربوں کے لیے تھی؟ اگر پہلی بات ہے تب تو نعوذ باللہ قرآن کا یہ مطالبہ ہی غلط ہے کہ سب رہنماؤں کو چھوڑ کر صرف اسی کی پیروی کی جائے، اور تمام دنیا کے طریقوں کو ترک کر کے صرف اُس ایک شخص کے اسوہ کا اتباع کیا جائے جو ہمارے پاس قرآن لایا تھا۔ اس صورت میں تو اتباع کرنے کے بجائے ہم کو اپنے ایمان ہی پر نظرِ ثانی کرنی پڑے گی لیکن اگر بات دوسری ہے

تو یہ کیا ماجرا ہے کہ تم وضو اور غسل کے مسائل میں، نکاح اور طلاق کے معاملات میں، ترکے اور وراثت کے مقدمات میں تو اس سرچشمہ ہدایت کی طرف رجوع کرتے ہو۔ لیکن جن مسائل کے حل پر تمہاری قوم کی زندگی و موت کا مدار ہے ان میں نہیں دیکھتے کہ قرآن تمہیں کون سا راستہ دکھاتا ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کس طرف تمہاری رہنمائی کرتی ہے۔

انتشارِ خیال و تشتتِ عمل

ہندوستان میں ہر طرف ایک بے چینی نظر آتی ہے۔ ساری مسلمان قوم پر ایک پریشانی چھائی ہوئی ہے۔ مستقبل کا سوال ایک درشنی ہنڈی کی طرح مسلمانوں کے سامنے آن کھڑا ہوا ہے، اور تقاضا کر رہا ہے کہ یا تو میرا معاملہ صاف کر دو یا دیوالہ نکالو۔ لیکن اس قوم کا حال کیا ہے؟ جس کا جدھر منہ اُٹھ رہا ہے چلا جا رہا ہے۔ اور جس کے ذہن میں جو بات آ رہی ہے کہہ رہا ہے اور لکھ رہا ہے۔ کوئی مارکس اور لینن کے اسوے کو دانتوں سے پکڑے ہوئے ہے، کوئی ہٹلر اور مسولینی کی سنت پر عمل کر رہا ہے، کوئی گاندھی اور جواہر لال کے پیچھے چلا جا رہا ہے، کوئی فرائض کی پرچونی فہرست میں ایک نئے فرض (جنگ آزادی) کا اضافہ کر رہا ہے، کسی پر نشستوں اور ملازمتوں کے فی صدی تناسب کا بھوت سوار ہے، کوئی حرکت اور عمل کا پجاری بنا ہوا ہے اور ہانکے پکارے کہہ رہا ہے کہ اگر پشاور کی گاڑی نہیں چلتی تو راس کماری ہی کی طرف جانے والی گاڑی پر سوار ہو جاؤ، اس لیے کہ منزلِ مقصود کوئی نہیں، حرکت ہی فی نفسہٖ موجود ہے۔ غرض ہر شخص جو کچھ بول سکتا ہے ایک نئی تجویز قوم کو سنا دیتا ہے اور ہر شخص جو کچھ لکھ سکتا ہے ایک ماہرانہ و مبصرانہ مقالہ لکھ کر شائع کر دیتا ہے۔ مگر اس تمام شور و شغب اور اس پورے ہنگامے میں کسی کو بھی یہ یاد نہیں آتا کہ ہمارے پاس قرآن نامی بھی کوئی کتاب ہے جس نے زندگی کے ہر مسئلہ میں ہماری رہنمائی کا ذمہ لے رکھا ہے اور ہم سے کبھی یہ بھی کہا گیا تھا کہ زندگی کے ہر معاملہ میں تمہارے لیے ایک عملی نمونہ موجود ہے۔

ہدایت صرف کتاب اللہ اور سُنّتِ رسول اللہ میں ہے

مسلمانوں کو مختلف راستوں کی طرف بُلایا جا رہا ہے۔ ہر راستہ کی طرف بُلانے والوں میں بڑے بڑے مقدس علماء ہیں۔ بڑے بڑے نامور لیڈر ہیں۔ بڑے بڑے زبان آور خطیب اور ماہرِ فن انشاپرداز ہیں۔ ہر وادی کے سرے پر ایسے لوگ کھڑے ہیں جن کی آزمودہ کاری مسلّم، قومی خدمت ناقابلِ انکار، اور سیاسی مہارت و بصیرت معروف و مشہور۔

ہر رہنما بڑی قابلیت کے ساتھ اپنے اپنے راستے کے نشیب و فراز دکھا رہا ہے اور دوسرے راستوں کے خدشات بیان کر رہا ہے۔ یہ سب کچھ قابلِ قدر ہے۔ مگر مسلمان کی فطرت کہتی ہے ایتونی شیئًا من کتاب اللہ و سنۃ رسولہ حتی اتولی۔ میرے سامنے شخصیتوں کو نہ لاؤ۔ کوئی شخص خواہ کتنا ہی بڑا آدمی ہو، عالم و فاضل ہو، مفسرِ قرآن ہو، معلمِ حدیث ہو، ماہرِ سیاست ہو، عمل اور قربانی کا نمونہ ہو، اس کی حرمت میرے سر اور آنکھوں پر، مگر جو ہدایت وہ دے رہا ہے، اگر وہ اس کے اپنے ذہن کی پیداوار ہے تو میرے لیے لائقِ اتباع نہیں۔ ہاں اگر وہ کتاب اللہ اور سنّتِ رسول اللہ میں کوئی دلیل اپنے پاس رکھتا ہے تو شخصی عظمت کی آمیزش سے الگ کرکے اس کو اور صرف اس کو سامنے لاؤ۔ اس لیے کہ وہی لائقِ اتباع ہے، اسی میں سچی ہدایت ہے، اور اسی کی پیروی میں فلاح و نجات ہے۔ اس کے بتائے ہوئے راستہ میں خواہ کتنی ہی دشواریاں ہوں، کتنے ہی خدشات اور کتنے ہی نقصانات ہوں، آخری اور دیرپا اور یقینی کامیابی اسی کے ذریعہ سے حاصل ہو سکتی ہے۔

آیئے آج اسی نقطۂ نظر سے قرآن اور سیرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر غور کریں کہ ہمارے اس وقت کے قومی مسائل میں اس کے اندر کیا ہدایت ہے۔ کچھ پروا نہیں اگر کوئی اس بات کو دقیانوسیت اور رجعت پسندی کہہ کر ناک بھوں چڑھائے۔ حالات جدید سہی، جغرافی ماحول مختلف سہی، مگر جس ہدایت کی طرف ہم رجوع کر

رہے ہیں، ہمارا ایمان ہے کہ وہ ہر زمانہ میں جدید ہے، ہر دور میں وقتی ہے، اور ہر جغرافی ماحول میں مقامی ہے۔

بعثتِ محمدی کے وقت عرب کی حالت اور حضورؐ کا طرزِ عمل

ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت آپؐ کے وطن کی سیاسی حالت کیا تھی اور اس حالت میں آپؐ نے کیا طرزِ عمل اختیار کیا۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ اس وقت عرب ہر طرف ظالم سلطنتوں سے گھرا ہوا تھا اور خود ملک کے اندر ہمسایہ قوموں کا امپیریلزم نفوذ کر چکا تھا۔ آپؐ کی پیدائش سے چند ہی روز قبل حبشی فوجیں یلغار کرتی ہوئی خاص اس شہر تک پہنچ گئی تھیں جس میں آپؐ پیدا ہوئے۔ عرب کا سب سے زیادہ زرخیز صوبہ یمن پہلے حبشیوں کے اور پھر ایرانیوں کے تسلط میں جا چکا تھا۔ عرب کے جنوبی اور مشرقی سواحل ایرانیوں کے زیرِ اثر تھے۔ عراقِ عرب کا علاقہ نجد کے حدود تک ایرانیوں کے اثر میں تھا۔ شمال میں عقبہ اور معان تک بلکہ تبوک تک سلطنتِ روم کے اثرات پہنچے ہوئے تھے۔ دونوں ہمسایہ سلطنتیں عرب کے قبائل کو اپنی اغراض کے لیے ایک دوسرے سے لڑاتی تھیں اور اندرونِ عرب میں اپنے اثرات پھیلا رہی تھیں۔ متعدد مرتبہ قسطنطنیہ کا قیصر مکہ کی چھوٹی سی ریاست کے معاملات میں مداخلت کر چکا تھا۔ عربی قوم کو ہر ملک گیر طاقت اپنے قبضہ میں لانا چاہتی تھی، کیونکہ اس قوم کا ملک بنجر تھا، مگر قوم بنجر نہ تھی۔ جہانگیری کے لیے بہترین سپاہی اس سے فراہم ہو سکتے تھے۔

ان حالات میں جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو آپؐ نے کیا کیا؟ اگرچہ آپؐ کو اپنے وطن اور اپنی قوم سے فطری محبت تھی اور آپؐ سے بڑھ کر حریت پسند کوئی نہ تھا، مگر آپؐ نے ایک قوم پرست (Nationalist) یا وطن پرست (Patriot) کی حیثیت اختیار نہ کی۔ بلکہ ایک حق پرست اور خدا پرست کی حیثیت اختیار کی۔ آپؐ کی نگاہ میں مقدم کام یہ نہ تھا کہ اپنے اہلِ وطن کی قوت کو جمع کر کے اجنبی استیلاء کی جڑیں خاکِ وطن سے اکھاڑ پھینکیں، بلکہ دوسرے ہر

کام سے مقدم یہ کام تھا کہ حق پرستوں کا ایک جتھا بنائیں اور اُس کے اندر ایسی طاقت پیدا کر دیں کہ وہ صرف عرب ہی میں نہیں، بلکہ خود روم و ایران میں بھی ظلم و عدوان کے استیلاء کا خاتمہ کر دے۔ آنحضرتؐ کے اہلِ وطن آپؐ کے بہترین اوصاف سے واقف تھے۔ انہوں نے عرب کی بادشاہی کا تاج آپؐ کے سامنے پیش کیا تھا، اس شرط پر کہ آپؐ اپنے اس جتھے کی توسیع و تنظیم سے باز آجائیں۔ اگر آپؐ وطن پرست ہوتے تو خدمتِ وطن کا موقع اس سے بہتر اور کون سا ہو سکتا تھا؟ مگر آپؐ نے اس تاج کو ٹھکرا دیا، اور اسی کام میں لگے رہے جس کے بار آور ہونے کی کم از کم اس وقت کوئی شخص امید نہ کر سکتا تھا۔ اس وقت آپؐ کی جمعیت دس بارہ آدمیوں سے زیادہ نہ تھی۔ تمام ملک میں کوئی قبیلہ اور کوئی گروہ آپؐ کا ساتھی نہ تھا۔ بلکہ سب مخالف اور سخت مخالف تھے۔ ظاہر اسباب کے لحاظ سے کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ اسکیم کب کامیاب ہو گی جس کو آپؐ لے کر اُٹھے تھے۔ اس بات کا ہر وقت امکان تھا کہ واقعۂ فیل کی طرح کا کوئی دوسرا واقعہ پھر پیش آجائے اور حجاز بھی یمن اور ارضِ غسان کی طرح اجنبی حکومت کا غلام بن جائے، مگر آپؐ نے ہر حال میں یہی ضروری سمجھا کہ پہلے حق پرستوں کی جمعیت کو بڑھائیں اور مضبوط کر لیں، پھر جیسی صورتِ حال ہو اس کے مطابق ملکیوں اور غیر ملکیوں کے ساتھ کوئی معاملہ کریں۔

اس کی کیا وجہ تھی؟ کیا آپؐ "کمیونلسٹ" تھے؟ کیا آپؐ نعوذ باللہ اپنے وطن کے غدار تھے؟ کیا خاکم بدہن آپؐ غیر ملکی امپیریلزم کے ایجنٹ تھے؟ ہرگز نہیں۔ تاریخ کے ناقابلِ انکار حقائق گواہ ہیں کہ کسی فرزندِ وطن نے اپنے وطن کو اتنی سربلندی عطا نہیں کی جتنی محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی بدولت عرب کو نصیب ہوئی۔ اور تاریخ ہی اس بات پر بھی گواہ ہے کہ کسی داعیِ دین نے غیر مذہب والوں کے ساتھ اتنے تحمل، اتنی فیاضی، اتنی رواداری، اور اتنی فراخ حوصلگی کا برتاؤ نہیں کیا۔ پھر یہ بھی دنیا کو معلوم ہے کہ اللہ کے رسولؐ نے کبھی روٹیوں کی تقسیم اور منافع کے بٹوارے کا سوال نہیں اُٹھایا۔ آپؐ نے نہ کبھی کی زندگی میں اس بنیاد

پر مصالحت کی کہ ریاست، قریش کے دارالندوہ اور جنگی و سیاسی عہدوں میں مسلمانوں کی اتنی نمائندگی ہو، اور نہ مدنی زندگی میں اس مسئلہ کو مدارِ صلح قرار دیا کہ یہود کے معاشی وسائل میں مسلمانوں کا اتنا حصّہ ہو۔

اب غور کیجیے کہ جب وہاں نہ کمیونزم تھا، نہ وطن دشمنی تھی، نہ اعدائے وطن سے سازباز تھا، تو پھر کون سی چیز تھی جس کی بنا پر آپ نے عرب کی سیاسی نجات اور تمدنی و معاشی فلاح پر اپنی بہترین قوتوں اور قابلیتوں کو صرف کرنے سے انکار کیا اور ہر کام سے پہلے خدا کا نام لینے والوں کی ایک طاقتور جمعیت بنانا اور زمین میں اس کا دبدبہ قائم کرنا ضروری سمجھا؟ اس کا جواب ایک اور صرف ایک ہی ہو سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نصب العین وطن پرست کے نصب العین سے بالکل مختلف تھا۔ اس نصب العین کی راہ میں باہر کے قیصر و کسریٰ اور گھر کے ابوجہل اور ابولہب دونوں یکساں سدِّ راہ تھے۔ اس نصب العین کو حاصل کرنے کے لیے ناگزیر تھا کہ واقعات کی رفتار اور ملک کے مستقبل اور آئندہ کے امکانی خدشات، سب کی طرف سے بے پروا ہو کر ایک ایسی جماعت کو منظم کیا جائے جو باطل کے غلبہ کو کسی صورت میں قائم نہ رہنے دے۔ اور اپنی طاقت سے زمین میں ایسی حالت قائم کر دے جس میں خدا پرستانہ تہذیب امن کے ساتھ پھل پھول سکے۔ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ[1]

وہی نصب العین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمان قوم کو دے گئے ہیں۔ مسلمان قوم ایک قوم ہی اس بنیاد پر بنی ہے کہ یہ نصب العین اس کے تمام افراد کا مشترک اور واحد نصب العین ہے۔ اس نصب العین کو سلب کر لیجیے، پھر مسلمان

---

[1] اور ان لوگوں سے لڑتے رہو، یہاں تک کہ فتنہ (یعنی کفر و فساد) باقی نہ رہے اور دین سب خدا ہی کا ہو جائے۔ (الانفال: ۳۹)

قوم کسی قوم کا نام نہیں ۔ یہاں عرب اور عجم کی کوئی خصوصیت نہیں ۔ زمان و مکان کا کوئی سوال نہیں ۔ مسلمان اگر مسلمان ہے تو ہر حال میں یہی اس کا نصب العین ہے ۔

مسلمانوں کو کس طرح جمع کیا جا سکتا ہے ؟

اب ایک دوسری نظر اسی کتاب ہدایت اور اسی سیرت پاک پر ڈالیے ۔

یہ جتھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم کیا تھا ، اس کی بنیاد کسی مادرِ وطن کی فرزندی ، کسی نسلِ انسانی کے انتساب ، کسی سیاسی و معاشی مفاد کے اشتراک پر نہ تھی بلکہ ایک مخصوص عقیدے اور ایک مخصوص طرزِ عمل پر تھی ۔ اس کو جوڑنے والی طاقت خدا کی محبت اور بندگی تھی نہ کہ اغراض کی محبت اور مادّی مقاصد کی بندگی ۔ اس کی طرف لوگوں کو بلانے والا نعرہ اذان کا نعرہ تھا ، نہ کہ وطنیّت کا نعرہ ۔ اس کے اجزاء کو سمیٹ کر ایک بنیانِ مرصوص بنانے والی چیز ایک اَن دیکھے خدا کی عبادت تھی ، نہ کہ کوئی محسوس مرئی علامت ۔ اس کو حرکت میں لانے والی چیز رضائے الٰہی کی طلب تھی نہ کہ منافع مادی کی طلب ۔ اس میں عمل کی گرمی پھونکنے والی قوت اعلائے کلمۃ اللہ کی خواہش تھی نہ کہ نسل و وطن کو سربلند کرنے کی تمنّا ۔

اس قوم کے نفسیات دنیا سے نرالے ہیں ۔ جو چیزیں دنیا کو جمع کرنے والی ہیں وہ اس قوم کو منتشر کر دینے والی ہیں ۔ جو صدائیں اپنے اندر دوسروں کے لیے غیر معمولی کشش رکھتی ہیں وہ اس قوم کے دل میں اُلٹی نفرت پیدا کر دیتی ہیں ——— جن مرئی علامتوں پر دوسرے گرویدہ ہوتے ہیں مسلمان ان کیلئے کوئی جذبہ عقیدت اپنے اندر نہیں پاتے ——— جن چیزوں میں دوسروں کو گرما دینے کی طاقت ہے وہ ان کے دلوں میں اُلٹی سردی پیدا کر دینے کا اثر رکھتی ہیں ——— جو چیزیں دوسروں کو عمل پر اُبھارنے والی ہیں وہی ان کو میدانِ عمل سے دُور بھگانے والی ہیں ۔

سارے قرآن کو اُٹھا کر دیکھ جاؤ ۔ پوری سیرت نبویؐ پر نظر ڈالو ۔ خلافتِ راشدہ کے

دَور سے اِس زمانہ تک کی اسلامی تاریخ پڑھ لو۔ تم کو معلوم ہو جائے گا کہ اسلام کی فطرت کیا ہے اور مسلمان قوم کا مزاج کس قسم کا ہے۔

جو قوم اس سوال پر صدیوں سے جھگڑ رہی ہے کہ نبیؐ پر سلام بھیجتے وقت بھی کھڑا ہونا چاہیئے یا نہیں، کیا تم توقع رکھتے ہو کہ وہ "بندے ماترم" کا گیت سُننے کے لیے تعظیماً کھڑی ہو گی؟ جس قوم کے دل میں مرئیات سے عقیدت کے بجائے سخت نفرت بٹھائی گئی ہے، کیا تمہیں اُمید ہے کہ وہ کسی جھنڈے کو سر جُھکا کر سلامی دے گی؟ جو قوم تیرہ سو برس تک خدا کے نام پر بُلائی جاتی رہی ہے، کیا تم سمجھتے ہو کہ اب وہ بھارت ماتا کے نام پر پروانہ وار دوڑی چلی آئے گی؟ جس قوم کے دل میں عمل کی گرمی پیدا کرنے والا داعیہ اب تک محض اعلائے کلمۃ اللہ کا داعیہ رہا ہے، کیا تمہارا گمان ہے کہ اب معدے اور بدن کے مطالبات اس میں حرارت پیدا کریں گے؟ یا کونسلوں کی نشستوں اور ملازمتوں کے تناسب کا سوال اس کے قلب و رُوح کو گرما دے گا؟ جس قوم کو عقیدے اور عمل کی وحدت پر جمع کیا گیا تھا، کیا تمہارا خیال ہے کہ وہ سیاسی اور معاشی پارٹیوں میں تقسیم ہو کر کوئی طاقت ور عملی قوم بن جائے گی؟ تخیل کی بنیادوں پر نظریات کی عمارتیں اُٹھانے والے جو چاہیں کہیں، مگر جس کسی نے قرآن اور سُنّت سے اسلام کے مزاج کو سمجھا ہے، وہ بادنیٰ تامل یہ رائے قائم کر سکتا ہے کہ مسلمان قوم کی فطرت جب تک بالکل مسخ نہ ہو جائے، وہ نہ تو ان محرکات سے حرکت میں آ سکتی ہے اور نہ ان جامعات کے ذریعہ سے جمع ہو سکتی ہے۔ غیر مسلم بلاشبہ اِن ذرائع سے جمع ہو جائیں گے اور ان میں حرکت بھی ان محرکات سے پیدا ہو جائے گی کیونکہ ان کو جمع کرنے اور حرکت میں لانے والی کوئی اور چیز نہیں ہے۔ ان کا مذہب ان کو منتشر کرتا ہے اور صرف وطن کی خاک ہی ان کو جمع کرتی ہے۔ ان کے معتقدات ان کے دلوں کو سرد کرنے والے ہیں؛ ان میں حرارت صرف معدے ہی کی گرمی سے پیدا ہو سکتی ہے۔ مگر مسلمان جس کو خدا کے نام پر جمع کیا گیا تھا اور جس میں ایمان کی گرمی پھونکی گئی تھی، آج تم اس کو ذلیل

مادّی چیزوں کے نام پر جمع نہیں کر سکتے، اور نہ ادنیٰ درجہ کی خواہشات سے اس میں حرارت پیدا کر سکتے ہو۔ اس طریقہ میں اگر تم کو کامیابی نصیب ہو سکتی ہے تو صرف اس وقت جب کہ تم مسلمان کو فطرتِ اسلام سے ہٹا دو اور اسے بلندیوں سے گرا کر پستیوں میں لے آؤ۔

اس کے معنی یہ نہ سمجھو کہ مسلمان وطن کا دشمن ہے۔ ہرگز نہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے وطن کی اصلاح و ترقی کے لیے کیا کچھ نہیں کیا؟ خلفائے راشدین نے وطن اور ابنائے وطن کی کیا کچھ خدمت نہ کی؟ بعد کے مسلمان جس جس ملک میں گئے، انہوں نے اس کو جنت بنا کر نہیں چھوڑا؟ غیر مسلم قوموں کے ساتھ فیاضانہ معاملہ کرنے میں کیا کبھی کوئی کوتاہی کی گئی؟ پس اُوپر ہم نے جو کچھ کہا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مسلمان اپنے ملک یا اپنی قوم کے معاشی اور تمدّنی مسائل سے بالکل بے پروا ہے بلکہ ہم یہ بات ذہن نشین کرنا چاہتے ہیں کہ مسلمان کی اصلی قوتِ محرکہ یہ چیزیں نہیں ہیں، اس کی جمعیت ان بنیادوں پر قائم نہیں ہوتی ہے، اس میں زندگی کی حرارت پیدا کرنے والی آگ یہ نہیں ہے۔ وہ طاقتور اور منظم ہونے کے بعد ان سب مسائل کو حل کرنے میں حصّہ لے سکتا ہے اور دوسروں سے بڑھ کر حصّہ لے سکتا ہے، مگر اس کو طاقتور اور منظم بنانے کے ذرائع یہ نہیں ہیں بلکہ کچھ اور ہیں۔

مسلم قوم کس طرح بنائی گئی تھی

اب ایک قدم اور آگے بڑھیے۔ یہ دیکھیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نئی قوم کن طریقوں سے بنائی تھی اور اس میں کن ذرائع سے وحدت اور قوتِ عمل پیدا کی تھی۔

جس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعوت لے کر اُٹھے تھے تو ساری دنیا میں تنہا آپ ہی ایک مسلم تھے۔ کوئی آپ کا ساتھی اور ہم خیال نہ تھا۔ دنیوی طاقتوں میں سے کوئی طاقت آپ کو حاصل نہ تھی۔ گرد و پیش جو لوگ آباد تھے

ان میں خودسری اور انفرادیت انتہا درجہ کو پہنچی ہوئی تھی۔ ان میں سے کوئی کسی کی بات سُننے اور اطاعت کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ وہ نسل اور قبیلہ کی عصبیت کے سوا کسی اور عصبیت کا تصور ہی نہ کر سکتے تھے۔ ان کے ذہن ان خیالات اور مقاصد سے دُور کا لگاؤ بھی نہ رکھتے تھے جن کی تبلیغ کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُٹھے تھے۔ اس ماحول اور ان حالات میں کون سی طاقت تھی جس سے ایک تنہا انسان، بے یار و مددگار اور بے وسیلہ انسان نے ان لوگوں کو اپنی طرف کھینچا؟ کیا آنحضرتؐ نے عربوں کو یہ لالچ دیا تھا کہ میں تم کو زمین کی حکومت دلواؤں گا؟ رزق کے خزانے دلواؤں گا؟ دشمنوں پر فتح اور غلبہ بخشوں گا؟ بیرونی غاصبوں کو نکال باہر کروں گا۔ اور عرب کو ایک طاقت ور سلطنت بنا دوں گا؟ تمہاری تجارت اور صنعت و حرفت کو ترقی دوں گا؟ تمہارے وسائلِ معیشت بڑھاؤں گا اور تمہیں ایک ترقی یافتہ اور غالب قوم بنا کر چھوڑوں گا؟ ظاہر ہے کہ ایسا کوئی لالچ آپؐ نے نہیں دلایا تھا۔ پھر کیا آپؐ نے امیروں کے مقابلہ میں غریبوں کی، اور سرمایہ داروں اور زمین داروں کے مقابلہ میں مزدوروں اور کاشت کاروں کی حمایت کا بیڑا اٹھایا تھا؟ سیرتِ نبوی گواہ ہے کہ یہ چیز بھی نہ تھی۔ پھر کیا آپؐ نے کوئی سیاسی یا تعلیمی یا تمدنی یا معاشی یا فوجی تحریک اُٹھائی تھی اور اس کی طرف لوگوں کو کھینچنے کے لیے نفسیاتی حربوں سے کام لیا تھا؟ واقعات شاہد ہیں کہ ان میں سے بھی کوئی چیز نہ تھی۔ پھر غور کیجیے کہ آخر وہ کس چیز کی کشش تھی جس نے عربی اور عجمی، امیر اور غریب، آقا اور غلام سب کو آپؐ کی طرف کھینچا؟ دنیا جانتی ہے کہ وہ صرف دو چیزیں تھیں۔ ایک قرآن کی تعلیم۔ دوسرے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت۔ لوگوں کے سامنے یہ پیغام پیش کیا گیا تھا اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ[1]

---

[1] یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں۔ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنالے۔ (آلِ عمران - ۶۴)

ان کو اس بات پر جمع کیا گیا تھا کہ اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ [1]

ان کو یہ تعلیم دی گئی تھی کہ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ [2]

ان کے سامنے یہ نصب العین رکھا گیا تھا کہ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ [3]

پھر جس شخص نے ان کو یہ دعوت دی تھی اس کا حال یہ تھا کہ کَانَ خُلُقُهُ الْقُرْاٰنَ۔ وہ جو کچھ کہتا تھا سب سے پہلے اور سب سے بڑھ کر خود اس پر عمل کر کے دکھاتا تھا۔ وہ فضیلتِ اخلاق اور عملِ صالح کا مجسمہ تھا اور اس کی زندگی میں راست بازی اور راست روی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

یہی دو چیزیں تھیں جنہوں نے ہر طرف سے لوگوں کو کھینچا اور وہ قوم بنا دی جس کا نام مسلمان ہے۔ نوعِ انسانی کے مختلف طبقوں اور گروہوں میں سے جن جن لوگوں کے لیے ان دو چیزوں میں کشش تھی، وہ اس مرکز کی طرف کھنچتے چلے گئے اور انہی سے مسلمان قوم وجود میں آئی۔ دوسرے الفاظ میں اس حقیقت کو یوں سمجھیے کہ اسلامی جمعیت نام ہی اس جمعیت کا ہے جو قرآن اور سیرتِ نبوی ؐ کی کشش سے وجود میں آئی ہے۔

---

[1] لوگو! جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے اس کی پیروی کرو اور اپنے رب کو چھوڑ کر دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرو۔ (اعراف - ۳)

[2] بے شک میری نماز، میرے تمام مراسمِ عبودیت، میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔ (انعام - ۱۶۳)

[3] یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو ملک میں دسترس دیں تو نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں اور نیک کام کرنے کا حکم دیں اور بُرے کاموں سے منع کریں۔ (الحج - ۴۱)

جہاں زندگی کے وہ اصول اور مقاصد ہوں گے جو قرآن نے پیش کیے ہیں اور جہاں طرزِ عمل وہ ہو گا جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا وہاں "مسلمان" جمع ہو جائیں گے، اور جہاں یہ دونوں چیزیں نہ ہوں گی وہاں اُن لوگوں کے لیے قطعاً کوئی کشش نہ ہو گی جو "مسلمان" ہیں۔

مسلمانوں کی قومی تحریکات کے ناکام ہونے کی وجہ

اب ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ہماری قومی تحریکات میں بنیادی نقص کون سا ہے جس کی وجہ سے مسلمان کسی تحریک کی طرف بھی فوج در فوج نہیں کھنچتے اور داعی کی آواز بہرے کانوں سے سُنتے ہیں؟ ان کی فطرت وہ آواز سُننا چاہتی ہے اور وہ طرزِ عمل دیکھنا چاہتی ہے جس کی کشش نے ان کو ساری دنیا سے الگ ایک قوم بنایا تھا۔ مگر افسوس کہ نہ وہ آواز کسی طرف سے آتی ہے اور نہ وہ طرزِ عمل کہیں نظر آتا ہے۔ بُلانے والے ان کو ایسے مقاصد کی طرف بُلاتے ہیں جو ان کی زندگی کے اصلی مقاصد نہیں ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ علوّ اور تمکّن فی الارض کی طرف آؤ۔ حالانکہ یہ مسلمان کا نصب العین نہیں ہے بلکہ اپنے نصب العین (اعلائے کلمۃ اللہ) کے لیے اس کی بے غرضانہ جدوجہد کا طبعی نتیجہ ہے۔ کوئی اُن کو وطن پرستی کی طرف بُلاتا ہے، حالانکہ اسی چیز کو چھوڑ کر تو وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد جمع ہوئے تھے۔ کوئی ان کو نہایت ادنیٰ درجہ کے مادی فوائد کی طرف بُلاتا ہے، حالانکہ مسلمان کی نگاہ میں ان کی حیثیت متاعِ غرور سے زیادہ نہیں۔ پھر جو لوگ مسلمانوں کی رہنمائی کے لیے اُٹھتے ہیں ان کی زندگی میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی ادنےٰ جھلک تک نظر نہیں آتی۔ کہیں مکمل فرنگیت ہے۔ کہیں نہرو اور گاندھی کا اتباع ہے۔ کہیں جُبّوں اور عماموں میں سیاہ دل اور گندے اخلاق لپٹے ہوتے ہیں۔ زبان سے وعظ، اور عمل میں بدکاریاں۔ ظاہر میں خدمتِ دین اور باطن میں خیانتیں، غداریاں اور نفسانی اغراض کی بندگیاں۔ جمہورِ مسلمین بڑی بڑی اُمیدیں لے کر ہر نئی تحریک کی طرف دوڑتے ہیں۔ مگر مقاصد کی پستیاں اور عمل کی خرابیاں دیکھ کر ان کے دل ٹوٹ جاتے ہیں۔

خیر یہ ایک دوسری داستان ہے۔ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

طریقِ تنظیم پر غور کیجیے کہ مسلمان قوم کی تنظیم اگر ہو سکتی ہے تو اسی طریق پر ہو سکتی ہے۔

اسلامی تنظیم کے اصول

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی جمعیت اس ڈھنگ پر بنائی تھی کہ پہلے تو آپؐ نے انسانی گروہ میں سے صرف ان لوگوں کو چھانٹ لیا جن کی فطرت میں ایک خالص صداقت اور ایک پاک زندگی کی طرف کھنچنے کی صلاحیت تھی۔ پھر تعلیم و تربیت کے بہترین ذرائع سے کام لے کر ان میں سے ایک ایک فرد کی اصلاح فرمائی، اس کے دل میں زندگی کا ایک بلند مقصد بٹھا دیا، اور اس کے کیریکٹر میں اتنی مضبوطی پیدا کی کہ وہ اس مقصد کے لیے جم کر جدّ و جہد کرے اور کسی فائدہ کا لالچ یا کسی نقصان کا خوف اسے اس مقصد کی راہ سے نہ ہٹا سکے۔ اس کے بعد ان افراد کو ملا کر ایک جماعت بنا دیا تاکہ افراد میں جو کچھ کمزوریاں باقی رہ جائیں، جماعت کی طاقت ان کو دُور کر دے۔ اجتماعی ماحول ایسا بن جائے جس میں نیکیاں پرورش پائیں اور بُرائیاں اُبھر نہ سکیں۔ افراد اپنے مقصدِ حیات کی تکمیل میں ایک دوسرے کے مددگار رہیں، اور اجتماعی طاقت سے اس کو حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

اس تعمیر کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کوئی ماہرِ فن انجینئر اینٹوں کے ڈھیر میں سے چھانٹ کر بہترین اینٹیں لے۔ پھر ان کو اس طرح پکائے کہ ایک ایک اینٹ بجائے خود پختہ ہو جائے۔ پھر ان سب کو نہایت عمدہ سیمنٹ سے جوڑ کر ایک مستحکم عمارت بنا دے۔

اس تنظیم کے بڑے بڑے اصول یہ تھے:۔

۱۔ جماعت کے تمام افراد کم از کم دین کے جوہر سے واقف ہوں تاکہ وہ کفر و اسلام میں تمیز کر کے اسلام کے طریقہ پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہ سکیں۔

۲۔ اجتماعی عبادات کے ذریعہ سے افراد میں اخوت، مساوات اور تعاون کی اسپرٹ پیدا کی جائے۔

۳۔ جماعت کے تمدن و معاشرت میں ایسے امتیازی خصائص اور حدود مقرر کیے جائیں جن سے وہ دوسری اقوام میں خلط ملط نہ ہو سکیں اور باطنی و ظاہری دونوں حیثیتوں سے ایک الگ قوم بنے رہیں۔ اسی لیے تشبہ بالاجانب کی سختی کے ساتھ ممانعت کی گئی۔

۴۔ تمام اجتماعی ماحول پر امر بالمعروف و نہی عن المنکر چھایا رہے تاکہ جماعت کے دائرہ میں کوئی انحراف اور کوئی بغاوت راہ نہ پا سکے۔ سرکشی کا پہلا اثر ظاہر ہوتے ہی اس کا استیصال کر دیا جائے اور منافقین کے ساتھ غلظت اور شدت کا ایسا برتاؤ ہو کہ یا تو وہ جماعت سے نکل جائیں یا اگر رہیں تو کوئی فتنہ نہ اُٹھا سکیں۔

۵۔ پوری مسلمان قوم ایک انجمن ہو، اور ہر مسلمان مرد اور عورت کو جز و اسلامی حق کی بنا پر اس کی رکنیت کا مساویانہ مرتبہ حاصل ہو ———— ایسے تمام انتسابات اور امتیازات کو مٹا دیا جائے جو مسلم اور مسلم میں تفریق کرتے ہوں۔ ہر فرد مسلم کو قومی معاملات میں حصہ لینے اور رائے دینے کا پورا حق حاصل ہو، حتیٰ کہ ایک غلام بھی کسی کو امان دیدے تو وہ پوری قوم کی طرف سے امان ہو۔

۶۔ جماعت کے تمام افراد ایک نصب العین پر متحد ہوں اور اس کے لیے جدوجہد اور قربانی کرنے کا جذبہ ان میں موجود ہو ———— ایک گروہ صرف اسی نصب العین کی خدمت کے لیے وقف رہے۔ اور بقیہ افراد جماعت اپنی معاش کے لیے جدوجہد کرنے کے ساتھ ساتھ پہلے گروہ کی ہر ممکن طریقہ سے مدد کرتے رہیں اور مجموعی طور سے پوری جماعت اور اس کے ہر ہر فرد کے دل میں یہ خیال بیٹھا ہوا ہو کہ اس کی زندگی کا اصل مقصود روزی کمانا نہیں بلکہ اسی ایک نصب العین کی خدمت کرنا ہے۔

تنظیم کے یہی اصول تھے جن سے وہ زبردست جماعت پیدا ہوئی جو دیکھتے دیکھتے آدھی دُنیا پر چھا گئی ——— اِس طریق تنظیم کی رفتار ابتدا میں بہت سست

تھی، حتیٰ کہ پندرہ برس تک وہ چند سو سے زیادہ افراد کو اپنے دائرے میں نہ لا سکی۔ مگر اس میں یہ قاعدہ مدِّ نظر رکھا گیا تھا کہ توسیع (Expansion) کے ساتھ استحکام (Consolidation) بھی ہوتا رہے۔ اس لیے یہ نظامِ جماعت جتنا پھیلتا گیا اتنا ہی مضبوط ہوتا چلا گیا، یہاں تک کہ جب ایک معتد بہ جماعت اِس طریق پر منظم ہو گئی تو وہ اتنی طاقت کے ساتھ اُٹھی کہ دنیا کی کوئی چیز اس کے سیلِ رواں کو نہ روک سکی۔ قرآن مجید میں اس کی چھوٹی سی ابتداء، پھر تدریجی ترقی، پھر غیر معمولی شان و شوکت کے ساتھ اس کے ظہور کو کیسے بلیغ انداز میں بیان کیا گیا ہے:۔ كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْأَهُ فَآزَرَهُ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوَىٰ عَلَىٰ سُوقِهِ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ[1]

مسلمان قوم کے مزاج کے ساتھ یہی طریق تنظیم مناسبت رکھتا ہے۔ یہ قوم تو پہلے ہی سے ایک جمعیت ہے ——— اس جمعیت کے اندر کوئی الگ جمعیت الگ نام سے بنانا، اور مسلمان اور مسلمان کے درمیان کسی دُوری یا کسی ظاہری علامت یا کسی خاص نام یا کسی خاص مسلک سے فرق و امتیاز پیدا کرنا، اور مسلمانوں کو مختلف پارٹیوں میں تقسیم کر کے ان کے اندر گروہ بندیوں اور فرقوں کی مصیبتیں پیدا کرنا یہ دراصل مسلمانوں کو مضبوط کرنا نہیں ہے، بلکہ ان کو اور کمزور کرنا ہے۔ یہ تنظیم نہیں تفرقہ پردازی اور گروہ بندی ہے۔ لوگوں نے آنکھیں بند کر کے جمعیت سازی کے یہ طریقے اہلِ مغرب سے لے لیے ہیں۔ مگر ان کو معلوم نہیں ہے کہ جو چیزیں دوسری قوموں کے مزاج کو موافق آتی ہیں وہ مسلمان قوم کے مزاج کو موافق نہیں آتیں۔ اس قوم کو اگر کوئی چیز راس آسکتی ہے تو ایک ایسی جمہوری تحریک ہے

---

[1] (وہ) گویا ایک کھیتی ہے جس نے (پہلے زمین سے) اپنی سوئی نکالی۔ پھر اس کو مضبوط کیا۔ پھر موٹی ہوئی اور پھر اپنی نال پر سیدھی کھڑی ہو گئی اور لگی کھیتی والوں کو خوش کرنے تاکہ کافروں کا جی جلائے۔ (الفتح - ۲۹)

جو پوری قوم کو ایک انجمن سمجھ کر شروع کی جائے اور جس میں توسیع و استحکام کے اس
تناسب کو ملحوظ رکھا جاتے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ملحوظ رکھا تھا۔ آپ
اگر کچے اور کمزور مسالے سے ریت کی سطح پر ایک عمارت کھڑی کردیں گے اور اس
سے قلعے کا کام لینا چاہیں گے تو لامحالہ وہ سیلِ حوادث کی ایک ٹکر بھی نہ جھیل سکے
گی۔

اسلام ـــــ ایک جامع تہذیب

دین و دنیا کی علیحدگی کا جاہلی تصور

اور

ہماری قومی سیاست میں اسکے اثرات

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے دنیا میں مذہب کا عام تصور یہ تھا کہ زندگی کے بہت سے شعبوں میں سے یہ بھی ایک شعبہ ہے، یا دوسرے الفاظ میں یہ انسان کی دنیوی زندگی کے ساتھ ایک ضمیمہ کی حیثیت رکھتا ہے تاکہ بعد کی زندگی میں نجات کے لیے ایک سرٹیفکیٹ کے طور پر کام آئے۔ اس کا تعلق کلیتہً صرف اس رشتہ سے ہے جو انسان اور اس کے معبود کے درمیان ہے۔ جس شخص کو نجات کے بلند مرتبے حاصل کرنے ہوں اس کے لیے تو ضروری ہے کہ دنیوی زندگی کے تمام دوسرے شعبوں سے بے تعلق ہو کر صرف اسی ایک شعبہ کا ہو جائے مگر جس کو اتنے بڑے مراتب مطلوب نہ ہوں، بلکہ نجات مطلوب ہو، اور اس کے ساتھ یہ خواہش بھی ہو کہ معبود اُن پر نظرِ عنایت رکھے اور ان کو دنیوی معاملات میں برکت عطا کرتا رہے اس کے

لیے بس اتنا کافی ہے کہ اپنی دُنیوی زندگی کے ساتھ اس ضمیمہ کو بھی لگائے رکھے۔ دُنیا کے سارے کام اپنے ڈھنگ پر چلتے رہیں اور ان کے ساتھ چند مذہبی رسموں کو ادا کر کے معبود کو بھی خوش کیا جاتا رہے۔ انسان کا تعلق خود اپنے نفس سے، اپنے ابنائے نوع سے، اپنے گردو پیش کی ساری دنیا سے ایک الگ چیز ہے، اور اس کا تعلق اپنے معبود سے ایک دوسری چیز، ان دونوں کے درمیان کوئی ربط نہیں۔

یہ جاہلیت کا تصور تھا اور اس کی بنیاد پر کسی انسانی تہذیب و تمدّن کی عمارت قائم نہ ہو سکتی تھی۔ تہذیب و تمدّن کے معنی انسان کی پوری زندگی کے ہیں، اور جو چیز انسان کی زندگی کا محض ایک ضمیمہ ہو، اس پر پوری زندگی کی عمارت ظاہر ہے کہ کسی طرح قائم نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں ہر جگہ مذہب اور تہذیب و تمدّن ہمیشہ ایک دوسرے سے الگ رہے۔ ان دونوں نے ایک دوسرے پر تھوڑا یا بہت اثر ضرور ڈالا، مگر یہ اثر اس قسم کا تھا جو مختلف اور متضاد چیزوں کے یکجا ہونے سے مترتب ہوتا ہے۔ اِس لیے یہ اثر کہیں بھی مفید نظر نہیں آتا۔ مذہب نے تہذیب و تمدّن پر جب اثر ڈالا تو اس میں رہبانیت، مادّی علائق سے نفرت، لذاتِ دنیوی سے کراہت، عالمِ اسباب سے بے تعلقی، انسانی تعلّقات میں انفرادیت، تنافر اور تعصب کے عناصر داخل کر دیے۔ یہ اثر کسی معنی میں بھی ترقی پرور نہ تھا۔ بلکہ دُنیوی ترقی کی راہ میں انسان کے لیے ایک سنگِ گراں تھا۔ دوسری طرف تہذیب و تمدّن نے جس کی بنیاد سراسر مادیّت اور خواہشاتِ نفس کے اتباع پر قائم تھی، مذہب پر جب کبھی اثر ڈالا اس کو گندا کر دیا۔ اس نے مذہب میں نفس پرستی کی ساری نجاستیں داخل کر دیں، اور اس سے ہمیشہ یہ فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی کہ ہر اس گندی اور بد سے بدتر چیز کو جسے نفس حاصل کرنا چاہے، مذہبی تقدّس کا جامہ پہنا دیا جائے، تاکہ نہ خود اپنا ضمیر ملامت کرے نہ کوئی دوسرا اس کے خلاف کچھ کہہ سکے۔ اسی چیز کا اثر ہے کہ بعض مذاہب کی عبادتوں تک میں ہم کو لذت پرستی اور بے حیائی کے ایسے طریقے ملتے ہیں جن کو مذہبی دائرے کے باہر خود ان مذاہب کے پیرو بھی بداخلاقی سے

تعبیر کرنے پر مجبور ہیں۔

مذہب اور تہذیب کے اس تعامل سے قطع نظر کرکے دیکھا جائے تو یہ حقیقت بالکل نمایاں نظر آتی ہے کہ دنیا میں ہر جگہ تہذیب و تمدّن کی عمارت غیر مذہبی اور غیر اخلاقی دیواروں پر قائم ہوتی ہے۔

سچے مذہبی لوگ اپنی نجات کی فکر میں دنیا سے الگ رہے اور دنیا کے معاملات کو دنیا والوں نے اپنی خواہشاتِ نفس اور اپنے ناقص تجربات کی بنا پر ——— جن کو ہر زمانہ میں کامل سمجھا گیا اور ہر زمانۂ مابعد میں ناقص ہی ثابت ہوتے ——— جس طرح چاہا چلایا اور اس کے ساتھ اگر ضرورت سمجھی تو اپنے معبود کو خوش کرنے کے لیے کچھ مذہبی رسمیں بھی ادا کرلیں۔ مذہب چونکہ ان کے لیے محض زندگی کا ایک ضمیمہ تھا اس لیے اگر وہ ساتھ رہا بھی تو محض ایک ضمیمہ ہی کی حیثیت سے رہا۔ ہر قسم کے سیاسی ظلم و ستم، ہر قسم کی معاشی بے انصافیوں، ہر قسم کی معاشرتی بے اعتدالیوں اور ہر قسم کی تمدّنی کج راہیوں کے ساتھ یہ ضمیمہ منسلک ہو سکتا تھا۔ اس نے ٹھگی اور قزاقی کا بھی ساتھ دیا، جہاں سوزی اور غارتگری کا بھی، سُود خواری اور قارونیت کا بھی، فحش کاری اور قحبہ گری کا بھی۔

مذہب کا اسلامی تصوّر

محمد صلی اللہ علیہ وسلّم جس غرض کے لیے بھیجے گئے وہ اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ مذہب کے اس جاہلی تصوّر کو مٹا کر ایک عقلی و فکری تصوّر پیش کریں اور صرف پیش ہی نہ کریں بلکہ اسی کی اساس پر تہذیب و تمدّن کا ایک مکمّل نظام قائم کرکے اور کامیابی کے ساتھ چلا کر دکھا دیں۔ آپؐ نے بتایا کہ مذہب قطعاً بے معنی ہے اگر وہ انسان کی زندگی کا محض ایک شعبہ یا ضمیمہ ہے۔ ایسی چیز کو دین و مذہب کے نام سے موسوم کرنا ہی غلط ہے۔ حقیقت میں دین وہ ہے جو زندگی کا ایک جز نہیں بلکہ تمام زندگی ہو۔ زندگی کی رُوح اور اس کی قوّتِ محرکہ ہو، فہم و شعور اور فکر و نظر ہو، صحیح و غلط میں امتیاز کرنے والی کسوٹی ہو، زندگی کے ہر میدان میں ہر ہر قدم پر

راہِ راست اور راہِ کج کے درمیان فرق کرکے دکھائے، راہِ کج سے بچائے، راہِ راست پر استقامت اور پیش قدمی کی طاقت بخشے، اور زندگی کے اس لاانتہا سفر میں، جو دنیا سے لے کر آخرت تک مسلسل چلا جا رہا ہے، انسان کو ہر مرحلے سے کامیابی و سعادت کے ساتھ گزار دے۔

اسی مذہب کا نام اسلام ہے۔ یہ زندگی کا ضمیمہ بننے کے لیے نہیں آیا ہے، بلکہ اس کے آنے کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے اگر اس کو بھی پرانے جاہلی تصور کے ماتحت ایک ضمیمۂ زندگی قرار دیا جائے۔ یہ جس قدر خدا اور انسان کے تعلق سے بحث کرتا ہے اسی قدر انسان اور انسان کے تعلق سے بھی کرتا ہے، اور اسی قدر انسان اور ساری کائنات کے تعلق سے بھی۔ اس کے آنے کا اصل مقصد انسان کو اسی حقیقت سے آگاہ کرنا ہے کہ تعلقات کے یہ شعبے الگ الگ اور ایک دوسرے سے مختلف و بیگانہ نہیں ہیں، بلکہ ایک مجموعے کے مربوط اور مرتب اجزاء ہیں اور ان کی صحیح ترکیب ہی پر انسان کی فلاح کا مدار ہے۔ انسان اور کائنات کا تعلق درست نہیں ہو سکتا جب تک کہ انسان اور کائنات کا تعلق درست نہ ہو۔ پس یہ دونوں تعلق ایک دوسرے کی تکمیل و تصحیح کرتے ہیں، دونوں مل کر ایک کامیاب زندگی بناتے ہیں، اور مذہب کا اصل کام اسی کامیاب زندگی کے لیے انسان کو ذہنی و عملی حیثیت سے تیار کرنا ہے۔ جو مذہب یہ کام نہیں کرتا وہ مذہب ہی نہیں ہے اور جو اس کام کو انجام دیتا ہے وہی اسلام ہے۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے کہ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ۔ "اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے"

اسلام ایک خاص طریقِ فکر (Attitude of Mind) اور پوری زندگی کے متعلق ایک خاص نقطۂ نظر (Outlook on Life) ہے۔ اور پھر وہ ایک خاص طرزِ عمل ہے جس کا راستہ اسی طریقِ فکر اور اسی نظریۂ زندگی سے متعین ہوتا ہے۔ اس طریقِ فکر اور طرزِ عمل سے جو ہیئت حاصل ہوتی ہے وہی مذہب اسلام ہے، وہی تہذیبِ اسلامی ہے، اور وہی تمدنِ اسلامی ہے۔ یہاں مذہب اور تہذیب

تمدن الگ الگ چیزیں نہیں ہیں بلکہ سب مل کر ایک مجموعہ بناتے ہیں۔ وہی ایک طریقِ فکر اور نظریۂ حیات ہے جو زندگی کے ہر مسئلہ کا تصفیہ کرتا ہے۔ انسان پر خدا کے کیا حقوق ہیں۔ خود اس کے اپنے نفس کے کیا حقوق ہیں۔ ماں باپ کے، بیوی بچوں کے، عزیزوں اور قرابت داروں کے، پڑوسیوں اور معاملہ داروں کے، ہم مذہبوں اور غیر مذہب والوں کے، دشمنوں اور دوستوں کے، ساری نوعِ انسانی کے، حتیٰ کہ کائنات کی ہر چیز اور قوت کے کیا حقوق ہیں؟ وہ ان تمام حقوق کے درمیان کامل توازن اور عدل قائم کرتا ہے اور ایک شخص کا مسلمان ہونا ہی اس امر کی کافی ضمانت ہے کہ وہ ان تمام حقوق کو پورے انصاف کے ساتھ ادا کرے گا، بغیر اس کے کہ ظلم کی راہ سے ایک حق کو دوسرے حق پر قربان کرے۔

پھر یہی طریقِ فکر اور نظریۂ حیات انسان کی زندگی کا ایک بلند اخلاقی نصب العین اور ایک پاکیزہ روحانی منتہائے نظر معین کرتا ہے، اور زندگی کی تمام سعی و جہد کو، خواہ وہ کسی میدان میں ہو، ایسے راستوں پر ڈالنا چاہتا ہے جو ہر طرف سے اسی ایک مرکز کی طرف راجع ہوں۔

یہ مرکز ایک فیصلہ کن چیز ہے۔ اسی کے لحاظ سے ہر شے کی قدر (Value) متعین کی جاتی ہے۔ اسی معیار پر ہر شے کو پرکھا جاتا ہے جو شے اس مرکزی مقصد تک پہنچنے میں مددگار ہوتی ہے اسے اختیار کر لیا جاتا ہے، اور جو شے سدِّ راہ ہوتی ہے اسے ردّ کر دیا جاتا ہے۔ فرد کی زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے معاملات سے لے کر جماعت کی زندگی کے بڑے بڑے معاملات تک یہ معیار یکساں کارفرما ہے۔ وہ اس کا بھی فیصلہ کرتا ہے کہ ایک شخص کو اکل و شرب میں، لباس میں، صنفی تعلقات میں، لین دین میں، بات چیت میں، غرض زندگی کے ہر معاملہ میں کن حدود کو ملحوظ رکھنا چاہیئے، تاکہ وہ مرکزِ مقصود کی طرف جانے والی سیدھی راہ پر قائم رہے، اور ٹیڑھے راستوں پر نہ پڑ جائے۔ اس کا بھی فیصلہ کرتا ہے کہ اجتماعی زندگی میں افراد کے باہمی روابط کن اصولوں پر مرتب کیے جائیں جن سے معاشرت، معیشت،

سیاست، غرض ہر شعبۂ زندگی کا ارتقاء ایسے راستوں پر ہو جو اصل منزلِ مقصود کی طرف جانے والے ہوں، اور وہ راہیں نہ اختیار کرے جو اس سے دُور ہٹانے والی ہوں۔ اس کا بھی فیصلہ کرتا ہے کہ زمین و آسمان کی جن قوتوں پر انسان کو دسترس حاصل ہو اور جو چیزیں اس کے لیے مسخر کی جائیں ان کو وہ کن طریقوں سے استعمال کرے، تاکہ وہ اس کے مقصد کی خادم بن جائیں، اور کن طریقوں سے اجتناب کرے تاکہ وہ اس کی کامیابی میں مانع نہ ہوں۔ اس کا بھی فیصلہ کرتا ہے کہ اسلامی جماعت کے لوگوں کو غیر اسلامی جماعتوں کے ساتھ دوستی میں اور دشمنی میں، جنگ میں اور صلح میں، اشتراکِ اغراض میں اور اختلافِ مقاصد میں، غلبہ کی حالت میں اور مغلوبی کے دَور میں، علوم و فنون کے اکتساب میں، اور تہذیب و تمدّن کے لین دین میں کن اصولوں کو ملحوظ رکھنا چاہیئے، تاکہ خارجی تعلقات کے ان مختلف پہلوؤں میں وہ اپنے مقصد کی راہ سے ہٹنے نہ پائیں بلکہ جہاں تک ممکن ہو بنی نوعِ انسان کے ان نادان اور گمراہ افراد سے بھی طوعاً یا کرہاً، شعوری طور پر یا غیر شعوری طور پر اس مقصد کی خدمت لے لیں جو اصل فطرت کے اعتبار سے ان کا بھی ویسا ہی مقصد ہے جیسا کہ پیروانِ اسلام کا ہے۔

غرض وہ ایک ہی نقطۂ نظر ہے جو مسجد سے لے کر بازار اور میدانِ کارزار تک، طریقِ عبادت سے لے کر ریڈیو اور ہوائی جہاز کے طریقِ استعمال تک، غسل و وضو اور طہارت و استنجاء کے جزوی مسائل سے لے کر اجتماعیات، معاشیات، سیاسیات اور بین الاقوامی تعلقات کے بڑے سے بڑے مسائل تک، مکتب کی ابتدائی تعلیم سے لے کر آثارِ فطرت کے انتہائی مشاہدات اور قوانینِ طبعی کی بلند ترین تحقیقات تک، زندگی کی تمام مساعی اور فکر و عمل کے تمام شعبوں کو ایک ایسی وحدت بناتا ہے جس کے اجزاء میں ایک مقصدی ترتیب اور ایک ارادی ربط پایا جاتا ہے، اور ان سب کو ایک مشین کے پرزوں کی طرح اس طرح جوڑتا ہے کہ ان کی حرکت اور تفاعل سے ایک ہی نتیجہ برآمد ہو۔

مذہب کی دنیا میں یہ ایک انقلابی تصوّر تھا، اور جاہلیت کے خیر سے بنے ہوئے دماغوں کی گرفت میں یہ تصوّر کبھی پُوری طرح نہ آسکا۔ آج دنیا علم و عقل کے اعتبار سے چھٹی صدی عیسوی کے مقابلہ میں کس قدر آگے بڑھ چکی ہے مگر آج بھی اپنی قدامت پرستی اور تاریک خیالی موجود ہے کہ یورپ کی شہرہ آفاق یونیورسٹیوں میں اعلیٰ درجہ کی تعلیم پائے ہوئے لوگ بھی اس انقلاب انگیز تصوّر کے ادراک سے اسی طرح عاجز ہیں جس طرح قدیم جاہلیت کے اَن پڑھ اور کودن لوگ تھے۔ ہزاروں برس سے مذہب کا جو غلط تصوّر وراثت میں منتقل ہوتا چلا آرہا ہے اس کی گرفت دماغوں پر ابھی تک مضبوط جمی ہوئی ہے۔ عقلی تنقید اور علمی تحقیق کی بہترین تربیت سے بھی اس کے بند نہیں کھلتے۔ خانقاہوں اور مسجدوں کے تاریک حجروں میں رہنے والے اگر مذہبیت کے معنی گوشۂ عزلت میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرنے کے سمجھیں اور دین داری کو عبادات کے دائرے میں محدود خیال کریں تو جائے تعجب نہیں، کہ وہ تو ہیں ہی تاریک خیال۔ جاہل عوام اگر مذہب کو باجے، تعزیے اور گائے کے سوالات میں محدود سمجھیں تو یہ بھی مقامِ حیرت نہیں کہ وہ تو ہیں ہی جاہل۔ مگر یہ ہمارے پروردگانِ نورِ علم کو کیا ہوا کہ ان کے دماغوں سے بھی قدامت پرستی کی ظلمت دُور نہیں ہوئی؟ وہ بھی مذہبِ اسلام کو انہی معنوں میں ایک مذہب سمجھتے ہیں جن میں ایک غیر مسلم قدیم جاہلی تصوّر کے تحت سمجھتا ہے۔

ہماری سیاست میں جاہلی تصوّر کے اثرات

فہم و ادراک کے اس تصوّر کی وجہ سے مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ کا ایک بڑا حصّہ نہ صرف خود غلط روش پر چل رہا ہے، بلکہ دنیا کے سامنے اسلام اور اس کی تہذیب و تمدن کی نہایت غلط نمائندگی کر رہا ہے۔ مسلم جماعت کے اصلی مسائل جن کے حل پر اس کی حیات و ممات کا مدار ہے، سرے سے ان لوگوں کی سمجھ ہی میں نہیں آتے، اور یہ ضمنی غیر متعلق مسائل کو اصل مسائل سمجھ کر عجیب عجیب طریقوں سے ان کو حل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

یہ مذہب کا پرانا محدود تصور ہی ہے جو مختلف شکلوں میں ظہور کر رہا ہے۔

کوئی صاحب فرماتے ہیں کہ میں پہلے ہندوستانی ہوں، پھر مسلمان۔ اور یہ کہتے وقت ان کے ذہن میں مذہب کا یہ تصور ہوتا ہے کہ اسلام جغرافی تقسیم قبول کر سکتا ہے۔ ترکی اسلام، ایرانی اسلام، مصری اسلام، ہندوستانی اسلام، اور پھر پنجابی، بنگالی، دکنی اور مدراسی اسلام الگ الگ ہو سکتے ہیں۔ ہر جگہ مسلمان اپنے اپنے مقامی حالات کے لحاظ سے ایک الگ طریق فکر اختیار کر سکتا ہے، زندگی کا ایک جداگانہ نقطہ نظر اور نصب العین قبول کر سکتا ہے، ان تمام سیاسی، معاشی اور اجتماعی نظاموں میں جذب ہو سکتا ہے جو مختلف قوموں نے مختلف اصولوں پر قائم کیے ہیں، اور پھر بھی وہ مسلمان رہ سکتا ہے۔ اس لیے کہ اسلام ایک "مذہبی ضمیمہ" ہے جو دنیوی زندگی کے ہر ڈھنگ اور ہر طریقہ کے ساتھ چسپاں ہو سکتا ہے۔

ایک دوسرے صاحب فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کو دین اور دنیا کے معاملات میں واضح امتیاز کرنا چاہیے۔ دین کا تعلق ان معاملات سے ہے جو انسان اور خدا کے درمیان ہیں، یعنی اعتقادات اور عبادات۔ ان کی حد تک مسلمان اپنی راہ پر چل سکتے ہیں، اور کوئی ان کو اس راہ سے نہ ہٹانا چاہتا ہے، نہ ہٹا سکتا ہے۔ رہے دنیوی معاملات تو ان میں دین کو دخل دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جس طرح دنیا کے دوسرے لوگ ان کو انجام دیتے ہیں اسی طرح مسلمانوں کو بھی انجام دینا چاہیے۔

ایک تیسرے صاحب کا ارشاد ہے کہ اپنے مذہبی، تمدنی اور لسانی حقوق کے لیے مسلمانوں کو بلاشبہ ایک الگ نظام کی ضرورت ہے مگر سیاسی اور معاشی اغراض کے لیے ان کو الگ جماعت بندی کی ضرورت نہیں۔ ان معاملات میں مسلم اور غیر مسلم کی تفریق بالکل غیر حقیقی اور مصنوعی ہے۔ یہاں مسلمانوں کے مختلف طبقوں کو اپنے اپنے مفاد اور اپنی اپنی اغراض کے لحاظ سے ان مختلف جماعتوں میں شامل ہونا چاہیے جو غیر مذہبی اصولوں پر سیاسی و معاشی مسائل کو حل کرنے کی جدوجہد کر رہی ہیں۔

ایک اور صاحب جو مسلم قوم کے تن مردہ میں جان ڈالنے کے لیے اٹھے ہیں ان کا خیال یہ ہے کہ اصل چیز ایمان باللہ اور اعتقاد یوم آخر اور اتباع کتاب و سنت نہیں ہے، بلکہ عناصر کی تسخیر اور قوانین طبعی کی دریافت اور نظم و ضبط کی طاقت سے ان عناصر مسخرہ و قوانین معلومہ کو استعمال کرنا ہے، تاکہ نتیجہ میں علو اور تمکن فی الارض حاصل ہو۔ یہ صاحب مادی ترقی کو مقصود بالذات قرار دیتے ہیں۔ اس لیے جو وسائل اس ترقی میں مددگار ہوں، وہی ان کے نزدیک اصل اہمیت رکھتے ہیں۔ باقی رہا وہ ذہن جو علم و عقل کی تہ میں کام کرتا ہے، اور جو اپنے طریق فکر اور زاویۂ نظر کے لحاظ سے وسائل ترقی کے استعمال کا مقصد اور تہذیب و تمدن کے ارتقاء کا راستہ اور تمکن فی الارض کا مدعا متعین کرتا ہے، سو وہ ان کی نگاہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا ——— وہ ذہن چاہے جاپانی ذہن ہو، یا جرمن، یا اطالوی یا فاروقی یا خالدی، ان کو اس سے کوئی بحث نہیں ان کے نزدیک یہ سب یکساں "اسلامی" ذہن ہیں، کیونکہ ان سب کے عمل کا نتیجہ ان کو ایک ہی نظر آتا ہے، یعنی علو اور تمکن فی الارض۔ ان کی نگاہ میں جس کو "زمین کی وراثت" حاصل ہے، وہی "صالح" ہے، اگرچہ وہ ابراہیم کے مقابلہ میں نمرود ہی کیوں نہ ہو۔ جو غالب اور بالادست ہے، وہی "مومن" ہے اگرچہ وہ مسیح کے مقابلہ میں بت پرست رومی فرمانروا ہی کیوں نہ ہو۔

ایک بڑا گروہ جو مسلمانوں کے قومی حقوق کی حفاظت کے لیے اٹھا ہے اس کے نزدیک اسلام اور اس کی تہذیب کی حفاظت صرف اس چیز کا نام ہے کہ ان کے مذہب اور "پرسنل لاء" کی حفاظت کا اطمینان دلایا جائے، ان کی زبان کو اپنے رسم الخط سمیت ایک سرکاری زبان تسلیم کر لیا جائے، اور جن لوگوں کی شخصیت پر اسلام کا لیبل لگا ہوا ہو، صرف انہی کو مسلمانوں کی نمائندگی کا حق حاصل ہو۔ انتخابی اداروں اور سرکاری ملازمتوں میں متناسب نمائندگی ان کے نزدیک سب سے بڑی اہمیت رکھتی ہے، اور اگر یہ فیصلہ کر دیا جائے کہ خالص اسلامی مسائل میں کوئی تصفیہ اس وقت تک نہ ہو گا جب تک خود مسلمان نمائندوں کی غالب اکثریت

اس کو قبول نہ کرے قرآن کے نزدیک گویا اسلامی حقوق کا پورا پورا تحفظ ہو گیا۔
دیکھا آپ نے شکلیں کس قدر مختلف ہیں۔ مگر حقیقت ان سب میں ایک ہے۔ یہ سب مختلف مظاہر ہیں اسی جاہلی تصور مذہب کے جو اسلامی تصور مذہب کے خلاف ہر زمانہ میں نت نئی شکلوں کے ساتھ بغاوت کرتا رہا ہے۔
اگر یہ لوگ اچھی طرح سمجھ لیں کہ مسلم کسے کہتے ہیں اور حقیقی معنی میں اسلامی جماعت کا اطلاق کس گروہ پر ہوتا ہے، تو ان کی تمام غلط فہمیاں دور ہو سکتی ہیں۔
قانونی حیثیت سے ہر وہ شخص "مسلم" ہے جو کلمۂ طیبہ کا زبانی اقرار کرے اور ضروریات دین کا منکر نہ ہو۔ لیکن اس معنی میں جو شخص "مسلم" ہے اس کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ وہ دائرۂ اسلام میں داخل ہے۔ ہم اس کو کافر نہیں کہہ سکتے، نہ وہ حقوق دینے سے انکار کر سکتے ہیں جو مجرد اقرارِ اسلام سے اس کو مسلم سوسائٹی میں حاصل ہوتے ہیں۔
یہ اصل اسلام نہیں ہے بلکہ اسلام کی سرحد میں داخل ہونے کا پروانہ ہے۔ اصل اسلام یہ ہے کہ تمہارا ذہن اسلام کے سانچے میں ڈھل جائے، تمہارا طریقِ فکر وہی ہو جو قرآن کا طریقِ فکر ہے —— زندگی اور اس کے تمام معاملات پر تمہاری نظر وہی ہو، جو قرآن کی نظر ہے، تم اشیاء کی قدریں (Values) اسی معیار کے مطابق معین کرو، جو قرآن نے اختیار کیا ہے، تمہارا انفرادی و اجتماعی نصب العین وہی ہو جو قرآن نے پیش کیا ہے۔ تم اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں مختلف طریقوں کو چھوڑ کر ایک طریقہ اسی معیارِ انتخاب کی بنا پر انتخاب کرو، جو قرآن اور طریقِ محمدی کی ہدایت سے تم کو ملا ہے۔
اگر تمہارا ذہن کو یہ چیز اپیل نہیں کرتی، اور تمہاری نفسیات قرآن کے نفسیات کے سانچے میں ڈھلنا قبول نہیں کرتے، تو کوئی تم کو دائرۂ اسلام میں آنے پر مجبور نہیں کرتا۔ عقل اور راست بازی کا اقتضا یہ ہے کہ تم کو اس دائرے کے باہر اپنے لیے مناسب جگہ تلاش کرنی چاہیے۔ لیکن اگر تمہارا ذہن اس چیز کو قبول کرتا ہے اور تم اپنے نفسیات کو قرآنی نفسیات کے ساتھ متحد کر لیتے ہو، تو

پھر زندگی کے کسی معاملہ میں بھی تمہارا راستہ اس راستہ سے الگ نہیں ہو سکتا جسے قرآن سبیل المومنین کہتا ہے۔

اسلامی ذہن یا قرآنی ذہن ——— کہ حقیقت میں یہ ایک ہی چیز ہیں ——— جس نظریۂ زندگی کے تحت چند اعتقادات پر ایمان لاتا ہے، چند عبادات تجویز کرتا ہے، چند شعائر (جو عام اصطلاح میں "مذہبی شعائر" کہے جاتے ہیں) اختیار کرتا ہے، ٹھیک اسی نظریہ کے تحت وہ کھانے کی چیزوں میں، پہننے کے سامان میں، لباس کی وضعوں میں، معاشرت کے طریقوں میں، تجارتی لین دین میں، معاشی بندوبست میں، سیاست کے اصولوں میں، تمدن و تہذیب کے مختلف مظاہر میں، مادی وسائل اور قوانینِ طبعی کے علم کو استعمال کرنے کے مختلف طریقوں میں بعض کو رد کرتا ہے اور بعض کو اختیار کرتا ہے۔ یہاں چونکہ نقطۂ نظر ایک ہے، طریقِ فکر ایک ہے، نصب العین ایک ہے، ترک و اختیار کا معیار ایک ہے، اس لیے زندگی بسر کرنے کے طریقے، سعی و جہد کے راستے، معاملاتِ دنیا کی انجام دہی کے اصول الگ نہیں ہو سکتے۔ جزئیات میں عمل کی شکلیں الگ ہو سکتی ہیں، احکام کی تعبیروں اور فروعات پر اصول کے انطباق میں تھوڑا بہت اختلاف ہو سکتا ہے، ایک ہی ذہن کی کارفرمائی مختلف مظاہر اختیار کر سکتی ہے، لیکن یہ اختلاف عوارض کا اختلاف ہے، جوہری اختلاف ہرگز نہیں ہے۔ جس بنیاد پر اسلام میں زندگی کی پوری اسکیم مرتب کی گئی ہے، اور اس کے تمام شعبوں کو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط کیا گیا ہے وہ کسی قسم کا اختلاف قبول نہیں کرتی۔ آپ خواہ ہندوستانی ہوں یا ترکی، یا مصری، اگر آپ مسلمان ہیں تو یہی اسکیم اپنی اسی اسپرٹ کے ساتھ آپ کو اختیار کرنی پڑے گی اور اس اسکیم کو رد کر دینا پڑے گا جو اپنی اسپرٹ اور اپنے اصولوں کے لحاظ سے اس کے خلاف ہو۔

یہاں آپ "مذہبی" اور "دنیوی" شعبوں کو ایک دوسرے سے الگ کر ہی نہیں سکتے۔ اسلام کی نگاہ میں دنیا اور آخرت دونوں ایک ہی مسلسل زندگی کے

دو مرحلے ہیں۔ پہلا مرحلہ سعی و عمل کا ہے، اور دوسرا مرحلہ نتائج کا ۔۔۔۔ آپ زندگی کے پہلے مرحلے میں دنیا کو جس طرح برتیں گے، دوسرے مرحلے میں ویسے ہی نتائج ظاہر ہوں گے ۔۔۔۔ اسلام کا مقصد آپ کے ذہن اور آپ کے عمل کو اس طرح تیار کرنا ہے کہ زندگی کے اس ابتدائی مرحلے میں آپ دنیا کو صحیح طریقہ سے برتیں تاکہ دوسرے مرحلہ میں صحیح نتائج حاصل ہوں۔ پس یہاں پوری دنیوی زندگی "مذہبی" زندگی ہے، اور اس میں اعتقادات و عبادات سے لے کر تمدن و معاشرت اور سیاست و معیشت کے اصول و فروع تک ہر چیز ایک معنوی اور مقصدی ربط کے ساتھ مربوط ہے۔ اگر آپ اپنے سیاسی و معاشی معاملات کو اسلام کی تجویز کردہ اسکیم کے بجائے کسی اور اسکیم کے مطابق منظم کرنا چاہتے ہیں تو یہ جزوی ارتداد ہے، جو آخرکار کلی ارتداد پر منتہی ہوتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ اسلامی تعلیمات کا تجزیہ کر کے بعض کو رد اور بعض کو قبول کرتے ہیں۔ آپ معتقداتِ دین اور عباداتِ دینی کو قبول کرتے ہیں مگر اس نظامِ زندگی کو ترک کر دیتے ہیں جس کی عمارت انہی عبادات کی بنیاد پر اٹھائی گئی ہے۔ اول تو یہ تجزیہ ہی اسلام کی رُو سے غلط ہے اور کوئی مسلمان جو حقیقت میں اسلام پر ایمان رکھتا ہو اس کا ارادہ نہیں کر سکتا کیونکہ یہ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ[1] کا مصداق ہے۔ پھر اگر آپ نے یہ تجزیہ کر کے دائرۂ اسلام میں رہنے کا عزم کیا بھی تو آپ اس دائرے میں زیادہ مدت تک نہ رہ سکیں گے کیونکہ نظامِ زندگی سے بے تعلق ہونے کے بعد معتقداتِ دین اور عباداتِ دینی سب بے معنی ہو جاتے ہیں۔ ان کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ غیر اسلامی اصولِ حیات پر ایمان لانے کے بعد اس قرآن پر ایمان قائم ہی نہیں رہ سکتا جو قدم قدم پر ان اصولِ حیات کی تکذیب کرتا ہے۔

---

[1] کیا بات ہے کہ تم کتابِ خدا کے بعض احکام کو تو مانتے ہو اور بعض سے انکار کیے دیتے ہو۔ (البقرہ: ۸۵)

بخلاف اس کے اگر آپ اس اسکیم کے مطابق اپنی سیاسی و معاشی زندگی کے معاملات کو منظم کرنا چاہتے ہیں جو اسلام نے تجویز کی ہے تو آپ کو الگ پارٹیوں میں منقسم ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ایک ہی پارٹی ——— حزب اللہ ——— ان سب کاموں کے لیے کافی ہے، کیونکہ یہاں سرمایہ دار اور مزدور، زمیندار اور کاشتکار، راعی اور رعیت کے مفاد میں تنازع نہیں ہے، بلکہ ان کے درمیان موافقت اور اشتراکِ عمل پیدا کرنے والے اصول موجود ہیں۔ کیوں نہ آپ ان اصولوں کیمطابق اپنی قوم کے مختلف طبقات میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کریں؟ جن کے پاس یہ اصول موجود نہیں ہیں وہ اگر مجبوراً تنازعِ طبقات lass کی آگ میں کودتے ہیں تو آپ کیوں ان کے پیچھے جائیں؟

اسی طرح اگر آپ مادّی ترقی چاہتے ہیں علو اور تمکن فی الارض چاہتے ہیں، تو اسلام خود اس باب میں آپ کی مدد کرتا ہے۔ مگر وہ چاہتا ہے کہ آپ فرعونی و نمرودی علو اور ابراہیمی و موسوی علو میں امتیاز کریں۔ ایک تمکّن وہ ہے جو جاپان اور انگلستان کو حاصل ہے۔ دوسرا وہ تھا جو صحابۂ کرام اور قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں نے حاصل کیا تھا۔ تمکن دونوں ہیں، اور دونوں تسخیرِ عناصر، استعمالِ اسباب اور قوانینِ طبعی کے علم اور ان سے استفادہ کرنے ہی کے نتائج ہیں، مگر زمین و آسمان کا فرق ہے دونوں گروہوں کے مقاصد اور نقطۂ نظر میں۔ آپ نتائج کے ظاہری اور نہایت سطحی تماثل کو دیکھتے ہیں۔ مگر ان کے درمیان جو روحی و اخلاقی بُعد ——— بعد المشرقین ——— ہے اس کو نہیں دیکھتے۔ دُنیا پرستوں کی ترقی اور ان کا تمکن اُس تسخیرِ عناصر اور استعمالِ اسباب کا نتیجہ ہے جس کی تہہ میں زندگی کا حیوانی نصب العین کام کر رہا ہے۔ بخلاف اس کے قرآن جس علو اور تمکن فی الارض کا وعدہ کرتا ہے، وہ بھی اگرچہ تسخیرِ عناصر اور استعمالِ اسباب سے ہی حاصل ہو سکتا ہے، مگر اس کی تہہ میں زندگی کا بلند ترین اخلاقی و روحانی نصب العین ہونا چاہیئے جس کا تحقق ہو نہیں سکتا جب تک کہ ایمان باللہ اور اعتقادِ یومِ آخر پوری طرح مستحکم نہ ہو، اور جب

تک کو زندگی کی ساری جد و جہد اس آہنی فریم کے اندر کسی ہوئی نہ ہو جس کی گرفت کو مضبوط کرنے کے لیے صوم و صلوٰۃ اور حج و زکوٰۃ کو آپ پر فرض کیا گیا ہے —— وہی "ارکانِ اسلام" جن کو آپ "مولوی کے غلط مذہب" کی ایجاد قرار دیتے ہیں۔

مسلمانوں کے قومی حقوق کو سمجھنے اور ان کے تحفظ کے صحیح طریقے معلوم کرنے میں جو غلطی کی جا رہی ہے اس کی تہ میں بھی وہی جہل کارفرما ہے جس کے مظاہر آپ اُوپر دیکھ چکے ہیں۔ اجتماعی زندگی کی پوری اسکیم اگر غیر اسلامی بنیادوں پر مرتب ہو جائے تو جس چیز کو آپ "مذہب" کہتے ہیں اور جسے "پرسنل لا" قرار دیتے ہیں اس کا اپنی اصل پر باقی رہ جانا اور آپ کی زبان کا اپنے رسم الخط کے ساتھ محفوظ رہنا کچھ بھی مفید نہ ہوگا۔ اس لیے کہ اس غیر اسلامی مجموعہ میں یہ بے جوڑ اسلامی اجزاء کسی طرح کھپ نہ سکیں گے اور رفتہ رفتہ اپنی جگہ چھوڑتے چلے جائیں گے۔ پھر ان اجزاء کی حفاظت جن نمائندوں کے ہاتھ میں آپ دینا چاہتے ہیں وہ اگر محض اصطلاحی و قانونی مسلمان ہوں تو وہ ان کی حفاظت بس اتنی ہی کر سکیں گے جتنی کہ غیر مسلم کر سکتے ہیں۔ ایسے مسلمان اگر اسلامی اصولوں کے خلاف ۵۱٪ نہیں ۹۹٪ کی اکثریت سے بھی کوئی فیصلہ کریں تو وہ اسلامی جماعت کے لیے اتنا ہی نقصان دہ ہوگا جتنا غیر مسلموں کا کوئی فیصلہ ہو سکتا ہے۔

جاہلیت کا یہی تصور ہے جس کے تحت کانگریس نے اپنا بنیادی حقوق ([illegible] Righ...) والا ریزولیوشن مرتب کیا ہے اور اسی تصورِ جاہلیت کے تحت اپنی لکھنؤ والی تقریر میں پنڈت جواہر لال نہرو نے فرمایا ہے کہ "کانگریس کسی مذہبی عقیدے سے اور مذہبی روایات میں قطعاً دخل نہیں دیتی۔ کانگریس کو مذہب میں مداخلت کی کوئی ضرورت نہیں اور نہ وہ ایسا کرے گی۔ کانگریس ہندوستان کے مذاہب کی آزادی، مذہبی لوگوں کی تہذیب کی آزادی، تمدن کی آزادی اور

زبان کی آزادی کی حامی ہے[۱]۔" پھر جاہلیت کا یہی تصور ہے جس کے تحت مسلمانوں کا ایک گروہ اس قسم کے اعلانات کو کافی سمجھتا ہے اور مسلمانوں کو مشورہ دیتا ہے کہ ایسے اعلانات پر وہ مطمئن ہو کر بیٹھ جائیں۔ کانگریسی رہنما تو خیر غیر مسلم ہیں اور مذہب کے صرف اسی تصور سے واقف ہیں جو انہیں وراثت میں ملا ہے، مگر مسلمانوں کے سیاسی رہنما (جن کے ساتھ بدقسمتی سے مذہبی رہنما بھی شریک ہوتے جاتے ہیں) اس سلسلہ میں جس ناواقفیت کا ثبوت دے رہے ہیں وہ حد درجہ افسوسناک ہے۔ یہ حضرات اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ اگر مذہب، یعنی معتقدات دین اور مذہبی اعمال میں مداخلت نہ ہو، اگر مسلمانوں کے "پرسنل لا" یعنی قوانین نکاح و طلاق و وراثت کو، جیسے کہ وہ برٹش گورنمنٹ کے ماتحت ہیں، بدستور محفوظ رہنے دیا جائے، اگر مسلمانوں کی قدیم رسوم و عادات کو جیسی کہ وہ اس وقت پائی جاتی ہیں، ایک اجل مسمی تک پرانے تبرکات (Relics) کی حیثیت سے زندہ رہنے دیا جائے تو بس مسلمانوں کا قومی مسئلہ حل ہو گیا، اور اس کے بعد مسلمانوں کو اپنے قومی مستقبل کی طرف سے مطمئن ہو جانا چاہیے۔ اگرچہ آزادی اور تحفظ کے یہ اعلانات بھی سراسر منافقانہ ہیں جیسا کہ میں آگے کے ابواب میں خود کانگریس کی تحریروں سے اور کانگریس کے شعبہ اسلامیات کے شائع کردہ مضامین سے ثابت کروں گا، تاہم اگر ان کو خلوص و نیک نیتی پر بھی محمول کیا جائے، تب بھی یہ سمجھنا انتہا درجہ کی کم فہمی پر دلالت کرتا ہے کہ ان اعلانات سے ہمارا قومی مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ درحقیقت ایسی چیزوں پر اطمینانِ قلب ظاہر کر کے ہمارے سیاسی و مذہبی رہنماؤں نے یہ راز فاش کیا ہے کہ وہ ابھی یہ سمجھے ہی نہیں کہ مسلمانوں کا اصل قومی مسئلہ ہے کیا۔

مسلمانوں کا اصل قومی مسئلہ

اگرچہ میں گزشتہ صفحات میں اس مسئلہ کی کافی تشریح کر چکا ہوں، لیکن یہاں

---

[۱] جمعیت علماء ہند کے واحد ترجمان "الجمعیۃ" مورخہ ۲۲ر شعبان ۱۳۵۵ھ میں یہ تقریر "صدر کانگریس کا اعلان حق" کے زیر عنوان شائع ہوئی۔

ایک مرتبہ پھر کوشش کروں گا کہ اس کو نہایت واضح صورت میں پیش کروں تاکہ یہ زمانہ کا جادو، جو جہلا اور علما سب کے دماغوں پر مسلط ہوتا جا رہا ہے، کسی طرح اُترے اور مسلمانوں کے ارباب حل و عقد اپنی توجہات کو اس مسئلہ کے حل کی طرف منعطف کریں۔

اوپر میں بتا چکا ہوں کہ اسلام اُس قسم کا کوئی مذہب نہیں ہے جو دُنیا کی زندگی سے الگ چند معتقدات اور چند مذہبی مراسم انسان کو دیتا ہو تاکہ وہ آخرت کی زندگی میں نجات کے لیے سرٹیفکیٹ کے طور پر کام آئیں۔ بلکہ وہ درحقیقت ایک جامع تہذیب و تمدن ہے جو دنیا کو مزرعۃ الآخرۃ (آخرت کی کھیتی) سمجھ کر، اور انسان کو زمین میں خلیفۂ الٰہی قرار دے کر زندگی کے جملہ معاملات کی تنظیم کرتا ہے "تاکہ انسان اس دنیا میں صحیح برتاؤ کرے" اور اس کے نتیجہ میں آخرت کی کامیابی سے ہم کنار ہو۔ اس غرض کے لیے اسلام نے مسلمانوں کو ایک مکمل ضابطۂ زندگی دیا ہے جو دوسرے ضوابطِ زندگی مثلاً کمیونزم، فاشزم، کیپٹلزم اور میٹریلزم وغیرہ سے بالکل مختلف صورت پران کے نظامِ اجتماعی کی تشکیل کرتا ہے اور ان کو علوم و آداب میں، اخلاق و معاملات میں، عادات و اطوار میں، تمدن و معاشرت میں، معیشت و سیاست میں، غرض زندگی کے ہر شعبے میں بعض طریقوں کو ترک اور بعض کو اختیار کرنے کی ہدایت کرتا ہے۔ اس ضابطہ کی اساس ایک خاص طریقۂ فکر اور ایک خاص مقصدِ حیات پر رکھی گئی ہے جو دوسری قوموں اور تہذیبوں کے طریقِ فکر و مقصدِ حیات سے بالکل مختلف ہے۔ جس کی رُو سے اشیاء کی قدریں (Values) دوسروں کی پسند کی ہوئی قدروں سے بالکل مختلف طور پر معین ہوتی ہیں اور جس کے لحاظ سے زندگی میں مسلمان اپنا راستہ دوسروں کے انتخاب کیے ہوئے راستوں سے الگ انتخاب کرتا ہے۔

ہر تہذیب کی طرح اس تہذیب کے بقا اور فروغ کا انحصار بھی دو چیزوں پر ہے۔

ایک یہ کہ مسلمانوں کا نظامِ تعلیم ایسا ہو جو ان کے دل و دماغ میں اسلام کے

طریقِ فکر اور مقصدِ حیات کو صحیح طور پر پیوست کردے ، اور ان کو اس قابل بنائے کہ وہ مسلمان کی حیثیت سے دیکھیں ، مسلمان کی حیثیت سے سوچیں ، اور اسلام کے بتائے ہوئے معیار کے مطابق زندگی کے ہر دوراہے پر ایک راستے کا انتخاب کریں۔

دوسرے یہ کہ یہ نظامِ تہذیب اپنی صحیح صورت میں عملاً قائم ہو، اجتماعی زندگی میں اس کے اصول عملاً نافذ ہوں ، اور ایک ایسا اسلامی ماحول بن جائے جس میں مسلمان خود بخود اسلامی اصولوں پر زندگی بسر کریں ، اگرچہ ان کے بعض افراد کو علمی حیثیت سے ان اصولوں کا پورا شعور نہ ہو۔ اس غرض کے لیے مسلمانوں کے پاس سیاسی طاقت کا ہونا ضروری ہے کیونکہ کوئی سوسائٹی سیاسی طاقت کے بغیر اپنی مخصوص ہیئت کی حفاظت نہیں کرسکتی۔

انگریزی اقتدار کی غلامی میں ہم کو اصل نقصان جو پہنچا ہے وہ یہی ہے کہ اپنی تہذیب کو ایک زندہ تہذیب کی حیثیت سے باقی رکھنے کے لیے یہ دونوں ذرائع ہم سے چھن گئے۔ ایک طرف ہماری قوم پر ایک ایسا نظامِ تعلیم مسلط کردیا گیا ہے جو وسیع پیمانہ پر ہمارے افراد کے طریقِ فکر کو بدل رہا ہے ، نظریۂ زندگی اور مقصدِ حیات کو بدل رہا ہے ، اور اس معیار کو بدل رہا ہے جس سے وہ اشیاء کی قدریں متعین کرتے ہیں۔ دوسری طرف ایک غیر قوم کی سیاسی طاقت نے ہم پر ایک ایسا ماحول مسلط کردیا ہے جو ہمارے عوام اور خواص کی زندگی کو روز بروز اسلامی مناہج سے ہٹاتا چلا جاتا ہے۔ اس نے ہمارے قوانینِ حیات کو بڑی حد تک معطل کر دیا ہے ، اور ہم اس کی بدولت اس طاقت سے محروم ہوگئے ہیں جس سے ہم اپنی سوسائٹی کو اس مخصوص اسلامی ہیئت پر قائم و برقرار رکھ سکیں۔

پس ہمارا اصل قومی مسئلہ یہ ہے کہ ہندوستان میں جو انقلاب درپیش ہے ، اس میں ہم اس نقصان کی تلافی کرسکیں جو انگریزی اقتدار سے ہماری قومیت اور ہماری تہذیب کو پہنچا ہے۔ ہمیں اتنی طاقت حاصل ہو کہ ہم اپنے نظامِ تعلیم کو خود اپنی ضروریات کے مطابق بنا سکیں اور ہمیں حکومت میں اتنا اقتدار حاصل ہو کہ ہم اپنے تمدنی"

معاشرتی اور معاشی مسائل کو خود اپنے اصولوں کے مطابق حل کر سکیں، اور اپنے اجتماعی نظام کو پھر سے اسلامی بنیادوں پر مرتب کریں۔ یہی وہ چیز ہے جس کی تشریح میں نے اپنے "نصب العین" والے مضمون میں کی ہے۔ ہم ایک ایسی آزادی وطن کو صحیح معنوں میں پورے وطن کی آزادی نہیں کہہ سکتے جس میں وطن کی ۱/۴ مسلمان آبادی کو یہ آزادی حاصل نہ ہو۔ نہ ہم کسی ایسی حکومت کو وطنی حکومت سمجھ سکتے ہیں جس میں وطن کے آٹھ کروڑ مسلمانوں کو یہ اقتدار حاصل نہ ہو ــــ نہ ہمیں کسی ایسی جنگِ آزادی سے کوئی دلچسپی ہو سکتی ہے جس کے ذریعہ سے ہم اپنے مشترک وطنی نصب العین (یعنی حریت و استقلالِ وطن) کے ساتھ ساتھ اپنے اس قومی نصب العین کو بھی حاصل نہ کر سکتے ہوں۔

یہ "قوم پرستی" کی تحریک جس کے تحت اس وقت آزادیٔ وطن کے نام پر جنگ کی جا رہی ہے، درحقیقت ہم کو اپنے اِس قومی مقصد کی تحصیل میں مدد نہیں دیتی، بلکہ اس کے برعکس ان نقصانات کو حدِ کمال پر پہنچانا چاہتی ہے جو ہم کو انگریزی اقتدار سے پہنچے ہیں۔ ڈیڑھ سو برس تک ایک غیر قوم کی غلامی میں رہنے کی وجہ سے ہماری قوم میں جہالت، افلاس، اخلاقی انحطاط، اجتماعی بدنظمی، تمدنی بے راہ روی، اور تہذیبِ اسلامی سے انحراف کی جتنی خرابیاں پیدا ہوئی ہیں، انہیں دُور کرنے میں ہماری مدد کرنا تو در کنار، وہ تو ان سے اُلٹا فائدہ اُٹھانا چاہتی ہے، اور ہماری ان اندرونی خرابیوں ہی کو اپنے لیے کامیابی کا ذریعہ سمجھتی ہے۔ ایک طرف اس تحریک کے علمبردار اپنا پورا زور اس بات پر صرف کر رہے ہیں کہ جمہور مسلمین کے دلوں سے اسلامی قومیت کا تخیل ہی مٹ جائے، اور وہ اپنی قومیت کے رشتہ سے کٹ کر معاشی طبقوں میں منقسم ہو جائیں، اور آپس میں روٹیوں پر لڑنا شروع کر دیں۔ دوسری طرف ان لوگوں کے پاس تہذیب و تمدن اور تنظیم حیات کے متعلق خود اپنے نظریات موجود ہیں جو اسلام کے اصولوں سے بالکل مختلف ہیں، اور وہ مسلمانوں کی اجتماعی مزاحمت سے بے خوف ہو کر یہ چاہتے ہیں کہ تمام ہندوستان کی اجتماعی

زندگی کو انہی نظریات کے تحت مرتب کریں جس کی لپیٹ میں مسلمان بھی آجائیں۔ اس طرح یہ تحریک ہمارے قومی مقاصد کے بالکل خلاف واقع ہوئی ہے، اور اس کے ساتھ شریک ہونے کے معنی یہ ہیں کہ ہم اپنی قومیت اور اپنی تہذیب کو نیست و نابود کرنے میں خود حصّہ لیں۔ وہ اپنے پروپگنڈا کی طاقت سے یہ خیال پھیلا رہے ہیں کہ جو لوگ ان کی اس تحریک سے اختلاف کرتے ہیں وہ انگریزی اقتدار کے حامی ہیں، ٹوڈی اور سامراج پرست ہیں۔ لیکن یہ ایک زبردست دجل و فریب ہے جس کو دن کی روشنی میں فروغ دیا جا رہا ہے۔ دراصل سب سے بڑا ٹوڈی اور سامراج پرست تو وہ ہے جو وطن کی نجات کے لیے ایسے طریقے اختیار کرتا ہے جن سے وطن کی ۱/۴ آبادی کسی طرح اتفاق نہیں کر سکتی۔ اپنی اس حماقت سے وہ خود انگریزی اقتدار کے قیام و بقا میں مدد دیتا ہے، اور پھر اس حماقت کا الزام ان لوگوں پر رکھتا ہے جو نجاتِ وطن کے لیے سرفروشی کرنے پر تیار ہیں مگر اپنی قومیت اور اپنی قومی تہذیب کو فنا کرنے پر فطرۃً تیار نہیں ہو سکتے۔

میں آگے کے ابواب میں اس امر پر تفصیل سے بحث کروں گا کہ یہ تحریک وطن پرستی کن طریقوں پر چلائی جا رہی ہے، اور مسلمانوں کے لیے مسلمان رہتے ہوئے اس کے ساتھ اشتراکِ عمل کرنا کس درجہ مہلک ہے۔

شبہات اور جوابات

میں نے اپنے گزشتہ مضامین میں حتی الامکان ہر پہلو کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن باوجود اس کے ان مضامین کو دیکھ کر مختلف اصحاب نے متعدد شبہات کا اظہار کیا ہے جن سے مجھے اندازہ ہوا کہ ابھی توضیحِ مقاصد میں بہت کچھ کمی رہ گئی ہے۔ ذیل میں چند اہم شبہات کو خود معترضین کے اپنے الفاظ میں نقل کر کے رفع کرنے کی کوشش کروں گا۔ امید ہے کہ میرے جوابات سے بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی۔

ناقابلِ عمل

آپ نے سیاسی کام کرنے کے اکثر ان طریقوں کو غلط اور مسلمانوں کے لیے مضر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے جن پر مسلمانوں کے مختلف گروہ آج کل عمل پیرا ہیں۔ لیکن نہایت طول طویل مباحث کے بعد اپنے مضمون "راہِ عمل" میں خود جو طریقِ کار مسلمانوں کے لیے تجویز کیا ہے وہ بالکل ہی ناقابلِ عمل اور غیر ممکن الوقوع معلوم ہوتا ہے۔ بجائے خود مقاصد بہت ارفع و اعلیٰ ہیں اور ہر مسلمان کو ان کے حصول کی کوشش کرنی چاہیے۔ لیکن آپ نے یہ نہیں بتایا کہ ان مقاصد کے حصول کے لیے اندازاً کتنی

مدت درکار ہوگی؟ اگر یہ مقاصد ایسے ہیں کہ ان کے حاصل کرنے میں صدیاں لگ جائیں گی تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ہندوستان کی سیاسی جنگ اس وقت تک ملتوی رہے گی جب تک مسلمان ان مقاصد کے حصول میں کامیاب نہ ہو جائیں؟

جواب

فاضل معترض ایک طرف یہ تسلیم فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کی قومی طاقت کو مضبوط کرنے کے لیے جن تدابیر کو میں ضروری اور ناگزیر قرار دیتا ہوں "وہ بہت ارفع و اعلیٰ" ہیں اور ہر مسلمان کو ان کے حصول کی کوشش کرنی چاہیئے۔ دوسری طرف وہ خود اپنے اس مسلّمہ کو محض اس بنیاد پر ردّ کر دیتے ہیں کہ یہ "تدابیر بالکل ہی ناقابلِ عمل، اور غیر ممکن الوقوع معلوم ہوتی ہیں۔ اور ان کے حصول کیلیے صدیاں بھی کم ہیں"۔ اس سے مجھے شُبہ ہوتا ہے کہ غالباً انہوں نے نہ تو ان وجوہ کی اہمیت پر کافی غور فرمایا ہے جن کی بنا پر میں ان تدابیر کو ناگزیر قرار دے رہا ہوں، اور نہ اس سوال پر زیادہ فکر صرف کی ہے کہ ان تدابیر کو رُو بکار لانے اور جلد از جلد نتیجہ خیز بنانے کی عملی صورتیں کیا ہیں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو غالباً وہ نہ تو اس طرح سرسری طور پر میری رائے سے اتفاق فرماتے اور نہ اس طرح سرسری نظر میں اسے ناقابلِ عمل سمجھ کر ردّ کر دیتے۔ چونکہ بحث کا اصلی اور اہم ترین نکتہ یہی ہے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ صرف معترض صاحب ہی نہیں بلکہ تمام وہ لوگ جو ان کے ہم خیال ہیں، اس کے اصولی اور عملی پہلوؤں پر پوری توجّہ فکر صرف کریں۔

اس بحث کو اصولی طریق پر طے کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ میرے خیالات کا تجزیہ کیجئے اور ایک ایک جز کے متعلق واضح طور پر فیصلہ کیجئے کہ آپ کو اس سے اتفاق ہے یا نہیں۔

(۱) میری نگاہ میں ہندوستان کے مسلمانوں کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک مسلمان ہونے کی حیثیت اور دوسری ہندوستانی ہونے کی حیثیت۔ ان میں سے پہلی حیثیت دوسری حیثیت پر مقدم ہے، اس معنی میں اگر بالفرض ان دونوں حیثیتوں میں مصالحت

ممکن نہ ہو، اور ہمارے سامنے یہ سوال پیش ہو جائے کہ ہم کس حیثیت کو دوسری حیثیت پر قربان کرنے کے لیے تیار ہوں گے، تو ہمارے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنی مسلمان ہونے کی حیثیت کو برقرار رکھیں اور ہندوستانی ہونے کی حیثیت کو اس پر قربان کردیں۔

یہ پہلا اور بنیادی مسئلہ ہے جس کے فیصلے پر دو بالکل مختلف اور متضاد مسلکوں میں سے کسی ایک کے انتخاب کا انحصار ہے۔ جو شخص معنی مذکور الصدر میں دوسری حیثیت کو پہلی حیثیت پر مقدم رکھتا ہے، اس کا راستہ میرے راستہ سے بالکل الگ ہے۔ اسلیے میں ایک ایسے مسئلہ میں جو صرف مسلمانوں سے تعلق رکھتا ہے اس کے ساتھ کوئی بحث کرنا نہیں چاہتا۔ میری بحث صرف ان لوگوں سے ہے جو اس بنیادی امر میں مجھ سے متفق ہیں۔ (آگے چل کر میں لفظ مسلمان جہاں کہیں استعمال کروں گا، اس سے میری مراد اسی دوسرے گروہ سے ہوگی)

(۲) مسلم ہندوستانیوں کی سیاسی پالیسی کا اصل الاصول میرے نزدیک یہ ہے کہ ان کی مسلم ہونے کی حیثیت اور ہندوستانی ہونے کی حیثیت میں کامل توافق ہو۔ اس ملک کا سیاسی، معاشی اور تمدنی ارتقا کوئی ایسی راہ اختیار نہ کرنے پائے جس میں ہماری ان دونوں حیثیتوں کا ساتھ ساتھ نبھنا مشکل ہو جائے ـــــ میں نہیں سمجھتا کہ اس سے کسی مسلمان کو اختلاف ہوگا۔ تاہم اگر کسی کو اختلاف ہو تو وہ اپنے اختلاف کے وجوہ بیان کرے۔

(۳) مذکورۂ بالا پالیسی کو موثر اور کامیاب بنانا صرف ہمارے عمل اور ہماری قوت پر منحصر ہے۔ ہمارے غیر مسلم ہم وطن اور غیر مسلم حکمران اگر ہر قسم کے تعصب سے خالی ہوں اور انتہا درجہ کی نیک نیتی کے ساتھ کام کریں، تب بھی وہ اُس توازن و توافق کو قائم نہیں کرسکتے جس کے قیام پر ہماری مذکورہ بالا دونوں حیثیتوں کے ساتھ ساتھ نبھنے کا انحصار ہے اس لیے کہ وہ زندگی کا اسلامی نقطۂ نظر کہاں سے لائیں گے؟ اصولِ اسلام کا فہم انہیں کیسے نصیب ہوگا؟

تہذیبِ اسلامی کی اسپرٹ کو وہ کیونکر سمجھ سکیں گے ؟ پس ہر قسم کے گروہی تعصبات سے قطع نظر کر لینے کے بعد بھی یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلامیت اور ہندوستانیت کے جس توازن و توافق پر مسلم ہندوستانی قوم کی زندگی کا مدار ہے وہ اس قوم کی اپنی طاقت اور مؤثر طاقت کے بغیر نہ قائم ہو سکتا ہے، نہ قائم رہ سکتا ہے ——— کیا آپ اس کو تسلیم کرتے ہیں ؟ اگر نہیں تو وجوہ ارشاد ہوں۔ اگر تسلیم ہے تو فرمایئے کہ آیا یہ حقیقت آپ کی نگاہ میں بنیادی اہمیت رکھتی ہے، یا اسے آپ ایسی چیز سمجھتے ہیں کہ حاصل ہو تو بہت خوب اور حاصل نہ ہو تو کچھ پروا نہیں، اس کے بغیر ہی آگے بڑھے چلو ؟

(۴) جس طاقت سے اس پالیسی کو مؤثر اور کامیاب بنایا جا سکتا ہے، میرے نزدیک وہ مسلمانوں میں موجود نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس چند ایسی کمزوریاں جڑ پکڑ گئی ہیں جن کی وجہ سے وہ ہندوستان کے سیاسی ارتقاء کی رفتار پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتے۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ تمام دوسرے کاموں سے پہلے ہمیں ان کمزوریوں کو دُور کرنا چاہیئے اور اپنے اندر کم سے کم اتنی طاقت پیدا کر لینی چاہیئے کہ ہم اس مُلک کے آئندہ نظامِ حکومت کی تشکیل میں مُسلمان ہونے کی حیثیت سے اپنا اثر استعمال کر سکیں۔ اس کے بغیر جنگِ آزادی میں شریک ہونا یا نہ ہونا دونوں ہمارے لیے یکساں مُہلک ہیں۔ آپ فرمائیں کہ اس بیان کے کس حصّہ سے آپ کو اختلاف ہے ؟ کیا آپ کا یہ خیال ہے کہ مسلمانوں میں وہ کمزوریاں موجود نہیں ہیں جنہیں مَیں نے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے ؟ یا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کمزوریوں سے وہ نتائجِ بد پیدا نہیں ہو سکتے جن کا خطرہ مَیں نے ظاہر کیا ہے ؟ یا آپ کی رائے یہ ہے کہ ہمیں حبِ وطن یا حبِ نفس کی خاطر ان خطرات کو گوارا کر لینا چاہیئے ؟ ان میں سے کون سی شق آپ اختیار فرماتے ہیں ؟

(۵) وہ طاقت جس کی ضرورت میں ثابت کر رہا ہوں میرے نزدیک اُن تدابیر کے سوا کسی اور طریقہ سے حاصل نہیں ہو سکتی جنہیں اختصار کے ساتھ میں نے بیان کیا ہے۔ اگر آپ کو سرے سے اس کی ضرورت ہی تسلیم نہیں، تب تو میرے نزدیک

تدابیر کی بحث لاحاصل ہے۔ البتہ اگر آپ کو اس کی ضرورت کا اتنا ہی شدید احساس ہے جتنا کہ مجھ کو ہے، تو آپ ایک مرتبہ پھر ان کا جائزہ لیجئے اور فرمایئے کہ ان کے سوا اور کون سی تدبیریں ہو سکتی ہیں جو ہماری کمزوریوں کو دور کرکے ہم کو مسلم ہونے کی حیثیت سے ایک طاقت ور جماعت بنانے والی ہوں۔ اس نقطۂ نظر سے جب آپ غور فرمائیں گے تو آپ کو محسوس ہو جائے گا کہ یہ محض چند خوش آئند تجویزیں نہیں ہیں جن کی قدر افزائی کے لیے صرف اتنی سفارش کافی ہو کہ "ہر مسلمان کو ان کے حصول کی کوشش کرنی چاہیے۔" بلکہ در حقیقت مسلمانوں کی قومی زندگی کا تحفظ انہی تدابیر پر منحصر ہے اور اب اگر ہم خودکشی نہیں کرنا چاہتے تو ہمیں بہر حال انہی کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

یہ تو تھی اصولی بحث۔ اب میں عملی پہلو کی طرف توجہ کرتا ہوں۔ فاضل معترض نے غالباً یہ سمجھا ہے کہ میں بالکل ایک آئیڈیل حالت کی طرف مسلمانوں کو لے جانا چاہتا ہوں اور میرے نزدیک علم و عمل، اتحاد و اتفاق اور نظم اجتماعی کے آخری و انتہائی مرتبہ کا حصول سیاسی جنگ میں حصہ لینے سے پہلے ناگزیر ہے، اسی بنا پر انہوں نے یہ اندازہ لگایا کہ یہ کام تو شاید صدیوں میں بھی پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکے گا۔ اگرچہ ایسی ایک آئیڈیل حالت بھی اس سے پہلے ایک صدی کے چوتھائی حصہ میں ہندوستان کے موجودہ حالات سے بدرجہا زیادہ خراب، عرب جاہلیت کے حالات میں پیدا کی جا چکی ہے۔ لہٰذا اس کو ناممکن الوقوع کہنا درست نہیں۔ لیکن اگر اس کو ناممکن الوقوع تسلیم بھی کر لیا جائے تو میں کہتا ہوں کہ جو کم سے کم طاقت اس وقت ہمیں درکار ہے اس کے لیے صدر اول کے سے مسلمانوں کی سی انتہائی دینداری اور اجتماعی تنظیم تک پہنچ جانا ضروری نہیں ہے صرف اس قدر کافی ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں میں اسلام کے اصولوں پر ایک ایسی رائے عام تیار کر دی جائے جو غیر مسلم تہذیب کے اثرات کو اپنی جماعت میں پھیلنے سے روک سکتی ہو، جس کے سامنے ایک قومی نصب العین واضح طور پر موجود ہو جو اپنے نصب العین

کے لیے اجتماعی جدو جہد کرسکتی ہو، جس میں اتنا شعور ہو کہ گمراہ کرنے والے رہبروں کو پہچانے اور ان کا اتباع کرنے سے انکار کردے اور جس میں اتنی طاقت ہو کہ منافقت اور غداری اس کے دائرے میں پھل پھول نہ سکے۔ یہ کام نہ غیر ممکن ہے، نہ صدیوں کی مدت چاہتا ہے۔ اگر مسلمان یہ سمجھ لیں کہ اس کے بغیر ہندوستان میں ان کا بحیثیت ایک مسلم قوم کے زندہ رہنا مشکل ہے، اور اگر ان کے نوجوانوں میں سے ایک جماعت سچے جذبے کے ساتھ اس کام کے لیے جانفشانی اور پیہم عمل پر آمادہ ہو جائے تو ایک قلیل مدت ہی میں ایک ایسی رائے عام تیار کی جاسکتی ہے۔ لیکن یہ سب کچھ اس وقت ممکن ہے جب کہ ہم سہولت پسندی چھوڑ دیں۔ صحیح طریق کار کی دشواریاں دیکھ کر ہمت ہار دینا اور دوسروں کے ہموار کیے ہوئے راستوں کو آسان دیکھ کر ان کی طرف دوڑ جانا، ایک ایسی ذہنیت کا نتیجہ ہے جس کے ساتھ دنیا کی کوئی قوم بھی اپنی زندگی کو برقرار نہیں رکھ سکتی۔ اگر خدانخواستہ یہی ذہنیت ہماری قوم پر غالب ہو گئی ہے اور ہم اس درجہ تنزل کو پہنچ چکے ہیں کہ اپنے قومی نصب العین کے لیے کوئی اجتماعی جدوجہد کرنا ہمیں غیر ممکن نظر آتا ہے، تب تو ہمیں خود اپنی قبر پر فاتحہ پڑھ لینی چاہیے۔

جنگِ آزادی اور مسلمان

آزادی کی جنگ کا شروع کرنا یا نہ کرنا ہم مسلمانوں کی مرضی پر منحصر نہیں ہے کہ ہم جب چاہیں تب ہی جنگ شروع ہو، اور جب تک ہم نہ چاہیں وہ رُکی رہے۔ سیاسی جنگ یا آزادی کی جنگ تو عرصہ ہوا کہ شروع ہو چکی اور برادرانِ وطن بہت سے معرکے سر بھی کر چکے اور نئے معرکے سر کرنے کی دُھن میں لگے ہوئے ہیں۔ ایسی حالت میں ہم مسلمان یہ کیسے کہہ سکتے ہیں، اور کس منہ سے کہہ سکتے ہیں کہ بھائیو! ذرا ٹھہر جاؤ ہمیں بھی تیار ہو لینے دو پھر جنگ شروع کرنا۔ ہماری ایسی آواز کو کون سُن سکتا ہے۔ اور اس پر ایک لمحہ کے لیے بھی کان دھر سکتا ہے؟

جواب

یہ بات مَیں نے کبھی نہیں کہی کہ ہندوستان کی سیاسی جنگ اس وقت تک کے لیے ملتوی ہو جائے گی یا ہو جانی چاہیئے جب تک مسلمان ان مقاصد کے حصول میں کامیاب نہ ہو لیں۔ پچھلے واقعات اور موجودہ حالات پر نظر کرتے ہوئے اس بات کا تو خیال بھی نہیں کیا جا سکتا کہ ہندوستان کے سیاسی ارتقاء کی رفتار ہمارے شریک نہ ہونے سے رُک جائے گی۔ مَیں نے جو کچھ کہا ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ منتشر اور مختلف الخیال افراد کی شکل میں مسلمانوں کا شریکِ جنگ ہونا فائدہ سے زیادہ نقصان کے امکانات رکھتا ہے، اور یہ نقصان اُس نقصان سے بہت زیادہ ہے جو کچھ مدت تک اس جنگ سے علیحدہ رہنے کی صورت میں پہنچے گا، لہٰذا مسلمانوں کو اپنی تمام تر توجہ اس طرف صرف کرنی چاہیئے کہ کم سے کم مدّت میں اپنے اندر وہ طاقت پیدا کر لیں جو شریکِ جنگ ہونے کے لیے ضروری ہے۔ ایسے فیصلوں میں اگر دُوسرے ان سے متعرض نہ ہوں تو انہیں بھی دوسروں سے متعرض نہ ہونا چاہیئے۔

ہر شخص جسے خُدا نے تھوڑی سی عقل بھی دی ہے، خود سمجھ سکتا ہے کہ جہاں ایک طرف اکثریت ہو اور متحد و منظم ہو، اور دوسری طرف اقلیت ہو اور متفرق اور پراگندہ ہو، تو ان دونوں کے مساتھ کا انجام کیا ہوگا؟ ہمارا حال اس وقت یہ ہے کہ ہمارے درمیان کوئی چیز بھی متفق علیہ نہیں ہے۔ ایک گروہ کا نصب العین کچھ ہے اور دُوسرے کا کچھ اور ——— ایک گروہ جن امور کو قومی مفاد سے متعلق سمجھتا ہے، دوسرا گروہ کہتا ہے کہ ان کو قومی مفاد سے کوئی تعلق نہیں، اور تیسرا گروہ "قومی مفاد" کا نام ہی سُن کر "فرقہ پرستی" "فرقہ وارانہ ذہنیت" "ٹوڈیت" اور "رجعت پسندی" کے آوازے کسنے شروع کر دیتا ہے۔ ایک جماعت کسی مسئلے پر اسلامی حقوق کی حفاظت کے لیے جدّوجہد کرتی ہے اور دوسری جماعت غیر مسلموں کی فوج میں شامل ہو کر سب سے اگلی صفوں میں اس کا مقابلہ کرتی نظر آتی ہے۔ حد یہ ہے کہ ایک جماعت کونسلوں کے اجلاس یا کانگریس کے اجتماع سے نماز کے لیے اُٹھتی

ہے، اور اس سے دس گنی جماعت بیٹھی رہتی ہے، اور بیٹھنے ہی پر اکتفا نہیں کرتی بلکہ اس کے بعض افراد غیر مسلموں سے تقرب حاصل کرنے کے لیے علانیہ نماز پڑھنے والوں کی مذہبی دیوانگی پر طنز کرتے ہیں۔ غور کیجیے کہ اس سے بڑھ کر اور کون سی چیز ہماری قوم کی اجتماعی طاقت کو نقصان پہنچانے والی، ہماری ہوا اکھاڑ دینے والی، اور ہندوستان کی سیاسی میزان میں ہم کو ہلکا کر دینے والی ہو سکتی ہے؟ اس بیماری کو ساتھ لیے ہوئے آپ جدھر بھی جائیں گے آپ کا کوئی وزن نہ ہوگا اور آپ کسی ایسی چیز کی حفاظت نہ کر سکیں گے، جو مسلمان ہونے کی حیثیت سے آپ کو عزیز ہو۔

مگر اس کا یہ مفہوم لینا درست نہیں کہ ہم جو سیاسی جنگ میں کانگریس کے ساتھ شرکت کرنے سے انکار کر رہے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم تعطل چاہتے ہیں۔ درحقیقت معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اپنی قوم کی منتشر طاقتوں کو جمع کرنا خود ایک جنگ ہے۔ یہ جنگ اگر ہم شروع کر دیں تو اس کے دوران میں ایک طرف ہمارے زنگ خوردہ ہتھیاروں پر صیقل بھی ہوگا اور دوسری طرف ہماری منتشر طاقت جتنی جتنی مجتمع ہوتی جائے گی، ملک کی سیاسی میزان میں ہمارا وزن بھی اتنا ہی بڑھتا چلا جائے گا۔ بخلاف اس کے اگر ہم نے یہ دیکھ کر کہ فلاں جماعت نے اتنے معرکے سر کر لیے ہیں، اور فلاں گروہ اتنا طاقت ور ہو چکا ہے مرعوبانہ ذہنیت کے ساتھ کوئی طریق کار اختیار کیا، تو یہ مسلمانوں کی زندگی کا ثبوت نہ ہوگا بلکہ ان کی شکست خوردہ ذہنیت کا ہوگا۔

سیاسی جنگ اور جدید طبقہ

آپ نے اپنے مضمون "آنے والا انقلاب اور مسلمان" میں جدید تعلیم و تہذیب سے متاثر ہونے والے مسلمانوں پر بہت سخت تنقید کی ہے اور غالباً آپ کا مقصد یہ ہے کہ یہ لوگ مسلمانوں کی طرف سے سیاسی جنگ میں حصہ لینے کے اہل نہیں ہیں۔ میرے نزدیک یہ وقت ایسا نہیں ہے کہ ہم اپنے میں سے کسی

گروہ کو اس سیاسی جنگ سے خارج کرنے کی کوشش کریں، نہ اس کا موقع ہے کہ پرانے تعلیم یافتہ لوگ نئے تعلیم یافتہ طبقہ کو اس سیاسی جنگ سے یہ کہہ کر خارج کر دیں کہ تم اس کے اہل نہیں ہو، اور نہ اس کا موقع ہے کہ جدید تعلیم یافتہ لوگ پرانے تعلیم یافتہ بزرگوں کو اس مدافعانہ جنگ سے خارج کرنے کی کوشش کریں۔ بلکہ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ اس وقت سب مسلمان متفق، متحد، یک دل اور یک زبان ہو کر اس مدافعانہ جنگ میں حصّہ لیں اور کَاَنَّھُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ[1] کا مصداق بن کر دنیا پر ثابت کر دیں کہ مسلمان ابھی زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے اور دنیا کی کوئی طاقت، کوئی قوت، کوئی تدبیر اس نورِ الٰہی کو بجھا نہیں سکتی جس کے مسلمان حامل ہیں۔

جواب

یہ ارشاد بالکل بجا ہے کہ اس وقت مسلمانوں کو بنیان مرصوص بننے کی ضرورت ہے لیکن معترض کو میرے کن الفاظ سے یہ غلط فہمی ہوئی کہ میں مسلمانوں کو بنیان مرصوص دیکھنا نہیں چاہتا بلکہ ان کے درمیان پارٹیوں کا اختلاف پیدا کرنا چاہتا ہوں؟ حقیقت یہ ہے کہ کسی قوم کو ایک ٹھوس جماعت صرف اسی طرح بنایا جا سکتا ہے کہ اس کے افراد ایک نصب العین پر متفق ہوں اور جسم واحد بن کر اس کے لیے ایک طریق کار اختیار کریں۔ اس غرض کے لیے ہم کو نصب العین اور طریق کار دونوں کی توضیح کرنی پڑے گی اور جس طرح ہمارا یہ فرض ہوگا کہ قوم کے ان تمام افراد کو اپنے ساتھ ملا لیں جو اس نصب العین اور اس طریق کار سے متفق ہوں، اسی طرح ہمارے لیے یہ بھی ناگزیر ہوگا کہ ان افراد کے ساتھ غلظت و شدت برتیں جو اپنی خودسری یا منافقت کی بنا پر جماعت کا ساتھ دینے سے انکار کریں، عام اس سے کہ وہ نئے تعلیم یافتہ ہوں یا پرانے تعلیم یافتہ —— یہ بالکل بدیہی بات ہے کہ

---

[1] گویا وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔ (الصّف ۴)

مختلف مقاصد کے تحت مختلف اور متضاد راستوں کی طرف جانے والے افراد کو کسی طرح ایک بُنیانِ مرصوص نہیں بنایا جا سکتا۔

ہندو اور مسلمان

آپ نے بلا ضرورت جو ضمنی بحثیں چھیڑی ہیں ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے نزدیک گزشتہ ستر سال میں مغربی تعلیم سے مسلمانوں کو نقصان ہی نقصان پہنچا ہے اور مختصر یہ کہ وہ مسلمان نہیں رہے۔ یہ تسلیم ہے کہ ہم میں کچھ نہ کچھ خرابیاں بھی پیدا ہوئیں مگر یہ تسلیم نہیں ہے کہ ہماری موجودہ حالت اب سے ڈیڑھ صدی پہلے کی حالت سے زبوں تر ہے اور ہماری اخلاقی خرابیاں اور کمزوریاں پہلے سے زیادہ ہو گئی ہیں۔ اگر کسی قوم کا سیاسی زوال اور محکومیت اس میں اخلاقی خرابیاں پیدا کرنے کو مستلزم ہے تو ہندوؤں کو تو محکومیت کی حالت میں رہتے ہوئے ایک ہزار برس ہو گئے مگر ہم دیکھ رہے ہیں کہ ان کی موجودہ اخلاقی، تعلیمی اور اقتصادی حالت بمقابلہ ہزار برس پہلے کے بہت بہتر ہے۔

جواب

مسلمانوں کی حالت کو ہندوؤں پر قیاس کرنا میرے نزدیک قیاس مع الفارق ہے۔ ہندو قوم میں وحدتِ ملّی کا کوئی تصوّر نہ تھا۔ ان کا سوشل سسٹم ان کو متفرق کرنے والا تھا نہ کہ مجتمع۔ ان کے اندر ایسی رسمیں رائج تھیں جو گھن کی طرح ان کی قوم کو کھائے جا رہی تھیں۔ وہ دُنیا کی دوسری قوموں سے بالکل الگ تھلگ ہندوستان میں پڑے ہوئے تھے اور اسی کو دنیا سمجھتے تھے۔ اس حالت میں جب وہ مسلمانوں کے اور پھر انگریزوں کے زیرِ حکومت آئے تو اگرچہ غلامی کے ناگزیر نتائج سے محفوظ نہ رہ سکے، لیکن بحیثیت مجموعی ان کو نقصان سے بہت زیادہ فوائد حاصل ہوئے۔ ان میں وحدتِ قومی کا ایک تصوّر پیدا ہو گیا، ان کو اپنے سوشل سسٹم کی بہت سی خرابیوں کا احساس ہوا جس کی بدولت متعدد اصلاحی تحریکیں وجود میں آئیں، اور باہر سے علم و تہذیب کی جو روشنی ان تک پہنچی اس نے

ان کے خیالات کی دنیا کو بہت کچھ بدل دیا۔ علاوہ بریں اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ "ہندویت" کی اساس کسی عقیدے اور کسی اجتماعی عمل اور کسی نظامِ تہذیب پر قائم نہیں ہے بلکہ نسل اور مرز بوم کی وحدت پر مبنی ہے، اس لیے بیرونی اثرات سے ان کے قدیم عقائد اور طرزِ معاشرت اور افکار و اعمال میں خواہ کتنا ہی تغیر ہو جاتے ان کی "ہندویت" بہرحال برقرار رہتی ہے۔ اس پر مزید یہ کہ ان کے اپنے مذہب و تمدن میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو ایک ترقی پذیر قومیت کو وجود میں لا سکے۔ لہٰذا مغرب کے عمرانی و سیاسی تصورات، ان کے لیے بجائے مضر ہونے کے درحقیقت مفید ہیں۔ کیونکہ یہی چیز ان کے اندر زندگی اور حرکت پیدا کر سکتی ہے، اور اسی سے ان میں قومیت کا نشوونما ہو سکتا ہے۔

مسلمانوں کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ یہ قوم اپنی ایک وحدت اور نہایت طاقتور وحدت رکھتی تھی، اس کا سوشل سسٹم غایت درجہ صحیح و سالم تھا، جاہلانہ رسوم سے یہ بالکل پاک تھی، اس میں ایک اعلیٰ درجہ کی حضارت موجود تھی، اور یہ سب کچھ اسے صرف ایک چیز کی بدولت حاصل ہوا تھا جس کا نام "اسلام" ہے۔ ہندوستان میں دوسری قوموں کے ساتھ جب یہ قوم خلط ملط ہوئی، تو اس کی بلندی تو دوسروں کو پستی سے اُٹھانے کی موجب ہوئی، مگر دوسروں کی پستی نے خود اس کو بلندی سے گرانا شروع کر دیا۔ اس نے دوسروں سے نسلی و وطنی عصبیت لی، نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی وحدت پارہ پارہ ہونے لگی۔ اس نے دوسروں سے جاہلیت کی رسوم لیں، نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی قومی طاقت کو گھن لگ گیا۔ اس نے اپنے سوشل سسٹم میں دوسروں کے طریقے داخل کر لیے، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ توازن اور اعتدال بگڑتا چلا گیا جو اس سسٹم کا طرۂ امتیاز تھا۔ اس نے دوسروں کے عقائد و افکار کو بغیر سوچے سمجھے قبول کرنا شروع کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ یہ اپنے مذہب سے دور ہٹتی چلی گئی، حالانکہ مذہب ہی اس کی قومیت اور اس کے اخلاق، تہذیب اور تمدن کا قوام تھا۔ یہی چیز آخر کار اس قوم کے سیاسی زوال کی باعث ہوئی، اور اس نے حکومت کے مقام سے گرا کر اسے غلامی کی لعنت میں مبتلا کر دیا۔ غلامی کے دور میں

جو مزید خرابیاں اس قوم میں پیدا ہوئیں، ان کو میں تفصیل کے ساتھ بیان کر چکا ہوں۔ اگر آپ انصاف کی نظر سے دیکھیں گے تو آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا، کہ مغربی استیلاء سے مسلمانوں پر جو اثرات مترتب ہوئے وہ ان اثرات کے بالکل برعکس ہیں جو ہندوؤں پر مترتب ہوئے ہیں۔ ہندوؤں کو اس نے پستی سے اٹھایا اور مسلمانوں کو اور زیادہ پستی میں گرا دیا۔ اس نے ہمارے اخلاق، عقائد، تہذیب و تمدن اور نظامِ معیشت و معاشرت کو جو نقصان پہنچایا ہے وہ ان جزوی فوائد کے مقابلہ میں بدرجہا زیادہ ہے جو مغربی تعلیم و تہذیب سے ہمیں حاصل ہوئے ہیں۔

مسلمانوں پر مغربی تہذیب اور مغربی تعلیم کے اثرات کا ذکر میرے مضامین میں محض ایک ضمنی بحث کی حیثیت سے نہیں آیا ہے بلکہ میں قومی امراض کی تشخیص اور ان کی شدت کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے ضروری سمجھتا ہوں کہ منجملہ دوسرے اسبابِ زوال کے ان اثرات کا بھی پوری طرح جائزہ لیا جائے۔

مسلمانوں کی اصل ضرورت

نئی تعلیم اور پرانی تعلیم کی بحث دراصل دور از کار ہے۔ نئے تعلیم یافتہ ہوں یا پرانے، وہ سب مل کر مسلمانوں کی کل آبادی کے مقابلہ میں آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔ ہمارے سیاسی مستقبل کا دارومدار زیادہ تر کاشت کاروں اور مزدوروں کے اس بے زبان طبقے پر ہے جس نے نہ تو پرانی تعلیم حاصل کی ہے اور نہ نئی۔ یہ لوگ مسلمانوں کی آبادی کا ۹۰ حصہ بلکہ اس سے بھی زیادہ ہیں، اس لیے ہم سب کا خواہ پرانے تعلیم یافتہ ہوں یا نئے، یہ فرض ہے کہ اس طبقہ کی اصلاح کریں، اس میں اپنے حقوق سمجھنے کا مادہ پیدا کریں، اور ان میں اس قسم کی استعداد پیدا کریں کہ وہ اپنے حق رائے دہندگی کو مسلمانوں کے مفاد کے لیے استعمال کر سکیں۔ اگر ہم ایسا کرنے میں کامیاب ہو گئے تو سمجھیے کہ ہم نے سیاسی جنگ جیت لی۔

جواب

درحقیقت یہی کام تو ہمارے پیشِ نظر ہے۔ ہم کو سب سے بڑا خطرہ یہ ہے

کہ ہمارے عوام جن کو اسلام کی تعلیمات سے کسی قسم کی واقفیت نہیں ہے، جو افلاس اور فاقہ کشی میں مبتلا ہیں، جن کو اسلامی تہذیب و تمدن کی گرفت میں رکھنے کے لیے کوئی نظام موجود نہیں ہے، جن میں جاہلیت کی رسوم پھیلی ہوئی ہیں، اور جو اسلامی تعلیم و تمدن کے اثر سے دُور رہنے کی بدولت ہندوستان کی آبادی کے سوادِ اعظم سے ہم رنگ ہو گئے ہیں، کہیں اشتراکیت اور نزاعِ طبقات کی اِس تبلیغ کا شکار نہ ہو جائیں جو اس وقت "قوم پرست" جماعت کی طرف سے کی جا رہی ہے۔ ہمیں اندیشہ ہے کہ اِن مسلمانوں کے پست طبقات کو یہ تحریک اسلام کا علم اور شعور رکھنے والے طبقات سے جُدا کر دے گی، معاشی کش مکش برپا کر کے ان کے درمیان عداوت ڈال دے گی، اور جب یہ طبقے اپنی قوم کے اہلِ دماغ گروہ کی رہنمائی سے محروم ہو جائیں گے، تو ان کی جہالت اور ان کے افلاس سے فائدہ اُٹھا کر انہیں اقتصادی مساوات کا سبز باغ دکھایا جائے گا، اور اس بہلانے سے ان کو غیر مسلم عوام میں جذب کر لیا جائے گا۔ یہ اندیشہ اس وجہ سے اور زیادہ بڑھ گیا ہے کہ اب تک "قوم پرست" تحریک کے مبلغین اور مسلم عوام کے درمیان جو دیوار حائل تھی، جس کی وجہ سے مسلم عوام ان کی تبلیغ کو سُننے تک کے روادار نہ تھے، اسے ہمارے علمائے کرام اپنی ناعاقبت اندیشی سے منہدم کر رہے ہیں۔ ان کے اس فعل کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مسلم عوام آہستہ آہستہ ان لوگوں کی باتیں کان دھر کے سُننے لگیں گے، اور چونکہ یہ لوگ علانیہ تبدیلِ مذہب کی تلقین نہیں کرتے، بلکہ ان اشتراکی خیالات کی تبلیغ کرتے ہیں جو مفلس طبقوں کے دل و دماغ پر بڑی آسانی کے ساتھ چھا جاتے ہیں، اِس لیے ہمارے عوام رفتہ رفتہ ان کے جال میں پھنستے چلے جائیں گے اور آخر کار یہ چیز اُمتِ مسلمہ کو پارہ پارہ کر دینے، اور جمہور مسلمین کو غیر مسلم سوادِ اعظم میں مدغم کر دینے کی موجب ہو گی۔ علمائے کرام آج جس چیز کو سمجھانے سے بھی نہیں سمجھ رہے ہیں، کل وہ چیز حقیقت بن کر ان کے سامنے آئے گی اور ایسی حالت میں آئے گی کہ اس کا علاج ان کی قدرت سے باہر ہو گا۔ اس وقت ان حضرات کی آنکھیں کھُلیں گی اور

انہیں معلوم ہوگا کہ جو تیر انہوں نے اندھیرے میں چلایا تھا وہ انگریزی سامراج کے بجائے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کے سینے میں پیوست ہوا ہے۔

ان خطرات کا سدِباب اگر کسی صورت سے ہو سکتا ہے تو وہ صرف یہی ہے کہ مسلمانوں میں ایک فعال جماعت ایسی اُٹھ کھڑی ہو جو جمہورِ قوم میں جا کر ایک طرف تو ان کے اندر اسلام کی جوہری تعلیم پھیلائے، رسومِ جاہلیت کو مٹائے، ان کو اسلامی تہذیب و تمدّن کے اصولوں سے باخبر کرے اور دوسری طرف ان کی روٹی کے مسئلہ کو اسلامی اصولوں کے مطابق حل کرے۔ ہم اشتراکی تحریک کی جو مخالفت کرتے ہیں اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم ظالمانہ سرمایہ داری اور ناجائز اغراض رکھنے والے طبقوں کے حامی ہیں۔ بلکہ دراصل اسلام کے متبع ہونے کی حیثیت سے ظالمانہ سرمایہ داری کو مٹانے اور مفلس طبقوں کی مصیبتوں کو حل کرنے کے لیے ہم خود اپنے اصول رکھتے ہیں اور وہ اشتراکیت کے اصولوں سے بالکل مختلف ہیں۔ ہم اپنی قوم کے معاشی مسائل کو خود اپنے ہی اصولوں کے مطابق حل کرنا چاہتے ہیں اور یہ گوارا نہیں کر سکتے کہ اشتراکیت کے علمبردار ہمارے جمہور پر قابض ہو کر اپنے طریقوں سے اُمتِ مسلمہ کو پارہ پارہ کر دیں۔ ہمارے سامنے اس وقت صرف معاشی اور سیاسی سوال ہی نہیں ہے بلکہ اس سے بڑھ کر اپنی تہذیب کی حفاظت کا بھی سوال ہے۔ اس لیے ہم کو اپنے جمہور کی تنظیم کرنے میں اسلامی اصول اختیار کرنے چاہئیں۔ ہمارے لیے گاندھی اور جواہرلال کا اسوہ قابلِ اتباع نہیں، بلکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ ہے جس کی پیروی ہم کو کرنی چاہیے۔ خداپرستوں کی تنظیم کے جو اصول ساڑھے تیرہ سو برس پہلے استعمال کیے گئے تھے، وہ صرف اسی زمانہ کے لیے نہ تھے۔ بلکہ تمام زمانوں اور علاقوں کے لیے تھے۔ ان کو عمل میں لانے کے طریقے اور وسائل زمانی و مکانی حالات کے لحاظ سے بدل سکتے ہیں۔ مگر وہ اصول بجائے خود اٹل ہیں۔ اور آپ جس ملک اور جس زمانہ میں بھی خدا پرست قوم کی تنظیم کرنا چاہیں گے آپ کو انہی اصولوں کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ باطل کا اقتدار جب پوری طرح چھایا ہوا ہوتا ہے

اس وقت لوگوں کو شبہ ہونے لگتا ہے کہ ان اصولوں پر عملدرآمد غیر ممکن الوقوع ہے یا اگر ممکن بھی ہے تو اس کے لیے صدیاں درکار ہیں۔ لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ غیر ممکن چیز ہر وقت ممکن ہو سکتی ہے، اور دیکھتے دیکھتے ہوا کا رخ بدل سکتی ہے البتہ اس کے لیے ایک کڑی شرط یہ ہے کہ اس مشین کو صرف وہی اخلاقی طاقت حرکت میں لا سکتی ہے جو سیرتِ محمدی کے سرچشمہ سے ماخوذ ہو۔ جن لوگوں میں باطل سے مرعوب ہو جانے اور ہر بڑھتی ہوئی طاقت کے آگے سر جھکا دینے کی کمزوری موجود ہو، اور جو لوگ اتنی استقامت نہ رکھتے ہوں کہ سخت سے سخت طوفان میں بھی راہِ راست پر جمے رہ سکیں، ان کے ہاتھوں سے یہ مشین کبھی حرکت نہیں کر سکتی۔ مسلمانوں کے لیے تنظیم کے کسی نئے پروگرام کی ضرورت نہیں۔ پروگرام تو بنا بنایا موجود ہے۔ کمی صرف ایک ایسے رہنما اور چند ایسے کارکنوں کی ہے جو اپنے مقصد میں اپنے نفس اور ہوائے نفس کو فنا کر سکتے ہوں، جن کے دل نام و نمود کی بھوک، ذاتی وجاہت کی پیاس، مال و زر کی حرص، اور نفاق و حسد کی آگ سے پاک ہوں، جن میں حق کو سربلند کرنے کا ایسا ارادہ موجود ہو جو کسی حالت میں ٹل نہ سکتا ہو اور جن میں اتنی صلاحیت ہو کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کے طریقہ پر نظم کے ساتھ کام کر سکیں۔

سلطنت در سلطنت

آپ اسلامی حقوق کی حفاظت کے لیے آئینی ضمانتوں کو بے فائدہ قرار دیتے ہیں۔ اس بنا پر کہ جب تک کہ ان ضمانتوں کی پُشت پر کوئی (Sanction) نہ ہو، اکثریت ان کی پابندی کے لیے مجبور نہیں ہو سکتی۔ اس کے مقابلہ میں آپ چاہتے ہیں کہ مسلمان سلطنت کے اندر ایک سلطنت بنانے کی کوشش کریں۔ مگر بعینہٖ وہی اعتراض آپ کی اس تجویز پر بھی تو ہو سکتا ہے۔ مسلمانوں کے پاس وہ کونسی طاقت ہوگی جو اس "سلطنت در سلطنت" کے احکام کو اکثریت کی مرضی کے خلاف نافذ کر سکے گی؟ فرض کیجیے کہ اکثریت یہ قانون نافذ کرتی ہے کہ ہندوستان میں گائے کی قربانی

یک قلم موقوف ہو جائے ۔مسلمانوں کی یہ "سلطنت در سلطنت" اس کو کیسے روک سکے گی؟ فرض کیجیے کہ کوئی مسلمان مرتد ہو جائے ۔ آپ اس کو رجم کی سزا کیسے دے سکیں گے؟ فرض کیجیے کہ آپ حدِ زنا جاری کرنا چاہتے ہیں ۔ کیونکر ممکن ہے کہ آپ مرتکبینِ زنا کے ساتھ غیر مسلم زانیوں یا زانیات پر بھی حد جاری کر سکیں؟

جواب

"سلطنت در سلطنت" ایک مبہم اصطلاح ہے ، جس کا اطلاق ایک حکومت کے حدودِ اقتدار میں کسی دوسرے نظام کی قوت و اثر کے مختلف مدارج پر ہوتا ہے ۔ اس قوت و اثر کے دائرے کا وسیع یا محدود ہونا دراصل منحصر ہے اُس نظام کی مضبوطی اور اس کے حامیوں کی معنوی طاقت کے کم یا زیادہ ہونے پر ۔ واقعات کی دنیا میں اقلیت و اکثریت کوئی اہم چیز نہیں ہے ۔ اصل چیز نظم اور اجتماعی ارادہ کی طاقت ہے ۔ اسی طاقت سے قلیل التعداد انگریز اپنے سے ہزار گنی اکثریت پر حکمران ہے ۔ ایک جمہوری نظامِ حکومت میں بھی "اقتدارِ اکثریت (Majority-rule)" کے قاعدہ کو ایک منظم اور قوی الارادہ اقلیت بے اثر یا کم اثر بنا سکتی ہے ۔ پس یہ سوال کہ وہ "سلطنت در سلطنت" جو مَیں تجویز کر رہا ہوں کن حدود تک وسیع ہو گی، اس حالت میں طے نہیں ہو سکتا جب کہ ہم سرے سے کوئی نظم اور کوئی اجتماعی ارادہ ہی نہیں رکھتے ۔ پہلے ہم کو یہ طاقت فراہم کرنی چاہیئے ۔ پھر ہم جتنی طاقت فراہم کر لیں گے ، اسی کی نسبت سے "سلطنت در سلطنت" کے حدود وسیع یا محدود ہوں گے ۔

شبہ دارالاسلام

آپ کہتے ہیں کہ اگر ہم دارالاسلام قائم نہیں کر سکتے تو کم از کم شبہ دارالاسلام ہی قائم کرنے کی کوشش کریں ۔ لیکن مَیں کہتا ہوں کہ جو نظامِ حکومت اس وقت قائم ہے یا جو آئندہ آئینی ضمانتوں کے تحت قائم ہو گا وہ بھی تو شبہ دارالاسلام ہو گا ۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ موجودہ نظامِ حکومت دارالاسلام نہیں ہے اور دارالحرب

بھی نہیں ہے، لہٰذا ان معنوں کے بین بین جو صورت بھی ہوگی، اس پر بلا شبہ دار الاسلام ہی کا اطلاق ہونا چاہیئے۔

جواب

بلا شبہ دار الاسلام سے میری مراد ایک ایسا نظام سیاست ہے جو خالص "دار الکفر" کی بہ نسبت خالص "دار الاسلام" سے زیادہ اقرب ہو۔ ہندوستان کی موجودہ حالت یہ نہیں ہے۔ اس میں مسلمانوں کو بحیثیت ایک قوم کے کسی طرح کی بھی خود اختیاری حاصل نہیں۔ جو برائے نام مذہبی اور تمدنی آزادی ان کو دی گئی ہے وہ غیر مسلم حکمرانوں کی عطا کردہ چیز ہے جس کے حدود کو کم یا زیادہ کرنا ان کے اپنے اختیارِ تمیزی پر موقوف ہے۔ ہمارے جن مذہبی احکام کو وہ اپنے اصول کے مطابق درست نہیں سمجھتے، ان کے نفاذ کو روک دیتے ہیں اور جو مذہبی احکام ان کی مصلحتوں کے خلاف ہیں ان کو بھی نافذ نہیں ہونے دیتے۔ اس کے بعد صرف وہ احکام رہ جاتے ہیں جو ان کی نگاہ میں بے ضرر ہیں، ان کے نفاذ کی وہ ہمیں اجازت دے دیتے ہیں۔ لیکن اس آزادی کے دائرے میں بھی ہم ان کے اقتدار کے بلا واسطہ اثر سے محفوظ نہیں ہیں۔ انہوں نے تعلیم کا جو نظام قائم کیا ہے وہ ہمارے مذہب اور تہذیب کے اصولوں کا مخالف ہے اور اس کے اثر سے ہماری نوجوان نسلوں کا ایک بڑا حصہ ان مذہبی احکام سے بھی روگردانی کرنے لگتا ہے جن کی بجا آوری میں ہم آزاد چھوڑے گئے ہیں۔ انہوں نے جو نظام معیشت قائم کیا ہے اس کی گرفت میں ہم اس قدر بے بس ہو چکے ہیں کہ ہمارے لیے اسلامی اصولِ معیشت کی پابندی قریب محال ہو گئی ہے۔ اگرچہ ظاہر میں کوئی قانون ایسا نہیں ہے جو ہم کو اپنے اصولوں کی پابندی سے روکتا ہو۔ اسی طرح ان کا نظام عدالت و قانون اور ان کا آئین حکومت ایسا ہے جو ہمارے اخلاق، معاشرت، تمدن، ہر چیز پر بلا واسطہ اثر ڈالتا ہے، اور اس کے مقابلہ میں ہم اس درجہ بے اختیار ہیں کہ اپنی حفاظت کے لیے کوئی کارگر تدبیر عمل میں نہیں لا سکتے۔ ان سب پر مزید یہ کہ غیر مسلم طاقت کا اقتدارِ مطلق فی نفسہ ایک زبردست اثر رکھتا ہے۔

جو طاقت کم از کم ظاہر کے اعتبار سے رزق کے خزانوں کی مالک اور عزت و ذلت بخشنے
کی مختار نظر آتی ہو، محکوم قوم اس سے تقرب حاصل کرنے کے لیے اپنی وہ بہت سی
چیزیں بھی اس کے قدموں میں لا کر ڈال دیتی ہے جنہیں وہ اس سے بجز نہیں مانگتی۔
ایسی حالت جس ملک کی ہو وہ اگر خالص دار الکفر نہیں تو اس سے اقرب ضرور ہے۔ اس
لیے اسے شبہ دار الکفر کہنا چاہیے نہ کہ شبہ دار الاسلام۔

میں جس چیز کی طرف مسلمانوں کے سیاسی فکر رکھنے والے لوگوں کو توجہ دلا رہا
ہوں وہ یہی ہے کہ انہیں اس حالت کو بدلنے کے لیے اپنی قوتوں کو جمع کرنا چاہیے۔
اگر اس کو بدلنا ہے تو اس کی تیاری کا یہی وقت ہے۔ انقلابی دور میں ایک حالت سے
دوسری حالت کی طرف انتقال کا عمل جاری ہوتا ہے۔ اس وقت ہم نسبتاً زیادہ آسانی
کے ساتھ آنے والی حالت کی شکل معین کرنے میں اپنا اختیار استعمال کر سکتے ہیں۔ جب
وہ ایک خاص صورت میں ڈھل جائے گی اور پوری طرح مستحکم ہو جائے گی اس وقت
ہمارے لیے اختیار استعمال کرنے کا شاید کوئی موقع باقی نہ رہے گا۔ گزشتہ صدی کے
ابتدائی دور میں ہم نے غفلت کی اور اس شبہ دار الکفر کو نہ صرف قائم ہو جانے دیا بلکہ
اپنے ہاتھوں سے اس کے قائم ہونے میں مدد دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم بالکل بے بس ہو کر
اس کی گرفت میں جکڑے گئے۔ اور آج ہر شخص دیکھ رہا ہے کہ ہمارے لیے اس کی
بندشوں میں سے کسی چھوٹی سے چھوٹی بندش کو توڑنا بھی کس قدر مشکل ہے۔ اسی سے
سبق حاصل کرنا چاہیے کہ اگر ہم نے ہندوستان کے سیاسی انقلاب کو موجودہ رفتار پر چلنے
دیا۔ اور کوئی ایسی منظم طاقت فراہم نہ کی جس سے ہم اس کی سمت متعین کرنے میں
خود اپنا اختیار بھی استعمال کر سکیں، تو نتیجہ یہ ہوگا کہ اس شبہ دار الکفر کی جگہ ایک دوسرا
شبہ دار الکفر لے لے گا، اور اس کے مستحکم ہو جانے کے بعد ہم اس کی گرفت میں بھی
اتنے ہی بے بس ہوں گے جتنے اس وقت ہیں۔ یہ ایک ایسی کھلی ہوئی بات ہے
جس کو سمجھنے کے لیے کسی گہرے تفکر کی ضرورت نہیں، محض عقلِ عام (Common Sense)
رکھنے والا ایک عامی بھی اس کو سمجھ سکتا ہے، مگر یہ ناساعد حالات کی طاقت کا کرشمہ

ہے کہ ایسی واضح بات کو سمجھانے کے لیے بھی دلائل کی ضرورت پیش آرہی ہے اور قائل
کے زور ست بھی اس کو دلوں میں اتارنا مشکل ہو رہا ہے۔ جو لوگ پہلے ہندوستانی اور
پھر سب کچھ ہیں وہ اگر اسے ماننے سے انکار کریں تو جائے تعجب نہیں، اس لیے کہ
ان کی نگاہ میں مسلمانوں کی قومی زندگی کا سوال کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتا۔ ان کا ضمیر
تو پہلے ہی فیصلہ کر چکا ہے کہ "شبہ دار الکفر ہو یا خالص دار الکفر، ہمیں صرف آزاد ہندوستان
چاہیے جس میں ہمارے رزق کے خزانے خود ہمارے اپنے ہاتھوں میں ہوں۔" لیکن جو
لوگ پہلے مسلمان اور پھر سب کچھ ہیں ان پر مجھے سخت حیرت ہے کہ وہ اس کو
سمجھنے سے کیوں انکار کرتے ہیں۔

مصالحت کے امکانات

آئینی ضمانتوں پر تو بہر حال برطانوی حکومت اور ہندوستان کی اکثریت کو راضی کیا جا
سکتا ہے اور یہ ایک قابلِ عمل چیز نظر آتی ہے، لیکن "سلطنت در سلطنت" کا تخیل تو
ہے ہی ایسا جس پر نہ برطانوی حکومت راضی ہو سکتی ہے اور نہ ہندوستان کی اکثریت۔
یہ نام درمیان میں آ جانے کے بعد تو مصالحت کا دروازہ ہی بند ہو جاتا ہے۔

جواب

اس سے پہلے میں جو کچھ بیان کر چکا ہوں اس کو غور سے پڑھنے کے بعد مجھے
اُمید ہے کہ معترض صاحب اپنی اس رائے پر نظرِ ثانی کریں گے۔ آئینی ضمانتیں اور
ان پر اکثریت کی رضامندی ایسی چیز نہیں ہے جس کے بل پر کوئی قوم زندہ رہ سکتی ہو۔
اگر ان ضمانتوں کی پُشت پر ہماری اپنی طاقت نہ ہو تو ان کا قائم رہنا یا نہ رہنا بہر حال
اکثریت کی رضامندی پر موقوف ہوگا، اور اس کے معنی یہ ہیں کہ ہندوستان کے
آئندہ نظامِ سیاست میں اکثریت کے اقتدار کی وہی حیثیت ہو جو اس وقت
انگریزی اقتدار کی ہے، اور اس کے دستِ قدرت میں ہم ویسے ہی بے بس ہوں
جیسے اب ہیں۔

اکثریت کے منظور کرنے یا نہ کرنے پر جس "سلطنت در سلطنت" کا مدار ہو،

اس نام سے موسوم کیے جانے کے قابل ہی نہیں ہو سکتی۔ یہ تو وہ چیز ہے جس کو ایک جماعت کا طاقت ور اجتماعی ارادہ قائم کرتا اور قائم رکھتا ہے، خواہ کوئی اس پر راضی ہو یا نہ ہو۔

ہندوستان کی سیاسی ترقی

یہ سلطنت در سلطنت کا تخیل ہندوستان کا سیاسی ترقی کے لیے بھی تو مفید نہیں ہے اگر اسی طرح ہندوستان کی ہر قوم سلطنت کے اندر ایک سلطنت بنانے کے لیے اُٹھ کھڑی ہو تو فی الواقع ہندوستان میں کوئی سلطنت قائم ہی نہیں ہو سکتی بلکہ اس کی جگہ فرقہ وارانہ انارکی لے لے گی۔

جواب

میں نصب العین والے مضمون میں ان کم سے کم حقوق اور اختیارات کی توضیح کر چکا ہوں جو ہندوستان میں مسلمانوں کی قومی زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہیں۔ "سلطنت در سلطنت" سے میری مراد مسلمانوں کا ایک ایسا اجتماعی نظام ہے جو انہی حقوق اور اختیارات کو استعمال کرے اور جس میں اتنی طاقت ہو کہ اگر کوئی ان حقوق اور اختیارات میں کمی کرنا چاہے بھی تو نہ کر سکے۔ آپ اس مضمون کو غور سے دیکھیے۔ اس میں جن حقوق اور اختیارات کا ذکر کیا گیا ہے، ان میں کون سی چیز ایسی ہے جو مشترک ہندوستانی مفاد کے لیے ہم کو دوسری ہمسایہ اقوام کے ساتھ پورا پورا تعاون کرنے سے روکتی ہو؟

اگر ہندوستان کی دوسری قومیں بھی اپنے مخصوص قومی مفاد کے لیے اس قسم کی خود اختیاری (Autonomy) حاصل کرلیں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں اور ان سب کو ایسی خود اختیاری حاصل ہونے کے بعد بھی ہندوستان کا مشترک نظامِ حکومت بخوبی چل سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جن حضرات نے صرف نظری سیاسیات (Theoretical Politics) کا مطالعہ کیا ہے وہ "سلطنت در سلطنت" کا نام سن کر کان کھڑے کرتے ہیں اور

سمجھتے ہیں کہ یہ ایک ناقابلِ عمل چیز ہے، لیکن عملی سیاسیات میں وسیع یا محدود پیمانے پر "سلطنت در سلطنت" کا وجود قریب قریب ہر ترقی یافتہ ملک میں پایا جاتا ہے اور سیاسی انصاف کے لیے اس کا وجود ناگزیر ہے۔ جہاں سلطنت کا غلبہ اتنا بڑھ گیا ہے کہ ملک کے تمام دوسرے طبقے "سلطنت در سلطنت" سے محروم ہو گئے ہیں، وہاں ظلم اور بے انصافی کا فقدان ہے۔ علاوہ بریں واقعات اس کا ثبوت دیتے ہیں کہ "سلطنت در سلطنت" ناقابلِ عمل چیز نہیں ہے۔ ہندوستان کے آئندہ نظامِ حکومت کی ترقی میں یہ اگر حارج ہو سکتی ہے تو صرف اس صورت میں جب کہ اس ملک کی مختلف قوموں کے اندرونی "نظامات" ایک دوسرے کے خلاف جارحانہ طرزِ عمل اختیار کریں، اور اپنی مرضی کو زبردستی دوسروں پر مسلط کرنا چاہیں۔ لیکن ہمیں اس نوعیت کی سلطنت در سلطنت مطلوب نہیں ہے جو انارکی اور خانہ جنگی برپا کرنے والی ہو۔ خالص دارالاسلام سے کم جس چیز کو ہم حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ اولاً ہمیں خود اپنے اصولوں کے مطابق اپنے گھر کی تنظیم و اصلاح کرنے کا اختیار و اقتدار حاصل ہو۔ ثانیاً ہندوستان کی سیاسی زندگی میں ہم کو اتنا اثر حاصل ہو کہ اس ملک کا سیاسی و تمدنی ارتقاء ہمارے اصولِ تہذیب اور مصالحِ قومی کے خلاف راستہ اختیار نہ کرنے پائے۔ اور اتفاقاً اگر یہ ارتقاء ایسا کوئی راستہ اختیار کر رہا ہو تو ہم اتنے بے بس نہ ہوں کہ اپنی اجتماعی طاقت سے اس کو روک نہ سکیں۔ یہی تین عنصر ہیں کہ اس مفہوم کی تکمیل کرتے ہیں، جسے میں "سلطنت در سلطنت" سے تعبیر کر رہا ہوں، اور یہ ایسی چیز ہے کہ اگر مسلمانوں کے علاوہ ہندوستان کی دوسری قوموں کو بھی یہ حاصل ہو، تو اس سے کوئی بدنظمی واقع نہیں ہو سکتی۔ اسلامی نقطۂ نظر کو چھوڑ کر اگر آپ محض عقل کی رو سے انصاف کا تقاضا معلوم کرنا چاہیں تو وہ صرف یہ ہے کہ جب ہندوستان تمام قوموں کا مشترک وطن ہے اور اس کی خوش حالی و ترقی سب کے عمل اور سب کی محنتوں اور قابلیتوں کا نتیجہ ہے تو یہاں کسی قوم کو بھی اتنا با اقتدار نہ ہونا چاہیے کہ وہ اپنی مرضی کو دوسروں پر مسلط کر دے اور نہ کسی قوم کو اتنا بے بس ہونا چاہیے کہ وہ اپنی اُن چیزوں کی حفاظت

بھی نہ کر سکے جنہیں وہ جان و مال سے زیادہ عزیز رکھتی ہو۔

خوف و ہراس

آپ کے اندازِ تحریر سے خوف و ہراس کی بُو آتی ہے۔ آپ ہندوؤں سے ڈرتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کو کھا جائیں گے۔ کیا یہ خوف محض اس وجہ سے ہے کہ وہ کثیر التعداد ہیں اور مسلمان ان کے مقابلہ میں قلیل التعداد ہیں؟ کیا قرآن آپ کو یہی سکھاتا ہے کہ قوت اور غلبہ کا مدار کثرت اور قلت پر ہے؟ کیا اس سے بڑھ کر بھی اور کوئی بزدلی ہو سکتی ہے کہ مسلمان ان مشرکین سے ڈر جائیں جو ۳۳ کروڑ خداؤں کو پوجتے ہیں؟ مسلمان ایک موحد قوم ہے۔ اس کے پاس قرآن جیسی کتاب ہے۔ اس کے اندر ایمان کی حرارت ہے کیونکر ممکن ہے کہ کفار و مشرکین اس پر غالب ہو جائیں؟ مسلمانوں کو اپنی قوت پر اعتماد ہونا چاہیئے، اور اسی اعتماد پر آزادی کی جنگ میں شریک ہونا چاہیئے۔ اگر ان میں عزم اور ہمت ہو تو کسی قوت سے بھی انہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ ان پر دوسروں کا رنگ کیا چڑھے گا۔ ان کے پاس تو صبغۃ اللہ ہے جو تمام رنگوں پر غالب آنے والا ہے۔

جواب

یہ اعتراض چند در چند غلط فہمیوں کا نتیجہ ہے، اور زیادہ تر ان لوگوں کی طرف سے پیش کیا گیا ہے جنہیں سوچنے سے پہلے بول دینے کی عادت ہے۔ انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ ہمیں خوف ہندوؤں کی طاقت سے نہیں بلکہ مسلمانوں کی کمزوریوں، اور ان کمزوریوں سے ہے جنہیں قرآن نے قوموں کے اسباب زوال و فنا میں شمار کیا ہے۔

قرآن کسی جگہ بھی یہ نہیں کہتا کہ مسلمان صرف اسی بنا پر دنیا میں غالب ہوں گے کہ ان کے نام عبداللہ اور عبدالرحمان ہیں اور کفار صرف اس بنا پر ان سے مغلوب ہو جائیں گے کہ وہ شیام سندر یا ارجن جیسے ناموں سے موسوم ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو قرآن اس تیرہ سو برس کی تاریخ میں نعوذ باللہ ہزاروں مرتبہ جھوٹا ثابت ہو چکا ہوتا۔ اگر ایسا ہوتا تو خصوصیت کے ساتھ گزشتہ دو سو برس کی تاریخ کا ایک ایک لمحہ اس کے "جھوٹ" کا

زندہ ثبوت ہوتا (معاذ اللہ) یہ قرآن رکھنے والے موحد مسلمان جن کا آپ ذکر فرما رہے ہیں، چین سے لے کر مراکش تک پھیلے ہوئے ہیں۔ کروڑوں کی تعداد میں ہیں۔ مگر کیا یہ چین کے بت پرستوں سے، روس کے ملحدوں سے، انگلستان، فرانس، ہالینڈ اور اٹلی کے تثلیث پرستوں سے مغلوب نہیں ہیں؟ یہی قرآن رکھنے والے موحد مسلمان صقلیہ اور اندلس میں بھی تھے۔ مگر کیا یہ وہاں سے حرفِ غلط کی طرح مٹا نہیں دیئے گئے؟ یہی قرآن رکھنے والے موحد فتنۂ تاتار کے زمانہ میں بھی تھے۔ مگر کس چیز نے ان کی تہذیب اور ان کی عظیم الشان سیاسی طاقت کو مشرکین تاتار کے ہاتھوں تباہ ہونے سے بچا لیا؟

یہ دنیا حقائق کی دنیا ہے، خوا ل کی دنیا نہیں ہے۔ آپ کلمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ پڑھ کر سمجھتے ہیں کہ کوئی منتر آپ کو سکھا دیا گیا ہے جسے پڑھتے ہی طلسم کے پتلے غیب سے پیدا ہوں گے اور کفار کو تہ تیغ کر دیں گے۔ آپ قرآن اپنے گھر میں رکھ کر سمجھتے ہیں کہ کوئی تعویذ آپ کے پاس آیا ہوا ہے جس کا بس گھر میں موجود ہونا ہی اسے تمام آفاتِ ارضی و سماوی سے محفوظ کر دے گا اور خدا اپنے قانونِ فطرت کو آپ کے لیے بدل ڈالے گا۔ وہ تمام اخلاقی عیوب اور وہ تمام قومی امراض اپنے اندر پالتے رہیئے جو کفار و مشرکین اور منافقین کے خصائص میں سے ہیں۔ اور پھر یہ پندار بھی اپنے دماغ میں رکھیے کہ ہم وہی مومن ہیں جن سے اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ کا وعدہ کیا گیا تھا۔ اور جب کوئی یاد دلائے کہ ان کمزوریوں کے ساتھ آپ کسی انقلاب کے طوفان میں زندہ نہیں رہ سکتے تو اس کو بزدلی کا طعنہ دیجئے۔ یہ اگر بہادری اور عقلمندی ہے تو ایسی بہادری اور عقل مندی آپ ہی کو مبارک رہے۔ میں تو اسے خام خیالی اور طفل تسلی سمجھتا ہوں۔ میرے نزدیک یہ زندگی کے نہیں تباہی کے لچھن ہیں۔ میں اس سپہ سالار کو احمق سمجھتا ہوں جو اپنی فوج کے کمزور پہلوؤں سے آنکھیں بند کر لیتا ہے، جو شیلے الفاظ سے اس میں طاقت کا جھوٹا پندار پیدا کرتا ہے، اور اسے خطابت کی شراب پلاتا ہے، تاکہ وہ مدہوش ہو کر تباہی کی خندقوں میں کود پڑے۔

بے شک کثرت و قلت پر غلبہ و قوت کا مدار نہیں ہے یقیناً کَمْ مِّنْ فِئَةٍ

فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ[1] ایک حقیقت ہے۔ مگر کچھ سوچا بھی ہے کہ وہ کون سی اقلیت ہے جو اکثریت پر غالب آتی ہے؟ وہ اقلیت جس میں نظم ہو، جس میں اطاعت امر ہو، جس میں وحدت ہو، جس میں ایک نصب العین پر کامل اتفاق ہو، جس میں اپنے نصب العین کی خاطر اجتماعی جدّ و جہد کرنے اور جان و مال کی قربانیاں دینے کا جذبہ ہو، جس کے افراد میں سیرت کی مضبوطی اور اخلاق کی بلندی ہو، جس کے افراد اپنی تہذیب کے اصولوں پر سختی کے ساتھ عامل ہوں، اور جس میں منافقین کا وجود عنقا ہو۔ ایسی اقلیت اگر آپ ہیں تو ۲۲ کروڑ ہندو کیا چیز ہیں، تمام دنیا کے کفار مل کر بھی آپ کو مٹا نہیں سکتے۔ لیکن فی الواقع کیا آپ ایسی ہی اقلیت ہیں؟ ایسی اقلیت آپ تھے تو تین لاکھ انگریز ۶ ہزار میل کے فاصلے سے آکر آپ کے کروڑوں افراد کو غلام بنانے میں کیسے کامیاب ہو گئے۔ بچوں کی طرح خواب نہ دیکھیے۔ ہوش میں آکر اس دماغ سے بھی کچھ کام لیجیے، جو خدا نے آپ کو سوچنے اور سمجھنے ہی کے لیے دیا ہے۔ کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه پڑھ کر آپ نے خدا پر کوئی احسان کیا ہے، جس کے معاوضہ میں وہ آپ کے لیے تمام قوانین طبعی کو اُلٹ دے گا؟ آپ دیکھ رہے ہیں کہ اکثریت متحد ہو رہی ہے، اس میں نظم پیدا ہو رہا ہے، وہ ایک مرکز کی اطاعت پر مجتمع ہو رہی ہے، وہ ایک نصب العین کی خدمت کے لیے قربانیوں پر آمادہ ہے، اس نے اپنے منافقین کا بڑی حد تک استیصال کر دیا ہے، وہ اپنے افراد میں سیرت کی مضبوطی پیدا کر رہی ہے۔ اس کے مقابلہ میں آپ خود اپنا حال بھی دیکھ سکتے ہیں۔ آپ میں کوئی نظم نہیں، کوئی مرکزیت نہیں، کوئی متفق علیہ نصب العین نہیں، کوئی صاحب امر شخص یا جماعت نہیں جس کی آپ اطاعت کریں۔ آپ کی مختلف پارٹیاں ایک دوسرے کے مقابلہ میں صف آرا ہو رہی

---

[1] بارہا ایسا ہوا کہ ایک قلیل گروہ اللہ کے اذن سے ایک بڑے گروہ پر غالب آگیا ہے۔
(البقرہ: ۲۴۹)

ہیں۔ کبھی جھانسی میں، کبھی بجنور میں، کبھی مرادآباد میں، خانہ جنگی کے لیے آپ کے اکھاڑے برپا ہوتے ہیں۔ خم ٹھونک کر بھائی کو بھائی چیلنج دیتا ہے اور جب ایک بھائی دوسرے بھائی کو مار لیتا ہے، تو اغیار کے سامنے اپنی برادرکشی پر سینہ تان تان کر فخر کا اظہار کرتا ہے۔ آپ کے افراد کیریکٹر کی ایسی کمزوری کا اظہار کرتے ہیں جو ساری قوم کی ہوا اکھاڑ دیتی ہے۔ آج اس گروہ میں ہیں تو کل دوسرے گروہ میں۔ آج یہ طاقت غالب ہے تو اس کے ساتھ ہیں، کل دوسری طاقت ابھرتی نظر آئی تو فوراً انہوں نے بھی اپنی وفاداریوں کا رُخ بدل دیا۔ افراد تو درکنار آپ کی جمعیتوں تک کا یہ حال ہے کہ ان میں کسی قسم کی استقامت رائے نہیں پائی جاتی۔ غیر مسلم نواز کی طرزِ عمل اختیار کریں، دو چار اسلامی جمعیتیں ان کی مخالف ہوں گی پھر دو چار ان کا ساتھ دینے کے لیے بھی کھڑی ہو جائیں گی، اور یہ حقیقت دنیا پر آشکارا کر دیں گی کہ مسلمانوں میں بہت آسانی سے تفرقہ ڈالا جا سکتا ہے۔ کیا یہی وہ ترکی سیرت ہے جس کو لے کر آپ کے لیے کَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً[1] کا معجزہ صادر ہو گا؟

قرآن اور سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھیے۔ آپ کو معلوم ہو گا کہ خدا کے قانون میں جانبداری کہیں نہیں ہے۔ جو اس قانون کے خلاف چلے گا، خواہ وہ مومن ہی کیوں نہ ہو، پیس ڈالا جائے گا، اور جو اس کی شرائط پوری کرے گا، خواہ وہ کافر و مشرک ہی کیوں نہ ہو، غالب اور فتح یاب ہو گا۔ صحابہ کرام کی جماعت سے بڑھ کر ایمان کی حرارت اور سیرت اسلامی کا استحکام رکھنے والی جماعت تو کوئی نہیں ہو سکتی۔ مگر ایسی کامل الایمان جماعت بھی مشرکین سے متعدد مرتبہ شکست کھا گئی، اور وہ بھی کس حالت میں؟ جب کہ خود سرکارِ رسالت مآب

---

[1] بارہا ایسا ہوا کہ ایک قلیل گروہ اللہ کے اذن سے ایک بڑے گروہ پر غالب آ گیا۔ (البقرہ - ۲۴۹)

صلی اللہ علیہ وسلم ان کے درمیان موجود تھے اور بنفسِ نفیس ان کی قیادت فرما رہے تھے۔ جنگِ احد میں صرف اتنا ہی قصور تو ہوا تھا کہ مومنین کے دلوں میں مال کی محبت آگئی اور انہوں نے اپنے سردار کے حکم کی خلاف ورزی کر ڈالی۔ نتیجہ کیا ہوا؟ پتھر کو پوجنے والے خدائے واحد کی عبادت کرنے والوں پر چیرہ دست ہوگئے اور خود رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ہاتھوں زخمی ہوئے۔ حَتّٰى إِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْأَمْرِ وَعَصَيْتُم مِّن بَعْدِ مَا أَرَاكُم مَّا تُحِبُّونَ ۔۔۔ إِذْ تُصْعِدُونَ وَلَا تَلْوُونَ عَلَىٰ أَحَدٍ وَالرَّسُولُ يَدْعُوكُمْ فِي أُخْرَاكُمْ فَأَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ[1] (آلِ عمران - ۱۶)۔ جنگِ حنین میں صرف اتنی ہی کوتاہی تو ہو گئی تھی کہ مسلمانوں کو اپنی کثرت پر ناز ہو گیا تھا۔ قانونِ فطرت نے اس کی سزا یہ دی کہ مشرکین کے مقابلہ میں ان کے پاؤں اکھاڑ دیئے۔ وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنكُمْ شَيْئًا وَضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُم مُّدْبِرِينَ[2] (التوبہ: ۲۵) جو خدا ایسے بے لاگ قانون کے ساتھ اس کائنات پر حکومت کر رہا ہے، اگر اس سے آپ یہ توقع رکھتے ہیں کہ اہلِ ایمان کی صفات سے عاری ہونے کے بعد بھی وہ آپ کی حمایت کرے گا، اور ان مشرکین

---

[1] یہاں تک کہ جب تم نے نامردی کی اور کام میں جھگڑا ڈالا اور نافرمانی کی بعد اس کے کہ تم کو دکھا چکا تمہاری خوشی کی چیز۔ جب تم چڑھے جاتے تھے اور پیچھے پھر کر نہ دیکھتے تھے کسی کو اور رسول پکارتا تھا تم کو تمہارے پیچھے سے پھر پہنچایا تم کو غم عوض میں غم کے۔ (آلِ عمران: ۱۵۲-۱۵۳)

[2] اور حنین کے روز، اس روز تمہیں اپنی کثرت تعداد کا غرہ تھا، مگر وہ تمہارے کام کچھ نہ آئی اور زمین اپنی وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی اور تم پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلے۔ (التوبہ: ۲۵)

کے مقابلہ میں آپ کو ثابت قدمی بخشے گا جو اس کے قانون طبیعی کی شرائط آپ سے زیادہ بہتر طریقہ پر پوری کر رہے ہیں، تو میں آپ کی خدمت میں صرف اتنا ہی عرض کروں گا کہ آپ عقلِ سلیم اور علمِ قرآن دونوں سے محروم ہیں۔

حصّہ سو

کانگریس، متحدہ قومی تحریک

اور

مسلمان

پچھلے دو حصوں میں جو مضامین دیئے گئے ہیں انہوں نے متحدہ ہندوستان کے طول و عرض میں ایک ہلچل مچا دی اور مسلمانوں کو ایک نئے طرز پر سوچنے کی دعوت دی۔ اس سے بجا طور پر اس امر کی پیاس پیدا ہوئی کہ رائج الوقت تحریکات کا تفصیلی جائزہ لیا جائے اور مسلمانوں کو جو راستہ دکھایا جا رہا تھا اس پر مسلسل تنقید کر کے بتایا جائے کہ متحدہ قومیت کی راہ کتنی غلط اور تباہ کن تھی۔ نیز یہ بھی بتایا جائے کہ ہندوستان کے سیاسی مسئلہ کے مختلف حل کیا ہو سکتے ہیں اور ان میں مسلمانوں کے لیے نفع بخش وہ کون سی ہے یہ مضامین ۱۹۳۸ء میں لکھے گئے اور متحدہ قومیت کی تحریک سے مسلمانوں کو کاٹنے اور حکومتِ الٰہیہ کی ضرورت کا احساس پیدا کرنے میں غیر معمولی طور پر مفید و مؤثر ہوئے۔ یہ مضامین مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ دوم کی شکل میں بارہا چھپ چکے ہیں ——— مرتب

تقدیم[1]

کسی قوم کے لیے اس وقت سے زیادہ پریشانی و سراسیمگی کا اور کوئی وقت نہیں ہوتا جب وہ دیکھتی ہے کہ اس کے گرد و پیش سارا ماحول اس کے خلاف بدل گیا ہے، زندگی کے کارخانہ کو چلانے والی تمام طاقتیں، اُن اصول اور ان مناہج کے خلاف چل رہی ہیں جن پر اعتقاداً و عملاً اس کے وجود ہی کی اساس قائم ہے، اور وہ اُس مچھلی کی طرح ہو کر رہ گئی ہے جس کے لیے زمین، ہوا، پانی، موسم، سب کے سب ناموافق و ناسازگار ہو گئے ہوں۔ بدقسمتی سے آج ہم ہندوستان کے مسلمان اسی صورتِ حال سے دوچار ہیں۔ ڈیڑھ صدی سے زیادہ مدت ہم پر اسی حالت میں گزر گئی ہے، اور برابر یہ حالت شدید تر ہوتی جا رہی ہے۔ ہندوستان کی کسی دوسری قوم کو یہ پریشانی پیش نہیں آئی۔ اس لیے دوسرے لوگ اُس الجھن کو بآسانی نہیں سمجھ سکتے جس میں ہم مبتلا ہیں۔ ان کے لیے ہر بدلی ہوئی صورت کے مطابق بدل جانا اور اپنی ہیئت کو ہر سانچے میں ڈھال لینا سہل ہے۔ ان

---

[1] یہ مضمون جمادی الاخری، ۱۳۵ھ میں لکھا گیا۔ مرتب

کے اعتقادات اور اصولِ حیات ان کے وجود سے الگ ایک چیز ہیں جن کے بدل جانے اور سراسر اُلٹ جانے کے بعد بھی ان کا وجود جُوں کا توں رہتا ہے لیکن ہمارے اعتقادات اور اصولِ حیات عین ہمارا وجود ہیں، اور ان کے بدل جانے کے معنی یہ ہیں کہ ہم ہم نہ رہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب سے ہندوستان کے حالات نے پلٹا کھایا ہے ہم ایک الجھن میں مبتلا ہیں، اور یہ الجھن بڑھتی جا رہی ہے، کیونکہ ہمارے گرد و پیش ایک ایسا ڈھانچہ بن گیا ہے اور بنتا جا رہا ہے جس میں ہم کسی طرح ٹھیک نہیں بیٹھتے۔

انگریزی حکومت جب ہندوستان پر مسلط ہوئی تو اس کے ساتھ ہی ہمارے ماحول میں ایک ہمہ گیر تغیر رونما ہونا شروع ہو گیا۔ ہم صرف مقامِ عزت و اقتدار ہی سے گرا نہیں دیئے گئے بلکہ ایک غیر مسلم غلبہ و استیلاء کا یہ نتیجہ روز بروز زیادہ شدت کے ساتھ ہمارے سامنے آنے لگا کہ ہمارے گرد و پیش افکار، نظریات، اصولِ اخلاق، طرزِ تمدن، معیارِ تہذیب، قوانینِ معاشرت و معیشت، نظامِ حکومت و سیاست، غرض ایک دنیا کی دنیا بدلتی جا رہی ہے اور اس کی ہر چیز ہمارے اجتماعی مزاج اور ہماری قومی طبیعت کے بالکل خلاف ہوتی جاتی ہے۔

اوّل اوّل ہم نے کوشش کی کہ پتھر کی ایک چٹان بن کر تغیر و انقلاب کی اس رَو کے مقابلہ میں ڈٹ جائیں۔ اس سے زیادہ اور کچھ کرنے کے ہم اہل بھی نہ تھے۔ صدیوں کے جمود نے ہم میں اتنی صلاحیت ہی باقی نہ رہنے دی تھی کہ ہم اس انقلاب کی حقیقت کو سمجھ سکتے، اور نہ اتنی طاقت باقی چھوڑی تھی کہ سوچ سمجھ کر ان تدابیر کو عمل میں لاتے جو کسی انقلاب کے مقابلہ میں اختیار کرنی چاہئیں۔ اتنی صلاحیت اور طاقت ہم میں ہوتی تو یہ انقلاب رونما ہی کیوں ہوتا؟

ایک صدی تک خوب پسنے، مادّی و اخلاقی حیثیت سے تباہ ہو جانے کے بعد یہ راز ہم پر کھلا کہ تغیرات زمانہ کے سیلاب کا مقابلہ جامد چٹان بن کر نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے بعد ہمارے دانش مندوں نے ہمیں ایک اور پالیسی کی تلقین

کی اور وہ یہ تھی کہ :-

زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز

ہم نے کہا کہ آؤ اسی کو آزما دیکھیں، شاید اپنے آپ کو کچھ بدل کر ہم اس نئے ڈھانچہ میں ٹھیک بیٹھ سکیں۔ چنانچہ ہم نے پہلے مغربی تعلیم کی طرف توجہ کی اور اپنے آپ کو زمانے کی رَو کے ساتھ بہنے کے لیے تیار کیا۔ پھر غیر مسلم حکومت کی بارگاہ میں درخورِ حاصل کرنے کی کوشش کی تاکہ اپنی کھوئی ہوئی مادّی طاقتوں میں سے کم از کم ایک معتد بہ حصّہ بازیافت کر لیں۔ پھر اپنے ملک کے جدید سیاسی تغیرات سے ہم آہنگ ہونے کی کوشش کی کہ زمانہ کا یہ سیلاب جس طرف جا رہا ہے اسی طرف سب کے ساتھ ہم بھی جائیں۔

یہ تغیرات جو ہم نے اپنی پوزیشن میں کیے، ان سب میں ہمارے پیش نظر یہ مسلک رہا کہ اپنی خودی کا تحفظ بھی کرو اور زمانے کے ساتھ بھی چلو۔ لیکن ستر برس کے تجربے پر ایک غائر نگاہ ڈال کر دیکھیے، کیا اس زمانہ سازی کے دَور میں ہم اپنی خودی کو محفوظ رکھ سکے ہیں؟ واقعات کی ناقابلِ تردید شہادت ہے کہ ایسا نہیں ہوا، اور عقل اس کو محال کہتی ہے کہ کبھی ایسا ہو سکتا ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ چوکھونٹے سانچے میں آپ ٹھیک بھی بیٹھیں اور اپنی ہیئت کی گولائی کو تبدیل بھی نہ کریں۔ دریا کے رُخ پر بہیں بھی اور اپنی جگہ پر قائم بھی رہیں۔ یہ دو باتیں بالکل متضاد ہیں اور ان کو جمع کرنا صریح عقل کے خلاف ہے۔

مغربی تعلیم کے تجربے سے کیا ثابت ہوا؟ یہ کہ جو ماحول ہم پر مسلّط ہے اس میں سے ایک عنصر یعنی تعلیم کو ہم دوسرے عناصر سے الگ کر کے نہیں لے سکتے۔ دوسرے عناصر جن کے ساتھ اس عنصر کا غیر منفک رابطہ ہے، خود بخود اس کے ساتھ آتے ہیں۔ زندگی کا ایک اور نقطۂ نظر، اخلاق کے کچھ دوسرے اصول، اشیاء کی قدر و قیمت متعین کرنے کا ایک مختلف معیار، تمدن زندگی کے کچھ نرالے ڈھنگ، جو سب کے سب اسلام سے بالکل بیگانہ ہیں، اس ایک چیز کو قبول کرتے ہی خواندہ و ناخواندہ

آسنے شروع ہو جاتے ہیں، اور ان سب کے جمع ہو جانے سے مسلمان خود بخود نا مسلمان بنتا چلا جاتا ہے۔

سرکارِ فرنگ کے دربار میں پہنچ کر ہمیں کیا سبق ملا؟ یہ کہ دین، ایمان، اخلاق، تہذیب، تمدن سب کچھ ایک روٹی کے عوض دے دو اور روٹی بھی پیٹ بھر نہ ملے۔ اپنی خودی کو قربان کیے بغیر وہاں سے تم کچھ نہیں پا سکتے۔ اور اس قربانی کے بعد بھی تمہاری حیثیت ایک خادم سے بڑھ کر نہیں ہوتی جو ایک تاجِ حقیر کی طرح آقا کے مفاد پر بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے۔

سیاسیات میں، زمانہ سازی کا پھل کیا ملا؟ یہ کہ تمام سیاسی تغیرات جو اب تک ہوئے اور آئندہ ہونے والے ہیں، ہمارے نظریاتِ عمرانی کے بالکل خلاف اور خداوندانِ فرنگ کے نظریاتِ عمرانی کے عین مطابق ہیں۔ ان کا نظریۂ قومیت، ان کے اصولِ جمہوریت، ان کے تصوراتِ حکومت و سلطنت، انہی چیزوں پر تمام جدید تغیرات کی بنا رکھی گئی ہے اور ہمارے لیے ایسے تغیرات سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کرنے کے معنی اپنے وجود کو ایک دوسرے وجود میں بالکل تحلیل کر دینے کے ہیں۔

ان تجربات کے بعد اب ضرورت ہے کہ ہم اپنی دوسری پالیسی پر بھی نظرِ ثانی کریں۔ پہلی پالیسی قریب قریب سو برس کے تجربہ سے غلط ثابت ہوئی اور اسے بدلنا پڑا۔ دوسری پالیسی کو ستر برس کے تجربے نے غلط اور غلط ہی نہیں مہلک ثابت کر دیا۔ اس کو بھی بدلنا اور بہت جلدی بدل ڈالنا چاہیئے۔ اب ہمارے لیے صرف تیسری پالیسی باقی رہ جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ:۔

زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز

جو ڈھانچہ تمہارے گرد و پیش چھا گیا ہے اس سے تم الگ بھی نہیں رہ سکتے، اور اس میں اپنی خودی قربان کیے بغیر ٹھیک بھی نہیں بیٹھ سکتے۔ لہٰذا آؤ اب مردوں کی طرح لڑ کر اس ڈھانچے کو توڑ ڈالو اور اسے مجبور کرو کہ تمہاری ہیئت کے مطابق بنے۔ جس سیلاب میں تم گھر گئے ہو اس کے ساتھ بہنے میں تمہارا وجود نمک کی طرح

تحلیل ہوا جاتا ہے، اور اس کے مقابلہ میں جامد چٹانیں بن کر تم اپنی جگہ جم بھی نہیں سکتے، لہذا آؤ، اب بہادروں کی طرح اُٹھ کر اس سیلاب کا رُخ پھیر دو اور اسے اس رُخ پر بہنے کے لیے مجبور کرو جو تمہاری فطرتِ مسلم کے مقتضا سے مطابقت رکھتا ہو۔ ہو سکتا ہے کہ تمہیں اس میں کامیابی نہ ہو۔ بہت ممکن ہے کہ تم خود ہی اس لڑائی میں ہلاک ہو جاؤ۔ مگر بکری کی زندگی کے سو برس سے شیر کی زندگی کا ایک دن بہرحال زیادہ قیمتی ہے۔

یہی انقلابی ذہنیت ہے جسے میں اب مسلمانوں میں، خصوصاً ان کے نوجوانوں میں پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ انقلابی ذہنیت یکایک پیدا نہیں ہوتی۔ زمانہ کی سخت ٹھوکریں کھا کھا کر آہستہ آہستہ دماغ درستی پر آتا ہے اور ان ٹھوکروں کے ساتھ آہستہ آہستہ انقلابی ذہنیت اس کے اندر اترتی ہے۔ اس دوران میں آدمی کو بڑے سخت مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ باہر والوں سے پہلے گھر والوں سے لڑائی، اور لڑائی بھی چونکھی لڑائی لڑنی پڑتی ہے۔ قدیم پالیسی جن دماغوں میں گہری جمی ہوئی ہوتی ہے وہ انقلاب کی دعوت سُن کر اوّل تو اس کا مفہوم و مدعا ہی نہیں سمجھ سکتے۔ پھر کچھ کچھ سمجھتے بھی ہیں تو اسے اپنے عادی تصوّرات کے خلاف پا کر مشتعل ہو جاتے ہیں۔ کوئی سمجھتا ہے کہ یہ کوئی نیا دوکاندار آیا ہے جو ہماری پُرانی جمی ہوئی دوکانوں کے مقابلے میں اپنی دوکان جمانے کے لیے یہ باتیں کر رہا ہے۔ کوئی خیال کرتا ہے کہ یہ کوئی گہری سازش ہے جسے دشمنوں نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ تیار کیا ہے۔ کوئی تیوری بدل کر کہتا ہے کہ جن لوگوں نے اپنے بال قومی خدمت میں سفید کیے ہیں ان کے مقابلہ میں نوخیز طفلِ مکتب ہو کر تمہیں زبان کھولتے شرم نہیں آتی۔ کوئی آوازہ کستا ہے کہ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ[1] اور کوئی نہنگ سال خوردہ سیلاب کے ساتھ بہتے ہوئے

---

[1] یہ شخص بجز اس کے کہ تمہاری طرح کا ایک (معمولی) آدمی ہے اور کچھ نہیں (اس دعوے سے اس کا مطلب یہ ہے کہ تم سے برتر ہو کر رہے۔ (المؤمنون - ۲۴)

ایک سرپرستانہ نگاہ اس رو کے خلاف تیرنے والی مچھلی پر ڈالتا ہے اور بس یہ کہہ کر آگے بڑھ نکلتا ہے کہ اس نے کوئی نئی بات نہیں کہی، ہم بھی پہلے کہہ چکے ہیں۔

پھر پرانے خیالات کی ایک دنیا ہوتی ہے جسے انقلاب کے داعی کو توڑنا پھوڑنا ہوتا ہے اور نئے خیالات کی ایک دنیا ہوتی ہے جو اسے بنانی پڑتی ہے۔ لوگ پرانے خیالات سے ہٹ نہیں سکتے جب تک کہ نہایت مضبوط دلائل کیساتھ تنقید کر کے ان کی بنیادیں ہلا نہ دی جائیں۔ اور نئے خیالات قبول نہیں کر سکتے جب تک کہ تعمیری افکار کو حکمتِ عملی کے ساتھ پیش کر کے انہیں قابلِ قبول نہ بنا دیا جائے اور معقول دلائل کے ساتھ انہیں مطمئن نہ کر دیا جائے کہ اس مضبوط ڈھانچے کو جس کی گرفت میں طوعاً یا کرہاً آ گئے ہو، یوں توڑا جا سکتا ہے اور اس کی جگہ یہ ڈھانچہ بنانے کی ضرورت ہے جس میں تم ٹھیک بیٹھ سکتے ہو، اور یہ دوسرا ڈھانچہ اس طرح بننا ممکن ہے۔ اس کام میں تخریبی تنقید اور جدید تعمیر دونوں ساتھ ساتھ کرنی پڑتی ہیں۔ جب تک یہ دونوں کام تکمیل کے قریب نہیں پہنچ جاتے، غلط فہمیوں، بدگمانیوں اور پریشان خیالیوں کا ایک گھرا غبار ہر طرف چھایا رہتا ہے جس کی وجہ سے پرانے خیالات کے معتقدین اور جدید وقدیم کے درمیان بھٹکنے والے مذبذبین کے ایک انبوہِ کثیر کو انقلابی نصب العین کا نقطہ صاف نظر نہیں آ سکتا کہ وہ اس پر جمع ہو سکیں، اور جب تک یہ نقطہ واضح ہو کر اس قابل نہیں بن جاتا کہ قوم کی عملی قوتیں اس پر مجتمع ہوں اس وقت تک عملی جدوجہد کی راہ میں کوئی قدم آگے نہیں بڑھ سکتا پس یوں سمجھئے کہ ابتداءً سب سے بڑا عمل یہی ہے کہ قدیم خیالات کا طلسم پیہم ضربوں سے توڑا جاتے اور جدید خیالات کے لیے راہ صاف کی جاتے۔

تخریبی تنقید کے مرحلے میں ایک بڑی مشکل یہ پیش آتی ہے کہ قدیم پالیسی کی غلطیاں اور مضرتیں ثابت کرنے کے لیے اس پالیسی پر چلنے اور چلانے والوں کو تنقید کا ہدف بنائے بغیر چارہ نہیں ہوتا۔ اور یہ ایسا کام ہے کہ جسے دل پر پتھر رکھ کر انجام

دینا پڑتا ہے۔ اس میں آدمی کو بہت سی دوستیوں، بہت سی محبتوں، بہت سے پرانے تعلقات کی قربانی دینی پڑتی ہے۔ اور بہت سے ان بزرگوں کی ناراضی مول لینا ہوتی ہے جن کا وہ تمام عمر احترام کرتا رہا ہے۔ اور جن کی بزرگی کے احترام سے اس کا دل کبھی خالی نہیں ہوتا۔ اس میں آدمی کو اس امر کا بھی اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں تنقید کی شدت سے وہ جواب میں ضد نہ پیدا کر دے، اور کہیں جوابی حملے خود اس کے ذہنی توازن کو نہ بگاڑ دیں۔ غرض اس خارزار سے اس کو بہت ہی سنبھل کر گزرنا پڑتا ہے اور ہر وقت اپنے اعصاب کی بندش چست رکھنی ہوتی ہے۔

انقلابی ذہنیت پیدا کرنے کے لیے تدریج کا خیال رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ لوگوں کی قوتِ تحمل سے زیادہ خوراک دینا بھی مہلک ہے اور جتنی خوراک کی طلب ان میں پیدا ہو چکی ہو اس سے کم دینا بھی بُرے نتائج پیدا کرتا ہے۔ یہاں قدم قدم پر آدمی کی قوتِ فیصلہ کا سخت امتحان ہوتا ہے، اور صرف خدا ہی کی مدد اس کو حالات کا صحیح اندازہ کرنے اور ٹھیک وقت پر ٹھیک قدم اٹھانے کی طاقت بخش سکتی ہے۔

میں اپنی کمزوریوں سے خوب واقف ہوں، اور انہی کمزوریوں کا احساس ہے جو مجھے ہر وقت مجبور کرتا ہے کہ میں خداوندِ عالم سے علمِ صحیح اور عقلِ سلیم کے لیے دعا کروں۔ محض فرض کی پکار نے مجھے مجبور کرکے اس کام پر آمادہ کیا ہے جس کے دشوار گزار مرحلوں کو دیکھ کر ایک طرف اور اپنی کمزوریوں کو دیکھ کر دوسری طرف، میری رُوح لرز اٹھتی ہے۔ بہر حال محض خدا کے بھروسے پر میں نے اس میدان میں قدم رکھ دیا ہے اور ان تمام حکمتوں کو پیشِ نظر رکھ کر جن کی طرف اُوپر اشارہ کر چکا ہوں، اپنے انقلابی مشن کی تبلیغ شروع کر دی ہے۔

پچھلے دو حصوں میں جو مضامین پیش کیے گئے ان کو مرتب کرتے وقت میں نے خاص طور پر اس بات کو ملحوظ رکھا تھا کہ ابھی محض لوگوں کو چونکانے اور ان کے دماغوں کو انقلابی تصورات کے لیے تیار کرنے کی ضرورت ہے، اس سے زیادہ کے وہ متحمل نہیں ہو سکتے۔ اس لیے میں نے مسلمانوں کی پچھلی تاریخ، ان کے موجودہ حالات اور ان

کے گرد وپیش کام کرنے والی قوتوں کے رُجحانات پر ایک سرسری تبصرہ کرتے ہوئے یہ بتانے پر اکتفا کیا تھا کہ تمہارے اندر کیا کمزوریاں ہیں، اور باہر سے کس قسم کے خطرات تم کو گھیرے ہوئے ہیں اور تمہاری تہذیب کی فطرت سے تمہارے ماحول کی طاقتیں کس طرح متصادم ہو رہی ہیں۔ اس تبصرے کے ساتھ میں نے جدید انقلابی نصب العین کی طرف محض چند اشارات کیے تھے اور انہیں قصداً زیادہ واضح نہیں کیا تھا تاکہ اچانک ایک نرالی آواز سُن کر طبائع آمادۂ بغاوت نہ ہو جائیں۔

اب اس حصّہ میں، میں ایک قدم اور بڑھا رہا ہوں۔ اب میں نے زیادہ وضاحت کے ساتھ ہندوستان کے موجودہ سیاسی نظام اور اس کی بنیادوں کا تجزیہ کیا ہے اور ایک ایک مقام پر اُنگلی رکھ کر بتایا ہے کہ یہاں مسلمانوں کے لیے ہلاکت ہے، اور یہاں ان کے لیے نقصان ہے، اور یہ چیزیں ان کے مزاجِ قومی کے منافی ہیں ـــــ یہ اُن لوگوں کا جواب ہے جنہوں نے یہ غلط فہمی پھیلا رکھی ہے کہ مسلمانوں کو محض خیالی خطرات سے ڈرایا جا رہا ہے ـــــ اس کے بعد میں نے مسلمانوں کے ان رہنماؤں کی پالیسی پر تنقید کی ہے جو ابتک "زمانہ باتو نسازد تو با زمانہ بساز" کے مسلک پر چلے جا رہے ہیں۔ جس قدر دلائل و شواہد میں فراہم کر سکتا تھا اُن سب سے کام لے کر میں نے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ پورا نظامِ حکومت و سیاست جو ہم پر مسلط ہے اپنے اصول و فروع سمیت ان اصولوں سے متصادم ہو رہا ہے جن پر ہماری قومی زندگی کی بنا قائم ہے، اور اس نظام کو انہی بُنیادوں پر قائم رکھ کر اپنے آپ کو جُوں کا تُوں یا کسی قدر تحفظ کے ساتھ اس میں فٹ کرنے کی کوشش کرنا سراسر ایک غیر دانشمندانہ طریق کار ہے اور مسلمان اس طریق کار سے ہرگز کسی فلاح کی، اور فلاح کیا معنی، اپنے بقا کی بھی اُمید نہیں کر سکتے۔ اِس بحث سے میرا واضح مقصد یہ ہے کہ خیالات، مقاصد اور پالیسیوں میں جو اشتباہ و التباس اور اُلجھاؤ اس وقت پایا جا رہا ہے اُسے ختم کر دیا جائے، جو مختلف اور متضاد راستے اس وقت خلط ملط اور گڈ مڈ ہو گئے ہیں ان کو الگ الگ کر کے دینِ قیّم کی راہ اور طاغوت کی راہ کو بالکل ایک دوسرے

سے ممیز کر دیا جائے اور لوگوں کو مجبور کر دیا جائے کہ دونوں میں سے کسی ایک ہی راستہ کو اپنے لیے منتخب کریں۔ جو وطن پرست ہیں اور ایک ہندوستانی قومیت میں جذب ہونا چاہتے ہیں وہ علیٰ وجہ البصیرت اور علیٰ رؤس الاشہاد اس راستے پر جائیں اور یہ سمجھ کر جائیں کہ یہ راستہ اسلام کے راستہ کے خلاف جا رہا ہے اور جو مسلمان ہیں اور مسلمان رہنا چاہتے ہیں وہ قوم پرستی اور نیشنلزم کا نام لینا چھوڑ دیں اور اس تحریک سے الگ ہو جائیں جو اسلامی قومیت کو وطنی قومیت میں تحلیل کرنا چاہتی ہے۔ بمختصر الفاظ میں یوں سمجھیے کہ میں اُن لوگوں کے موقف کو ناممکن الوقوف بنا دینا چاہتا ہوں جو بیک وقت دو کشتیوں میں پاؤں رکھنا چاہتے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ یہ مخالف سمتوں میں جانے والی کشتیاں ہیں۔ سب سے آخر میں میں نے زیادہ وضاحت کے ساتھ یہ بتایا ہے کہ ہمارے لیے اب صحیح قومی پالیسی کیا ہے اور اس کو کس طرح عمل میں لایا جا سکتا ہے اس میں ان لوگوں کو پورا جواب مل جائے گا جو اس غلط خیال میں خرص و تخمین کے تیر تکے چلا رہے ہیں کہ میرے پاس صرف سلب ہی سلب ہے، اثبات و ایجاب نہیں ہے۔

مسلمانوں کی غلط نمائندگی اور اُس کے نتائج

یہ سوال کہ ہندوستان کے مسلمان کیوں بے چین اور غیر مطمئن ہیں، اور کیوں اپنے ملک کی اس سیاسی جدوجہد میں، جس کو "جنگ آزادی" کہا جاتا ہے، اپنے شایان شان حصّہ نہیں لیتے، ایک ایسا معمّا بن گیا ہے جسے سمجھنا صرف غیر مسلموں ہی کے لیے نہیں، بلکہ خود بہت سے مسلمانوں کے لیے بھی دشوار ہو گیا ہے۔ مسلمانوں کی حالت اس وقت اُس شیر خوار بچے کی سی ہے جو اپنی تکلیف پر روتا اور تڑپتا ہے، مگر ٹھیک ٹھیک یہ نہیں بتا سکتا کہ اس کو تکلیف کیا ہے جس پر وہ رو اور تڑپ رہا ہے۔ حتیٰ کہ بسا اوقات غیر تو غیر، خود اس کی اپنی ماں کو یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ اسے فی الواقع کوئی شکایت نہیں، محض ضد چڑھ گئی ہے۔ اس وقت ضرورت تھی کہ مسلمان قوم کے ذہن کو ٹھیک ٹھیک پڑھ کر اس کی بے چینی اور بے اطمینانی کے حقیقی اسباب دریافت کیے جاتے، اُس اصل مسئلے کو واضح اور منقح صورت میں پیش کیا جاتا جو ہندوستانی مسلم قوم کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ بنا ہوا ہے اور یہ بتایا جاتا کہ ہندوستان کا مسلمان فی الواقع چاہتا کیا ہے۔ نیز مسلمان کے نقطۂ نظر سے ہندوستان کے موجودہ حالات اور مستقبل

کے رُجحانات کا تجزیہ کر کے صاف صاف بیان کر دیا جاتا کہ کس طرح یہاں ایسا ماحول پیدا ہو رہا ہے اور ہوتا جا رہا ہے جس کو مسلمان اپنی قومی زندگی کے لیے مہلک سمجھتا ہے۔ صرف یہی ایک صورت تھی جس سے مسلمانوں کی اپنی پراگندہ خیالی، اور غیر مسلموں کی حیرانی، بدگمانی اور بدتدبیری کا خاتمہ ہو سکتا تھا۔ بعض غیر مسلموں نے اس ضرورت کو محسوس کیا اور اس معمّے کو سمجھنے اور مسلمانوں کے ذہن کو پڑھنے کی کوشش بھی کی مگر وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکتے تھے اور نہ ہو سکے۔ یہ کام دراصل ایسے لوگوں کے کرنے کا ہے جن کے احساسات جمہور مسلمین کے احساسات سے متحد الاصل ہیں اور اس کے ساتھ جن میں یہ قوت بھی ہے کہ اپنے اندر جو کچھ محسوس کریں اس کی واضح تصویر خارج میں کھینچ کر رکھ دیں۔

مسلمانوں کے صاحبِ علم و صاحبِ فکر لوگوں نے اس باب میں جس غفلت سے کام لیا ہے اس کا نتیجہ ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ یہ مسئلہ بالکل نااہل اور ناقابلِ اعتماد لوگوں کے ہاتھوں میں کھلونا بن گیا ہے اور انہوں نے اس کو نہایت غلط طریقوں سے پیش کر کے دوسروں ہی کو نہیں، خود اپنی قوم کو بھی پریشان خیالیوں اور غلط فہمیوں میں مبتلا کر دیا ہے۔

ان میں سے ایک بڑی جماعت تو اسلام کا صحیح علم ہی نہیں رکھتی، اور نہ اس حقیقت کو سمجھ سکتی ہے کہ مغربی علوم کے فروغ، غیر مسلم حکومت کے اقتدار، اور اب جدید نیشنلزم کے بڑھتے ہوئے سیلاب سے مسلم قوم کے لیے فی الواقع کون سا بنیادی سوال پیدا ہو گیا ہے۔ یہ لوگ بغیر سمجھے بُوجھے محض چند سطحی اور چھچھورے جزئیات کو مسلمانوں کے قومی مسائل بنا کر پیش کرتے ہیں، اصرار پر مناسب حد سے زیادہ زور دے کر اپنی پوزیشن کو اور زیادہ مضحکہ خیز بنا دیتے ہیں۔ اس سے ہوشیار لوگوں کو یہ خیال پھیلانے کا اچھا موقع مل جاتا ہے کہ مسلمانوں کا قومی مسئلہ چند بہت ہی چھوٹی چھوٹی باتوں سے مرکب ہے جن کو محض جہالت، تنگ نظری اور نادانی کی وجہ سے اتنی اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔

ایک دوسری جماعت جس نے اس مسئلہ کی حمایت میں اپنے آپ کو بہت نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے ، انگریزی سلطنت کے وفادار غلاموں پر مشتمل ہے ، اور ان کا فائدہ اسی میں ہے کہ اصل مسئلہ کو فروعات میں گم کر دیا جائے تاکہ مسلمان فضول چیزوں پر لڑ کر اپنی قوت ضائع کرتے رہیں اور ان کی جان و مال کے خرچ پر سرکار برطانیہ کا کام بنتا رہے۔ ان حضرات کی مداخلت سے اس مسئلہ کی عزت و وقعت اور بھی زیادہ کم ہو گئی ہے اور مخالف گروہ کے چالاک لوگوں کو یہ مشہور کرنے کا بہت اچھا بہانہ ہاتھ آ گیا ہے کہ درحقیقت مسلمانوں کے قومی مسئلہ کا کوئی وجود ہی نہیں ہے ، یہ تو محض امپیریلسٹ پالیسی کا ایک شاخسانہ ہے ، اور صرف ٹوڈیوں ، رجعت پسندوں اور سرکار پرستوں ہی کی اغراض نے اسے پیدا کیا ہے۔

ان دونوں گروہوں کی بدولت جو نقصان ہمارے مقدمہ کو پہنچا ہے ، اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ غیر تو غیر خود مسلمان بھی اب اس دھوکہ میں مبتلا ہوتے جا رہے ہیں کہ درحقیقت ہمارا کوئی قومی مسئلہ نہیں ہے - اور اگر ہے بھی تو وہ ایسا اہم نہیں کہ آزادیٔ وطن سے بڑھ کر ہم کو اس کی فکر ہو۔ چنانچہ مسلمانوں کے اپنے آدمیوں کی زبانوں پر اب وہی باتیں آنے لگی ہیں جو کل تک غیر مسلم اخباروں اور لیڈروں کی زبان و قلم پر تھیں - یعنی مسلم مفاد کا نام لینا رجعت پسندی اور ٹوڈیت اور فرقہ پرستی ہے۔ یہ جادو عوام سے گزر کر علماء پر بھی چڑھ رہا ہے اور وہ لوگ اس سے متاثر ہو رہے ہیں جن کا اصل فرض یہ تھا کہ جانشینانِ رسول ہونے کی حیثیت سے اس مسئلہ کو سمجھتے اور سمجھاتے اور جانشینانِ رسول ہونے کی حیثیت ہی سے اس کو حل کرنے کی کوشش کرتے۔ اب اگر ہماری قوم کے وہ چند اصحاب فکر جو حقیقت کو سمجھتے ہیں اور سمجھانے کی بھی اہلیت رکھتے ہیں ، اور جن کا ذہن ابھی تک بیرونی اثرات سے آزاد ہے ، اپنی خاموشی نہ توڑیں گے اور صاف صاف حقیقت کو بیان نہ کریں گے تو یقیناً زمانے کی دو تین گردشیں بھی نہ گزرنے پائیں گی کہ مسلمانوں کی پوری قوم فریب میں مبتلا ہو جائے گی۔ اس میں شک نہیں کہ اب مسلمانوں کے مفاد کا نام لینا اپنے آپ کو بڑے خطرے میں

ڈالنا ہے۔ کیونکہ اب غیروں ہی سے نہیں، خود اپنے بھائیوں سے بھی ایسے شخص کو گالیاں سُننی پڑیں گی۔ اور انسان کے لیے غیروں کی گالیوں سے بدرجہا زیادہ دل شکن ان لوگوں کی گالیاں ہوتی ہیں جن کی بھلائی کے لیے وہ کام کرتا ہے۔ لیکن خواہ نتائج کیسے ہی تلخ ہوں، جن لوگوں کو اپنی قوم کا مفاد عزیز ہے، انہیں ہر بُرے سے بُرے نتیجہ کو برداشت کرنے کے لیے تیار ہونا چاہیئے اور کم از کم تذکیر کا فرض بجالانے سے ہرگز منہ نہ موڑنا چاہیئے۔

اس کو مسلمانوں کی بدنصیبی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ وہ لوگ جو سب سے بڑھ کر ان کے قومی مزاج کو سمجھنے والے اور ان کے جذبات و داعیات کا صحیح حال جاننے والے اور ان کے قلب و روح کی سچی نمائندگی کرنے والے ہو سکتے تھے، اور جن سے یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ اس قوم کی حقیقی مشکلات کو سمجھ کر کوئی کارگر تدبیر اور علاج تجویز کریں گے، آج وہ بھی زمانہ کے غالب اثرات کی رَو میں بہتے جا رہے ہیں، اور نادانستہ ان کی زبانوں سے وہ باتیں نکل رہی ہیں جو کل تک زیادہ کھلے الزامات کی صورت میں غیروں کی زبان سے نکلا کرتی تھیں۔ مثال کے طور پر میں اس تقریر کا اقتباس نقل کرتا ہوں جو ابھی حال میں مولانا سیّد سلیمان ندوی نے مدراس میں ارشاد فرمائی ہے[1]۔ مولانا کے علم و فضل، ان کی صداقت، ان کے تفکّر و تدبر کا جیسا معترف میں ہمیشہ تھا ویسا ہی آج بھی ہوں، اور ان کی تقریر کا اقتباس نقل کرنے سے میرا مدعا ان کی ذاتِ گرامی پر کوئی حرف لانا نہیں ہے۔ بلکہ دراصل میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ وقت کے غالب خیالات نے ہماری قوم کے اتنے بڑے صاحبِ فکر و بالغ النظر عالم پر بھی کیا اثر کیا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:-

---

[1] مولانا نے ترجمان القرآن میں اس اقتباس کے شائع ہونے پر شکایت فرمائی تھی لیکن یہ نہیں فرمایا کہ انہوں نے یہ الفاظ نہیں کہے تھے یا کم از کم ان کا مفہوم یہی نہ تھا جو "انصاری" کے رپورٹر نے روایت بالمعنی کے طور پر بیان کیا ہے۔

"اس وقت تین ہی صورتیں ہیں۔ یا تو مسلمان اپنے گھروں کے دروازے بند کر کے بیٹھ رہیں اور جب آزادی کی جنگ ختم ہو جائے تو اپنے دروازے کھول کر باہر نکلیں اور گلیوں میں آزادی کی بھیک مانگتے پھریں۔ یا یہ کہ اپنا کیمپ الگ لگائیں اور یہ دیکھتے رہیں کہ آزادی کی فوج اپنی قوتِ بازو سے کب میدان جیتتی ہے اور مالِ غنیمت پر قبضہ کرتی ہے۔ اس وقت وہ آگے بڑھیں اور فاتح فوج سے مالِ غنیمت میں جھگڑا کریں۔ یا یہ کہ وہ آزادی کی فوج میں شامل ہو کر آزادی کے لیے ان کے دوش بدوش کھڑے ہو کر جنگ کریں اور اپنے لیے اپنی عظیم الشان قومیت کی پوزیشن کے مطابق اپنی کوششوں سے اپنی جگہ حاصل کریں۔"

("انصاری" مورخہ ۲ رمضان ۵۶ ۱۳ھ)

غور کیجیے! یہ ارشادِ گرامی کن مفروضات کا نتیجہ ہے۔ "مسلمان جو کئی سال تک آزادی کی جنگ سے الگ رہے اور اب بھی ٹھٹکے کھڑے ہیں، اس کی وجہ کچھ اور نہیں، محض بُزدلی ہے، اور یہ قوم بُزدل ہونے کے ساتھ کمینہ بھی ہے۔ جب آزادی کی فوج کے سورما سپاہی جو ظاہر ہے اکثر و بیشتر غیر مسلم ہی ہیں شیروں کی طرح شکار مار لیں گے، تو یہ جنگل کے ذلیل جانوروں کی طرح اُگر حصہ لڑانے کی کوشش کرے گی" —— یہ ہے مسلمانوں کی وہ تصویر جو ان الفاظ سے ذہن سامع میں بنتی ہے، اور اس کے ساتھ غیر مسلموں کی عظمت و بزرگی کا کیسا مرعوب کن نقشہ ذہن کے سامنے آتا ہے کہ گویا وہ شیرانِ بیشۂ حریت ہیں جو تمام ہندوستان کے لیے آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ پھر یہ "جنگِ آزادی" کس قدر پاک، کیسی بے عیب اور کتنی بے لوث چیز فرض کی گئی ہے کہ اس میں کسی لوث کا شبہ کرنا تو گویا ممکن ہی نہیں۔ ایسی پاک جنگ، ایسے مقدّس جہاد میں حصہ لینے سے مسلمانوں کا احتراز کرنا کسی معقول وجہ پر تو مبنی ہو ہی نہیں سکتا۔ اب بس یہ ایک ہی وجہ رہ جاتی ہے کہ مسلمان بُزدل، دون ہمت اور کمینہ ہیں۔

ایک دوسرے بزرگ جن کے علم، تقویٰ، اور دیانت کا احترام میرے دل میں ان کے کسی شاگرد اور مرید سے کم نہیں ہے، اپنے ایک مضمون میں تحریر فرماتے ہیں:

"جس طرح آزادی کے لیے جدوجہد کرنا ہندوستان کی دوسری قوموں پر واجب ہے، اسی طرح مسلمانوں پر بھی واجب ہے، بلکہ ان کے لیے اسباب وجوب بہ نسبت دیگر اقوام ہند کے چند در چند زائد ہیں۔ پس مسلمانوں کا دوسری اقوام سے پیچھے رہنا انتہائی شرمناک اور ذلیل امر ہے۔"

(مولانا حسین احمدؒ کا مکتوب "آفتاب" لکھنؤ، مورخہ ۵ اپریل ۴۰ء)

یہاں بھی وہی نظریہ کام کر رہا ہے۔ حقائق سے آنکھیں بند کر کے یہ تسلیم کر لیا گیا کہ ہندوستان کی موجودہ سیاسی جدوجہد فی الواقع خالص آزادیٔ وطن کی جدوجہد ہے، اور اس مفروضہ پر یہ حکم لگا دیا گیا کہ اس جدوجہد میں شریک ہونا مسلمانوں پر واجب ہے، اور اس سے ان کا علیحدہ رہنا کسی معقول وجہ پر مبنی نہیں بلکہ "انتہائی شرمناک اور ذلیل امر ہے۔"

میرے ایک نہایت محترم بھائی جو علم و فضل کے ساتھ خلوص نیت کی نعمت سے بھی مالا مال ہیں اور عصر حاضر کے مشہور مفسر قرآن مولانا حمید الدین فراہی رحمہ اللہ کی جانشینی کا شرف رکھتے ہیں، اپنے ایک تازہ مضمون میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"یہ ساری تنظیم صرف اکثریت کے خطروں اور اندیشوں پر مبنی ہے۔ یہ اندیشے واقعی ہیں یا غیر واقعی؟ ہم تھوڑی دیر کے لیے تسلیم کر لیتے ہیں کہ واقعی ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ امر بھی ظاہر کر دینا چاہتے ہیں کہ یہ تنظیم کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ انگریزوں کے ہاتھوں بالکل انہی نعروں اور انہی ہنگاموں کے ساتھ ۷۵ء کے بعد شروع ہو گئی تھی اور ۱۹۰۵ء کے بعد سے تو ہندوستان میں کوئی انگریز حکمران ایسا نہیں آیا۔ جس نے اکثریت کی چیرہ دستیوں سے بچاؤ کے لیے

مسلمانوں کی تنظیم اپنی حکومت کی مسلمہ پالیسی نہ قرار دی ہو۔ اور یہ تنظیم
اُس تھوڑے سے وقفے کے سوا جو تحریک خلافت نے پیدا کر دیا تھا۔ پورے
استحکام کے ساتھ باقی رہی ہے۔ اور ہم سے زیادہ ہمارے مہربان حکام
نے اس کی رضاعت و تربیت کی ذمہ داریاں محسوس کی ہیں اور جب
تک موجودہ سیاسی ضروریات باقی ہیں اور حالات کوئی نئی کروٹ
نہیں بدلتے، کوئی وجہ نہیں کہ وہ اپنے اس عظیم الشان انسانی و سیاسی
فرض سے جو بحیثیت ہمارے فرمانروا ہونے کے ان پر عائد ہوتا ہے
سبک دوش ہو جائیں گے۔ پس جو چیز بنی بنائی موجود اور پورے استحکام
قوت کے ساتھ موجود ہے اس پر مزید چونے گارے کے اسراف کی
کیا ضرورت ہے؟ اگر اکثریت آپ کے حصن حصین میں سرنگ
لگانے کی فکر میں ہے تو نصیب اعدا آپ کیوں اس درجہ مضطرب و
سراسیمہ ہوں؟ جو بیدار مغز حکومت ایک لاکھ روپیہ سرحد پر روزانہ
خرچ کر کے محض فرضی خطروں کا سدِ باب کرتی ہے کیا وہ اتنی بے ہوش
اور بے خود ہو گئی ہے کہ وہ اپنے حفظ و بقا کی ریڑھ کی ہڈی کو یونہی
اعدا کے حملوں کا ہدف بننے کے لیے چھوڑ دے گی؟"

(مولانا امین احسن اصلاحی، الاصلاح۔ سرائے میر۔ مورخہ جولائی ۳۸ء)

آگے چل کر مولانا فرماتے ہیں:۔

"اگر آپ سچ مچ مسلمانوں کو منظم کرنا چاہتے ہیں تو ان کو کسی
اکثریت و اقلیت کے خطروں سے ڈرانے کی ضرورت نہیں ہے۔
صرف اللہ سے ڈرایئے۔"

پھر ایک طویل بحث کے بعد آیات قرآنی سے استدلال کرتے ہوئے یہ نتیجہ
نکالتے ہیں کہ:۔

"تمہارے سامنے بھی ہمت آزمائی اور عمل کا ایک میدان (یعنی

یہی "آزادی کی جنگ" ہے، جس میں اگر داخل ہو جاؤ تو فتح مندی تمہارے ہی لیے ہے۔ لیکن اکثریت کے خوف اور اس کے سامان اور روپیہ کی کثرت نے تم کو سراسیمہ کر دیا ہے۔ اس لیے عزم و ہمت سے محروم ہو کر تم پست ہمتی کی خاک مذلت پر لوٹ رہے ہو" (حوالہ مذکور)

دیکھیے! یہاں خود ہماری قوم کا ایک اہلِ قلم ہمارے مقدمہ کی کس قدر غلط ترجمانی کر رہا ہے۔ جس عینک سے پنڈت جواہر لال نہرو مسلمانوں کے معاملہ کو دیکھتے ہیں، ٹھیک وہی عینک خود ہمارے ایک بھائی نے اپنی آنکھوں پر لگالی ہے، اور لطف یہ ہے کہ یہاں اس عینک پر رُوسی کارخانے کے بجائے قرآنی رصدگاہ کا لیبل لگا ہوا ہے تاکہ مسلمان بے چارا بچاؤ کی کوئی راہ نہ پا سکے۔ دُنیا سے تو گیا ہی تھا، دین کی عدالت سے بھی گمراہی کا فتویٰ سنے!

جس حکومت کی مہربانیوں کا اس قدر لطیف پیرایہ میں اُوپر ذکر فرمایا گیا ہے، اس کی سب سے بڑی مہربانی ہمارے حالِ زار پر یہ ہے کہ اس نے ڈیموکریسی کے انگریزی اصول ہندوستان میں رائج کیے ہیں، جن کی رُو سے دو مسلمانوں کے مقابلہ میں ۶ غیر مسلموں کی رائے بہرحال صحیح ہے، اور حکومت ہمیشہ اسی رائے کے مطابق چلے گی جو ڈیموکریسی کے اس قاعدے کی بنا پر صحیح قرار پائے۔ مہربان سرکار کی لائی ہوئی اس نعمت کو آگے بڑھ کر وہ غیر مسلم قبول کر لیتے ہیں جو "ہمّت آزمائی اور عمل" کے میدان میں دادِ مردانگی دے رہے ہیں کیونکہ اس میں سراسر انہی کی "فتح مندی" ہے۔ مسلمان اس پر ناک بھوں چڑھاتا ہے تو وہی غیر مسلم اپنی "فتح مندانہ" پوزیشن رکھنے کے لیے مسلمان پر یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ یہ سب کچھ انگریز کے اشارے سے ہو رہا ہے۔ خود غرضانہ نقطۂ نظر سے غیر مسلموں کا یہ کہنا بالکل حق بجانب، کیونکہ ان کو اپنے مفاد کی حفاظت کے لیے ہر ممکن تدبیر کرنی ہی چاہیے۔ مگر یہ مسلمانوں کی بدقسمتی نہیں تو اور کیا ہے کہ خود ان کے اپنے بہت سے لکھنے پڑھنے والے افراد بھی اس معاملہ میں غیر مسلموں کے ہمنوا بن جاتے ہیں۔ سرکار برطانیہ کی لائی ہوئی ڈیموکریسی کی

لعنت تو ان کو نعمت نظر آتی ہے ۔ مگر اس لعنت سے بچنے کے لیے مسلمان اگر کوئی کوشش کرتے ہیں تو ارشاد ہوتا ہے کہ اکثریت و اقلیت کا سوال چھیڑنے کے معنی انگریزی اقتدار کی حفاظت کے ہیں ۔

پھر لطف یہ ہے کہ ایک طرف تو ڈیموکریسی کا یہ قاعدہ تسلیم کر لیا جاتا ہے کہ دو مسلمان چاہے وہ موسیٰ و ہارون ہی کیوں نہ ہوں ، باطل پر ہیں اگر ان کے مقابلہ میں فرعون یا سامری کی اُمت کے چھ آدمی مخالفانہ رائے دیں ، اور دوسری طرف یہ بھی ارشاد ہوتا ہے کہ " مسلمانوں کو اکثریت و اقلیت کے خطروں سے ڈرانے کی ضرورت نہیں ، صرف اللہ سے ڈرانا چاہیئے " اور یہ ہدایت بھی فرمائی جاتی ہے کہ اگر ڈیموکریسی کے اس قاعدے کو قبول کر کے تم " ہمت آزمائی اور عمل کے میدان میں کود پڑو گے " تو " فتح مند ہو گے ، ورنہ یوں ہی " پست ہمتی کی خاک ذلت " پر لوٹتے رہو گے ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انگریز اور ہندو مل کر جو زہر تم کو کھلا رہے ہیں ، ہمت کر کے اسے کھا جاؤ ۔ انشاء اللہ تم کو شہادت کا درجہ نصیب ہوگا جو عین " فتح مندی " ہے ، ورنہ اس زہر کو کھانے سے اگر تم نے انکار کیا ، اور لَا يَسْتَوِي الْخَبِيثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ أَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيثِ[1] کے قرآنی اصول پر پست ہمتوں کی طرح اصرار کرتے رہے تو " اولو الالباب " تم کو جواہر لال نہرو کے ساتھ مل کر طنز و تعریض کی لطیف زبان میں " سرکار برطانیہ کے ٹوڈی " کا طعنہ دیں گے ۔

سب سے آخر میں مولانا ابو الکلام آزاد کی ایک تحریر ملاحظہ ہو جن کا انقلاب حال میرے نزدیک مسلمانوں کے لیے اِس صدی کی سب سے بڑی ٹریجڈی ہے ۔ پچھلے سال جب کانگریس کے ایوان سے مسلم ماس کانٹیکٹ (Muslim Mass — Contact) — کا علم اُٹھایا گیا تو اس کے ساتھ ہی مولانا کا ایک سپہ سالارانہ خطبہ بھی اخبارات میں شائع ہوا ۔ اس میں یہ ارشاد فرمانے کے بعد کہ " مسلمانوں کو اگر کانگریس

---

[1] ناپاک اور پاک برابر نہیں اگرچہ ناپاک کی کثرت تجھ کو فریفتہ کرنیوالی ہو ۔ (المائدہ ۱۰۰)

میں شریک ہونا چاہیے تو صرف اس لیے کہ امداد حق یا غیر مشروط تعاون یہی ہے جسے مولانا
اپنی تمام تقریر اس انداز سے فرماتے ہیں گویا مسلمان اس تحریک میں اس لیے شریک
ہو جائیں جس کی اساس وطنی قومیت اور آئیڈیالوجی سیکولر جمہوری نمونہ پر رکھی گئی ہے یا
نہیں تو وہ بزدل ہیں، کم ہمت ہیں، اور ذلت کی موت مرجانے والے ہیں۔ پوری
تحریر نقل کرنے کی یہاں گنجائش نہیں، مگر چند فقرے نقل کیے بغیر چارہ بھی نہیں:-

"ایک زمانہ تھا جب مسلمانوں نے کانگریس کی شرکت سے اس لیے
انکار کر دیا تھا کہ وہ سرے سے سیاسی اصول و تغیر کے مخالف تھے۔
انہیں یہ بات سمجھائی گئی تھی کہ ہندوستان میں ہندوؤں کی اکثریت ہے
اس لیے یہاں جو تبدیلی بھی جمہوری و نیابتی اداروں کے طریقہ پر کی جائے
گی ہندوؤں کے لیے مفید ہوگی مسلمانوں کے لیے مضر ہوگی۔ چنانچہ
۱۸۸۸ء میں لارڈ ڈفرن اور سر آکلینڈ کالون نے سر سید احمد خاں مرحوم
کو یہی راہ دکھائی تھی اور اسی بنا پر انہوں نے کانگریس کی مخالفت کا اعلان
کیا تھا...... اب ملک اصلاحات کے لیے نہیں بلکہ کامل تبدیلی کے
لیے لڑ رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان تغیرات کے بعد اب کانگریس کی عدم
شرکت کے لیے ۸۸ء والی بات سود مند نہیں ہو سکتی۔ ناگزیر ہے کہ کوئی
دوسری ہی بات اختیار کی جائے۔ چنانچہ اب بعض حضرات نے یہ طریقہ
اختیار کیا ہے کہ جب کبھی کانگریس کی تحریک میں شرکت کا سوال چھڑتا
ہے یا خود کانگریس کا کوئی رکن مسلمانوں کو توجہ دلاتا ہے تو فوراً یہ حضرات
فرقہ وارانہ حقوق اور تحفظات کا سوال چھیڑ دیتے ہیں۔ انہیں خطرہ ہے
کہ اگر برطانی اقتدار ملک میں باقی نہیں رہے گا یا بالکل کمزور پڑ جائے گا تو
ہندو اکثریت ان کے حقوق پامال کر دے گی...."

"خطروں اور تباہ حالیوں کی اس اندیشہ ناکی کا کن لوگوں کو یقین
دلایا جا رہا ہے؟ ان لوگوں کو جو بلحاظ تعداد کے ہندوستان کی سب سے بڑی

دوسری اکثریت اور بلحاظ معنوی قوی کے سب سے پہلی طاقت ور جماعت ہیں، اور پھر ان تمام خطروں کا انسداد کیونکر ہو سکتا ہے بجز اس طرح کہ انڈین نیشنل کانگریس ایک رزولیوشن پاس کر دے، جوں ہی اس نے رزولیوشن پاس کر دیا، خطروں اور تباہ حالیوں کا تمام بادل، جو آٹھ کروڑ انسانوں کے سروں پر چھایا ہوا ہے، دفعتاً چھٹ جائے گا۔

• انہیں اگر کانگریس میں شریک ہونا چاہیے تو صرف اس لیے کہ انہیں اپنے اوپر بھروسہ ہے۔ اس لیے نہیں کہ دوسروں نے انہیں بھروسہ دلایا ہے، یا دوسرے انہیں بھروسہ دلا سکتے ہیں۔ اگر فی الحقیقت ان کی بے بسی اور بے چارگی اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ خطروں اور تباہ حالیوں میں گھر گئے ہیں اور تحفظ کی راہ اس کے سوا کچھ نہ رہی کہ یا تو انگریزی اقتدار کے سہارے جئیں یا کانگریس کے اطمینان دلانے پر، اور خود ان کے اندر خود اعتمادی و ہمت کی ایک چنگاری بھی نہیں رہی جو ان کی ٹھنڈی رگوں کو گرم کر سکے، تو میں کہوں گا ایسی زندہ نعشوں کے لیے یہی بہتر ہے کہ جہاں پڑی ہیں پڑی رہیں۔ ....“

مسلمانوں کی یہ تصویر وہ شخص کھینچ رہا ہے جو ایک زمانہ میں اسلامی ہند کی نشاۃ ثانیہ کا سب سے بڑا لیڈر تھا۔ ان کی مظلومی کا اس سے زیادہ دردناک منظر اور کیا ہو سکتا ہے کہ جو کبھی ”الہلال“ اور ”البلاغ“ کا ایڈیٹر تھا وہ آج ان کی اس قدر غلط ترجمانی کرے۔ مولانا کے مفروضات جن پر اس پورے خطبہ کی بنا رکھی گئی ہے مختصر الفاظ میں حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ سیاسی اصلاح و تغیر کے معنی محض اس تبدیلی کے ہیں جو انگریزوں کے رائج کیے ہوئے جمہوری و نیابتی اداروں کے طریقہ پر کی جائے۔ ایسی تبدیلی کی مخالفت جس مسلمان نے کی اس نے گویا نفس سیاسی اصلاح و تغیر کی مخالفت کی۔ یہ بات اس ہندو کے کہنے کی تھی جو انگریزی اصول جمہوریت و نیابت کو اپنے لیے مفید پا کر قوم

پرستانہ جوش کے ساتھ قبول کرتا ہے۔ مگر وقت کی جادوگری کا تماشہ دیکھیے کہ اس نظریہ کو مولانا ابوالکلام بیان فرما رہے ہیں اور محسوس تک نہیں کرتے کہ فی نفسہٖ یہ نظریہ کس قدر پوچ اور بے اصل ہے۔

۲۔ مسلمانوں کا یہ خیال غلط تھا کہ ہندوستان میں جو تبدیلی انگلستان کے جمہوری دنیاوی ادارات کے نمونہ پر کی جائے گی وہ بربنائے اکثریت ہندوؤں کے لیے مفید اور بربنائے اقلیت مسلمانوں کے لیے مضر ہو گی ———— سیاسیات کا طفلِ مکتب بھی بتا سکتا ہے کہ مولانا کا یہ مفروضہ محض بے اصل ہے اور بلا کسی غور و فکر کے انہوں نے اُس بات کو قبول کر لیا ہے جو ہندوؤں کے سیاسی لیڈر جان بوجھ کر ہمیں بیوقوف بنانے کے لیے کہا کرتے ہیں۔ انگریزوں نے اپنے ملک کے جن جمہوری دنیاوی اداروں کو یہاں ہمارے سر منڈھا ہے ان کی بنا ہی اکثریت کی حکومت (Majority Rule) پر ہے اور ان کو جوں کا توں ایک ایسے ملک میں جہاں دو مختلف قومیں رہتی ہوں، رائج کرنے کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں کہ اکثریت حکمران اور اقلیت محکوم ہو کر رہے۔ لہٰذا سر سید احمد خاں مرحوم کے دَور میں جو رائے قائم کی گئی تھی وہ ہرگز غلط نہ تھی۔ البتہ اگر کسی چیز کو غلط کہا جا سکتا ہے تو وہ ان کی وہ پالیسی ہے جو اس مصیبت سے بچنے کے لیے انہوں نے اختیار کی اور اس کو بھی اس زمانے کے حالات سامنے رکھ کر غلط قرار دیتے ہوئے ایک صاحبِ فکر آدمی کو تامل کرنا چاہیے۔

۳۔ مسلمانوں نے کانگریس سے علیحدگی کا فیصلہ اس بنا پر کیا تھا کہ لارڈ ڈفرن اور سر آکلینڈ کالون نے سر سید احمد خاں مرحوم کو یہ راہ دکھائی تھی ———— مولانا کو شاید خبر نہیں کہ کانگریس کا قیام اور وہ اصول و مقاصد جن پر آج تک کانگریس چل رہی ہے، سب کچھ اسی لارڈ ڈفرن کی رہنمائی کا نتیجہ ہے، اور اس میں لارڈ رپن اور لارڈ ڈلہوزی اور اس عہد کے متعدد دوسرے انگریز مدبرین کے دماغوں نے بھی کام کیا ہے۔ کم از کم اپنے ورکنگ کمیٹی کے رفیق ڈاکٹر پٹا بھی سیتا رامیا ہی کی "تاریخ کانگریس" مولانا نے پڑھ لی ہوتی تو شاید اپنی قوم کے دامن پر دھبہ لگانے کے لیے ہندوؤں کے کارخانہ

روشنائی سے یہ سیاہی مستعار لیتے ہوئے، ان کو کچھ نہ کچھ تامل ضرور ہوتا۔

۴۔ اب ملک اصلاحات کے لیے نہیں بلکہ کامل تبدیلی کے لیے لڑ رہا ہے۔

یہ تحریر اس وقت لکھی گئی ہے جب اصلاحات جدید کو قبول کر کے الکشن لڑے جا چکے تھے امپیریلسٹ گورنمنٹ کے تحت صوبوں کی حکومت کا انتظام کرنے کے لیے کانگریس اپنی خدمات پیش کر چکی تھی، اور اس اقدام میں خود جناب مولانا بھی شریک تھے پھر جب اپنے عمل سے آپ نے ثابت کر دیا کہ آپ کامل تبدیلی کے لیے نہیں بلکہ اصلاحات کے لیے اور ان اصلاحات کے لیے لڑ رہے ہیں جو انگریز اپنے مفاد کے لیے دے رہا ہے اور ہندو اپنے مفاد کے لیے لے رہا ہے، تو "کامل تبدیلی" کے لفظ بے معنی کو محض اس لیے دُہرانا کہ اس کے بغیر مسلمانوں کا منہ کالا نہیں کیا جا سکتا، مہاسبھائی ہندوؤں کو تو ضرور زیب دیتا ہے مگر مولانا کو زیب نہیں دیتا۔

۵۔ مسلمانوں کی موجودہ پوزیشن یہ ہے کہ وہ یا تو انگریزی اقتدار کے سہارے جینا چاہتے ہیں اور اس فکر میں ہیں کہ انگریز کی سنگینیں ان کی حفاظت کے لیے ہندوستان میں موجود رہیں یا پھر یہ چاہتے ہیں کہ کانگریس ان کو تحفظ کا زبانی اطمینان دلا دے۔

یہ بات ایک ہندو امپریلسٹ کے کہنے کی تھی اور کہہ رہے ہیں اسے مولانا ابوالکلام۔ حقیقت میں تو پوزیشن اس وقت یہ ہے کہ دس سال کے بعد کانگریس اور ہندو مہاسبھا پھر اسی نقطہ پر جمع ہو گئی ہیں جس پر یہ نہرو رپورٹ میں جمع ہوئی تھیں۔ "انقلاب" کا ڈراما ختم ہو چکا ہے اور اس کی جگہ وہی دستوری ارتقاء کا نصب العین برسر کار آ گیا ہے جو ابتداء سے ان کے پیش نظر تھا۔ "دستوری ارتقاء" کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ انگریز اپنی سنگین سے مسلمان کو اس وقت تک دبائے رکھے جب تک ہندو اس کی جگہ لینے کے لیے کافی طاقت ور اور کافی قابو یافتہ نہ ہو جائے۔ اب مسلمان جس فکر میں ہے وہ یہ نہیں ہے کہ انگریز کی طرف جائے یا ہندو کی طرف، بلکہ پریشان ہو کر یہ دیکھ رہا ہے کہ گھر کا ساتھی باہر کے غاصب کا اسسٹنٹ بن گیا ہے، باہر کا غاصب اس کو سنگین سے دبائے ہوئے ہے، اور گھر کا ساتھی اپنی

رسیاں کھول کھول کر اس کے ہاتھ پاؤں باندھتا چلا جاتا ہے۔ یہ وقت ایسا تھا کہ مولانا ابوالکلام جیسے لوگ اٹھ کر مسلمانوں کو ان دونوں بلاؤں کے مشترک عمل سے بچانے کی تدبیر کرتے، مگر مولانا ان کو الٹا اس بات پر مطعون فرما رہے ہیں کہ تم اس دامِ فریب میں پھنسنے سے دور کیوں بھاگے جا رہے ہو! ہمت کر کے اپنی گردن اور اپنے ہاتھ پاؤں اس کے پھندوں میں سے کیوں نہیں دیتے!

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ پروپیگنڈا کی طاقت کیسی زبردست طاقت ہے۔ اور جب کوئی قوم نامساعد حالات میں گھر جاتی ہے تو اس پر باہر ہی سے نہیں اندر سے بھی کیسے مصائب نازل ہوتے ہیں۔ جو تصویر اپنی اغراض کے لیے غیروں نے کھینچی تھی، وہ اب خود ہماری اپنی قوم کے دماغوں میں بیٹھتی چلی جا رہی ہے اور اس کو وہ لوگ ہماری اصلی تصویر کی حیثیت سے پیش کر رہے ہیں جن سے ہم توقع رکھتے تھے کہ وہ ہمارے سب سے بہتر نمائندے ہوں گے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ مولانا ابوالکلام یا مولانا حسین احمد یا مولانا سید سلیمان نے یہ باتیں جان بوجھ کر فرمائی ہیں؟ ہرگز نہیں۔ غنا بھی خیالات سے جیروں لگتی ہے وہ غیر محسوس طور سے دماغوں میں نفوذ کرتے ہیں اور غیر ارادی طور سے زبانوں پر آ رہے ہیں۔ یہ ایک جادو ہے جو سروں پر چڑھ کے بول رہا ہے اور کیا بتائیے کہ کیسے کیسے بلند مقام سروں پر چڑھ کر کیا کچھ بول رہا ہے۔ فرقہ پرستی کا لفظ جو مغربی تصورِ قومیت کو پیش نظر رکھ کر وضع کیا گیا تھا، آج مسلمانوں کے علماء اور بڑے بڑے لیڈر اس لفظ کو خود مسلمانوں پر استعمال کر رہے ہیں۔ "نیشنلزم" یا قوم پرستی کا لفظ آج بے تکلف افتخار کے انداز میں بولا جا رہا ہے۔ گویا یہ تسلیم کر لیا گیا کہ ہندوستان ایک "قوم" ہے اور مسلمان، ہندو، عیسائی وغیرہ اس قوم کے فرقے ہیں۔ "رجعت پسندی" اور "ذہنیت" کے الزامات اب خود مسلمانوں کی طرف سے مسلمانوں پر عائد کیے جانے لگے ہیں۔ اور یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ آزادی کے اس جہادِ مقدس میں کود پڑنے سے احتراز بلکہ اس میں ادنیٰ تامل بھی اگر کسی چیز کا نتیجہ ہو سکتا ہے تو وہ بس رجعت پسندی و ذہنیت ہے، یا پھر بزدلی۔

اس طرح ملک کے شعور و جذبات سے دماغ اس قدر متاثر ہو چکے ہیں کہ اب ان کو صبر و سکون کے ساتھ یہ سوچنے کی بھی مہلت نہیں ملتی آخر وہ کیا چیز ہے جو مسلمان جیسی بہادر اور اعلیٰ روح حریت پسند قوم جنگ آزادی کے برابر دس سال سے اس جنگ میں اپنے شایانِ شان حصہ لینے سے محروم ہے؟ اور وہ کیا چیز ہے جس کی وجہ سے اپنوں اور غیروں کے طعنے سننے اور ایسے سخت الزامات آئے دن سہتے رہنے کے باوجود اس قوم کے خون میں جوش نہیں آتا؟ اگر اس کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ شاید یہ مسلمان کا قصور ہو، تو اس کی ایک دوسری ممکن وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ شاید اس "جنگِ آزادی" میں کوئی کھوٹ ہو۔ شاید یہ "شیرانِ بیشۂ حریت" اس جنس کے شیر نہ ہوں جن سے "اسد اللہ" میل کر سکتا ہے اور کرتا رہا ہے۔ شاید اس "آزادی کی فوج" میں وہ خصوصیات ہوں جنہیں دیکھ کر مسلمان کا ضمیر یہ فیصلہ کر لیتا ہو کہ ان کے ساتھ چل کر میں اپنی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکوں گا۔ کم از کم امکان تو دونوں پہلوؤں کا ہے پھر آخر یہ پروپیگنڈا کی طاقت اور نامساعد حالات کی قہرمانی نہیں تو کیا ہے جس کی بدولت رفتہ رفتہ دماغوں پر پہلی شق کا امکان حزم و یقین بن کر مسلط ہوتا جا رہا ہے اور دوسری شق کے متعلق اب طوفان میں بہنے والی کشتی کے مسافروں اور ملاحوں میں سے کسی کو بھی یاد نہیں آتا کہ اس کا بھی کوئی امکان ہے۔

میں آئندہ ابواب میں ناقابلِ تردید واقعات و شواہد سے ثابت کروں گا کہ فی الواقع صورتِ حال یہی دوسری ہے، اور مسلمانوں کو اسی صورتِ حال نے اپنے اہلِ وطن کے ساتھ سیاسی جد و جہد میں حصہ لینے سے روک رکھا ہے۔ اس بحث سے میرا مقصد ایک طرف تو عام مسلمانوں کے تصورات کو واضح کرنا ہے کیونکہ وہ حالات کو دیکھ دیکھ کر پریشان تو ہو رہے ہیں مگر ابھی تک ان خطرات اور مشکلات کو پوری طرح سمجھے نہیں ہیں جن میں وہ اس وقت گھر گئے ہیں، اور اسی وجہ سے انہیں اپنی نجات کا صحیح راستہ پانے میں مشکل پیش آ رہی ہے۔ دوسری طرف میں انصاف پسند غیر مسلموں کو بھی یہ بتانا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کے اصلی احساسات کیا ہیں، ان کا ذہن کس طرح

کام کر رہا ہے اور ہندوستان کی موجودہ سیاسی تحریکات کس طرح مسلمان کے مزاج، اس کے مفاد اور ان اصولوں کے خلاف چل رہی ہیں جن پر وہ ایمان رکھتا ہے۔ ان باتوں کو اگر وہ سمجھ لیں تو انہیں معلوم ہو جائے کہ مسلمان کا مقدمہ ایسا مہمل نہیں ہے جیسا کہ اس کے غلط نمائندے پیش کر رہے ہیں، بلکہ درحقیقت وہ بالکل صحیح بنیاد پر لڑ رہا ہے اور لڑنے پر مجبور کر دیا گیا ہے۔ تیسری طرف اس بحث میں میرے پیش نظر یہ مقصد ہے کہ ان حضرات علماء کو اُن کی غلطی پر متنبہ کروں جو مذہب کے نام سے مسلمانوں کو پشت بمنزل چلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں ان کو اصل حقائق سے روشناس کرانا چاہتا ہوں۔ جس جنگِ آزادی کو وہ اتنا مقدس سمجھ رہے ہیں میں بتانا چاہتا ہوں کہ وہ درحقیقت کس نوعیت کی جنگ ہے۔ جس آزادی کی فوج کو وہ سمجھ رہے ہیں کہ راہِ حق پر گامزن ہے۔ میں بتانا چاہتا ہوں کہ وہ دراصل کس راہ پر جاری ہے اور مسلمان قوم بحیثیت مسلمان ہونے کے چند قدم سے زیادہ اس راہ پر اس کے ساتھ نہیں چل سکتی۔ جس طریقِ کار کو وہ بالکل صحیح طریقِ کار سمجھ کر اختیار کر رہے ہیں میں بتانا چاہتا ہوں کہ وہ خدا اور رسول کے بتائے ہوئے طریقِ کار کے بالکل خلاف ہے۔ یہ سب کچھ عرض کرنے کے بعد میں ان سے درخواست کروں گا کہ اس کو ٹھنڈے دل سے پڑھیں۔ انصاف کی نظر سے دیکھیں اور اس نورِ علم و بصیرت سے جو خدا نے ان کو دیا ہے کام لے کر اپنے حال پر غور کریں کہ کیا وہ مسلمانوں کی صحیح رہنمائی کر رہے ہیں؟ اگر ان کا ضمیر گواہی دے کہ یہ رہنمائی غلط ہے تو انہیں بلا لحاظ اس کے کہ غلط راستہ پر کتنی دُور جا چکے ہیں، اُلٹے قدم واپس ہونا چاہیئے۔ اور راہِ راست معلوم کرنے کے لیے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ اور عقلِ سلیم کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ اور اگر انہیں اس پر اصرار ہو کہ وہی راستہ صحیح ہے جس پر وہ چل رہے ہیں اور مسلمانوں کو چلانا چاہتے ہیں تو میں ان سے مطالبہ کروں گا کہ پہلے وہ دلائل سے اپنا حق بجانب ہونا ثابت کریں محض شخصیتوں کے درمیان تقابل کرنا، یا سیاسی پارٹیوں کی گزشتہ و موجودہ روش کے درمیان موازنہ کرنا یا نرے جذبات سے سپہ سالارانہ انداز

میں اپیل کرنا کوئی استدلال نہیں ہے اور نہ اس سے احقاقِ حق یا ابطالِ باطل ہوا کرتا ہے۔ براہِ کرم حقائق اور واقعات کی دنیا میں آیئے۔ جو حقائق مَیں پیش کر رہا ہوں، یا تو یہ ثابت کر دیجیے کہ وہ حقائق نہیں ہیں، یا پھر ان حقائق کو تسلیم کر کے دلیل حجت سے ـــــ حجت خواہ عقلی ہو یا نقلی، مگر بہر حال ہو حجت ـــــ ثابت کیجیے کہ ان کے باوجود وہی راہ صحیح ہے جو آپ نے اختیار کی ہے۔

یہ کوئی چیلنج نہیں ہے، بلکہ دراصل اس احساسِ ذمّہ داری سے ایک اپیل ہے جو ہر مسلمان کے دل میں ہوتا ہے، جس کی بنا پر وہ اپنے آپ کو ہر عمل کے لیے خدا کے سامنے جواب دہ سمجھتا ہے۔ پھر اس کا مقصد کسی گروہ کو ملزم بنانا اور قابلِ ملامت ٹھیرانے کی کوشش کرنا بھی نہیں ہے۔ جیسا کہ ایک پارٹی کے لوگ دوسری پارٹی والوں کے مقابلے میں کیا کرتے ہیں۔ جو شخص یہ الفاظ لکھ رہا ہے وہ کسی پارٹی میں شامل نہیں اور اُس نے آج تک خدا کی پارٹی کے سوا کسی پارٹی کی طرف بھی مسلمانوں کو دعوت نہیں دی ہے۔ لہٰذا اس اپیل میں خواہ مخواہ پارٹی فیلنگ (Party Feeling) کی بو سونگھنے کی بھی کوشش نہ کی جائے۔ اس کے ساتھ ایک اور بات بھی صاف کہہ دینا چاہتا ہوں۔ میرا یہ خطاب ائمہ سیاست کے مقتدیوں سے نہیں بلکہ خود اماموں سے ہے۔ ان جاہل مقتدیوں سے مَیں کسی بحث میں نہیں اُلجھنا چاہتا جو محض جواب دینے کی خاطر جواب دیا کرتے ہیں، بات کو پوری طرح سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے اور بس باوّل نظر میں یہ دیکھ کر کہ کہنے والا کچھ اُن کی خواہشات کے خلاف کہہ رہا ہے، جوابی بحث اور بحث بھی نہیں بلکہ بازاریوں کی طرح حملے شروع کر دیتے ہیں۔

آزادی اور قومی تشخّص

مسلمانوں کے سامنے "آزادی" کا نام لے کر توقع کی جاتی ہے کہ وہ اس دلفریب نام کو سُن کر بے خود ہو جائیں گے اور حقائق سے آنکھیں بند کر کے ہر اس راستہ پر چل کھڑے ہوں گے جسے "آزادی کا راستہ" کہہ دیا جائے۔

اس میں شک نہیں کہ مسلمان بھی آزادی کے اتنے ہی خواہش مند ہیں جتنے ہندوستان کے دوسرے رنگ بلکہ مسلمانوں میں اس چیز کی تڑپ دوسروں سے بھی کچھ زیادہ ہے۔ ان میں ایک قلیل جماعت ایسی ضرور ہو سکتی ہے جو اپنی اغراض کے لیے ہندوستان میں غیر ملکی اقتدار چاہتی ہو۔ ہندوؤں، سکھوں، پارسیوں اور ہندوستان کی دوسری قوموں میں بھی ایسی قلیل التعداد جماعتیں موجود ہیں۔ لیکن جمہور مسلمین میں شاید کوئی ایک شخص بھی آپ کو نہ ملے گا جو ہندوستان کو انگریزوں کا غلام دیکھنا چاہتا ہو۔ بلکہ اوسطاً ایک مسلمان دوسری تمام قوموں کی بہ نسبت انگریزیت اور اس کے اقتدار کو زیادہ نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اس کا مذہب ہی اسے یہ سکھاتا ہے کہ مادہ پرستی، شہوات کی بندگی اور ظلم و جور پر جس تہذیب اور جس سیاست کی بنا قائم ہو اس سے نفرت کرے۔ پھر اس کے دل میں آج تک یہ زخم تازہ ہے کہ اس مُلک کی حکومت اس سے

چھینی گئی ہے اور اسی کو سب سے زیادہ پامال کیا گیا ہے، اس لیے نہ صرف فطرتاً، بلکہ تاریخی لحاظ سے بھی مسلمان سب سے بڑھ کر آزادی وطن کا خواہش مند ہے۔

آزادی کیوں ؟

لیکن سوال یہ ہے کہ آزادیٔ وطن سے مراد کیا ہے؟ کوئی قوم آزادی کیوں چاہتی ہے؟ یہ چیز فی نفسہٖ مطلوب ہے، یا کسی غرض کے لیے ناگزیر وسیلہ ہونے کی حیثیت سے مطلوب ہے؟ اگر وہ غرض حاصل ہونے کے بجائے اُلٹی فوت ہوتی جاتی ہو تو کیا پھر بھی کسی قوم سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ "آزادی" کے نام پر دیوانہ وار دوڑی چلی آئے گی؟ کیا ایسی "آزادی" کو وہ قوم بھی اپنے لیے آزادی سمجھ سکتی ہے جس کو حقیقت میں آزادی نہ مل رہی ہو؟ اور کیا اس قسم کی آزادی کے لیے جنگ اور قربانی کرنا عقل، فطرت، دین کسی چیز کی رُو سے بھی کسی قوم کا فرض ہو سکتا ہے؟ یہ سوالات ہیں جن پر میدانِ جنگ میں قدم رکھنے سے پہلے ہر ذی عقل انسان غور کرنے پر مجبور ہے، اور مسلمان آخر ذوی العقول سے خارج تو نہیں ہے کہ ان بنیادی سوالات کو نظرانداز کر کے خواہ مخواہ اس بگل کی آواز پر لفٹ رائٹ شروع کر دے جو شیوگاؤں یا سوراج بھون سے پھونکا جائے۔

یہ ظاہر ہے کہ "آزادیٔ وطن" سے مراد ہمالیہ و گنگا جمنا اور مشرقی و مغربی گھاٹوں کی آزادی نہیں ہے۔ یہ پہاڑ اور یہ دریا دس ہزار برس پہلے جیسے آزاد تھے ویسے ہی آج بھی ہیں اور قیامت تک رہیں گے۔ دراصل غلام یہ پہاڑ اور یہ دریا نہیں ہیں بلکہ ہندوستان کے باشندے ہیں، اور آزادیٔ وطن سے مراد حقیقت میں وطن کے باشندوں ہی کی آزادی ہو سکتی ہے۔

پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ وطن جب ۳۵[1] کروڑ باشندوں سے آباد ہے تو صحیح معنوں میں آزادیٔ وطن، صرف اسی آزادی کو کہا جا سکتا ہے جو ان پورے ۳۵ کروڑ

---

[1] یہ اعداد و شمار ۱۹۴۱ء کی مردم شماری سے پہلے کے ہیں — مرتب

باشندوں کے لیے آزادی ہو۔ اہلِ وطن میں سے بعض کی آزادی اور بعض کی غلامی کو پُورے وطن کی آزادی سے ہرگز تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ عموماً لوگ محض سہولت پسندی کی بنا پر بہت سے ایسے ملکوں کو "آزاد" کہہ دیا کرتے ہیں جن کے باشندوں کا ایک حصّہ آزاد اور دوسرا حصّہ خود اہلِ وطن کا غلام ہوتا ہے۔ مثلاً جس دَور کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ہندوستان آزاد تھا اس میں درحقیقت "ہندوستان" آزاد نہ تھا بلکہ ہندوستان کا آریہ آزاد تھا۔ شودر کی غلامی اُس مُلک کے باشندوں کی غلامی سے بھی ہزار درجہ زیادہ بدتر تھی جسے اصطلاحاً ہم غلام کہتے ہیں۔ آج امریکہ کو آزاد مُلک کہا جاتا ہے۔ حالانکہ امریکہ کی آزادی محض اس کے سفید فام باشندوں کی آزادی ہے، سیاہ فام باشندے کسی آزادی سے متمتع نہیں۔ اسی طرح روس کی آزادی صرف اس کے کمیونسٹ باشندوں تک محدود ہے۔ مسلمان، عیسائی اور تمام غیر اشتراکی بلکہ غیر اسٹالینی باشندوں کے لیے قطعاً کوئی آزادی نہیں، بلکہ ہماری غلامی سے بھی بدتر غلامی ہے۔ جنوبی افریقہ کی آزادی محض اِس کے فرنگی باشندوں کے حصّہ میں آئی ہے۔ وہاں کی دیسی آبادی اور ہندوستانی آبادی اس درجہ غلام ہے کہ ہم اپنے آپ کو نسبتاً ان کے مقابلہ میں آزاد کہہ سکتے ہیں۔ جرمنی کی آزادی صرف آرین نسل کے لیے ہے، سامیوں کے لیے نہیں۔ چیکوسلواکیہ کی آزادی چند روز پہلے تک صرف چیک اور سلواک باشندوں کے لیے مخصوص تھی، دوسروں کے لیے نہیں[1]۔ ایسے ممالک کو اگر عرفِ عام میں آزاد کہا جاتا ہے تو اس سے وہ تلخ حقیقت شیرینی نہیں بن جاتی جو ان کے غلام باشندوں کو رات دن زہر کے گھونٹوں کی طرح حلق کے نیچے اتارنی پڑتی ہے۔

یہ ایک عام غلط فہمی ہے کہ محض غیر ملکی اقتدار سے آزاد ہو جانے کا نام "آزادی" رکھ دیا گیا ہے، حالانکہ یہ آزادی کی تمام حقیقت نہیں ہے، بلکہ صرف اس کا مقدمہ ہے۔ آزادی کا اصلی جوہر تو حکومتِ خود اختیاری سے متمتع ہونا اور اپنی اجتماعی خواہشات و ضروریات کو پُورا کرنے پر آپ قادر ہونا ہے۔ یہ چیز اگر مُلک کے کسی گروہ کو حاصل نہ ہو، اگر اس کی تکمیل اپنے ہی وطن کے کسی دوسرے گروہ کے ہاتھ میں

---

[1] یہ بات چیکوسلواکیہ پر جرمنی کے قبضے کے بعد لکھی گئی تھی۔

رہے کہ جس طرح وہ چاہے اسے اُٹھائے اور جس طرف چاہے اسے چلائے اور جو کچھ چاہے اس پر لاد دے تو وہ حقیقت میں غلام ہی ہوگا، اس کے لیے مُلک کی آزادی محض بے معنی ہوگی۔ غلامی اپنی حقیقت اور فطرت کے لحاظ سے بہرحال ایک ہی چیز ہے۔ اس لحاظ سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا کہ وہ غیر ملک والوں کی غلامی ہے یا اہلِ وطن کی۔ اگرچہ تجربے سے یہی ثابت ہوا ہے کہ کمیت و کیفیت کے اعتبار سے اہلِ وطن کی غلامی بہ نسبت غیر ملکیوں کی غلامی کے زیادہ شدید ہوتی ہے۔ مثلاً جو سلوک امریکہ کا سفید فام اپنے حبشی اہلِ وطن کے ساتھ کرتا ہے، یا جو برتاؤ روس کا اشالینی اپنے غیر اشالینی یا غیر اشتراکی اہلِ وطن سے کر رہا ہے، اس کو کوئی نسبت اُس طرزِ عمل سے نہیں جو ہندوستان میں انگریزوں نے ہمارے ساتھ اختیار کیا ہے۔ تاہم دونوں قسم کی غلامیوں میں سے ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے کا سوال ہرگز پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ غلامی بہرحال ایسی چیز ہے کہ اسے دفع کرنے کی کوشش ہی کرنی چاہیے۔ پس جو شخص اہلِ وطن کی غلامی کو غیر ملکیوں کی غلامی پر ترجیح دیتا ہو اور دوسری قسم کی غلامی کو محض پہلی قسم کی غلامی میں بدل لینے کا نام "جنگِ آزادی" رکھے، اور ایسی جنگِ آزادی میں شریک ہونے کو فرض قرار دے، وہ دراصل جنت الحمقاء کا باشندہ ہے۔ کوئی صاحبِ عقل انسان اس کی پیروی نہیں کر سکتا۔ نہ ایک پوری کی پوری قوم اتنی بیوقوف ہو سکتی ہے کہ وہ صرف غیر ملکی اقتدار سے آزاد ہونے کے لیے میدانِ جنگ میں کود پڑے، اور یہ پوچھنے کی ضرورت نہ سمجھے کہ آزادی کے اصلی جوہر میں بھی اس کا کوئی حصّہ ہے یا نہیں۔

ایک وطن کے باشندوں کو مجرد اس واقعہ کی بنا پر کہ وہ ایک وطن کے باشندے ہیں، تمام حیثیات سے ایک سمجھ لینا، اور اس مفروضہ پر ملک کی آزادی کو ان سب کے لیے یکساں آزادی قرار دینا، یا تو جہالت ہے یا پھر خطرناک قسم کی چالاکی۔ بہت سے لوگ اسی مفروضہ کو سامنے رکھ کر بے تکلف کہہ جاتے ہیں کہ "بھائی! جب مُلک آزاد ہوگا تو سب آزاد ہو جائیں گے۔" لیکن یہ مفروضہ ہر حال میں ہر جگہ صحیح نہیں ہو سکتا۔ جہاں صرف ایک قوم رہتی ہو، مختلف گروہ اور ان گروہوں کے درمیان گروہی امتیازات نہ

ہوں، اور سب باشندے اپنے عقائد، جذبات، خیالات (Sentiments) رسوم و رواج، تواہمی معاشرت اور طرز زندگی کے اعتبار سے ایک ہوں یا بالکل باہم متقارب ہوں، وہاں تو بلا شبہ کہا جا سکتا ہے کہ محض ملک کا آزاد ہو جانا ہی تمام باشندگان ملک کا آزاد ہو جانا ہے کیونکہ وہاں اہالی ملک کے درمیان رنگ رنگ کے گروہ ہی کا وجود نہیں ہے جن کی بنا پر اس امر کا امکان پیدا ہوتا ہو کہ آزادی ایک گروہ کے پاس آ کر رہ جائے اور دوسرے گروہ تک نہ پہنچ سکے۔ لیکن جس ملک کے باشندوں میں ایک سے زیادہ گروہ موجود ہوں اور ان کے درمیان نسل یا رنگ، یا زبان، یا عقائد، جذبات اور طرز زندگی کے بین اختلافات موجود ہوں، وہاں اس امر کا امکان ہے کہ آزادی کی دولت کو ایک گروہ اچک لے اور دوسرے گروہ یا گروہوں کو اس سے محروم کر دے۔ ایسی جگہ وہ مفروضہ نہیں چل سکتا جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ وہاں ہر گروہ کو یہ پوچھنے کا حق ہے، اور اگر وہ اپنے وجود کو عزیز رکھتا ہے تو اسے پوچھنا چاہیے کہ آزادی حاصل کرنے کا کونسا طریقہ اختیار کیا جا رہا ہے، اور جس آزادی کے لیے جدوجہد کی جا رہی ہے وہ کس نوع کی آزادی ہے۔ پھر اگر واقعات سے کسی گروہ پر یہ ثابت ہو جائے کہ حصول آزادی کا وہ طریقہ اختیار کیا جا رہا ہے جو اس کے اجتماعی وجود کو نقصان پہنچانے والا ہے، اور ملک کی آئندہ حکومت ایسے اصولوں پر تعمیر ہو رہی ہے جن کی بدولت حکمرانی کے اختیارات سے وہ لازمی طور پر محروم ہو جاتا ہے تو اس سے ہرگز یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ ایسی جنگ آزادی میں حصہ لے گا۔ ایسی آزادی کو ملک کی آزادی کہنا حقیقت کے خلاف ہے۔ جس گروہ کے لیے یہ آزادی نہیں بلکہ غلامی ہے، اور جس گروہ کے لیے یہ زندگی نہیں بلکہ موت ہے وہ آخر کیوں اس کے حاصل کرنے میں حصہ لے۔

اس مرحلے پر پہنچ کر ہم سے دو مختلف باتیں کہی جاتی ہیں، اور ضرورت ہے کہ ہم ان پر ٹھنڈے دل سے غور کریں۔ کہا جاتا ہے کہ ملک کی آزادی کا لازمی نتیجہ

خوشحالی ہے، اور یہ خوشحالی جب آئے گی تو تمام باشندے اس سے متمتع ہوں گے۔ تعلیم عام ہوگی۔ تمدن ترقی کرے گا۔ صنعت و حرفت اور تجارت کو فروغ ہوگا۔ معیارِ زندگی بلند ہوگا۔ اور اقوام عالم کے درمیان اہلِ ملک کی عزت بڑھے گی۔ یہ فوائد ظاہر ہے کہ ملک کے تمام باشندوں کو حاصل ہوں گے۔ پھر کیوں نہ ملک کے ہر گروہ کو ان فوائد سے یکساں دلچسپی ہو اور کیوں نہ وہ ان کے حصول کے لیے مل کر جد و جہد کریں؟

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ملک کی خوش حالی اور ترقی کے لیے آزادی ناگزیر ہے، اور آزادی کے حصول میں مختلف گروہوں کا وجود اور ان کے امتیازات مانع ہیں، لہٰذا کوشش کرنی چاہیے کہ ان گروہوں کو اور ان کے امتیازات کو مٹا کر تمام اہلِ ملک کو ایک کر دیا جائے۔ کیونکہ جب تک یہ باقی رہیں گے ملک آزاد نہ ہو سکے گا اور جب تک ملک آزاد نہ ہوگا، تمام اہلِ ملک خواہ وہ کسی گروہ سے تعلق رکھتے ہوں، یکساں بدحالی، افلاس، جہالت، اخلاقی اور ذہنی پستی میں مبتلا رہیں گے، کیا تم ان حالات کو دائمًا برقرار رکھنا چاہتے ہو؟

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ایک ملک کے باشندوں میں عقائد، جذبات، طرزِ زندگی، زبان، ادب اور تہذیب و تمدن کے اختلافات غیر حقیقی اور مصنوعی ہیں۔ ان کو زندگی کے اہم تر مسائل سے کوئی علاقہ نہیں۔ زندگی کے اہم تر مسائل یہ ہیں کہ لوگوں کو کھانے کے لیے مل رہا ہے یا نہیں؟ ان کے لیے زندگی کی ضروریات پوری کرنے اور مزید برآں زندگی کی آسائشوں سے متمتع ہونے کے مواقع موجود ہیں یا نہیں؟ ان کے ملک میں دولت آفرینی کے جو وسائل موجود ہیں اُن سے کس قدر فائدہ اُٹھایا جا رہا ہے؟ اور جو دولت وہ پیدا کر رہے ہیں وہ کس طرح تقسیم ہو رہی ہے؟ ان اہم تر مسائل کا تعلق تمام باشندگانِ ملک سے یکساں ہے اور ان میں ان سطحی اختلافات کا کچھ دخل نہیں جن کا تم ذکر کرتے ہو۔ لہٰذا یہ اختلافات اگر موجود بھی ہیں تو انہیں نظر انداز کر دینا چاہیے اور تمام باشندگانِ ملک کو ایک قوم فرض کر کے زندگی کے ان مسائل کو حل کرنا چاہیے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ تہذیب و تمدن کے بقا و قیام اور عروج و ارتقاء کا انحصار بھی معاشی فلاح اور سیاسی آزادی پر ہے۔ یہ چیز اگر حاصل نہ ہو تو کوئی تہذیب زندہ نہیں رہ سکتی، کجا کہ ترقی کر سکے۔ لہٰذا تہذیب و تمدن کا مفاد بھی اس امر کا متقضی ہے کہ ملک کے تمام گروہ مل کر پہلے سیاسی آزادی اور معاشی فلاح کے لیے جدوجہد کریں۔

یہ مختلف باتیں کبھی مختلف زبانوں سے اور کبھی ایک ہی زبان سے سننے میں آتی ہیں۔ لیکن جب ہم ان پر غور کرتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ اگر یہ ہم کو دھوکا دینے کے لیے نہیں کہی جا رہی ہیں تو ان کے کہنے والے خود دھوکے میں ہیں۔ وہ حقیقت کو طالب علم کی نظر سے نہیں دیکھتے، بلکہ مشنری کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جو اپنی خواہشِ نفس کے اتباع میں گم ہو جاتا ہے۔

آج انسان اس دور سے آگے نکل چکا ہے جس دور میں وہ محض ایک جانور ہونے کی حیثیت سے بس اپنی جسمانی ضروریات کی تکمیل کا خواہش مند ہوتا تھا، اور یہ امر اس کی نگاہ میں کوئی خاص اہمیت نہ رکھتا تھا کہ یہ ضروریات کس ڈھنگ پر، کس صورت میں پوری ہوتی ہیں۔ اب اس کے لیے اپنی ہزارہا برس کی طے کی ہوئی مسافت کو اُلٹے پاؤں دوبارہ طے کرنا اور یکایک اسی دورِ وحشت و حیوانیت کی طرف پسپا ہو جانا محال ہے۔ اس طویل مدت میں اس کی عقل، اس کے مذاق، اس کے علم اور اس کی قوتِ اجتہاد و اکتساب کے ارتقا سے انسانیت کے مختلف نمونے (Models) پیدا ہو چکے ہیں۔ ایک ایک قوم ایک ایک نمونے کو پسند کر کے اس پر اپنی اجتماعی شخصیت تعمیر کر چکی ہے۔ اور اس خاص نمونۂ انسانیت کو اپنی قومی ہیئت (National Type) بنا چکی ہے جو صدیوں کے نشوونما سے اس کے اندر پختہ ہوا ہے۔ اب ایک قوم کی زندگی دراصل اس کے نیشنل ٹائپ کی زندگی ہے اور اس کے نیشنل ٹائپ کا مر جانا خود اس قوم کا مر جانا ہے۔ اگرچہ ضروریاتِ زندگی کا پورا ہونا، دولت حاصل کرنا اور اسے خرچ کرنا آج بھی ایک قوم کے لیے اتنی ہی اہمیت رکھتا ہے جتنی اہمیت آج سے دس ہزار برس پہلے رکھتا تھا۔ لیکن ان تمام معاملات کا دامن ہر قوم کے مخصوص نظریہ

زندگی اس کے ضابطۂ اخلاق، اس کے اصول معاشرت وتمدن، اور اس کے معیار قدر وقیمت کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔ ہر قوم اپنی ضروریات کو اپنے نیشنل ٹائپ کے مطابق پورا کرنا چاہتی ہے۔ آپ محض "ضروریات زندگی" کا نام لے کر کسی قوم سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان کے حصول کے لالچ میں وہ اپنے نیشنل ٹائپ کو تبدیل کر دے۔ کیونکہ اس کی تبدیلی دراصل قوم کی موت ہے۔ کوئی قوم جس کی قومی سیرت مستحکم ہو چکی ہو وہ محض آسائشوں کے لالچ سے اپنے نیشنل ٹائپ کو بدلنے پر آمادہ نہیں ہو سکتی۔ اور جو قوم اس پر آمادہ ہو جائے اس کے متعلق یہ یقین کے ساتھ جان لینا چاہیئے کہ یا تو اس کا کیرکٹر ابھی بنا نہیں ہے، یا پھر وہ ایک ذلیل اور موقع طلب (Opportunist) قوم ہے جس کی سیرت پر کوئی اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

آزادی اور قومی وجود

اس بنیادی حقیقت کو ذہن نشین کرنے کے بعد غور کیجئے کہ کوئی قوم آزادی کیوں چاہتی ہے۔ اس سوال کا صرف ایک ہی جواب ممکن ہے۔ اور وہ یہ کہ اپنے نیشنل ٹائپ کی حفاظت اور اس کے نشو وارتقاء کی خواہش ہی دراصل آزادی کی طلب کا مبداء ہے۔ جو قوم غلام ہوتی ہے وہ اپنے نیشنل ٹائپ کو صرف یہی نہیں کہ ترقی نہیں دے سکتی، بلکہ اس کے برعکس اس کا نیشنل ٹائپ مضمحل ہو جاتا ہے۔ اگر کسی قوم کو اپنا نیشنل ٹائپ عزیز نہ ہو تو اس میں سرے سے آزادی کی خواہش پیدا نہ ہو گی اور جس قوم میں آزادی کے لیے تڑپ پائی جاتی ہے اس کی تڑپ کا کوئی سبب اس کے سوا نہیں کہ وہ اپنے نیشنل ٹائپ کو عزیز رکھتی ہے، اسے فنا نہیں ہونے دینا چاہتی، اور اس کو ترقی دینے کی خواہش مند ہے۔

جب حقیقت یہ ہے تو وہ صرف ایک جاہل اور بیوقوف آدمی ہوگا جو آزادی حاصل کرنے کی خاطر کسی قوم کو اپنا نیشنل ٹائپ بدل دینے کے لیے کہے گا۔ اس سے بڑھ کر اور کیا حماقت ہو سکتی ہے کہ جس چیز کی خاطر آزادی کی خواہش ایک قوم میں پیدا ہوا کرتی ہے اسی چیز کو مٹانے کا خیال ظاہر کیا جائے اور پھر یہ توقع رکھی جائے کہ

آزادی کی پکار اس قوم کے دل و دماغ کو اپیل کرے گی۔ کیا کوئی شخص نقصان اٹھانے کی نیت سے تجارت کر سکتا ہے؟ کیا کوئی شخص مرنے کے لیے غذا کھا سکتا ہے؟ کیا کوئی شخص اس غرض کے لیے پانی کی طرف دوڑ سکتا ہے کہ اس کی پیاس بجھنے کے بجائے اس کا سینہ جل جائے؟ اگر یہ ممکن نہیں تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک قوم اپنے قومی وجود کو ختم کرنے کے لیے آزادی کی خواہش کرے حالانکہ آزادی اس کی مطلوب ہی صرف اس لیے ہو سکتی ہے کہ اپنے قومی وجود کو زندہ رکھے اور ترقی دے۔

بلاشبہ یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ کوئی قوم اپنے نیشنل ٹائپ کی حفاظت اور ترقی کے لیے کچھ نہیں کر سکتی جب تک کہ وہ آزاد نہ ہو جائے لیکن اس کے ساتھ یہ سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ جس ملک میں متعدد قومیں مختلف قومی ہیئتوں کے ساتھ رہتی ہوں وہاں مجرد ملک کی آزادی کو ہر ہر قوم کی آزادی نہیں کہا جا سکتا۔ یہاں آپ کو صراحت کے ساتھ یہ بتانا پڑے گا کہ آزاد حکومت کی نوعیت کیا ہوگی۔ اگر آزاد حکومت کے لیے آپ کے پاس اس جمہوریت کے اصول ہوں جس کے معنی محض اکثریت کی حکومت کے ہیں تو لامحالہ یہ آنے والی آزادی صرف اس قوم کے لیے آزادی ہوگی جو کثیر التعداد واقع ہوئی ہو۔ قلیل التعداد قوموں کے لیے اس کے معنی بجز اس کے کچھ نہ ہوں گے کہ وہ غیر ملکی اقتدار سے نکل کر خود اپنی ایک ہم وطن قوم کی تابع ہو جائیں۔ ایسی آزادی کو نہ تو قلیل التعداد قومیں اپنے لیے آزادی سمجھ سکتی ہیں اور نہ یہ توقع کر سکتی ہیں کہ اکثریت کی حکومت کے تحت رہ کر انہیں اپنے نیشنل ٹائپ کی حفاظت اور ترقی کا کوئی موقع مل سکے گا۔ آزادی کی جنگ میں ان کے لیے صرف اسی وقت کشش پیدا ہو سکتی ہے جب کہ آزاد حکومت کا ایک ایسا نقشہ ان کے سامنے پیش کیا جائے جس میں ان کے لیے بھی حکومت خود اختیاری رکھی گئی ہو۔ اس لیے کہ صرف حکومت خود اختیاری ہی وہ چیز ہے جس سے کوئی قوم اپنے نیشنل ٹائپ کی حفاظت و ترقی کے لیے کچھ کر سکتی ہے اور نیشنل ٹائپ کی حفاظت و ترقی ہی وہ واحد غرض ہے جس کے لیے کوئی قوم آزادی چاہتی اور آزادی کی خاطر لڑ سکتی ہے۔

رہا یہ قول کہ ملک کی خوش حالی میں تمام باشندگانِ ملک کا یکساں حصہ ہوگا خواہ ملک کا نظامِ حکومت بالکل اکثریت کے ہاتھوں میں ہی کیوں نہ ہو، تو یہ قطعاً غلط ہے۔ جہاں قومی امتیاز موجود ہو وہاں ترجیح ہم جنس لازماً موجود ہوتی ہے۔ اور جہاں ترجیح ہم جنس پائی جاتی ہو وہاں صرف عقائد، جذبات، طرزِ زندگی، زبان و ادب اور تہذیب و تمدن ہی کے معاملہ میں ایک قوم کا مفاد دوسری قوم سے مختلف نہیں ہوتا بلکہ معاشی، سیاسی اور انتظامی معاملات میں بھی لازماً مختلف ہو جاتا ہے۔ وہاں جس طرح ایک قوم اپنی تعلیم، اپنی معاشرت اور اپنی تہذیب کے سوال کو بے خوف و خطر دوسری قوم کے ہاتھ میں نہیں دے سکتی، اسی طرح وہ اپنی روٹی کے سوال کو بھی اس کے ہاتھ میں دے کر مطمئن نہیں ہو سکتی، اور نہ انتظامی و تشریعی ادارات میں اپنی نمائندگی کے سوال کو اس پر چھوڑ سکتی ہے۔ جس جگہ ایک شخص پانی پینے اور کھانا کھانے کے لیے بھی یہ دیکھتا ہو کہ پانی لانے والا اور کھانا بیچنے والا اس کا ہم قوم ہے یا نہیں، جہاں ایک شخص بازار میں خرید و فروخت کرتے وقت بھی دکاندار کی قومیت پر نظر رکھتا ہو، جہاں ایک مزدور سے خدمت لیتے ہوئے یا کسی آدمی کو ملازم رکھتے ہوئے بھی دیکھا جاتا ہو کہ اس مزدور یا اس امیدوار کا تعلق کس قوم سے ہے، وہاں یہ دعویٰ ہرگز نہیں کیا جا سکتا کہ ملک کے سارے باشندوں کا معاشی یا سیاسی مفاد یکساں ہے، اور کسی ایک قوم کے ہاتھ میں حکومت کے اختیارات سمٹ جانے سے دوسری قوم کے پیٹ کو کوئی خطرہ نہیں۔

پھر جیسا کہ میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں، یہ خیال کرنا بھی بالکل غلط ہے کہ دولت آفرینی اور تقسیمِ دولت اور معیارِ زندگی کی ترقی اور ضروریاتِ زندگی کی فراہمی کے مسائل کا کوئی تعلق تہذیب و تمدن سے نہیں ہے۔ اس باب میں ہر جماعت اپنا ایک الگ مسلک اور الگ نقطۂ نظر رکھتی ہے اور محض آسائشِ جسمانی کے لالچ سے اس بات پر آمادہ نہیں ہو سکتی کہ اپنے نقطۂ نظر کو دوسرے نقطۂ نظر سے بدل لے۔ آپ اشتراکی جماعت سے یہ توقع نہیں کر سکتے کہ وہ اپنے نظریاتِ معیشت و اجتماع کو کسی لالچ کی بنا پر سرمایہ دارانہ نظریات سے بدل لے گی۔ اسی طرح آپ کو ایک مسلمان سے بھی یہ

توقع نہ کرنی چاہیئے کہ وہ ان مسائل کو حل کرنے میں اپنے مخصوص نقطۂ نظر کو بدل دیگا اور اپنے آپ کو دوسروں کے حوالہ کر دے گا کہ وہ جس طرح چاہیں اس کے لیے دولت کی پیدائش اور اس کی تقسیم کے سوال کو حل کر دیں، درآنحالیکہ یہ سوال اس کی تہذیب و تمدن کے نقشے کو بنانے اور بگاڑنے میں فیصلہ کن اہمیت رکھتا ہے۔

اِس بحث سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آسکتی ہے کہ جو لوگ "آزادی" کا لفظ زبان سے نکال کر یہ توقع رکھتے ہیں کہ ہندوستان کے مسلمان اس نام کو سُنتے ہی ان کی طرف دوڑے چلے آئیں گے، اور جب ان کی یہ توقع پُوری نہیں ہوتی تو مسلمانوں کو بُزدلی اور رجعت پسندی اور حامراج پرستی کے طعنے دیتے ہیں، وہ کس خام خیالی میں مبتلا ہیں۔ ہر قوم میں تھوڑے یا بہت افراد ایسے ضرور نکل آتے ہیں جو اپنے تخیلات و اوہام میں گُم ہو کر اپنے قومی مفاد کو بھُول جاتے ہوں، اور ایسے افراد بھی ضرور پائے جاسکتے ہیں جو دن کی روشنی میں بھی نمایاں حقائق کو نہ دیکھ سکتے ہوں۔ مگر ایک پُوری کی پوری قوم نہ اندھی ہو سکتی ہے اور نہ بیوقوف۔ وہ کسی آواز پہ دوڑ پڑنے سے پہلے یہ ضرور دیکھے گی کہ اس کو کس طرف بُلایا جا رہا ہے۔ وہ محض آزادی کی پُکار پر فریفتہ نہیں ہو سکتی۔ بلکہ عین اس کی عقل اور فطرت کا اقتضا ہے کہ اس پُکار کی حقیقت پر غور کرے اور یہ تحقیق کرے کہ آزادی حاصل کرنے کے لیے کون سا طریقہ اختیار کیا جا رہا ہے اور پکارنے والے جس آزادی کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں اس کی نوعیت کیا ہے۔

آئندہ صفحات میں انہی دو سوالات کی تحقیق کی جائے گی۔

قوم پرستوں کے نظریات

خوش قسمتی سے ہمارے پاس ایک ایسی کتاب موجود ہے جس میں ہندوستان کے بین الاقوامی مسئلے اور اس کے حل، اور ہندوستان کی آزاد حکومت کے نقشے اور اس کے طریق حصول کے متعلق "قوم پرست جماعت" کے نظریہ کی پوری تشریح مل جاتی ہے۔ یہ کتاب پنڈت جواہر لال نہرو کی تصنیف ہے، جو نہ صرف کانگریس کے صدر رہ چکے ہیں، بلکہ گاندھی جی کے متوقع جانشین سمجھے جاتے ہیں۔ اگرچہ آگے چل کر ہم اس قوم پرستی کے تمام اساطین سے استفادہ کرنے والے ہیں، مگر بحث کی ابتدا بھارت بھوشن پنڈت جواہر لال نہرو کے افادات سے کرنا ہر آئینہ مناسب ہے۔

پنڈت جی کو یہ فخر حاصل ہے کہ انہوں نے ہندوستان کے بین الاقوامی مسئلہ کا ایک نیا حل دریافت کیا ہے جس کی گہرائیوں تک یا تو ان سے پہلے کے ہندستانی سیاستدانوں کی نظر نہ پہنچی تھی، یا ان میں ایسا انقلابی حل پیش کرنے کی جرأت نہ تھی۔ اس حل کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے اُن نظریات کا تجزیہ کرنا ضروری ہے جن کو پنڈت جی نے بطور اصول موضوعہ کے تسلیم کر لیا ہے اور پھر انہی پر اس پالیسی کی بنیاد رکھی ہے جسے وہ اس مسئلہ کا صحیح حل سمجھتے ہیں۔ میں ان نظریات کو ترتیب وار بیان کروں گا تاکہ اس

پالیسی کی پیدائش اور اس کے ارتقاء کا پورا نقشہ آپ کے سامنے آجاتے۔

اصول موضوعہ

پنڈت جی کے تصور کی ابتدا یہاں سے ہوتی ہے کہ وہ ہندوستان کی آبادی کو ایک قوم فرض کرتے ہیں۔ تاریخِ یورپ اور سیاسیاتِ یورپ کے مطالعہ سے ان کے ذہن میں قومیت کا صرف ایک ہی تصور پیدا ہوا ہے، اور وہ یہ کہ ایک جغرافی رقبہ کی تمام آبادی ایک قوم ہے اور اس کو ایک ہی قوم ہونا چاہیئے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ فرانس ایک ملک اور ایک قوم ہے جرمنی ایک ملک اور ایک قوم ہے۔ اٹلی، انگلستان، ہسپانیہ وغیرہ ایک ایک ملک اور ایک ایک قوم ہیں۔ اس مشاہدے کے دوران میں ان کی نظر اس حقیقت کی طرف نہیں جاتی کہ ان میں سے ہر ملک کے باشندے ایک اسپرٹ، ایک قسم کے تمدن اور کم از کم قریبی دور کی حد تک ایک قسم کی تاریخی روایات کے حامل ہیں، اور وہ تمام عناصر ترکیبی جن سے ایک قومیت وجود میں آتی ہے ان کے درمیان مشترک ہیں یا واقعات کی رفتار نے ان کو مشترک بنا دیا ہے اور اس اشتراک ہی نے ان کے اندر یہ ہم آہنگی اور یگانگت پیدا کی ہے۔ ان سب حقیقتوں کو نظر انداز کر کے وہ ایک نہایت سطح بین آدمی کی طرح یہ فرض کر لیتے ہیں کہ ان سب ممالک میں قومیت کی اساس رشتۂ وطنیت کا اشتراک ہے، اور اسی طرح سے ہر خاک وطن کی پیداوار کو ایک ہی قوم ہونا چاہیئے۔ یہی تصور ہے جس کے تحت ان کے قلم سے یہ الفاظ نکلے ہیں:-

> "ہندوستان میں مسلم اقلیت پر زور دینے کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ بس یہی کہ ایک قوم کے اندر ایک دوسری قوم موجود ہے جو یکجا نہیں ہے، منتشر ہے مبہم ہے اور غیر متعین ہے۔ اب سیاسی نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو یہ تخیل بالکل لغو معلوم ہوتا ہے اور معاشی نقطۂ نظر سے یہ بہت دور از کار ہے اور بدقت قابل توجہ کہا جا سکتا ہے۔ مسلم قومیت کا ذکر کرنے کے معنی یہ ہیں کہ دنیا میں کوئی قوم ہی نہیں بس مذہبی اخوت

کا رشتہ ہی ایک چیز ہے، اس لیے جدید مفہوم میں کوئی قومیت نشوونما نہ پاسکے۔"

(میری کہانی، جلد دوم صفحہ ۳۲۱ - مکتبہ جامعہ دہلی)

اس عبارت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ پنڈت جی کے ذہن میں ہندوستانی قومیت کا تصور کیا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ مطالعہ اور فہم کا قصور ہو، یا ہندوستان کو ایک قوم دیکھنے کی آرزو نے ان کے ذہن کو روشن ترین حقائق کے ادراک سے عاجز کر دیا ہو۔ بہرحال یہ واقعہ ہے کہ وہ قوم پرستی اور فرقہ پرستی کے الفاظ کو بالکل حقیقی معنوں میں لیتے ہیں۔ ان کے نزدیک ہندوستان میں ایک ہی قوم رہتی ہے، اور یہ مسلمان، ہندو، عیسائی وغیرہ محض اس قوم کے فرقے ہیں۔ اسی بنا پر وہ ہندوستان کی ان جماعتوں کے اختلافات کو "فرقہ وارانہ" مسئلے سے تعبیر کرتے ہیں، اور یہ بنیادی حقیقت ان کے ذہن کی گرفت میں آتی ہی نہیں کہ یہ مسئلہ دراصل فرقہ وارانہ نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے ---- آپ چاہیں تو اسے بدقسمتی کہیے اور بہت ہی ناگوار چیز سمجھیے، مگر ہے یہ حقیقت اور اس حقیقت کو نظر انداز کرنے میں پنڈت جی تنہا نہیں ہیں بلکہ تمام "قوم پرست" ان کے شریک حال ہیں۔

تصورِ قومیت کے بعد دوسرا تصور جو صاحب موصوف کے دماغ پر حاوی ہے وہ کارل مارکس کا فلسفۂ تاریخ ہے۔ یہاں اس فلسفہ کی تشریح کا موقع نہیں۔ مختصر یہ کہ جس طرح کسی بھوکے سے پوچھا گیا تھا کہ دو اور دو کتنے ہوتے ہیں تو اس نے کہا تھا کہ چار روٹیاں، اسی طرح معاشی مصائب کے مارے ہوئے اس فلسفی نے بھی دنیا کے تمام مسائل کا مرکز و محور صرف روٹی کے مسئلہ کو قرار دیا ہے۔ تاریخ کے تمام انقلابات میں اس کو معاشی طلب یا بھوک کے سوا کوئی قابلِ توجہ عامل (Factor) نظر نہیں آتا۔ اس کے نزدیک جواہر لال نہرو کے الفاظ میں:-

"دنیا کی ساری تاریخ کا خلاصہ یہ ہے کہ معاشی مفاد ہی وہ قوت ہے جو جماعتوں اور طبقوں کے سیاسی خیالات کی تشکیل کرتی ہے۔" (صفحہ ۴۰۰)

اگرچہ پنڈت جی بقولِ خود کسی اذعانی عقیدے (Dogma) کے قائل نہیں ہیں۔ مگر مارکس کی اس تعبیرِ تاریخ کو انہوں نے وحی آسمانی کی طرح قبول کیا ہے اور اس کے متعلق وہ فرماتے ہیں کہ "اب میرے نزدیک تاریخ کے معنی ہی بدل گئے۔ مارکس کی تعبیر نے اسے کہیں زیادہ روشن اور واضح کردیا۔" (صفحہ ۱۴۱)

اپنے تصورِ قومیت کے ساتھ اس مارکسی فلسفہ کو ملا کر پنڈت جی یہ نظریہ قائم کرتے ہیں کہ اول تو ہندوستان کی تمام آبادی ایک قوم ہے۔ پھر اس قوم میں اگر کوئی حقیقی امتیاز و اختلاف ہوسکتا ہے تو وہ صرف معاشی بنیاد ہی پر ہوسکتا ہے۔ یہ ہندو اور مسلم اور عیسائی، یعنی مذہب کی بنیاد پر جو اختلافات ہیں، یہ کسی طرح معقول نہیں ہیں۔ اختلاف کی فطری اور معقول بنیاد یہ ہے کہ قوم کے اندر جن کے پاس ایک روٹی ہو وہ سب ایک گروہ ہوں، اور جن کے پاس دو روٹیاں ہوں وہ دوسرا گروہ ہوں، وھلم جرّا۔ پھر اگر ان کو لڑنا ہو تو روٹیوں پر لڑیں۔ بلکہ "اگر" کیا معنی، ان کو اسی چیز پر لڑنا چاہیے۔

اسی نظریہ کی بنیاد پر ہندوستان جدید کا یہ لیڈر کہتا ہے:۔

"معاشی نقطۂ نظر سے یہ (یعنی مسلم قومیت کا تخیل)، بہت دُور از کار ہے اور بدقت قابلِ توجہ کہا جاسکتا ہے۔" (صفحہ ۳۳۱)

"ایسے لوگ ابھی تک زندہ ہیں جو ہندوستان کا ذکر اس طور پر کرتے ہیں گویا دو ملتوں اور قوموں کے بارے میں گفتگو ہے۔ جدید دنیا میں اس دقیانوسی خیال کی گنجائش نہیں ہے۔ آج جماعتوں اور ملتوں کی بنیاد اقتصادی فوائد پر رکھی جاتی ہے۔"

(جواہر لال کا خطبۂ صدارت آل انڈیا نیشنل کنونشن منعقدہ مارچ ۱۹۳۷ء)

اس کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے کہ جب سارے ہندوستان کی آبادی ایک قوم ہے، اور اس قوم کے درمیان فرقے اور گروہ بننے کی وجہ محض معاشی اغراض ہی ہو سکتی ہیں، تو پھر یہ ہندو مسلم اور دوسرے فرقے پیدا کیسے ہوگئے؟ یہ معاملہ کیا ہے کہ

غیر معاشی چیزوں نے ہندوؤں کو ایک "فرقہ" اور مسلمانوں کو دوسرا "فرقہ" بنا دیا اور ان کے درمیان غیر معاشی وجوہ نے اختلافات پیدا کر دیے ؟ یہاں موقع تھا کہ پنڈت جی خود اس نظریہ ہی پر نظر ثانی کرتے جسے انہوں نے مارکس کی "وحی" سے بے سوچے سمجھے اخذ کیا اور اذعانی عقیدے کے طور پر تسلیم کر لیا ہے۔ ان کے سامنے واقعات کی دنیا میں ایک کھلی ہوئی حقیقت موجود تھی جو شہادت دے رہی تھی کہ انسان کے جسم میں صرف معدہ ہی ایک عضو رئیس نہیں ہے۔ صرف بھوک ہی وہ چیز نہیں ہے جو اس کی ذہنیت اور اس کے خیالات کی تشکیل کرتی ہو۔ صرف معاشی عامل (Economic Factor) ہی ایک عامل نہیں ہے جو انسانوں کو قوموں اور گروہوں کی شکل میں مجتمع کرتا اور ان کے درمیان اختلافات پیدا کرتا ہو۔ مگر انہوں نے تمام حقائق سے آنکھیں بند کر کے یہ رائے ——— عقلی و استدلالی نہیں بلکہ روحانی و وجدانی رائے ——— قائم کر لی کہ یہ مذہبی تفریق ایک غیر فطری چیز ہے، اور اس مادۂ فاسد یعنی مذہب نے دخل انداز ہو کر "ہندوستانی قوم" کو ایک صحیح بنیاد (یعنی روٹی کی بنیاد) کے بجائے، ایک غلط بنیاد (یعنی طرزِ خیال اور طریقِ زندگی) کی بنیاد پر متفرق کر دیا ہے۔

اس تصور کے زیرِ اثر، جگہ جگہ وہ مذہب پر یوں غصہ اتارتے ہیں:۔

"جس چیز کو مذہب یا منظم مذہب کہتے ہیں اسے ہندوستان میں اور دوسری جگہ دیکھ دیکھ کر میرا دل ہیبت زدہ ہو گیا ہے۔ میں نے اکثر مذہب کی مذمت کی ہے اور اسے اکثر مٹا دینے کی آرزو ظاہر کی ہے قریب قریب ہمیشہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اندھے یقین اور ترقی دشمنی کا، بے دلیل عقیدت اور تعصب کا، توہم پرستی اور لوگوں سے بے جا فائدہ اٹھانے کا، قائم شدہ حقوق اور مستقل اغراض رکھنے والوں کے بقا کا حامی ہے۔" (صفحہ ۱۶۱)

مذہب کے خلاف نفرت و غضب کا اظہار "ہندوستانی قوم" کے اس لیڈر نے اتنی کثرت کے ساتھ کیا ہے کہ تمام تحریروں کو نقل کرنا ایک طولِ عمل ہے۔ وہ اپنی تقریروں

اور تحریروں میں ہر اس موقع پر جہاں ہندو مسلم کا نام آتا ہے، چیں بجبیں ہو کر کہتے ہیں کہ "مذہب کو بیچ میں کیوں لاتے ہو؟" اس ارشاد سے ان کی مراد یہی ہوتی ہے کہ سیاسی، اجتماعی اور معاشی گروہوں میں مذہب کی بنیاد پر تفریق کرنا سرے سے غلط ہے۔ اس غلط بنیاد کو ڈھانا چاہیے، نہ کہ اس کو سامنے لا کر ایک قابلِ لحاظ چیز قرار دینا۔

ہندوستانی "قوم" میں فرقوں کے وجود اور ان کے باہمی اختلاف کی یہی ایک توجیہ ہمارے وطنی لیڈر کے پاس نہیں ہے۔ دوسری توجیہ اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہے۔ وہ اس کو برطانوی امپیریلزم کی پیدا کردہ چیز سمجھتے ہیں۔ ان کا یہ خیال ہے کہ انگریزوں کو اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لیے ہندوستانی قوم میں اختلاف پیدا کرنے کی ضرورت تھی اسی لیے اور صرف اسی لیے یہ اختلافات موجود ہیں۔

دیکھیے، یہاں نظر کا کتنا بڑا پھیر ہو گیا ہے۔ اگر پنڈت جی ذرا سمجھ سے کام لیتے تو یہ بات بآسانی ان پر واضح ہو سکتی تھی کہ ہندوستان میں حقیقی اختلافات موجود تھے، انگریزوں نے ان سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور اس کوشش میں دو قسم کے لوگوں سے ان کو مدد ملی۔ ایک وہ خود غرض لوگ جو اپنے ذاتی فائدے کے لیے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نزاعات کو بھڑکاتے اور پیچیدہ تر بناتے ہیں۔ جنہوں نے نہایت چالاکی سے اپنے آپ کو ان دونوں کا سرپرست اور نمائندہ بنا لیا ہے، نہ اس لیے کہ ان کے اختلافی مسائل کو اطمینان بخش طریقہ پر حل کریں، بلکہ محض اس لیے کہ ان اختلافات کو دائماً برقرار رکھ کر اپنے ذاتی مفاد اور برطانوی سلطنت کے مفاد کی خدمت کرتے رہیں۔ دوسرے وہ بیوقوف لوگ جو ان اختلافات کی حقیقت کو سمجھنے اور انہیں دانش مندی کے ساتھ حل کرنے سے انکار کرتے ہیں اور اس طرح ان کے برقرار رکھنے میں مددگار بنتے ہیں۔ اگر پنڈت جی اس مسئلے کو دیکھتے تو انہیں راستہ صاف نظر آتا۔ لیکن وہ اپنے تخیل کی آنکھ سے اس کو دیکھتے ہیں، اور محض یہ دیکھ کر کہ ملک کے چند خود غرض اور ترقی دشمن لوگ انگریزی حکومت کے ساتھ مل کر ہندو مسلمانوں کے اختلافی مسائل سے ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں، یہ نتیجہ نکال لیتے ہیں کہ درحقیقت ان اختلافی مسائل کی کوئی اصلیت نہیں ہے،

بلکہ یہ صرف برطانوی امپیریلزم اور اس کے ہندوستانی ایجنٹوں کی پیدا کردہ چیز ہے۔ اس بنا پر وہ جگہ جگہ " فرقہ وارانہ " مسئلے کے متعلق اس قسم کے خیالات کا اظہار فرماتے ہیں:۔

" ان کا (انگریزوں کا) ترپ کا پتہ فرقہ وارانہ مسئلہ تھا اور اسے انہوں نے خوب کھیلا۔" (صفحہ ۲۰)

" فرقہ پروری کے پردہ میں دراصل ترقی دشمنی نہاں ہے۔" (صفحہ ۲۳)

" اور اغراض کے اس ہجوم میں برطانوی ہند کے نمائندوں کی سرداری عموماً آغا خاں کے حصّہ میں آتی تھی۔" (صفحہ ۲۱)

" اصل دقّت فرقہ پروری نہیں ہے۔ اصل میں سیاسی ترقی دشمنی راہ میں حائل تھی۔ اور فرقہ وارانہ مسائل کی آڑ میں کام کر رہی تھی۔" (صفحہ ۲۴)

" حکومت روز بروز معاشرتی خرابیوں کی پشت پناہ بنتی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا میل جول ہندوستان کی سب سے زیادہ رجعت پسند جماعتوں سے رہتا ہے۔ جُوں جُوں اس کی سیاسی مخالفت بڑھتی جاتی ہے اسے عجیب عجیب حمایتی ڈھونڈنے پڑتے ہیں۔ آج کل برطانوی حکومت کے سب سے بڑے حامی انتہائی فرقہ پرست، مذہبی رجعت پسند اور اصلاح و ترقی کے دشمن لوگ ہیں۔ مسلمانوں کی فرقہ پرست جماعتیں سیاسی معاشی اور سماجی اعتبار سے انتہائی رجعت پسند ہیں۔ ہندو مہاسبھا بھی اُن سے کچھ کم نہیں۔" (صفحہ ۱۷۰)

" فرقہ پرست رہنماؤں کا اتحاد ان لوگوں کے ساتھ ہو گیا ہے جو ہندوستان اور انگلستان میں سب سے زیادہ رجعت پسند لوگ کہے جا سکتے ہیں، اور یہ لوگ فی الحقیقت سیاسی، اور سیاسی سے بھی زیادہ تمدنی اصلاح و ترقی کے دشمن ہیں۔ ان کے جملہ مطالبات میں سے ایک بھی عوام الناس کے فائدے کے لیے نہیں ہے۔" (صفحہ ۳۱۱)

یہ اور ایسی ہی بہت سی تحریریں پنڈت جی کے اندازِ فکر پر صاف روشنی ڈالتی ہیں۔ ان کا اندازِ فکر یہ ہے کہ بیمار کا خود غرض طبیبوں اور عطاروں کے پھندے میں پھنس جانا اِس بات کی دلیل ہے کہ وہ دراصل بیمار ہی نہیں۔ ان کی رائے میں یہ تحقیق کرنے کی ضرورت ہی نہیں کہ آخر کیا چیز ہے جس کی وجہ سے ان مکار طبیبوں اور عطاروں کو اِس بیمار پر ہاتھ صاف کرنے کا موقع مِل رہا ہے۔ سبب پر غور کرنے اور غلط معالجوں کے پھندے سے نکال کر خود صحیح علاج کرنے کی زحمت کون اُٹھائے۔ اس کا علاج بس یہی ہے کہ مرض کے وجود سے انکار کر دیا جائے۔

ہندوستان کے بین الاقوامی مسئلہ کی یہ دو توجیہیں کرنے کے بعد پنڈت جی ان دونوں کے درمیان رشتہ جوڑتے ہیں۔ ان کا نظریہ ترقی کر کے یہ صورت اختیار کرتا ہے کہ مذہب نے ہندوستانی "قوم" کو "فرقوں" میں تقسیم کیا ہے، انگریزی امپیریلزم (سامراج) کے لیے یہ تقسیم مفید ہے، اور سرمایہ دارانہ، زمیندارانہ، اور تمام متقل اغراض (Vested Interests) رکھنے والے طبقے سامراج کے ساتھ سازش کر کے اس تقسیم کو اپنی اور سامراج کی مشترک اغراض کے لیے استعمال کر رہے ہیں، لہٰذا مذہب اور سامراج، اور خود غرض طبقے، تینوں باہمی قریبی رشتہ دار ہیں، تینوں قابلِ نفرت ہیں اور تینوں کو مٹا دینا چاہیئے۔ اسی نظریہ کے تحت یہ ارشادات جگہ جگہ پنڈت جی کے قلم سے نکلے ہیں:۔

"منظم مذہب (Organized Religion) بلا استثنار متقل اغراض سے وابستہ ہو جاتا ہے اور یوں لازمی طور پر ایک ترقی دشمن قوت بن کر تغیر اور ترقی کی مخالفت کرتا ہے۔ حقِ ملکیت اور موجودہ نظامِ معاشرت کے متعلق اس کا رویّہ یہی ہے۔" (صفحہ ۴۰۔۱۶۷)

"جیل میں برطانوی افسر صرف دو قسم کی کتابیں پڑھنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ مذہبی کتابیں اور ناول۔ یہ عجیب بات ہے کہ حکومتِ برطانیہ مذہب کی بڑی قدردان ہے اور بڑی بے تعصبی کے ساتھ ہر قسم کے مذاہب

کی ہمت افزائی کرتی ہے۔" (صفحہ ۱۱۸)

"مذہب امن کا واعظ کہتا ہے لیکن اس کے باوجود ایسے نظام کی تائید کرتا ہے جس کا دارومدار ظلم پر ہے۔" (صفحہ ۲۹۲)

اشتراکیت

ان تینوں دشمنوں کی سازش سے ہندوستان کو نجات دلانے اور اس ملک کو پھر جنت نشاں بنا دینے کی جو صورت پنڈت جی کے پیش نظر ہے وہ حسب ذیل ہے:۔

"ہر پھر کر ہم اسی چیز پر پہنچ جاتے ہیں جس کے سوا اس مسئلہ کا اور کوئی حل نہیں یعنی ایک اشتراکی نظام کا قیام، پہلے قومی دائرے میں اور پھر ساری دنیا میں۔ ایسا نظام جس میں دولت کی پیدائش اور تقسیم ریاست کی نگرانی میں مفاد عامہ کے لحاظ سے کی جاتے۔ یہ انقلاب کس طرح ہونا چاہیئے؟ یہ ایک جداگانہ سوال ہے۔ لیکن یہ بات بالکل واضح ہے کہ جس چیز میں پوری قوم بلکہ کل نوع انسانی کی بھلائی ہو وہ محض اس وجہ سے نہیں روکی جا سکتی کہ کچھ لوگ جو موجودہ نظام سے فائدہ اٹھاتے ہیں اس تغیر کے مخالف ہیں۔ اگر سیاسی یا تمدنی ادارے[1] اس تبدیلی کی راہ میں حائل ہیں تو ان کو مٹا دینا چاہیئے۔" (صفحہ ۲۰-۲۱۹)

"جب تک ہمیں تھوڑی بہت سیاسی آزادی حاصل نہ ہو گی، ہمارے لیے قوم پرستی کا تخیل ہی سب سے بڑا محرک عمل رہے گا۔ یہاں تک کہ لوگوں کے دل میں قوم پرستی کے جذبہ کی جگہ تمدنی و اجتماعی انقلاب (Social Revolution) کا جذبہ پیدا[2] ہو جائے۔" (صفحہ ۱۴۵)

---

[1] مذہبی اداروں کا نام نہیں لیا گیا۔ مگر پچھلی تصریحات سے واضح ہے کہ فی الذہن وہ بھی مراد ہیں۔

[2] یہ مقام ذرا تشریح کا محتاج ہے۔ اشتراکی نقطۂ نظر سے قوم پرستی (بقیہ صفحہ ۲۰۸ پر)

"بعض لوگ جو عدم تشدد کا عقیدہ رکھنے کے مدعی ہیں، کہتے ہیں کہ شخصی ملکیت کو اس کے مالکوں کی مرضی کے خلاف قومی ملکیت بنانے کی کوشش کرنا جبر ہے، اس لیے یہ عدم تشدد کے خلاف ہے۔ یہ کافی نہیں سمجھا جاتا کہ اکثریت موجودہ نظام میں تبدیلی چاہتی ہے۔ اس کے ساتھ یہ شرط لگائی جاتی ہے کہ جن لوگوں کو اس تبدیلی سے نقصان پہنچنے والا ہے انہیں بھی راضی کر لینا چاہیے۔ یہ اُمید رکھنا کہ ایک پُورے طبقے یا پوری قوم کے عقائد بدلے جا سکیں گے یا اپنے حریفوں کو عقلی دلائل سے قائل کرنے یا ان کے جذبۂ انصاف کو اُبھارنے سے باہمی مخالفت دُور ہو جائے گی، اپنے آپ کو دھوکا دینا ہے۔ یہ محض ایک فریب خیال ہے کہ مؤثر دباؤ ڈالے بغیر، یعنی جبر و تشدد سے کام لیے بغیر کوئی حاکم قوم محکوم ملک سے قبضہ اُٹھا لے گی، یا کوئی طبقہ اپنے اقتدار یا امتیازی حقوق سے دستبردار ہو جائے گا۔"[1] (صفحہ ۵۸، ۵۶)

"دراصل جمہوری حکومت کے معنی یہ ہیں کہ اکثریت، اقلیت

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰۷ سے) (نیشنلزم) ایک غلط چیز ہے۔ اشتراکیوں کا مقصد تمام دنیا میں اشتراکی انقلاب برپا کرنا ہے۔ جس کی تشریح بابو سبھاش چندر بوس نے ہری پورہ کانگریس کے خطبہ صدارت میں کی ہے۔ جب تک ساری دنیا کی قوموں میں اشتراکی نظام قائم نہ ہو جائے، کسی ایک ملک میں اس کا قائم رہنا مشکل ہے۔ مگر پنڈت جی اور ان کے ہم خیال حضرات کی رائے یہ ہے کہ سردست بین الاقوامی اشتراکیت کو رہنے دو، سب سے پہلے اپنے مُلک میں ہم کو سیاسی آزادی حاصل کرنی چاہیے۔ کیونکہ اس کے بغیر ہم بین الاقوامی اشتراکیت کے لیے کچھ نہیں کر سکتے اور اپنے ملک میں سیاسی آزادی حاصل کرنے کے لیے ناگزیر ہے کہ ہم "قوم پرستی" کا مسلک اختیار کریں۔

[1] مطلب یہ ہے کہ پہلے ملک کی اکثریت کو اشتراکی خیال کا بنا لیا جائے، پھر جو لوگ اشتراکیت کے عقیدہ و مسلک کو قبول نہ کریں۔ ان کو زبردستی اشتراکی نظام کی اطاعت پر مجبور کیا جائے۔

کو ڈرا کر اور دھمکا کر اپنے قابو میں رکھتی ہے۔" (صفحہ ۴۵۵)

"سوسائٹی کی موجودہ کشمکش یعنی قومی جنگ اور پھر طبقات کی جنگ کا تصفیہ جبر کے سوا کسی اور صورت سے ممکن نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ پہلے لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانے کا کام بہت بڑے پیمانہ پر کرنا پڑیگا۔ کیونکہ جب تک بہت بڑی جماعت ہم خیال نہ ہو جائے اس وقت تک نظامِ تمدن کو بدلنے کی کوئی تحریک مضبوط بنیاد پر قائم نہ ہو سکے گی۔ لیکن اس کے بعد تھوڑے لوگوں پر جبر کرنے کی ضرورت ہوگی۔"

(صفحہ ۷۰-۴۶۹)

یہ ہے وہ نقشہ جو ہندوستان کی نجات کے لیے اس کے سب سے بڑے لیڈر کے ذہن میں ہے۔ قومی حکومت (یعنی وہ حکومت جو مذہبی قومیتوں کو مٹا کر "قومی" بنائی جائے) آخری منزلِ مقصود نہیں ہے، بلکہ پہلا مرحلہ ہے۔ دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ مذہبی عقائد کے بجائے معاشی عقائد کی تبلیغ کر کے ایک عظیم اکثریت کو ہم خیال بنایا جائے۔ اس کے بعد تیسرا مرحلہ یہ ہے کہ جو اقلیت اس معاشی مذہب کی پیروی قبول نہ کرے اس کو ڈرا کر، دھمکا کر، لوٹ مار اور قتل و غارت گری کر کے، وسیع پیمانہ پر اجتماعی ڈاکہ زنی کر کے نظامِ تمدن میں انقلاب پیدا کیا جائے۔ پھر آخری مرحلہ یہ ہے کہ تھرڈ انٹرنیشنل کے اصول پر تمام دنیا میں کمیونزم کی اشاعت اور اس کے قیام کا بیڑا اُٹھایا جائے، جس طرح تھوڑی مدت قبل روس نے اُٹھا رکھا تھا۔ ظاہر ہے کہ ہندوستان سے جس بین الاقوامی اشتراکیت کا علم بلند کیا جائے گا اس کی ٹکر سب سے پہلے اس بین الاقوامی نظامِ اجتماعی سے ہوگی جو ہندوستان کے ہمسایہ ممالک میں پھیلا ہوا ہے، یعنی اسلام۔

پنڈت جواہر لال سمجھتے ہیں کہ مسلمان بہادر ہیں، بھوکے ہیں، اور اس کے ساتھ

۱؎ ڈیموکریسی (جمہوریت) کے اس تصور کو خوب سمجھ لیجیے۔

ان کے اندر اشتراکیت کے عناصر پہلے سے موجود ہیں۔ لہذا ہندوؤں کی بہ نسبت وہ اشتراکی انقلاب کے لیے زیادہ اچھے سپاہی بن سکتے ہیں۔ مزید برآں وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف وہی لوگ زیادہ کامیابی کے ساتھ لڑ سکیں گے جن کے نام اور لباس مسلمانوں کے سے ہوں۔ لہذا وہ اشتراکیت کی لاگ سے مسلمانوں کو اپنی فوج میں بھرتی کرنا ضروری خیال کرتے ہیں۔ اسی بنا پر ارشاد ہوتا ہے:-

"میرے خیال میں عام مسلمان، عام ہندوؤں سے زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں، اس لیے کہ ان کے نظام اجتماعی میں ایک حد تک آزادی پائی جاتی ہے اور اگر ان میں ایک مرتبہ بیداری پیدا ہو جائے تو غالباً وہ اشتراکیت کی راہ پر تیزی سے قدم بڑھائیں گے۔" (صفحہ ۵۰۶)

ان الفاظ میں پنڈت جی نے اپنے اصل مقصد کو پوری طرح واضح کر دیا ہے لیکن انہیں خوب معلوم ہے کہ مسلمانوں کو قوم پرستی اور پھر بین الاقوامی اشتراکیت کے نظام میں جذب کرنا آسان کام نہیں ہے۔ سب سے پہلے تو اسلامی قومیت کا تخیل اس راہ میں حائل ہے جس کی وجہ سے مسلمان، غیر مسلموں کے ساتھ ایک قومیت بنانے اور اس میں جذب ہو جانے کے لیے تیار نہیں ہو سکتے۔ پھر اسلامی تہذیب کیساتھ مسلمانوں کی شیفتگی ایک دوسری رکاوٹ ہے۔ کیونکہ مسلمان اپنی تہذیب کو تمام تہذیبوں سے بہتر سمجھتے ہیں اور اس کو کسی دوسری تہذیب سے بدل لینے پر آسانی کے ساتھ راضی نہیں ہو سکتے۔ اس کے بعد آخری اور اہم ترین روک یہ ہے کہ اسلام کا اجتماعی نظام (سوشل سسٹم) زندگی کے سارے شعبوں پر حاوی ہے۔ جس کی وجہ سے مسلمان کسی دوسرے اجتماعی نظام کو اپنی زندگی کے کسی شعبے میں بھی اس وقت تک جگہ نہیں دے سکتے جب تک کہ وہ خود اسلام سے منحرف نہ ہو جائیں۔ ان مشکلات کو اچھی طرح سمجھ کر پنڈت جی نے اپنا نقشۂ جنگ بنایا ہے۔

ان کا پہلا حملہ اسلامی قومیت پر ہے۔ وہ مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ تم سرے سے کوئی قوم ہی نہیں ہو۔ یہ محض برطانوی سامراج کا ایک داؤں اور چند سامراجی ایجنٹوں کا پروپیگنڈا ہے جس نے تمہارے دماغ میں یہ ہوا بھر دی ہے کہ تم ایک قوم ہو۔ حالانکہ سیاسی اور معاشی

نقطۂ نظر سے ہندوستان میں صرف "ہندوستانی قوم" ہی پائی جاتی ہے، اور اس قوم کے اندر ایک دوسری قوم کا موجود ہونا سراسر ایک لغو تخیل ہے:-

"ہندوستان میں مسلم قومیت پر زور دینے کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ بس یہی کہ ایک قوم کے اندر ایک دوسری قوم موجود ہے جو یکجا نہیں ہے منتشر ہے، مبہم ہے اور غیر متعین ہے۔ اب سیاسی نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو یہ تخیل بالکل لغو معلوم ہوتا ہے اور معاشی نقطۂ نظر سے یہ بہت دُور از کار ہے اور بدقت قابلِ توجہ کہا جا سکتا ہے[1]" (صفحہ ۲۲۱)

---

[1] جب ہم دیکھتے ہیں کہ پنڈت جی اشتراکیت کے قائل ہیں اور مارکس کی تعلیم پر اعتقاد رکھتے ہیں، اور اس کے باوجود اسلامی قومیت کے خلاف یہ طرز استدلال اختیار کر رہے ہیں، تو ہمیں مجبوراً یہ رائے قائم کرنی پڑتی ہے کہ پنڈت جی نے خود اپنے شخصی اعتقاد کے خلاف محض سیاسی طور پر یہ طرز استدلال اختیار فرمایا ہے۔ مارکس کا نعرہ یہ تھا کہ "تمام دنیا کے مزدور ایک ہو جاؤ"۔ اس کی تعلیم یہ تھی کہ اشتراکی خیال کا آدمی جہاں بھی ہے ایک اشتراکی جماعت سے تعلق رکھتا ہے۔ جرمنی کا اشتراکی اٹلی کے اشتراکی کا کامریڈ (رفیق) ہے، اور خود اپنے وطن بلکہ شہر بلکہ محلہ میں رہنے والے بورژوا سے اس کا کوئی رشتہ نہیں۔ اسی تخیل پر بین الاقوامی اشتراکیت کی بنا رکھی گئی ہے۔ اشتراکی ہونے کی حیثیت سے پنڈت جواہر لال بھی اسی تخیل پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود اسلامی قومیت پر اعتراض کر رہے ہیں، حالانکہ یہ قومیت بھی اسی اصول پر قائم ہوتی ہے کہ ایک عقیدے اور ایک مقصدِ زندگی اور ایک اصولِ اجتماعی کے قائل جہاں کہیں بھی ہوں ایک جماعت ہیں چاہے ان میں بعد المشرقین ہی کیوں نہ ہو، اور اس کے خلاف مسلک رکھنے والا اگر ہم محلہ کیا معنی —— ایک دیوار بیچ بھی رہتا ہو تو وہ بہرحال دوسری ہی جماعت کا آدمی ہے۔ ہمارے لیے یہ تسلیم کرنا مشکل ہے کہ جو شخص اشتراکی جمعیت کو سمجھ سکتا ہے وہ اسلامی جمعیت کو نہیں سمجھ سکتا۔ لامحالہ ہم یہی سمجھنے پر مجبور ہیں کہ اسلامی قومیت کا وجود چونکہ پنڈت جی کے مقاصد میں حارج ہے اس لیے وہ قصداً ٹھیک اسی چیز پر اعتراض کر رہے ہیں جس کے اصول کی صداقت پر وہ اعتقاد رکھتے ہیں۔ اور اعتراض کے لیے اُن دلائل سے کام لے رہے ہیں جن کی صداقت پر وہ دل سے اعتقاد نہیں رکھتے۔

"مسلم قوم کا تخیل تو صرف چند لوگوں کی من گھڑت اور محض پرواز خیال ہے اگر اخبارات اس کی اس قدر اشاعت نہ کرتے تو بہت تھوڑے لوگ اس سے واقف ہوتے اور اگر زیادہ لوگوں کو اس پر اعتقاد ہوتا بھی تو حقیقت سے دوچار ہونے کے بعد اس کا خاتمہ ہو جاتا" (صفحہ ۲۳۲)

اسلامی تہذیب کیا ہے؟

اس کے بعد وہ اسلامی تہذیب کی طرف بڑھتے ہیں اور مسلمانوں کو یہ سمجھاتے ہیں کہ حقیقت میں تمہاری کوئی خاص تہذیب ہی نہیں ہے:-

"لیکن یہ اسلامی تہذیب ہے کیا چیز؟ کیا عربوں، ایرانیوں اور ترکوں وغیرہ کے بڑے بڑے کارناموں کی ایک یاد ہے جو نسلی تعلق کی وجہ سے اب تک باقی ہے؟ یا اس کا مطلب زبان، آرٹ، موسیقی اور رسم و روایات ہیں؟ مجھے تو یاد نہیں آتا کہ کوئی شخص آج کل اسلامی موسیقی یا اسلامی آرٹ کا بھی ذکر کرتا ہو[1]" (صفحہ ۲۳۲)

---

[1] تہذیب کے متعلق اس قسم کے خیالات آنریبل مسٹر سمپورنانند وزیر تعلیمات صوبہ متحدہ نے بھی اپنی حال کی ایک تقریر میں ظاہر فرمائے ہیں۔ ان کا ارشاد ہے:-

"مسلمانوں کی تہذیب کیا ہے؟ تہذیب مذہب میں شامل نہیں ہے۔ اس کا جلوہ شاعری، فن تعمیر، سنگ تراشی، مصوری اور موسیقی میں نظر آتا ہے۔ یہی وہ چیزیں ہیں جن کا مجسمہ تہذیب ہے۔ کیا ہندو اور مسلمان کی تہذیب کے درمیان ان چیزوں میں کوئی بین فرق ہے؟ زمانہ ماضی کے چند بہترین لوگوں کو لیجیے۔ وہ سب مسلمان ہیں لیکن راگوں کے نام کیا ہیں؟ یہ راگ اور راگنیاں سب سنسکرت نام ہیں۔ کیا کوئی ہندو گویا ایسا ہے جو یہ کہنے کا حق رکھتا ہو کہ ہندوستانی گانے ہندو گاتے ہیں یا کوئی مسلمان یہ کہہ سکتا ہے کہ ہندوستانی گانے مسلمان گاتے ہیں؟ ہندوستانی مصوری اور فن تعمیر کے شباب کا زمانہ عہد مغلیہ میں تھا۔ پھر اب کیوں ہم ہندو تہذیب اور مسلمان تہذیب کا ذکر کرتے ہیں"؟

(مدینہ، مورخہ ۲۱ اپریل ۳۸ء) (باقی صفحہ ۲۱۳ پر)

"میں نے یہ سمجھنے کی بہت کوشش کی کہ یہ اسلامی تہذیب ہے کیا چیز مگر میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں اس میں کامیاب نہ ہوا۔ میں دیکھتا ہوں کہ شمالی ہند میں متوسط طبقہ کے مٹھی بھر مسلمان اور انہی کی طرح کے ہندو بھی فارسی زبان اور روایات سے متاثر ہوئے ہوئے ہیں۔ جب عوام الناس پر نظر ڈالتا ہوں تو اسلامی تہذیب کی نمایاں ترین علامتیں یہ نظر آتی ہیں۔ ایک خاص قسم کا پاجامہ نہ زیادہ لمبا نہ زیادہ چھوٹا۔ ایک خاص طریقہ سے مونچھوں کو مونڈنا یا ترشوانا مگر ڈاڑھی کو بڑھنے کے لیے چھوڑ دینا۔ اور ایک قسم کا ٹونٹی دار لوٹا۔ بالکل اسی کے جواب میں ہندوؤں کے بھی چند رسمی طریقے ہیں، یعنی دھوتی باندھنا، سر پر چوٹی رکھنا اور مسلمانوں کے لوٹے سے مختلف طرز کی لٹیا رکھنا۔ یہ امتیازات بھی دراصل زیادہ تر شہروں میں پائے جاتے ہیں اور مفقود ہوتے جا رہے ہیں۔ ہندو اور مسلم کاشتکاروں اور مزدوروں میں مشکل ہی سے فرق کیا جا سکتا ہے۔ تعلیم یافتہ مسلمان شاید ہی ڈاڑھی رکھتے ہیں۔ علی گڈھ والے البتہ سُرخ ٹوپی کے گرویدہ ہیں (اس کا نام ترکی ہے حالانکہ خود ترکی میں اب اسے کوئی نہیں پوچھتا)۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۱۲ سے) "ہم ایران کی مثال لیتے ہیں۔ ایران کا مذہب اسلام ہے اور عرب کا مذہب بھی اسلام ہے لیکن کوئی کہہ سکتا ہے کہ ایران میں عربی تہذیب ہے"۔

(حوالہ مذکور)

ان خیالات کو جب ہم پڑھتے ہیں تو ہمیں کہنا پڑتا ہے کہ یہ اگر سیاسی فریب کاری نہیں ہے تو سخت جہالت ہے۔ یہ لوگ اسلامی تہذیب ہی کو نہیں بلکہ نفس تہذیب کے مفہوم کو بھی نہیں جانتے اور پھر اس موضوع پر زبان کھولنے کی جرأت کرتے ہیں۔ میں اس سے پہلے اسلامی تہذیب کی کافی تشریح کر چکا ہوں اور آگے چل کر ان صفحات میں دوبارہ اس کی تشریح کروں گا۔

مسلمان عورتیں ساری پہننے لگی ہیں اور آہستہ آہستہ پردہ سے باہر نکل رہی ہیں[1]۔" (صفحہ ۲۲۵)

یہاں تک تو صرف یہ دعوٰی تھا کہ "اسلامی تہذیب" حقیقت میں کسی چیز کا نام ہی نہیں ہے۔ اس کے بعد دُوسرا پہلو اختیار کیا جاتا ہے اور یُوں ارشاد ہوتا ہے کہ مسلمان جس چیز کو اپنی تہذیب کہہ رہے ہیں وہ اب زندہ نہیں رہ سکتی۔ زمانے کے انقلابات اس کو مٹا دیتے ہیں، مٹا دیں گے اور خود مسلمان قومیں آج اس کو چھوڑ رہی ہیں:۔

"اب تو قومی تہذیبوں کا زمانہ بھی بہت تیزی سے گزر رہا ہے اور پوری دنیا ایک تہذیبی وحدت بنتی جا رہی ہے۔ اس ناگزیر رجحان کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔" (صفحہ ۲۲۶)

"اس زمانہ میں ہندی مسلمانوں کو پیہم صدمات پہنچے ہیں اور ان کے بہت سے خیالات جن کی پرورش بڑی تمنا سے کی گئی تھی پاش پاش ہو گئے۔ اسلام کے مردِ غازی، اترک نے نہ صرف یہ کہ اس خلافت ہی کو ختم کر دیا جس کے لیے ہندوستان ۱۹۲۰ء میں اُٹھ کھڑا تھا، بلکہ یکے بعد دیگرے ایسے قدم اٹھائے ہیں جو مذہب سے اس کو دُور لیے جا رہے ہیں۔ مصر بھی اسی راستہ پر جا رہا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہی حال عربی ممالک کا ہے سوائے ملک عرب کے جو بہت پیچھے ہے۔ ایران کی نظریں اپنے

---

[1] یہاں مسلمانوں کے اور ان قوم پرستوں کے مقاصد کا تضاد بالکل نمایاں ہے۔ ہم ان حالات کو اس نظر سے دیکھتے ہیں کہ غلامی کی وجہ سے ہمارا نیشنل ٹائپ مضمحل ہو رہا ہے اور ہمیں آزادی کی ضرورت اسی لیے ہے کہ حکومت خود اختیاری کے وسائل سے کام لے کر اپنے نیشنل ٹائپ کو مستحکم کریں۔ مگر یہ حضرات اسی امر واقعہ کو کہ ہمارا نیشنل ٹائپ اس قدر مضمحل ہو چکا ہے، اس بات کی دلیل قرار دیتے ہیں کہ سرے سے ہمارا کوئی نیشنل ٹائپ ہے ہی نہیں، اور ہمیں اب اُس نمونے کے مطابق ڈھلنے پر راضی ہو جانا چاہیے جو ان کے پیشِ نظر ہے۔

تمدنی احیاء کے لیے تاریخ قبل از اسلام پر پڑتی ہیں۔ غرض ہر جگہ مذہب بالکل پس پشت ڈالا جا رہا ہے اور وطنیت جنگ آزما لباس میں ظاہر ہو رہی ہے[1]" (صفحہ ۳۳۶)

مطلب یہ ہے کہ مسلمانو! یہ تم کس چیز کو لیے بیٹھے ہو؟ جو چیز فنا ہو رہی ہے، جس کا فنا ہونا یقینی ہے جس کو سب مسلمان قومیں چھوڑ رہی ہیں اسے تم کیوں پکڑے ہوئے ہو؟ چھوڑ دو اسے، اور آؤ اس راستہ کی طرف جدھر ہم بلا رہے ہیں۔

یہ سب کچھ کہنے کے بعد پھر بھی دل میں تردد باقی رہتا ہے کہ یہ کم بخت مذہب پرست مسلمان، اپنی تہذیب اور قومیت پر جان دینے والے متعصب لوگ، اتنا سمجھانے پر بھی نہ مانیں گے لہٰذا ایک آخری حربہ استعمال کیا جاتا ہے۔ مسلمان کے دل میں انگریز اور اس کی غلامی سے جو نفرت ہے اسے مدد پر بلایا جاتا ہے اور اس سے یوں کام لیا جاتا ہے:۔

"ہندوستان میں مسلم قوم اور اسلامی تہذیب پر اور ہندو و مسلم تہذیبوں کے انتہائی اختلاف پر بڑا زور دیا جاتا ہے۔ پھر اس سے یہ لازمی نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ برطانیہ کا ہندوستان میں ہمیشہ کے لیے رہنا ضروری ہے تاکہ دونوں میں توازن قائم رکھے اور بیچ بچاؤ کر سکے۔"
(صفحہ ۳۴۰)

"(مسلم قومیت کا ذکر کرنے کا) مطلب یہ ہے کہ مطلق العنان حکومت یہاں رہنی چاہیئے یا بدیسی حکومت۔" (صفحہ ۳۴۱)

---

[1] اسلام کو رو بہ زوال، بلکہ بزعم خود فنا پذیر دیکھ کر اس قوم پرست لیڈر کے قلب میں جو انشراح و انبساط کی کیفیت پیدا ہو رہی ہے، اس کو غور سے ملاحظہ کیجیے۔ یہ پنڈت جی اپنی بے تعصبی کا سکہ جمانے کی بہت کوشش کرتے ہیں، مگر دل میں اسلام کے لیے جو عناد اور دشمنی کا جذبہ بھرا ہوا ہے وہ کسی طرح چھپائے نہیں چھپ سکتا۔

"ہاں اب مسلم قوم اور اسلامی تہذیب کا کیا ہوگا ؟ کیا یہ دونوں آئندہ صرف شمالی ہند میں برطانیہ کی شفیق حکومت کے تحت پھلتی پھولتی رہیں گی ؟" (صفحہ ۲۲۷)

یہاں پہنچ کر ہندوستان کے "قومی" لیڈر نے اپنی سیاست دانی کے جوہر پوری طرح نمایاں کیے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اسلامی تہذیب اور اسلامی قومیت صرف سرکارِ برطانیہ ہی کے سہارے سے جی سکتی ہے۔ لہٰذا جو لوگ ان دونوں کو باقی رکھنا چاہتے ہیں وہ سب ٹوڈی اور سرکار پرست ہیں اور ان کا مقصد یہ ہے کہ بدیسی حکومت یہاں ہمیشہ قائم رہے۔ اب اگر اس ملعون سامراج سے نجات چاہتے ہو، اگر آزادی کی خواہش ہے تو اس قومیت اور تہذیب کے تحفظ کا نام لینا چھوڑ دو۔ ورنہ جو کوئی یہ نام لیگا، ٹوڈی قرار دیا جائے گا ـــــ یہ آخری ضرب بڑی کاری ضرب ہے۔ ہماری قوم کے بہت سے حریت پسندوں کو یہی ضرب "آزادی کی فوج" میں کھینچ لے گئی ہے اور بہت سے اُن لوگوں کی زبانوں پر اس نے مہر لگا دی ہے جو حریت پسند کہلانا چاہتے ہیں اور ٹوڈیت کے گھناؤنے خطاب سے بچنا چاہتے ہیں۔

نیا حربہ

قومیت اور تہذیب کی خبر لینے کے بعد پنڈت جی اسلام کے نظامِ اجتماعی کی طرف بڑھتے ہیں تاکہ اس کو درہم برہم کر کے جمہور مسلمین کو جدید ہندوستانی قومیت میں جذب کر لیا جائے۔

پنڈت جی کو خوب معلوم ہے کہ مسلمانوں کے ہوش مند لوگ جو اسلام سے واقف ہیں، جن میں اپنی قومیت کا شعور پوری طرح موجود ہے، جو اپنی قومی تہذیب کو ہر چیز سے زیادہ قیمتی سمجھتے ہیں، وہ تو قیامت تک اس پوزیشن کو قبول کرنے پر راضی نہ ہوں گے۔ ان کے لیے قطعی ناممکن ہے کہ اسلامی قومیت کو چھوڑ کر ہندوستانی قومیت میں اپنے آپ کو ضم کر دیں، اور ان کو ایک لمحہ کے لیے بھی یہ گوارا نہیں ہو سکتا کہ اُس تہذیب کو خیرباد کہہ دیں جسے وہ اس گئی گزری حالت میں بھی اپنی عزیز ترین متاع سمجھتے ہیں۔

قومیت کو چھوڑنا، تہذیب سے دست بردار ہونا، جدید ہندی قومیت اور اشتراکی تہذیب و تمدن میں جذب ہو جانا یہ تو بہت دُور کی چیزیں ہیں۔ مسلمانوں کے اس گروہ سے تو اُلٹا یہ خطرہ ہے کہ ہندوستان کے آزاد نظامِ حکومت میں وہ اپنی قومیت اور اپنی تہذیب کو زیادہ مضبوطی کے ساتھ قائم کرنے کی کوشش کرے گا اور اس غرض کے لیے حکومت کے اقتدار میں برابر کی شرکت حاصل کرنا چاہے گا۔

اس خطرے کو اچھی طرح محسوس کر کے پنڈت جی نے یہ تدبیر نکالی ہے کہ مسلمانوں کی قومی جمعیتوں سے اب خطاب ہی نہ کیا جائے بلکہ ان کے افراد تک براہِ راست پہنچنے کی کوشش کی جائے۔ یہ افراد چونکہ منتشر ہیں، مفلس ہیں، اسلام اور اس کی تہذیب کے اصولوں سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں، اسلامی نظامِ اجتماعی کا شیرازہ درہم برہم ہو جانے کی وجہ سے ان کا شعورِ اسلامیت بڑی حد تک مضمحل ہو چکا ہے، اس لیے ان کو با آسانی توڑ لیا جا سکتا ہے۔ قبل اس کے کہ مسلمانوں کا "بورژوا" طبقہ ——— اشتراکی زبان میں قوم کے اہلِ دماغ اور متوسط طبقوں کا یہی نام ہے ——— بیدار ہو کر اپنی قوم کو سنبھالنے کی فکر کرے، قوم کو اس کے قابو سے نکال لیا جائے، یا زیادہ صحیح الفاظ میں اس کی "شدھی" کر لی جائے۔

یہی حقیقت ہے اس پالیسی کی جس کو مسلم عوام کے ساتھ ربط قائم کرنے (Muslim Mass Contact) کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ پنڈت جی نے آل انڈیا نیشنل کنونشن کے خطبۂ صدارت میں اس پالیسی کی تشریح ان الفاظ میں فرمائی تھی:-

"ہم نے عام لوگوں سے نگاہ ہٹا کر مدتوں فرقہ وارانہ لیڈروں کی باہمی مصالحت اور گفت و شنید میں وقت گنوایا ہے۔ یہ طریقہ غلط ہے اور میں چاہتا ہوں کہ دوبارہ ادھر نگاہ بھی نہ ڈالیں۔ ایسے لوگ ابھی تک زندہ ہیں جو ہندو مسلمانوں کا ذکر اس طور پر

کرتے ہیں گویا دو ملتوں اور قوموں کے بارے میں گفتگو ہے۔ جدید
دنیا میں اس دقیانوسی خیال کی کوئی گنجائش نہیں۔ آج جماعتوں
اور ملتوں کی بنیاد معاشی مفاد پر رکھی جا رہی ہے اور اس لحاظ
سے ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی سب ملتوں کا بھلا اسی میں ہے
کہ اپنی بے کاری اور غریبی کو سامنے رکھ کر سب مل کر قومی آزادی
کے لیے آگے بڑھیں۔ جب کبھی ہم اوپر کے لوگوں سے منہ موڑ
کر عام لوگوں کی طرف نگاہ ڈالیں گے تو ہمیں ان معاشی مصیبتوں
کا حل تلاش کرنا پڑے گا۔ جو سوال ایک زمانہ سے فرقہ وارانہ مسئلہ
بن گیا ہے اس کا صحیح حل یہی ہے۔"

کیسے معصوم کیسے بے ضرر ہیں یہ الفاظ! مگر کتنے زہریلے ہیں! اس سے
پہلے جو تصریحات خود پنڈت جی کی زبان سے میں نقل کر چکا ہوں ان کو سامنے
رکھ کر جب آپ اس نئی پالیسی کو دیکھیں گے تو صاف نظر آ جائے گا کہ یہ دراصل
شدھی کی تحریک ہے ایک دوسری شکل میں۔ یہ مذہبی شدھی نہیں، سیاسی
اور معاشی شدھی ہے اور اس کا نتیجہ عملاً وہی ہے جو مذہبی شدھی کا تھا فرق صرف
یہ ہے کہ وہ کھلی ہوئی تحریک ارتداد تھی جس پر مسلمانوں کے جاہل اور عالم سب
چونکنے ہو گئے تھے اور یہ ایسی خفی تحریک ارتداد ہے کہ جہلا تو درکنار علما تک
اس کی کنہ کو پہنچنے میں دقت محسوس کر رہے ہیں۔ اس تحریک کے بانیوں نے
پھوہڑپن سے کام لیا تھا۔ انھوں نے مسلمانوں سے کہا کہ تم اپنی قومیت اور اپنے
مذہب کو چھوڑ کر ہندو قومیت اور مذہب میں آ جاؤ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں
میں کوئی کودن سے کودن آدمی بھی ایسا نہ تھا جو اس پر بھڑک نہ اٹھا ہو۔ بخلاف
اس کے اس تحریک کا بانی ایک ہوشیار شخص ہے۔ یہ کہتا ہے کہ تم کوئی قوم ہی
نہیں ہو۔ تمہاری کوئی تہذیب ہی نہیں ہے علیحدہ کسی چیز کے چھوڑنے کا تو کوئی
سوال ہی نہیں۔ دراصل تم ایک قوم یعنی "ہندوستانی قوم" کے فرد ہو مگر سامراج

کے ایجنٹوں نے تم کو اس قوم سے جُدا کر رکھا ہے۔ آؤ اپنی قوم میں مِل جاؤ۔ آزادی حاصل کرو۔ اور اشتراکی تہذیب کے قائم کرنے میں حصّہ لو جس میں تم کو خوب روٹیاں ملیں گی ——— ہے یہ بھی زہر ہی کا گھونٹ، مگر دیکھیے کیسے ہوش گوش کے لوگ اسے شیرِ مادر سمجھ کر نوش فرما رہے ہیں۔

آزادی کی فوج کے مسلمان سپاہی

پنڈت جواہر لال کے جو خیالات گزشتہ صفحات میں پیش کیے گئے ہیں ان کو محض ایک شخص کے ذاتی خیالات سمجھ کر سرسری طور پر نظر انداز کر دینا صحیح نہیں ہے۔ اوّل تو یہ اس شخص کے خیالات ہیں جو گاندھی جی کے بعد کانگریس میں سب سے زیادہ باا ثر ہے اور دو مرتبہ کانگریس کا صدر رہ چکا ہے۔ دوسرے یہ کہ جواہر لال کے بعد انہی کے ہم خیال بلکہ ان سے زیادہ سخت خیالات رکھنے والے شخص، سوباش چندر بوس کا صدر منتخب ہونا اس امر کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ کانگریس پر ان خیالات کا پورا غلبہ ہے۔ ان سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اب یہ خیالات لیڈروں کے ذاتی خیالات نہیں رہے ہیں بلکہ درحقیقت کانگریس کی سرکاری پالیسی کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ کانگریس نے مارچ ۳۷ء کے بعد جمہور مسلمین کے ساتھ ربط قائم کرنے کی جو تحریک (Muslim Mass Contact) کے نام سے شروع کی ہے وہ ٹھیک انہی راستوں پر چل رہی ہے جو پنڈت جی نے تجویز کیے ہیں۔ پورا غیر مسلم پریس جو کانگریس کے زیر اثر ہے مسلمانوں میں اسلامی قومیت اور اسلامی تہذیب کے خلاف بغاوت پھیلانے میں لگا ہوا ہے۔ جس گوشے سے اس بغاوت کا کوئی اثر ظاہر ہوتا ہے، اس کا بڑے جوش کے ساتھ خیر مقدم کیا جاتا ہے اور ہر اس آواز کو جو اسلامی شعور

کے تحت کسی مسلمان کی زبان سے بلند ہوتی ہے۔ "فرقہ پرستی" اور "رجعت پسندی" کے آوازے کس کر دبا دیا جاتا ہے۔

اس طرزِ عمل کی توضیح کے لیے میں صرف دو مثالیں پیش کروں گا جن سے اس تحریک کے رجحانات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

پچھلے سال لکھنؤ یونیورسٹی کے ایک مسلمان نژاد طالب علم نے برملا اعلان کیا تھا کہ میں مسلمان نہیں ہوں۔ مسلمانوں نے اس پر اعتراض کیا کہ جو شخص خود اسلام سے منکر ہے وہ کسی انتخاب میں مسلمان ہونے کی حیثیت سے امیدوار بننے کا حق دار کیسے ہو سکتا ہے۔ اس واقعہ پر اظہار رائے کرتے ہوئے ایک کانگریسی اخبار (ہندوستان ٹائمز) لکھتا ہے:-

"اگر ووٹروں کی فہرست میں نام درج ہونے اور انتخابات کے لیے بحیثیت امیدوار کھڑے ہونے سے پہلے لوگوں کے عقائد کی تحقیقات شروع ہو گئی تو ہمارا موجودہ انتشار و اختلال اور زیادہ پریشان کن ہو جائے گا۔ اس سے تو یہ بات بالکل عیاں ہو گئی کہ ہمارا یہ سارا انتخابی نظام جس کو ہمارے آقاؤں نے اس قدر کامل غور و فکر کے بعد مرتب کیا ہے، اس وقت بے کار ہو کر رہ جائے گا جب کہ لوگ صرف ہندو یا مسلمان نہ رہیں گے بلکہ فرداً فرداً اپنے مخصوص عقائد اور شبہات پیدا کر لیں گے۔ مسٹر نقوی کو مستقبل کے لیے ایک فال نیک سمجھنا چاہیے اور کیا خبر کہ وہ آنے والی صبح صادق کے ایک پیغمبر ہوں۔"

آگے چل کر اس مضمون میں انگلستان کے ان ملاحدہ کو مثالاً پیش کیا گیا ہے، جنہوں نے حریت فکر کا علم بلند کیا تھا اور اپنی مذہب پرست قوم کے ہاتھوں تکلیفیں اٹھائی تھیں، مثلاً چارلس بریڈلا، مارلے اور رابرٹ انگرسول۔ پھر اسلام سے بغاوت کرنے والے اس نوجوان کو ان "بہادروں" کی صف میں جگہ دے کر اس کی ہمت و جرأت پر تحسین و آفرین کے پھول برسائے گئے ہیں۔

ایک دوسرا کانگریسی اخبار (تیج) اپنی ۱۲ راگست ۳۷ء کی اشاعت میں ایک

مسلمان عورت کا خط شائع کرتا ہے جس کے الفاظ حسب ذیل ہیں:۔

"جب میرٹھ میں پوجیہ پنڈت جواہر لال نہرو تشریف لائے تو میں اپنے خاوند سے چھپ کر جلسہ دیکھنے گئی۔ اس وقت سے میرا دل بے چین رہنے لگا۔ میں نے اپنے مکان پر ترنگی جھنڈا لگا دیا۔ لیکن جب میرے خاوند نے اسے پھاڑ ڈالا تو میں نے سارا دن نہ کھانا کھایا اور نہ رات کو سوئی بلکہ تمام رات اور دن برابر روتی رہی۔ جب میرے خاوند نے میرے پیارے پنڈت جواہر لال کو گالیاں دینی شروع کیں تو میں نے کہا اگر ان کی شان میں کچھ کہا تو جان کھو دوں گی۔ چنانچہ میں اسی دن سے لڑ کر اپنے باپ کے گھر چلی آئی ہوں۔ اب جب تک میرا خاوند معافی نہ مانگے گا اپنے مکان پر کانگریس کا جھنڈا نہ لگائے گا، اور کانگریس کا ممبر نہ بنے گا میں اس کی شکل بھی نہ دیکھوں گی۔

ایڈیٹر صاحب! میں نے پچاس مسلمان عورتیں تیار کر رکھی ہیں جو پردے کو چھوڑ کر ہر وقت کانگریس کا کام کرنے کو تیار ہیں۔ مگر ہمارے گھر والے ہم کو تنگ کرتے ہیں۔ اب آپ بتائیں میں کیا کروں؟ اور ہمارے پوجیہ پنڈت جواہر لال سے کہیئے کہ ہم مسلمان عورتیں کیا کریں؟"

بہت ممکن ہے کہ یہ خط فی الواقع کسی مسلمان عورت کا لکھا ہوا نہ ہو، اور محض ایک جعل ہو۔ لیکن اگر یہ جعل ہے تو یہ اور بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ "لشکرِ آزادی" کے ان نقیبوں کے مافی الضمیر پر روشنی ڈالتا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ "قوم پرستی" کے یہ علمبردار مسلمان مردوں اور عورتوں کو کیا دیکھنا چاہتے ہیں۔ "آزادی کی فوج" کے لیئے کس قسم کے سپاہی ان کو مسلمانوں میں درکار ہیں۔ اور کم از کم کس حد تک اصولِ اسلام سے منحرف ہو جانا ضروری ہے جس کے بعد وہ کسی مسلمان کو "قوم پرست" تسلیم کر سکتے ہیں۔

یہ بغاوت صرف غیر مسلموں ہی کی زبان و قلم کے ذریعہ سے نہیں پھیلائی جا رہی ہے

بلکہ خود مسلمان بھی اس کی اشاعت کے لیے آلۂ کار بنائے جا رہے ہیں۔ مسلمان لیڈر، مسلمان اہلِ قلم اور مسلمان رسائل و جرائد اُنہی تمام خیالات کو مسلمانوں میں پھیلانے کا وسیلہ بن گئے ہیں اور بنتے جا رہے ہیں جو پنڈت جواہر لال نہرو کی زبان سے آپ سُن چکے ہیں۔ اور یہ بالکل ظاہر ہے کہ مسلمانوں کو بہکانے کے لیے غیر مسلموں کی بہ نسبت خود مسلمان زیادہ کارگر ذریعہ بن سکتے ہیں۔ اس کے لیے آپ کو جتنی مثالوں کی ضرورت ہو میں پیش کر سکتا ہوں۔ مگر یہاں صرف اُن حضرات کی تحریروں سے استشہاد کروں گا، جو کانگریس میں کوئی نہ کوئی "سرکاری" ذمہ دارحیثیت رکھتے ہیں۔

بہار کے مشہور کانگریسی لیڈر ڈاکٹر سید محمود صاحب، جو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے سیکرٹری رہ چکے ہیں، اور اس وقت صوبہ بہار کی وزارت میں واحد مسلمان وزیر ہیں، اپنے ایک مضمون میں فرماتے ہیں:-

"مختصر یہ کہ اخلاقی، سیاسی اور دوسرے تمام حکیمانہ تصورات کو قطعیت اور عملیت کا جامہ پہنا کر مسلمانوں کے تخیل کو عمل کا آئینہ بنا دیا۔ بعض نے اپنے ولولہ و جوش سے مجبور ہو کر ہندوستان میں متحدہ قومیت کی آفرینش کے پیشِ نظر ایک ایسے جدید نظام مذہبی کی نشوونما کرنی چاہی جو ہندوستان میں سب کے مناسب حال ہو۔ یہ ان لوگوں کی معمولی خدمات نہیں کہی جا سکتیں، جو اجنبی تھے، لیکن انہوں نے جلد ہی اپنی قسمتوں کو اہلِ ملک کے ساتھ ہمیشہ کے لیے وابستہ کر لیا۔"

(جامعہ۔ اکتوبر ۱۹۳۶ء)

آپ سمجھے کہ یہ "جدید نظام مذہبی" کا اشارہ کس چیز کی طرف ہے؟ یہ اشارہ اکبر کے دینِ الٰہی کی طرف ہے۔ کتنا مختصر اشارہ ہے، مگر "قوم پرست مسلمان"؟ ـــــ مجموعۂ ضدین ـــــ کی معراجِ تخیل کو کتنی صاف روشنی میں پیش کرتا ہے۔ اکبر کا دور اسلامی ہند کی تاریخ میں پہلا دور ہے۔ جس میں سیاسی اغراض پر مذہب کو قربان کرنے کی ابتدا ہوئی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے "تذکرہ" میں اس نامبارک

دور کے جو حالات بیان فرماتے ہیں ان کو پڑھیئے تو آپ کو اس کی فتنہ سامانیوں کا اندازہ ہو گا۔ یہ پہلا فتنہ عظیم تھا جس نے پوری طاقت کے ساتھ الحاد و بے دینی پھیلا کر ہندوستان کے مسلمانوں کو وطنی قومیت میں جذب کرنے کی کوشش کی۔ اس دور کے تمام صلحاء امت اس فتنے پر چیخ اُٹھے تھے حضرت شیخ احمد مجدد سرہندی رحمتہ اللہ علیہ نے اسی کیخلاف علم جہاد بلند کیا تھا۔ اسی ناپاک دور کے اثرات تھے جنہوں نے دارا شکوہ کی صورت میں جنم لیا۔ اسی زہر کو دور کرنے کے لیے عالمگیر پچاس برس جدوجہد کرتا رہا۔ اور یہی زہر آخر کار مسلمانوں کی سیاسی طاقت کو گھن کی طرح کھا گیا۔ مسلمانوں میں قوم پرستی کی جدید تحریک دراصل اسی پرانی تحریک کی نشأۃ ثانیہ ہے۔ لہٰذا یہ لوگ اس فتنہ عظیم کو فتنے کی حیثیت سے نہیں بلکہ "خیر القرون" کی حیثیت سے دیکھتے ہیں اور وسوسہ (Inspiratîon) حاصل کرنے کے لیے اسی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک متحدہ قومیت کی آفرینش کا یہ پہلا تجربہ ہندوستانی مسلمان کی "خدمات" میں شمار ہونے کے لائق ہے۔ ان کے ذہن میں "متحدہ قومیت" کا تصور یہی ہے کہ ہندوستان کے مسلمان اپنی قسمتوں کو اسی طرح اہل ملک کے ساتھ ہمیشہ کے لیے وابستہ کر لیں۔ پنڈت جواہر لال بھی اس کے سوا کچھ نہیں چاہتے۔

آگے چل کر ڈاکٹر صاحب اپنے اس مضمون میں فرماتے ہیں:۔

"سوال یہ ہے کہ ہندوستان میں آخر ہمارا نصب العین اور مقصد کیا ہے؟ کیا ہم اس سمت میں قدم اُٹھانے کو آمادہ ہیں کہ ایک مشترک قومیت کی مع تمام لوازم کے تشکیل کریں؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہے تو یہ بالکل ظاہر ہے کہ ہندوستان صرف ایک جغرافیائی نام ہے جس میں ایک سے زیادہ "اقوام" بستی ہیں۔ کیا ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہر "قوم" علیحدہ علیحدہ اپنے مسائل کو حل کرے اور مشترکہ دولت ہند (Common Wealth) میں صرف انسانی اور مادی امداد کیا کرے؟ اگر مسئلہ ہند کا یہی حل ہے تو ہماری اس وقت کی کوششیں اس کے

برعکس بالکل ناکام رہی ہیں ......

لیکن اگر ہمارے سوال کا جواب اثبات میں ہے اور ہم واقعی یہ چاہتے ہیں کہ ہم اسی راہ پر گامزن ہوں جو اکبر اور دوسرے از منہ وسطیٰ کے حکمرانوں نے بنادی تھی تب تو ہمیں عزم و استقلال کے ساتھ ہمیشہ نہ صرف اسی راہ پر چلنا چاہیئے بلکہ ہمارے پیشوں اور رسوم میں بھی یکسانیت ہونی چاہیئے بعض کے نزدیک تو اس حل میں بھی مسلم اقلیت کے لیے ایک مضرت ہے۔ لیکن اس کا کوئی چارۂ کار نہیں۔ اب چونکہ کوئی تیسرا حل موجود نہیں ہے اس لیے مسلمانوں کو ملک کی خاطر اور اپنی خاطر اسے قبول کرنا چاہیئے۔"

یہاں مافی الضمیر بالکل واضح ہو گیا۔ صوبہ بہار کے چالیس لاکھ مسلمانوں کی قسمتیں جس شخص کے ساتھ وابستہ ہیں، جسے بہار کی وزارت میں ہماری آئندہ نسلوں کی تعلیم کا نگراں بنایا گیا ہے، وہ سرے سے اِس تخیل ہی کا مخالف ہے کہ ہندستان میں مسلمانوں کی کوئی مستقل "قومیت" باقی رہے اور آزاد ہندوستان میں ان کو ایک ممتاز اجتماعی وجود کی حیثیت سے اپنے مسائل خود حل کرنے کا موقع حاصل ہو۔ اس کا نصب العین ہمارے نصب العین سے بالکل مختلف اور جواہر لال نہرو کے نصب العین سے بالکل متحد ہے۔ ہم آزادی اس لیے چاہتے ہیں کہ ڈیڑھ سو برس کے غیر مسلم اقتدار نے ہماری قومیت اور ہماری تہذیب کو جو نقصان پہنچایا ہے اس کی تلافی کر سکیں۔ اور وہ آزادی اس لیے چاہتا ہے کہ اب تک جو نقصان ہمیں پہنچا ہے، آگے چل کر وہ اپنے طبعی نتیجہ کو پہنچ جائے یعنی ہماری مضمحل شدہ قومیت ہندستان کی مشترک قومیت میں جذب ہو جائے، ہماری تہذیب کی کوئی امتیازی شان باقی نہ رہے، ہمارے مختلف پیشوں کے لوگ اپنے اپنے ہم پیشہ غیر مسلموں کے ساتھ گھل مِل جائیں اور ان کے درمیان پیشوں کے ساتھ رسوم میں بھی یکسانیت "پیدا ہو جائے ہندوستان کی مختلف قوموں کے لیے لفظ "اقوام" کا استعمال ہی فاضل ڈاکٹر

کے نزدیک قابلِ اعتراض ہے۔ وہ ہندوستان کو ایک جغرافیائی نام نہیں، بلکہ ایک قومی وحدت بنانا چاہتے ہیں۔ ان کے نزدیک مسئلہ ہند کا یہ حل بالکل غلط ہے کہ ہر "قوم علیحدہ علیحدہ اپنے مسائل کو حل کرے اور مشترکہ دولتِ ہند میں صرف انسانی اور مادّی امداد کرے"۔ برعکس اس کے صحیح حل یہ ہے کہ "مسلمان اُسی راستہ پر گامزن ہوں جو اکبر اور ازمنۂ وسطیٰ کے حکمرانوں نے بنا دی تھی"۔ یعنی ہندوستان کی کان نمک میں نمک بننے کے لیے تیار ہو جائیں۔ اور یہ سب کچھ مسلمانوں کو کیوں کرنا چاہیے؟ خدا اور رسول کی خاطر نہیں، بلکہ ملک کی خاطر اور اپنی خاطر۔ غالباً یہاں "اپنے پیٹ کی خاطر" لکھنے میں ڈاکٹر صاحب کو شرم محسوس ہوتی ہوگی۔ ایں ہم غنیمت است!

کیا جواہر لال نہرو کا تصوّرِ قومیت اس سے کچھ بھی مختلف ہے!

مسلمانوں کو اپنے نام "مسلم" پر بڑا فخر ہے۔ خدا کا رکھا ہوا نام، اور وہ نام جس سے بڑھ کر عزّت و افتخار کا نام آج تک دنیا کی کسی قوم کو نصیب نہیں ہوا، مگر ڈاکٹر سیّد محمود صاحب کے نزدیک اس علیحدہ نام سے مسلمانوں کا موسوم ہونا قابلِ اعتراض ہے۔ ہندو، مسلمان، عیسائی، پارسی اور اس قسم کے دوسرے تمام اسماء ان کے نزدیک محو ہو جانے چاہئیں اور صرف ایک نام "ہندی" تمام باشندگانِ ہند کے لیے استعمال ہونا چاہیے تاکہ جداگانہ قومیتوں کا احساس باقی نہ رہے۔ فرماتے ہیں:-

> "ہندی" کو زبان کے لیے نہیں بلکہ "اہلِ ہند" کے لیے اختیار کرنا چاہیے۔ دنیا بھر میں صرف ہمارا ملک ہی ایک ایسا ملک ہے جس میں لوگ مختلف مذاہب سے شناخت میں آتے ہیں۔ صرف اس کا اظہار ہی ہماری دماغی کیفیت کا آئینہ بن جاتا ہے اور ہمارے متعلق یہ بات ثابت کر دیتا ہے کہ "ہم اس برِّاعظم کی علیحدہ علیحدہ مذہبی اقوام ہیں"۔ اسی لیے اب وقت آگیا ہے کہ ہم سب ایک مشترکہ نام اختیار کریں۔

"ہم علیحدہ علیحدہ مذہبی اقوام ہیں" یہ گویا ہمارے دامن پر ایک شرمناک دھبا ہے جسے مٹا دینے کی ضرورت ہے! وہ دماغی کیفیت ہی لائق صد شرم و ندامت ہے

جس کے تحت دنیا کے اس اکیلے ملک ہندوستان دوزخ نشان کے باشندے مختلف مذاہب سے شناخت میں آتے ہیں یا یہ ثابت ہو جاتا کہ ہم دورِ وحشت کی یادگار ہیں اور اس تلخ حقیقت کو شیرینی یا کم از کم فریب شیرینی سے بدل دینے کے لیے اب ناگزیر ہو گیا ہے کہ ہم ان ناموں کو بدل ڈالیں جو علیحدہ مذہبی اقوام ہونے کے احساس کو زندہ رکھتے ہیں۔"

یہ ہیں اس زعیم قوم کے خیالات جس کو مولانا ابوالکلام آزاد نے صوبہ بہار کی وزارت میں ۴۰ لاکھ مسلمانوں کی نمائندگی کے لیے منتخب فرمایا ہے[1]۔

یہ تو صرف ایک نظیر تھی۔ کہیں آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ یہ بس ایک ہی نظیر ہے۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے حال ہی میں ایک مستقل شعبہ اسلامیات قائم کیا ہے، جس کے کارکن مسلمان ہیں اور نشر و اشاعت کے آلۂ کار سب کے سب مسلمان اخبارات ہیں۔ مسلمانوں کے لیے کانگریس نے جو بیش بہا خدمات انجام دی ہیں ان کی فہرست میں اس شعبۂ اسلامیات کے قیام کو بھی ایک نمایاں جگہ دی جاتی ہے۔ چنانچہ جمعیت علمائے ہند کا واحد ترجمان "الجمعیت" اس خدمتِ جلیلہ کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے:-

"دورِ جدید میں مسلمانوں نے شکایت کی کہ کانگریس عام مسلمانوں سے ربط نہیں رکھتی۔ اسلامی جرائد نے اس شکایت کو پیش کیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اس کی معقولیت کو تسلیم کیا۔ اور محض مسلمانوں کی دل دہی اور سہولتِ کار کے لیے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ماتحت اسلامیات کا ایک مستقل شعبہ کھول دیا۔"

(الجمعیت مورخہ ۵ رمضان ۵۶ھ)

---

[1] اس موقع پر مولانا ابوالکلام کے "تذکرہ" میں ان علماء و مشائخ کے حالات پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے۔ جنہوں نے دورِ اکبری میں سیاسی اغراض پر دین کی قربانی چڑھانے والوں کیساتھ مداہنت برتی تھی۔ ان لوگوں کے متعلق مولانا نے جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے وہ انشاء اللہ ازدیادِ بصیرت کے موجب ہوں گے۔

بے چارے ناواقف عوام جب ان الفاظ کو دیکھیں گے تو کہیں گے کہ کیسی مہربان ہے یہ کانگریس۔ اس نے آج تک کوئی شعبہ ہندویات و سکھیات و پارسیات نہیں کھولا۔ مگر ہماری "دلدہی" اس کو یہاں تک منظور ہے کہ خاص ہمارے لیے ایک شعبۂ اسلامیات کھول دیا۔ اب ذرا اس شعبہ کی کارگذاری ملاحظہ ہو۔

ڈاکٹر محمد اشرف صاحب (معتمد شعبۂ اسلامیات) کا ایک مضمون الجمیعت ہی میں ۱۸ رجب ۵۶ھ کی اشاعت میں درج ہوا ہے، اور ادارہ کی جانب سے اس پر کوئی تردیدی نوٹ یا اختلافی اشارہ تک نہیں ہے۔ اس میں ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں:۔

"ہندوستان میں سیاسی یا اقتصادی حالات اس درجہ ترقی کر گئے ہیں اور فضا کا تقاضا اس درجہ شدید انقلاب انگیز ہے کہ رجعت پسندوں اور سامراج پرستوں کی یہ ہمت نہ ہوئی کہ علانیہ کانگریس یا آزادی کی جدوجہد کی مخالفت کریں اس لیے ملک کو پیچھے لے جانے والی طاقتیں اور سامراج کی حامی جماعتیں کسی تعصب کی آڑ لیتی ہیں۔ گزشتہ سات آٹھ سال میں جب کبھی سیاسی یا سماجی ترقی کے لیے قدم بڑھایا گیا، ہندو مسلم سوال ضرور چھیڑ دیا گیا۔ مجھے یاد ہے کہ جب ابتدائی تعلیم کے متعلق کانگریسیوں نے صوبۂ متحدہ کی کونسل میں ایک زمانہ میں سوال چھیڑا، تو رجعت پسند مسلمانوں نے فوراً مذہبی تعلیم و تربیت کا سوال شروع کر دیا اور ڈاکٹر ضیاء الدین اور دوسرے لوگ اس موقع پر کونسل چھوڑ کر چل دیے۔ ساردا ایکٹ کے خلاف ہندو اور مسلمان قدامت پسندوں نے جو ہنگامہ کیا وہ سب کو معلوم ہے۔ ترقی پسندی کی طرح رجعت پسندی بھی ہماری پبلک زندگی کے ہر پہلو پر محاذ قائم کرنا چاہتی ہے اور ظاہر ہے کہ کوئی بوسیدہ خود فنا نہیں ہوتا۔ بڑھتی ہوئی سماجی قوتیں جدوجہد کے بعد اسے معزول کر دیتی ہیں۔"

غور فرمایئے مسلمان بچوں کے لیے تعلیم کی اسکیم میں مذہبی تعلیم و تربیت کا مطالبہ کرنا رجعت پسندی ہے۔ سامراج کی حمایت ہے، ملک کو پیچھے پیجانے والی طاقتوں کا کام ہے۔ فضا کا انقلاب انگیز تقاضا اب یہ ہے کہ اس "بوسیدہ" چیز کو بڑھتی ہوئی سماجی قوتیں جدوجہد کے بعد معزول کر دیں۔

آگے چل کر ڈاکٹر صاحب یہ بحث شروع کرتے ہیں کہ کانگریس کی شرکت کے سلسلہ میں مسلمانوں کی تہذیب اور روایات کا سوال جو اٹھایا جا رہا ہے، یہ دراصل ترقی پسند اور انحطاط پذیر قوتوں کی کشمکش کا ایک عکس ہے ——— "ترقی پسند" اور "انحطاط پذیر" ان دو اصطلاحوں کا مفہوم پنڈت جواہر لال اور ان کے "شعبۂ اسلامیات" کی لغت میں جو کچھ ہے اس کی تشریح میں بعد میں عرض کروں گا، یہاں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ "ترقی پسند" قوتیں اسلامی تہذیب کے سوال کو کس نظر سے دیکھتی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں:-

> "یہ صحیح ہے کہ مسلمان ایک مخصوص تہذیب کے حامل رہے ہیں۔ باوجود اختلافات اور تنوع کے ان میں ایک قسم کی یگانگت اور یکسانیت پائی گئی ہے یہ کہنا تو مشکل ہے کہ مسلمانوں کی زبان ایک تھی یا تمدن کے مظاہر ایک سے تھے، لیکن تاریخی طور پر کسی حد تک یہ صحیح ہے کہ مسلمان حکمران طبقہ کے رجحانات ایک سمت کی طرف دکھائی پڑتے ہیں جو لوگ اسلامی تہذیب پر بحث کرتے ہوئے یہ بھول جاتے ہیں کہ اس تمدن اور تہذیب نے ایک خاص ماحول میں تربیت پائی تھی اور بہرصورت مسلمانوں کی حکمران حیثیت سے وابستہ تھی۔ جو لوگ بے صبری کے ساتھ اسلامی تہذیب کی خصوصیات گناتے وقت یہ حدیث سناتے ہیں کہ کلکم راعٍ وکلکم مسئول عن رعیتہ، وہ اکثر یہ واقعہ بھول جاتے ہیں کہ یہ حدیث یا اس قسم کے دوسرے اقوال اس زمانہ کے ... حالات کا عکس ہیں جب انسانوں کی تقسیم حاکم اور محکوم راعی اور ... میں ہوتی تھی اور

مسلمان من حیث القوم حکمراں تھے ۔۔۔۔۔۔۔۔ البتہ اسلامی تمدّن اور
تہذیب کا مفہوم اس درجہ محدود نہ تھا جیسا کہ آج کل ہو گیا ہے ۔ آج اسلامی
تہذیب کی زندگی خطرہ میں پڑ جاتی ہے اگر مسلمان بجائے کلاہ اور عمامہ
کے گاندھی ٹوپی پہننے لگتے ہیں یا ہندی رسم الخط کے پرچار کے لیے دو چار
ہندو وانڈ کھڑے ہوتے ہیں ۔ ایک خاص قسم کا لباس اگر نہ پہنیے یا اگر فصیح و
بلیغ اردو نہ بولیے تو آپ کو تمدنی حیثیت ہی سے نہیں بلکہ مذہبی حیثیت
سے بھی مسلمان رہنا مشکل ہو جاتا ہے ۔ واقعہ یہ ہے کہ معیاری اور
ٹکسالی مسلمان صرف وہ خوش نصیب لوگ ہیں جو دہلی اور لکھنؤ کی
فضا میں پلے اور بڑھے ہیں ۔ (چاہے وہ کائستھ اور کشمیری برہمن
ہی کیوں نہ ہوں) یا پھر دیو بند اور فرنگی محل کا لباس پہننے والے علماء
کی وضع کے پابند لوگ ۔"

دیکھیے ان "ترقی پسندوں" کے علم و فضل اور ان کی دانش و بینش کا معیار کس قدر بلند ہے ۔ ان کے ارشادات جب ہم پڑھتے ہیں تو بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی آواز کو ایک ریکارڈ میں بھر دیا ہے اور وہی ریکارڈ جگہ جگہ بجتا پھر رہا ہے ۔ اپنے شیخ طریقت پنڈت جواہر لال کی طرح یہ لوگ بھی اسلامی تہذیب و تمدن کے مسئلہ پر اظہار خیال کر کے درحقیقت اپنی بے علمی کا راز فاش کرتے ہیں اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف اسلامی تہذیب و تمدن ہی سے نابلد نہیں ہیں ، بلکہ نفس تہذیب و تمدن کے مفہوم سے نا آشنا ہیں ———— یا اگر نا آشنا نہیں ہیں تو عمداً غلط بحث کر کے مسلمانوں کو دھوکا دینے کی کوشش کر رہے ہیں ۔

لہ جہالت ملاحظہ ہو ۔ جو حدیث انسان کی انفرادی ذمہ داری و مسئولیت کا عظیم الشان اخلاقی تصور پیش کر رہی ہے ، اس کی معنویت کو کس بُری طرح خاک میں ملایا گیا ہے ۔ پھر اس علم اور اس فہم پر جسارت کا یہ حال ہے کہ اسلامی تہذیب و تمدّن کے متعلق ماہرانہ گفتگو فرمائی جاتی ہے ۔

یہ تہذیب نام رکھتے ہیں تمدنی مظاہر کا، حکمران طبقے کے آداب و اطوار کا، لباس کی وضعوں اور کھانوں اور مٹھائیوں کا، موسیقی اور سنگتراشی اور مصوری کا، اور اظہار مافی الضمیر کے وسائل کا۔ پھر ان تمدنی مظاہر میں گردش ایام کے ساتھ جو تغیرات رونما ہوتے ہیں ان میں یہ اس حیثیت سے کوئی امتیاز نہیں کرتے کہ کون سے تغیرات ایک تہذیب کے زیر اثر ہوئے اور کون سے دوسری تہذیب کے زیر اثر۔ بس سطح پر چند تغیرات دیکھ کر یہ اپنی تقریر شروع کر دیتے ہیں کہ دیکھو تاریخ کے دوران میں تمہارا تمدن بار بار بدل چکا ہے۔ اور جب تمدن بدلا ہے تو گویا تہذیب بدل گئی ہے۔ لہٰذا اسلامی تہذیب و تمدن کسی متعین حقیقت کا نام نہیں ہے۔ جس طرح پہلے تم بہت سے تغیرات قبول کر چکے ہو اسی طرح اب بھی اُن تغیرات کو قبول کرنے کے لیے تیار رہو جو جن کا تقاضا، فضل کے انقلاب انگیز حالات یا بالفاظ دیگر جواہر لال اور ان کی امت کے رجحانات کر رہے ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ یہ لوگ علانیہ ایسی صریح جاہلانہ باتیں لکھنے اور شائع کرنے کی جرأت کیسے کرتے ہیں۔ کیا انہوں نے یہ فرض کر لیا ہے کہ سارا ہندوستان بس جہلا ہی سے آباد ہے اور یہاں کوئی پڑھا لکھا آدمی نہیں رہتا؟

اگرچہ یہاں تفصیل کا موقع نہیں ہے مگر میں عام ناظرین کی واقفیت کے لیے بطور جملہ معترضہ صرف اتنا عرض کیے دیتا ہوں کہ دراصل تہذیب اِس طریق فکر، اُس نظریۂ حیات اور اس معیار امتیاز و انتخاب کا نام ہے جو انسانوں کی کسی معتدبہ جماعت کے دل و دماغ پر حاوی ہو جاتا ہے اور اس کے زیر اثر وہ جماعت دنیا میں زندگی بسر کرنے کے مختلف طریقوں میں سے کسی خاص طریقے کو اختیار کرتی ہے۔ اور تمدن اُس خاص طرز زندگی کا نام ہے جو اسی تہذیب کے زیر اثر اختیار کیا جائے۔ ہم جس چیز کو اسلامی تہذیب کہتے ہیں وہ لکھنؤ اور دلّی کی فصیح و بلیغ اردو اور دیوبند و فرنگی محل کے علماء کا لباس نہیں ہے، بلکہ وہ اُس ذہنیت، اُس طرز خیال اور ان اصول حیات پر مشتمل ہے جو قرآن اور سیرت رسول سے ماخوذ ہیں۔ جب تک کوئی تمدن اس تہذیب کے حدود کے اندر

ہے وہ اسلامی تمدن ہے، خواہ اس کی زبان، اس کے لٹریچر، اس کے آداب و اطوار، اس کے کھانوں اور مٹھائیوں، اس کے لباس و طرزِ معاشرت اس کے فنونِ لطیفہ میں کتنے ہی تغیرات واقع ہو جائیں۔ مظاہر کا تغیر بجائے خود کسی تمدن کو اسلامی تہذیب کے دائرے سے خارج نہیں کر دیتا۔ البتہ جب وہ اس نوعیت کا تغیر ہو کہ اسلامی تہذیب کے اصول و قواعد میں اس کے لیے کوئی سندِ جواز نہ ہو، تو یقیناً وہ تمدن کو غیر اسلامی تمدن بنانے کا موجب ہوگا۔ مثال کے طور پر مسلمان مشرق سے لے کر مغرب تک بیسیوں طرح کے لباس پہنتے ہیں، مگر ان سب میں ستر عورت کے انہی حدود کا لحاظ رکھا جاتا ہے جو اسلامی تہذیب نے مقرر کر دیے ہیں لہٰذا یہ سب اپنے تنوعات کے باوجود اسلامی تمدن ہی کے لباس کہے جائیں گے۔ مگر جب کوئی لباس ان حدود سے قاصر ہوگا تو ہم اسے غیر اسلامی لباس کہیں گے۔ اسی طرح غذا کے متعلق حلال و حرام کے حدود اسلامی تہذیب نے مقرر کیے ہیں، ان کے تحت خواہ کتنی ہی انواع و اقسام کے کھانے مسلمانوں کے گھروں میں پکتے ہوں اور تاریخ کے دوران میں ان کی نوعیتیں کتنی ہی بدل جائیں، اور کھانے کے طریقوں میں کتنا ہی تغیر رونما ہو جائے، ان سب کو اسلامی تمدن ہی کے دائرے میں جگہ ملے گی۔ البتہ جب مسلمانوں کی غذا حدودِ حلت سے متجاوز ہوگی تو ہم کہیں گے کہ وہ اسلامی تہذیب و تمدن سے بغاوت کر رہے ہیں۔ اسی پر زندگی کے تمام معاملات کو قیاس کر لیجیے۔ عرب، ہندوستان، ایران، ترکستان اور شمالی افریقہ کے تمدنوں میں بظاہر خواہ کتنا ہی فرق ہو، بہرحال جب تک ان کے اندر اسلامی تہذیب کی روح موجود ہوگی، اور جب تک یہ شریعتِ اسلامی کے ضابطہ میں رہیں گے، ان پر یکساں "اسلامی تمدن" کا اطلاق ہوگا۔ مگر جب یہ کسی دوسری تہذیب کا اثر قبول کریں گے اور ایسی چیزیں اپنے اندر داخل کر لیں گے جو اسلامی تہذیب کی روح یا شریعتِ اسلام کے خلاف ہوں، تو بلاشبہ یہ کہا جائے گا کہ ان ممالک میں اسلامی تمدن مسخ ہو رہا ہے۔

اب آپ غور فرمائیں کہ پنڈت جواہر لال اور ان کے یہ مسلمان متبعین اسلامی تہذیب

تمدن کے مسئلے کو کیسی غلط روشنی میں پیش کر رہے ہیں ۔ یہ دنیا کو اور خود ناواقف مسلمانوں کو باور کرانا چاہتے ہیں کہ :-

"اسلامی تہذیب و تمدن فی نفسہ کوئی چیز نہیں ہے بلکہ صدیوں پہلے مغلوں اور پٹھانوں کے دورِ حکومت میں جو طور طریقے مسلمانوں میں رائج ہو گئے تھے انہی کا نام اسلامی تہذیب و تمدن رکھ دیا گیا ہے ۔ آج جو مسلمان اسلامی تہذیب و تمدن کے تحفظ کا شور مچا رہے ہیں ، ان کا مقصد محض اُس گزرے ہوئے تاریخی دَور کی میراث کو اِس بدلتے ہوئے زمانہ میں جوں کا توں برقرار رکھنا ہے ، اِس لیے یہ رجعت پسند اور ترقی دشمن ہیں "

ایک پوری قوم کے نقطۂ نظر کی اس قدر غلط ترجمانی اور اتنی جسارت کے ساتھ شاید یورپ کے سیاسی بازی گروں سے بھی بن نہ آتی ۔ یہ ہمارے ہم وطن ادھم قوم اس معاملہ میں ان سے بھی بازی لے گئے ۔

ان کو اگر معلوم نہیں ہے تو ہم انہیں بتانا چاہتے ہیں کہ ہم اُس تمدن کی حفاظت کے لیے نہیں اُٹھے ہیں جو کسی زمانہ میں حکمران طبقہ کے رجحانات سے پیدا ہوا تھا ۔ بلکہ اِس لیے اٹھے ہیں کہ ہماری قوم کا تمدنی ارتقاء قرآنی تہذیب کے راستہ سے منحرف نہ ہونے پائے ۔ ہمیں دلی اور لکھنؤ کی ٹکسالی اردو کو بچانے کی فکر نہیں ہے ، بلکہ اُس ذہن کو اسلامی ذہن رکھنے کی فکر ہے جس نے اپنی شخصیت ظاہر کرنے کے لیے اس زبان کو وسیلہ بنایا ہے ۔ ہم دیو بند اور فرنگی محل کے لباس کو محفوظ رکھنے کے لیے نہیں لڑ رہے ہیں ، بلکہ اس لیے لڑنا چاہتے ہیں کہ ہمارے مرد اور ہماری عورتیں اس لباس حیا سے خارج نہ ہو جائیں جو اسلامی تہذیب نے انہیں پہنایا ہے اور اس لڑائی کی ضرورت ہمیں اس لیے پیش آئی ہے کہ ہم ہندوستان کی سیاست پر تم جیسے لوگوں کو غالب آتے دیکھ رہے ہیں جن میں ہماری تہذیب کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں جن میں اتنی راست بازی و انصاف پسندی نہیں کہ دوسروں کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش

کریں، اور جن میں ان کمزوریوں کے ساتھ ہٹلر اور مسولینی کی فاشستی روح گھس گئی ہے کہ اپنی مرضی کو دوسروں پر مسلط کرنے کے لیے کسی طاقت کے استعمال سے دریغ نہیں کرتے خواہ اس کے استعمال میں صداقت، انسانیت اور اخلاق کو قربان ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔

خیر یہ ایک ضمنی بحث تھی۔ یہاں میں صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ کانگریس کا یہ شعبہ اسلامیات جو ہماری "دلدہی" اور "سہولت کار" کے لیے قائم کیا گیا ہے، دراصل کیا خدمات انجام دے رہا ہے۔ اسلامی تہذیب و تمدن کے متعلق پنڈت جواہر لال نہرو کے جو نظریات آپ پڑھ چکے ہیں، ان کو مسلمان مضمون نگاروں اور مسلمان اخباروں کے ذریعہ سے مسلمانوں کے دلوں میں اُتارنا اس کا مقصد ہے، اور آپ نے دیکھ لیا کہ یہ شعبہ جو ہماری "دلدہی" کے لیے قائم کیا گیا ہے اس مقصد کو کس خوبی کے ساتھ پورا کر رہا ہے۔ وہ ہمیں سمجھا رہا ہے کہ یہ تہذیب جس کی حفاظت کا تم دعویٰ کر رہے ہو، کوئی چیز بھی تو نہیں ہے۔ مسلمان حکمران طبقہ کے رجحانات تھے سو وہ طبقہ ہی ختم ہو گیا۔ ایک خاص ماحول میں اس تہذیب نے تربیت پائی تھی، سو وہ ماحول ہی اب باقی نہیں۔ اب لے دے کے تمہاری تہذیب یہ رہ گئی ہے کہ ایک خاص وضع کا لباس پہن لیتے ہو اور ٹکسالی اُردو بول لیتے ہو، تو وہ بھی دلّی اور لکھنؤ تک محدود ہے اور دلّی و لکھنؤ میں بھی وہ کوئی خاص تمہاری چیز نہیں ہے۔ بلکہ کائستھ اور کشمیری برہمن بھی تمہارے ساتھ شریک ہیں۔ کیا اسی مہمل چیز کو تم فضا کے انقلاب انگیز تقاضوں اور سیاسی و اقتصادی حالات کی ترقی کے مقابلہ میں بچانا چاہتے ہو؟ یہ تو عین رجعت پسندی ہے کیونکہ وہ دور گزر چکا جس میں یہ تہذیب پیدا ہوئی تھی۔ اور یہ سامراج پرستی بھی ہے۔ کیونکہ فضا کے انقلاب انگیز تقاضوں کے مقابلہ میں اس بوسیدہ چیز کی حفاظت صرف اسی طرح ہو سکتی ہے کہ تم سامراج کی حمایت کرو اور سامراج تمہاری حمایت کرے! ——— مسلمانوں کو شکایت تھی کہ کانگریس عام مسلمانوں سے ربط نہیں رکھتی۔ اس شکایت کی معقولیت تسلیم کر کے کانگریس نے کیسے معقول طریقہ سے اسے دُور کیا ہے!

ڈاکٹر اشرف صاحب کا وعظ ابھی ختم نہیں ہوا۔ آگے سُنیے :۔

"جاگیرداری اور عہد بادشاہت کے زمانہ میں باعتبار زبان، لباس، تمدّن، بلکہ مذہبی عقاید کے لحاظ سے بھی مسلمانوں میں کوئی یکسانیت نہ تھی۔ عربی، فارسی، ترکی، تاتاری، چینی سب مسلمانوں کی زبانیں تھیں۔ مغربی، مشرقی، ایرانی، رومی، ہندی ہر طرح کے لباس مسلمانوں کے ہر طبقہ میں رائج ہو چکے تھے۔ چنانچہ جب ہمایوں ہندوستان سے جلاوطن ہو کر ایران پہنچا تو شاہِ ایران نے بجائے ایرانی کھانوں کے اپنے مہمان کے لیے خاص طور پر ہندوستانی مٹھائیاں اور کھانے تیار کرائے۔ عقائد کی یکسانیت کا تو مسلمانوں میں سرے سے کوئی سوال ہی نہیں، بہتر فرقے ضرب المثل ہیں۔"

کچھ غور بھی کیا آپ نے کہ یہ تنوّع کی تمام مثالیں کس مقصد کے لیے پیش کی جا رہی ہیں؟ اس کا مقصد یہ ہے کہ جب اتنی زبانیں بول کر، اتنے مختلف لباس پہن کر، ایران میں ہندوستانی مٹھائی کھا کر، بہتّر فرقوں میں بٹ کر، اور عقائد میں یکسانیت سے محروم ہو کر بھی تم مسلمان رہے تو اب اگر تم گاندھی کیپ اور دھوتی پہن لو، تمہاری عورتیں سماجی خدمت (Social Service) کے لیے گھروں سے باہر نکل آئیں، تم نئی "ہندوستانی" زبان بولنی اور لکھنی شروع کر دو، مخلوط تعلیم گاہوں میں تمہارے لڑکے اور تمہاری لڑکیاں "جدید طرز تعلیم" حاصل کرنے لگیں، سیاسی، معاشرتی اور معاشی انقلاب کی جدید تحریکات تم میں پھیلنے لگیں تو اس میں کون سا مضائقہ ہو جائے گا؟ اسی مقصد کو چھپا کر ان الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے :۔

"اس اعتبار سے آج ہم ایک نئے اور زندہ تمدّن کی تعمیر میں مصروف ہیں۔ ہماری سیاسی اور سماجی جدوجہد اس نئے تمدّن کا پیش خیمہ ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ ہم اس نئی تاریخی منزل اور اس کے تقاضے سے باخبر ہوں۔"

اب آپ کو معلوم ہو گیا کہ یہ ساری دماغ سوزی اس سماجی انقلاب (Social Revolution) کے لیے مسلمانوں کو تیار کرنے کی خاطر کی گئی ہے جس کا نقشہ پنڈت جواہر لال نہرو کے خیالات میں آپ دیکھ چکے ہیں اور یہ دعوت پھیلائی کس اخبار کے ذریعہ سے جا رہی ہے ؟ اُس اخبار کے ذریعہ سے جو جمعیت علمائے ہند کا واحد ترجمان ہے۔ کیسے صحیح راستہ پر جا رہی ہے "یہ آزادی کی فوج!" شردھانند کی شدھی پر شورِ قیامت برپا تھا۔ جواہر لال کی شدھی شربت کے گھونٹوں کی طرح اُتاری جا رہی ہے۔

"آزادی کی فوج" اپنے مسلمان سپاہیوں سے جو خدمت لے رہی ہے اُن میں سے دو صاحبوں کے کارنامے آپ نے ملاحظہ فرما لیے۔ ایک صاحب نے اسلامی قومیت پر تیشہ چلایا۔ دوسرے صاحب نے اسلامی تہذیب پر ضرب لگائی۔ اب تیسرے سپاہی کا کارنامہ ملاحظہ ہو۔

اسی "شعبۂ اسلامیات" کے ایک ذمہ دار کارکن منظر رضوی[1] صاحب کا ایک طویل مضمون "مسٹر جناح کی کھوکھلی قیادت" کے عنوان سے اخبار "مدینہ" بجنور نے نومبر ۳۷ء کی کئی اشاعتوں میں درج کیا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں:

> "ہمارا دوسرا حربہ حکومت اور اس کے حاشیہ بردار زمینداروں، تعلقداروں، جاگیرداروں کی مال گزاری اور لگان بند کرنا ہے۔ لیکن یاد رہے کہ ان پایوں کو گراتے وقت ایک بہت بڑی کرانتی (انقلاب) مچے گی، بلوے اور فساد ہوں گے۔ اس میں خونریزیاں بھی ہوں گی، خون کی ندیاں بہیں گی اور سب کچھ ہو گا۔ اس وقت یہ جتنے زمیندار، سرمایہ دار،

---

[1] ابھی معلوم ہوا کہ یہ صاحب کانگریس سکریٹریٹ سے الگ کر دیے گئے۔ لیکن ان کی علیحدگی کا سبب یہ مضامین اور پالیسی نہیں بلکہ کچھ اور ہے۔ لہٰذا ان مضامین کی ذمہ داری سے کانگریس سکریٹریٹ اب بھی بری الذمہ نہیں ہے۔

پونجی اور کارخانوں کے مالک، تعلقوں اور جاگیرداروں کے آقا یہی راجہ محمود آباد، نواب چھتاری، سر سکندر حیات، راجہ نریندر ناتھ، گھنشام داس برلا، بھائی پرمانند، سیٹھ ڈالمیا جو مسلم ملت اور ہندو جاتی کے نعرے لگائے جاتے ہیں، اپنی اپنی غریب اور دکھی جنتا اور غریب اور فاقہ مست عوام کو چھوڑ کر برٹش سامراج کے ساتھ ہوں گے اور ان پر گولے اور بم برسائیں گے۔ دوسری طرف غریبوں کی طاقت ہوگی اور ان کی جیون ساتھی کانگریس۔"

ہماری آنے والی لڑائی دراصل امیری اور غریبی کی لڑائی ہوگی۔ اس میں ہندوستان بھر کے امیر چاہے وہ کسی مذہب اور فرقے کے کیوں نہ ہوں بدیسی سامراج کے ساتھ ہوں گے۔ اور وہ ہم غریبوں اور مفلسوں کو توڑنے اور تباہ کرنے کے لیے ہر ہتھیار کو استعمال کریں گے۔ پھر کسانوں اور مزدوروں کی جاگ سے امیروں کو، راجہ محمود آباد، نواب چھتاری اور سر سکندر جیسے لوگوں کو بہت بڑا خطرہ محسوس ہو رہا ہے۔ وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ زمانہ پلٹا کھانے کو ہے دولت اور امیری ہاتھ سے نکلنے کو ہے۔ امیروں کو نیچے آنا ہے، غریبوں کو اوپر جانا ہے۔ ان سب باتوں کے ڈر سے ہندو جاتی اور مسلم ملت کے یہ ہندو مسلم نام لیوا اپنے اپنے مذہب کے لوگوں کو سامراج مخالف تحریک سے ہٹا کر رکھنا چاہتے ہیں تاکہ یہ لوگ مل کر آخری لڑائی نہ لڑنے پائیں۔ اس لیے قرآن اور حدیث کی آیتیں اور وید اور شاستر کے اشلوک پڑھے جا رہے ہیں۔"

جنگ آزادی کی نوعیت کو اس طرح واضح کرنے کے بعد فاضل مضمون نگار فرماتے ہیں:-

"مسٹر جناح نے پکار کر کہا، "ہندوستان بھر کے مسلمانو! مل جاؤ۔" سوال یہ ہے کہ ہندوستان بھر کا مسلمان آپس میں کیوں ملے؟ اس اتحاد کی ضرورت کیا؟ اس کا مقصد کیا؟ جہاں تک توحید رسالت، مذہبی معتقدات، اور

مذہبی حرکت وعمل کا تعلق ہے وہ آپس میں ملے ہوتے ہیں۔ بالکل متحد ہیں۔ ان میں کوئی اختلاف نہیں۔ اور ہم مسٹر جناح کو یقین دلاتے ہیں کہ آئندہ بھی کوئی اختلاف نہ ہوگا۔ لیکن سیاسی اور اقتصادی اغراض ومفاد کے لیے مسلمانوں کا آپس میں ملنا ناممکن ہے۔ وہ ہرگز متحد نہیں ہو سکتے اور نہ ان کو متحد ہونا چاہیئے۔ مسلمانوں کے اغراض اور فائدے بالکل ایک سے نہیں ہیں۔"

ہندوستان میں امیر وغریب کے دو طبقے ہیں۔ امیروں کی غرض یہ ہے کہ امیری کے جتنے بھی وسائل ہیں ان پر ان لوگوں کا قبضہ رہے اور غریبوں کی محنت سے وہ فائدہ اٹھاتے رہیں۔ غریبوں کا فائدہ اس میں ہے کہ امیر کے وسیلے ان کے ہاتھ سے چھن جائیں اور ان کا انتظام اس طرح ہو کہ ملک سے غربت دور ہو۔ غربت کے دور کرنے کا سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہیں کہ دولت کے ان محدود پہلوؤں کو ان کے چنگل سے نکال لیا جائے۔ شخصی ملکیت کو ختم کیا جائے۔ یہ عام اور اصولی بات ہے ــــ اب ہندوستان کے آٹھ کروڑ مسلمانوں کا فائدہ کیا ہے؟ مسلمانوں میں بھی کچھ امیر ہیں اور کچھ غریب۔ سب کی ایک ہی حالت نہیں ہے۔ مسلمانوں کے تھوڑے سے لوگ امیر ہیں جو زیادہ سے زیادہ ایک کروڑ ہوں گے۔ سات کروڑ مسلمان محنت سے روزی حاصل کرتے ہیں۔ جب تک پونجی شاہی دولت کی پیداوار اور تقسیم کے طریقوں کو ہم متذکرہ بالا انقلابات سے غارت نہیں کرتے ان کے روزگار کا کوئی انتظام نہیں ہو سکتا۔ اس کے خلاف وہ ایک کروڑ مسلمان بھی ہیں جن کے پاس زمین، جائداد، کارخانے اور کانیں ہیں۔ ان کی جیبوں میں بڑی بڑی سرکاری ملازمتیں ہیں۔ وہ سکھ اور چین کی زندگی بسر کرتے ہیں اور مزے اڑاتے ہیں۔ اب ان سات کروڑ غریب مسلمانوں کو ایک کروڑ امیر مسلمانوں سے ملنے کے لیے کہا جاتا ہے۔"

"خیر تو عام مسلمانوں کے حقوق اور مفاد عام ہندوؤں سے جدا نہیں ہیں۔ خود مسلم ملت کے حقوق و مفاد باہم دگر متضاد اور مختلف ہیں۔ ان میں کوئی یگانگت نہیں۔ مختصر یہ کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے بھی ہمارے مفاد آپس ہی میں بالکل مختلف ہیں۔"

یہی منظر صاحب اپنے ایک دوسرے مضمون (مدینہ مورخہ ۱۳ دسمبر ۴۲ء) میں فرماتے ہیں:۔

"غریبوں، مفلسوں، اور غلاموں کا کوئی مذہب اور کوئی تمدن نہیں۔ اس کا سب سے بڑا مذہب روٹی کا ایک ٹکڑا ہے۔ اس کا سب سے بڑا تمدن ایک پھٹا پرانا کپڑا ہے۔ اس کا سب سے بڑا ایمان موجودہ افلاس اور نکبت سے چھٹکارا پا لینا ہے۔ وہی روٹی اور کپڑا جس کے لیے وہ چوری کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ آج افلاس اور غلامی کی دنیا میں اس کا کوئی مذہب اور کوئی تمدن نہیں۔۔۔۔۔۔۔ اس پیٹ کے لیے ایسے انقلاب اور کرانتی کرنی پڑے گی۔"

چند اور فقرے اسی مضمون کے ملاحظہ ہوں:۔

"اس وقت ہندوستان میں دو ہی سوال اس اعتبار سے ہیں۔ سرمایہ داری کا استحصال اور غلامی یا ترقی اشتراکیت اور آزادی۔ بیچ کی کوئی راہ نہیں۔ ہمارا کوئی درمیانی مسلک نہیں ہو سکتا۔"

"اسی ردِ عمل کا نتیجہ روس کی نئی حکومت ہے، جو زمین پر ایک جنت ہے۔ وہاں بے روزگاری، بھوک، جہالت اور تنگ دستی کا نام نہیں۔"

"مذہب اور عقائد کو ان باتوں سے کیا خطرہ؟ مذہب تو ہمیشہ اگر اس میں اخلاقی اور روحانی طاقت رہی ہے، زندہ تابندہ اور پائندہ ہی رہا ہے۔ مذہب کی سب سے بڑی فکر ہمارے فقیہوں

اور محدثوں کو ہو سکتی ہے نہ کہ عیاش رئیسوں کو۔ سو ہمارے فقیہہ اور محدث اور علماء آج ہی نہیں بلکہ اسی وقت سے، جب سے قومی تحریک کی شروعات ہوئی ہے، ہمارے ساتھ رہے ہیں۔ لیکن آج ہمارا نصب العین مذہبی نہیں ہے، بلکہ محض اقتصادی اور سیاسی ہے۔ ہمیں تو آج کے حالات میں رہ کر، آج کے حالات سے اپنی قیادت قائم کرنی ہے۔ علماء کا ایک طبقہ ایک ہی چیز کو حرام قرار دیتا ہے اور دوسرا حلال۔ آج انہی کا ایک طبقہ تحریک کانگریس کو شجر ممنوعہ سمجھتا ہے اور دوسرا خیر و برکت کا مجموعہ۔ اور پھر اس کا کیا یقین ہے کہ جب ہم ایک ہی سماج اور نئے نظام معاش کی تاسیس کرنے لگیں گے، جب ہم شخصی ملکیت کو خارج اور ختم کرکے ملک کی دولت اور اس کی پیداوار کو نئے طریقوں پر تقسیم کرنے لگیں گے، تو اس وقت بھی یہ طبقہ ہمارے ساتھ ہوگا[1]۔"

۱۲ دسمبر ہی کے "مدینہ" میں پنجاب پراونشل مسلم ماس کانٹیکٹ کمیٹی کے سکریٹری منشی احمد دین صاحب کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں:-

"ہم تو دیانتداری کیساتھ یہ سمجھ چکے ہیں کہ ہندوستان کے آنے والے انقلاب میں جو جنگ آزادی لڑی جائے گی وہ محنت اور سرمایہ، غریب اور امیر، بالفاظ دیگر ظالم اور مظلوم کی جنگ ہوگی، جس میں ہندو اور مسلمان مظلوم ایک طرف ہوں گے۔ گویا اس لڑائی میں ہندو اور مسلمان عوام دونوں برابر ہوں گے۔ لہذا فرقہ وارانہ جنگ، طبقہ وارانہ جنگ میں تبدیل ہوگی۔"

ان طویل اقتباسات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ آزادی کی فوج کے مسلمان

---

[1] خط کشیدہ فقرے علمائے کرام کے لیے خاص طور پر غور کے لائق ہیں۔

سپاہی کس وفاداری کے ساتھ اس مشن کو مسلمانوں میں پھیلا رہے ہیں جو ان کے غیر مسلم لیڈروں نے ان کے سپرد کیا ہے۔

حصولِ آزادی کا طریقہ

پچھلے دونوں ابواب پر تبصرہ کرنے سے پہلے میں ناظرین کو اُن تنقیحات کی طرف دوبارہ توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں جو میں نے اِس سلسلہ کے تمہیدی مباحث میں قائم کی تھیں۔ ان تنقیحات میں سے اوّلین تنقیح یہ تھی کہ :-

"ہمیں جنگِ آزادی میں شریک ہونے سے پہلے یہ دریافت کرنا چاہیئے کہ آزادی حاصل کرنے کے لیے طریقہ کون سا اختیار کیا جا رہا ہے۔ اگر تحقیق سے معلوم ہو کہ حصولِ آزادی کا وہ طریقہ اختیار کیا جا رہا ہے جو ہماری تہذیب اور ہمارے نظامِ اجتماعی کے اصولوں سے متصادم ہوتا ہو، تو ہم اس کے ساتھ تعاون نہیں کر سکتے۔"

اس تنقیح کو پیشِ نظر رکھ کر دیکھیے کہ کانگریس کے مسلم اور غیر مسلم لیڈروں اور کارکنوں کی جو تحریریں پچھلے دو ابواب میں نقل کی گئی ہیں ان سے حصولِ آزادی کے کس راستے کا نشان ملتا ہے۔

اسلامی قومیت اور تہذیب پر حملہ

ان کے نزدیک ہندوستان کو آزاد کرانے کے لیے ضروری ہے کہ اس ملک کی

تمام قومیتوں اور قومی امتیازات کو مٹا کر پوری آبادی کو ایک قوم بنا دیا جائے۔

اس غرض کے لیے وہ سب سے پہلے اسلامی قومیت پر حملہ کرتے ہیں کیونکہ جب تک مسلمانوں کے ذہن میں یہ خیال موجود ہے کہ پیروانِ اسلام ایک قوم ہیں اور منکرین اسلام دوسری قوم، اس وقت تک آٹھ کروڑ کی اس عظیم الشان آبادی کا ہندوستانی قومیت میں تحلیل ہو جانا محال ہے۔ اسی لیے تمام قوم پرست یک زبان ہو کر کہتے ہیں کہ "مسلمان" کسی قوم کا نام نہیں ہے، اور اسی لیے ان کی تعلیم یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان اپنے آپ کو "مسلم" کہنے کے بجائے "ہندی" کہیں۔

ان کا دوسرا حملہ اسلامی تہذیب و تمدن پر ہے۔ ہندوستان کی آبادی ایک قوم نہیں بن سکتی جب تک کہ سب ایک تہذیب اور ایک تمدن نہ اختیار کر لیں۔ عقائد، جذبات و احساسات، لباس، طرزِ زندگی، زبان، ادب اور قوانین معاشرت و تمدن کے لحاظ سے جب تک مسلمانوں میں یک جہتی باقی ہے اس وقت تک بہرحال وہ اپنے آپ کو ایک قوم ہی سمجھتے رہیں گے اور جب تک ان امور میں وہ ہندوستان کے دوسرے باشندوں سے مختلف ہیں، اس وقت تک بہرحال ان کا قومی تشخص دوسروں سے الگ ہی رہے گا۔ اس علیحدگی کو مٹانے کے لیے مسلمانوں میں پورے زور شور کے ساتھ یہ تبلیغ کی جا رہی ہے کہ ان کی نہ کوئی خاص تہذیب ہے اور نہ کوئی مخصوص تمدن۔ "زمانے کے شدید انقلاب انگیز تقاضوں" سے جو تہذیب پیدا ہو رہی ہے، اور ہندوستان کے دوسرے باشندوں میں جو تمدن نشو و نما پا رہا ہے، اسے ان کو بے تکلف قبول کرنا چاہیے تاکہ وہ سب کے ساتھ ہم رنگ ہو جائیں۔

اسلام کے نظام اجتماعی پر حملہ

ان کا تیسرا حملہ اسلام کے نظامِ اجتماعی پر ہے۔ مسلمانوں میں اشتراکیت کی تبلیغ جو کی جا رہی ہے اس کا مقصد در اصل یہی ہے کہ صرف اسی ذریعہ سے اسلامی سوسائٹی کے نظام کو پارہ پارہ کیا جا سکتا ہے اور مسلمانوں کی جماعت کے افراد کو ایک دوسرے سے الگ کر کے فرداً فرداً غیر مسلم آبادی میں جذب کرنے کے لیے اس کے سوا کوئی

دوسری تدبیر نہیں ہے۔ کانگریس کے متعلق یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو چکی ہے کہ اس کا نصب العین اشتراکی نہیں ہے۔ نہ وہ سرمایہ داروں سے بگاڑنا چاہتی ہے نہ سرمایہ داری نظام کو ختم کرنا چاہتی ہے۔ نہ اُس سماجی (تمدنی) انقلاب کی حامی ہے جس کا ذکر پنڈت جواہر لال اور بابو سوبھاش چندر بوس بار بار کیا کرتے ہیں۔

ہری پورہ کانگریس میں جواہر لال کے سامنے اور سوباش چندر بوس کی صدارت میں سردار ولبھ بھائی پٹیل نے سوشلسٹ جماعت کو بُری طرح ڈانٹا تھا اور یہ الفاظ کہے تھے کہ:۔

"تم کانگریس میں دستِ راست اور دستِ چپ کی جماعتیں پیدا کرنے کے ذمہ دار ہو حالانکہ کانگریس ہمیشہ سے ایک وحدت رہی ہے۔ ہم برابر دو سال سے تمہارے وجود کو برداشت کر رہے ہیں، مگر وقت آ رہا ہے جب ہم تمہیں برداشت نہ کر سکیں گے۔"

(ٹائمز آف انڈیا مورخہ ۲۲ فروری ۳۸ء)

اس زجر و توبیخ پر ہندوستانی اشتراکیت کے ان دونوں اُقنوموں[1] میں سے ایک نے بھی دم نہ مارا۔ کانپور، احمد آباد اور دوسرے مقامات پر مزدوروں کا سر خود کانگریسی وزارتیں ہی کچلتی رہی ہیں۔ مدراس اور صوبہ سرحد اور دوسرے صوبوں میں جہاں کہیں اشتراکیوں نے چادر سے پاؤں نکالا، وہاں کانگریسی حکومتوں ہی نے ان کی سرکوبی کی ہے۔ ابھی چند ہی روز ہوئے ہیں کہ حکومت مدراس نے اشتراکیت کی تبلیغ کے خلاف ایک کمیونکے شائع کیا ہے جس میں وہ لکھتی ہے کہ:۔

"چند پمفلٹ جو ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی کی طرف سے شائع کیے جا رہے ہیں، حال میں حکومت کے ہاتھ آئے ہیں۔ ان

---

[1] "اقنوم" مسیحی دینیات کی ایک اصطلاح ہے۔ باپ بیٹے اور روح القدس کو اقانیم ثلاثہ کہتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک "اقنوم" ہے۔ مرتب۔

سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پارٹی حد سے گزرتی جارہی ہے اور اس
ملک میں ابتری پھیلانا چاہتی ہے۔ اس لیے حکومت اپنا فرض سمجھتی ہے
کہ پبلک کو اس سے متنبہ کر دے تا کہ عام باشندگان ملک نادانستگی میں
ایسی تحریک سے متاثر نہ ہو جائیں جس کا فلسفہ اور طریق کار بالکلیہ اس ملک
کی تہذیب اور روایات کے خلاف ہے "۔
اس کے بعد اس کمیونکے میں اشتراکی پمفلٹوں کا خلاصہ دیا گیا ہے جس کے یہ الفاظ
خاص طور پر غور طلب ہیں:۔

"محنت کش طبقوں کی انقلابی فوج، یعنی ہندوستان کی کمیونسٹ
پارٹی اس ملک میں طبقہ وارانہ جنگ برپا کرے گی اور قومی انقلابی ہڑتال کا
اعلان کرے گی۔ کاریگر اپنے اوزار رکھ دیں گے۔ دماغی کام کرنے والے
دفتروں سے نکل آئیں گے۔ طلبہ مدرسوں سے سڑکوں پر آجائیں گے۔
کسان مال گزاری اور لگان دینے سے انکار کر دیں گے۔ ملیں کھڑی ہو
جائیں گی، کارخانے اور ریل اور بجلی گھر بند ہو جائیں گے......"
(ملاحظہ ہو اخبار ہریجن مورخہ ۲۰ اگست ۳۸ء)

یہ ٹھیک وہی خیالات ہیں جو کانگریس سکریٹریٹ کے دفتر سے منظر رضوی
صاحب شائع کر چکے ہیں۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ جب یہ خیالات مسلمانوں میں پھیلائے
جاتے ہیں تو ان کو جائز رکھا جاتا ہے اور جب حقیقت میں ملک کے اندر اشتراکی انقلاب
برپا کرنے کے لیے ان کی اشاعت کی جاتی ہے تو کانگریسی حکومت ان کو ہندوستان
کی تہذیب اور روایات کے منافی قرار دیتی ہے اور ان کے خلاف تنبیہی کمیونکے
نشر کرنا ضروری سمجھتی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اشتراکیت فی الواقع کانگریس
کی سرکاری پالیسی نہیں ہے، بلکہ خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں میں اس مسلک کو صرف
اس غرض سے پھیلایا جارہا ہے کہ اسلامی سوسائٹی کو درہم برہم کرنے کی اس کے سوا
کوئی تدبیر نہیں۔ حال میں بنگال کے کانگریسی مسلمانوں کا اجتماع بابو سوباش چندر بوس کے

زیر صدارت منعقد ہوا تھا۔ زیر بحث یہ سوال تھا کہ عامۂ مسلمین میں کانگریس کے خیالات اور اصول کامیابی کے ساتھ کس طرح پھیلائے جا سکتے ہیں اور جو مشکلات اِس راہ میں حائل ہیں ان کا حل کیا ہے۔ طویل بحث و تمحیص کے بعد جو بات باتفاق طے ہوئی وہ یہ تھی کہ:-

"مسلمانوں میں کانگریس کو مقبول بنانے کے لیے ایک معاشی پروگرام پیش کرنا ناگزیر ہے۔ اور پروگرام ایسا ہونا چاہیے جو محنت پیشہ عوام کو اپیل کر سکے۔" (ذیشیل کال۔ مجریہ ۱۲ اگست ۳۸ء)

"معاشی پروگرام" کے لفظ کو خاص طور پر نوٹ کیجیے۔ اس چھوٹے سے مرکب لفظ میں وہ تمام معانی بھرے ہوئے ہیں جن کی تشریح آپ پنڈت جواہر لال نہرو اور منظر رضوی اور کامریڈ احمد دین صاحبان کی زبانوں سے سن چکے ہیں۔ یہ لوگ خوب جانتے ہیں کہ عام مسلمان خواہ کتنے ہی جاہل ہوں، مگر پھر بھی انہیں اسلام سے گہری محبت و عقیدت ہے، اور کوئی شخص اپنی جان کو خطرے میں ڈالے بغیر ان سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ تم اسلام چھوڑ دو۔ اس لیے ان میں علانیہ الحاد و بے دینی کی تبلیغ کرنا کسی طرح ممکن نہیں۔ البتہ اگر ان کے سامنے "روٹی" پیش کی جائے اور اس میں بے دینی کو لپیٹ کر رکھ دیا جائے تو یہ بھوک کے مارے ہوئے غریب لوگ لپک کر اسے لے لیں گے اور بے تکلف حلق کے نیچے اُتار جائیں گے۔ ادھر سے مطمئن ہو جانے کے بعد پھر وہ ہر زہر کو خوشی سے ہضم کر سکتے ہیں۔

یہی کچھ سمجھ کر یہ لوگ خستہ حال مسلمانوں کے دلوں پر قبضہ کرنے کے لیے پیٹ کی طرف سے راستہ پیدا کر رہے ہیں جو بھوکے آدمی کے جسم کا سب سے زیادہ نازک حصّہ ہوتا ہے۔ یہ ان سے کہتے ہیں کہ "آؤ ہم وہ طریقہ بتائیں جس سے امیری اور غریبی مٹتی ہے اور آسودہ حالی آتی ہے" پھر جب بیچارہ بھوکا مسلمان دو روٹیوں کی اُمید پر ان کی طرف دوڑتا ہے تو یہ اسے خدا پرستی کے بجائے شکم پرستی کے مذہب کی تلقین کرتے ہیں اور اس سے کہتے ہیں کہ "غریب اور مفلس کا کوئی مذہب اور کوئی تمدّن نہیں۔ اس

کا سب سے بڑا مذہب روٹی کا ایک ٹکڑا ہے۔ اس کا سب سے بڑا تمدن ایک پھٹا پرانا کرتہ ہے۔ اس کا سب سے بڑا ایمان اس موجودہ افلاس اور نکبت سے چھٹکارا پا لینا ہے۔" مذہب اشتراکیت کا یہ ابتدائی سبق جس آن اِس بیچارے جاہل مسلمان کو دیا جاتا ہے، اسی آن اسے یہ پٹی بھی پڑھائی جاتی ہے کہ "مذہب اور عقائد کو ان باتوں سے کیا خطرہ؟ کیا تعلق؟ مذہب تو ہمیشہ، اگر اس میں اخلاقی اور روحانی طاقت رہی ہے، زندہ تابندہ اور پائندہ ہی رہا ہے۔" اور پھر مزید ضمانت کے طور پر اس سے یہ بھی کہہ دیا جاتا ہے کہ "بھائی مذہب کی سب سے بڑی فکر تو فقیہوں اور محدثوں ہی کو ہو سکتی ہے، سو دیکھ لو کہ یہ فقیہ اور محدّث اور علماء ہمارے ساتھ ہیں۔"

روٹی کو دین اور روٹی ہی کو ایمان قرار دینے کے بعد یہ آگے بڑھتے ہیں اور ان پڑھ مفلس مسلمان سے کہتے ہیں کہ دیکھو میاں، تمہارے اصلی بھائی وہ غیر مسلم عوام ہیں جو تمہاری ہی طرح بھوک اور افلاس میں مبتلا ہیں۔ تمہیں جو کچھ ملے گا انہی کے ساتھ مل کر جدوجہد کرنے سے ملے گا۔ اور تمہارے اصلی دشمن وہ مسلمان ہیں جو کسی زمین یا مکان یا کارخانے کے مالک ہیں یا جن کے پاس تم سے زیادہ وسائل معیشت موجود ہیں۔ تمہیں جو کچھ مل سکتا ہے، انہی سے لڑ کر مل سکتا ہے۔ پس آؤ اپنے غیر مسلم بھائیوں کے ساتھ مل کر اپنے ان مسلمان دشمنوں سے لڑو۔

کانگریس کے طریقِ کار کے نتائج

اس تبلیغ کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اس کا پہلا نتیجہ یہ ہوگا کہ جوں جوں یہ خیالات عام مسلمانوں کے دلوں میں گھر کریں گے، اسلامی سوسائٹی پارہ پارہ ہوتی چلی جائے گی۔ اسلام میں سوسائٹی کا نظام دین کی وحدت پر قائم ہے۔ تمام وہ لوگ جو توحید اور رسالتِ محمدی کے قائل ہیں، ایک ہی ہیئتِ اجتماعی میں شامل ہو جاتے ہیں۔ خواہ ان میں سے ایک عثمانؓ غنی کی طرح سرمایہ دار ہو اور دوسرا ابوذرؓ غفاری کی طرح قلاش (رضی اللہ عنہما)۔ اسی دینی وحدت کی بنا پر ان میں نماز کی جماعت سے لے کر شادی بیاہ تک ہر قسم کے معاشرتی اور تمدنی تعلقات قائم ہوتے ہیں، اور انہی تعلقات سے یہ سب مل کر ایک

سوسائٹی بناتے ہیں۔ اس کے برعکس اشتراکی تبلیغ ان کو معاشی حیثیت سے الگ الگ طبقوں میں تقسیم کرتی ہے اور ان کو یہ سکھاتی ہے کہ ایک معاشی طبقہ کا مسلمان دوسرے معاشی طبقہ کے مسلمان سے لڑے اور اس کو اپنا دشمن سمجھے۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد یہ ایک سوسائٹی کے ممبر نہیں رہ سکتے۔ طبقہ وارانہ جنگ ان کے درمیان صرف معاشرتی تعلقات ہی کو منقطع نہ کرے گی بلکہ خالص دینی حرکت و عمل میں بھی ان کا آپس میں ملنا غیر ممکن ہو جائے گا۔ یہ کسی طرح ممکن ہی نہیں کہ جن کے درمیان روٹی کی جنگ چھڑ گئی ہو وہ ایک دوسرے کے ساتھ مسجدوں میں جمع ہوں یا وہ مال دار مسلمان اپنے اس غریب مسلمان بھائی کو زکوٰۃ دے جس کے متعلق اسے یقین ہے کہ وہ اس کا گھر لوٹنے کی فکر میں لگا ہوا ہے۔ اسی طرح یہ بھی ناممکن ہے کہ جو لوگ معاشی اغراض کے لیے ایک دوسرے کے دشمن بن چکے ہوں اور جن کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف بغض اور حسد کی آگ بھڑک چکی ہو وہ ایک دوسرے کو اپنا بھائی سمجھیں اور ان کے درمیان انما المومنون اخوۃ کا رشتہ قائم رہ جائے۔

اس کا دوسرا نتیجہ یہ ہوگا کہ مسلمانوں کے عوام مذہب سے قطعی بیگانہ ہونے چلے جائیں گے۔ معاشی طبقات کی جنگ عامۂ مسلمین کو صرف بڑے تعلقہ داروں، جاگیرداروں اور لکھ پتیوں ہی سے الگ نہ کرے گی بلکہ متوسط طبقہ کے ان تمام مسلمانوں سے بھی کاٹ دے گی جو نسبتۂ خوش حال ہیں۔ منظر رضوی صاحب کے اپنے اندازے کے مطابق متوسط طبقہ کے مسلمان تقریباً ایک کروڑ ہیں اور عام مفلس مسلمان سات کروڑ۔ طبقہ داری جنگ کے معنی ان ایک کروڑ مسلمانوں سے سات کروڑ مسلمانوں کے برسر پیکار ہو جانے کے ہیں۔ اب یہ ظاہر ہے کہ اپنے دین کا علم، اپنی تہذیب کا شعور، احکام شرعیہ کی واقفیت، جو کچھ بھی ہے اسی تعلیم یافتہ متوسط طبقہ ہی میں پائی جاتی ہے۔ یہی طبقہ اس ملک میں اسلامی تہذیب کو کسی نہ کسی حد تک سنبھالے ہوئے ہے۔ عوام انہی سے دین سیکھتے ہیں، انہی سے احکام معلوم کرتے ہیں، اور انہی کے اثر سے تھوڑے یا بہت اسلامی نظام تہذیب و تمدن کی گرفت میں رہتے

ہیں۔ جب طبقہ واری جنگ کی بدولت سات کروڑ عام مسلمان ان ایک کروڑ متوسط طبقہ کے مسلمانوں سے کٹ کر الگ ہو جائیں گے تو وہ اسلام سے بالکل بے گانہ ہو کر رہ جائیں گے ، خود ان کے پاس کوئی علم نہ ہوگا - اور جب متوسط طبقہ کے لوگ ان کو دین کے احکام سنائیں گے تو اشتراکیت کا مبلغ فوراً پکار کر کہے گا کہ ہوشیار! پھر وہی مذہب کی افیون تمہیں کھلائی جا رہی ہے ، اور پھر اسی "منظم مذہب" کے پھندے میں تم کو پھانسا جا رہا ہے جو " اندھے یقین اور ترقی دشمنی کا بے دلیل عقیدت اور تعصب کا ، توہم پرستی اور لوگوں سے فائدہ اٹھانے کا قائم شدہ حقوق اور مستقل اغراض رکھنے والوں کا حامی ہے "

اس کا آخری اور فیصلہ کن نتیجہ یہ ہوگا کہ عامۂ مسلمین جب اسلامی قومیت کے تخیل سے خالی الذہن ہو کر فرد فرد بن جائیں گے ، اور جب وہ اسلامی تہذیب و تمدن کو ایک لفظ بے معنی سمجھ کر اس غیر اسلامی تہذیب و تمدن کو قبول کرتے چلے جائیں گے جو " زمانے کے شدید انقلاب انگیز تقاضوں " سے پیدا ہو رہا ہے ، اور جب تعلیمیافتہ متوسط طبقہ کے مسلمانوں سے کٹ کر وہ اپنے معاشی طبقہ کے غیر مسلموں میں جا ملیں گے تو خود بخود ان کی شدھی ہو جائے گی اور وہ آہستہ آہستہ غیر اسلامی قومیت میں اس طرح جذب ہو جائیں گے جیسے نمک کی ڈلی پانی میں گھل گھل کر آخر کار غائب ہو جاتی ہے ۔ رہے متوسط طبقہ کے مٹھی بھر مسلمان جو اسلام کے خلاف کسی سماجی اور معاشی نظام کو قبول کرنے سے انکار کریں گے تو ان کے حق میں پنڈت جواہر لال نے پہلے ہی فیصلہ کر دیا ہے کہ جو " سیاسی یا تمدنی ادارے اس تبدیلی کی راہ میں حائل ہوں انہیں مٹا دینا چاہیئے " اور یہ کہ " اکثریت نظام تمدن کو بدلنے کی خواہش مند ہو تو ضروری نہیں کہ اقلیت کو اس پر راضی کرنے کی کوشش کی جائے بلکہ اس پر مؤثر دباؤ ڈالنا چاہیئے ، اور جبر و تشدد سے کام لینا چاہیئے " اور یہ کہ " جمہوری حکومت کے معنی ہی یہ ہیں کہ اکثریت ، اقلیت کو ڈرا کر اور دھمکا کر اپنے قابو میں رکھے "

یہ ہے وہ راستہ جو آزادی حاصل کرنے کے لیے قوم پرستوں نے تجویز کیا ہے اور جس پر وہ عملاً چل رہے ہیں۔ ان کے نزدیک آزادی حاصل نہیں ہو سکتی جب تک کہ ملک کی پوری آبادی کو ایک قوم نہ بنا دیا جائے اور ملک کی پوری آبادی کو ایک قوم نہیں بنایا جا سکتا جب تک کہ مسلمان قوم کا وجود کلیۃً ہندوستانی قومیت میں تحلیل نہ ہو جائے۔ لامحالہ اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ حصولِ آزادی کے اس طریقہ کو اختیار کرنے سے مسلمان قوم پہلے ختم ہو گی اور آزادی اس کے بعد حاصل ہو گی۔ اب میں علمائے دین اور مفتیانِ امت سے اور ہر اس مسلمان سے جو اسلام اور قوم پرستی کا بیک وقت دم بھرتا ہے، دریافت کرتا ہوں کہ کیا اسلام اور یہ قوم پرستی صریحاً ایک دوسرے کی ضد نہیں ہیں؟ اور کیا اس طریقہ سے آزادی حاصل کرنا قرآن، حدیث، عقل، غرض کسی چیز کی رُو سے بھی مسلمانوں کا فرض ہے؟ بلکہ فرض کیا معنی میں پوچھتا ہوں کہ آزادی کے لیے قومی خودکشی کا یہ طریقہ اختیار کرنا کسی مسلمان کے لیے جائز بھی ہے؟ اور کیا اس طریقہ سے آزادی کی جنگ لڑنے والوں کے ساتھ موالات کرنا صریح تعلیماتِ قرآنی کے خلاف نہیں ہے؟

میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور اب پھر کہتا ہوں کہ یہ تحریک قطعی طور پر "شدھی" کی تحریک ہے۔ اس میں اور شردھانند والی شدھی میں حقیقت اور نتیجہ کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں۔ مسلمان جب اسلام سے منحرف اور اسلامی جماعت سے خارج ہو گیا تو خواہ وہ ہندو مت میں جائے یا بے مت ہو جائے، دونوں صورتیں یکساں ہیں۔ البتہ دونوں شدھیوں میں فرق صرف یہ ہے کہ ایک کھلی ہوئی شدھی تھی، اور دوسری دام ہمرنگِ زمین کا حکم رکھتی ہے۔ اُس کے ساتھ کوئی مسلمان تعاون کا نام بھی نہ لے سکتا تھا، اور اس کی فوج میں فقیہ اور محدث اور مفسر تک سرگرم عمل نظر آ رہے ہیں۔ اِس لحاظ سے یہ تحریک اپنی پیش رو تحریک سے ہزار درجہ زیادہ خطرناک ہے۔

پھر جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، اس طریقہ سے جو آزادی حاصل ہو گی وہ ان

آٹھ کروڑ یا سات کروڑ جسموں کے لیے تو آزادی ہو سکتی ہے جو مسلمانوں کی نسل سے پیدا ہوئے ہیں۔ مگر اس قوم کے لیے آزادی نہیں ہو سکتی جو "مسلمان" ہے۔ مسلمانوں کے لیے مسلمان ہونے کی حیثیت سے وہ آزادی نہ ہو گی بلکہ ان کی قومیت، ان کی تہذیب اور ان کے نظامِ اجتماعی کی کامل بربادی اور اُس کام کی تکمیل ہو گی جس کو انگریزی امپریلیزم نے ڈیڑھ سو برس پہلے شروع کیا تھا۔ حقیقت میں یہ ایک ایسا حربہ ہے جو انگریزی سلطنت سے پہلے اسلام پر حملہ کرتا ہے اور اس سے پہلے اس کو ختم کر دینا چاہتا ہے۔ مَیں تصور نہیں کر سکتا کہ کوئی صاحبِ عقل مسلمان جو مسلمان رہنا چاہتا ہو اس حربے کو خود اپنے دین اور اپنی قوم پر چلانے میں کس طرح حصّہ لے سکتا ہے۔

طُرفہ ماجرا یہ ہے کہ وہی جواہر لال اور وہی ان کے قوم پرست ساتھی جنہوں نے حصولِ آزادی کے اس طریقہ کو کھُلم کھُلا اختیار کیا ہے، ہم مسلمانوں کو آزادی کی مخالفت اور سامراج پرستی کا طعنہ بھی دے رہے ہیں کیونکہ ہم اپنی قبر کھودنے میں ان کا ہاتھ بٹانے سے انکار کرتے ہیں۔ حالانکہ درحقیقت آزادی کے دشمن اور سامراج پرستی کے مجرم وہ خود ہیں۔ انہوں نے خود ہی آزادی حاصل کرنے اور سامراج سے لڑنے کا وہ طریقہ اختیار کیا ہے جس کو ہندوستان کی ⅓ آبادی کسی طرح قبول کر ہی نہیں سکتی۔ اس غلط اور اختلافی طریقہ سے وہ خود مُلک کی آزادی کو دُور پھینک رہے ہیں اور سامراج کی مدد کر رہے ہیں۔ اور پھر طعنہ ہم کو دیتے ہیں کہ تم آزادی کی جنگ سے الگ رہ کر برطانوی سامراج کو مدد دے رہے ہو! اگر ان کے پاس عقل ہے تو انہیں سمجھنا چاہیئے کہ کوئی جماعت اپنے جماعتی وجود کو فنا کرنے کے لیے آزادی نہیں چاہا کرتی اور نہیں چاہ سکتی۔ آزادی کی ضرورت قومی زندگی کے لیے ہوتی ہے نہ کہ قومی موت کے لیے۔ لہٰذا آزادی کی خاطر ہر چیز قربان کی جا سکتی ہے مگر قومی زندگی قربان نہیں کی جا سکتی۔ تم جب کسی قوم کے سامنے آزادی کا وہ راستہ پیش کرتے ہو جس میں اس کی قومیت کی موت ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تم خود اس کو مجبور کر رہے ہو کہ وہ

تمہاری تحریکِ آزادی سے لڑے۔ اس کا یہ لڑنا عین مقتضائے فطرت ہے۔ خواہ دنیا کی کوئی قوم بھی ہو، ایسی حالت میں بہرحال لڑے گی۔ اور اگر اس لڑنے کا یہ نتیجہ ہو کہ بیرونی اقتدار کو اس سے فائدہ پہنچے تو اس کی کچھ پروا نہ کرے گی۔ اِس لیے کہ بیرونی اقتدار کا نقصان بھی زیادہ سے زیادہ وہی ہو سکتا ہے جو اس نام نہاد تحریکِ آزادی کا ہے، یعنی اس کی قومیّت کی موت۔ پھر ایک موت اور دوسری موت میں آخر وجہ ترجیح کیا ہے؟

جنگِ آزادی کا مطمحِ نظر

اب ہمیں اپنی دوسری تنقیح کی طرف توجہ کرنی چاہیے، اور وہ یہ کہ جس آزادی کے لیے یہ قوم پرست حضرات لڑ رہے ہیں اس کی نوعیت کیا ہے، اور کیا مسلمان ہونے کی حیثیت سے اِس نوعیت کی آزادی کسی درجہ میں بھی ہمارے لیے مطلوب یا مفید ہو سکتی ہے؟ اس تنقیح کو ہم دو حصّوں میں تقسیم کریں گے۔ ایک یہ کہ اس آزادی کا مطمحِ نظر کیا ہے؟ یعنی موجودہ حکومت کو ہٹا کر یہ کس قسم کی حکومت کن اصولوں پر قائم کرنا چاہتی ہے۔ دوسرے یہ کہ خود اس جنگِ آزادی کی نوعیت کیا ہے؟ یعنی یہ انقلابی ذرائع سے کامل انقلاب چاہتی ہے یا نیم انقلابی نیم دستوری ذرائع سے بتدریج ایک نظامِ حکومت کو گرانا اور دوسرا نظامِ حکومت تعمیر کرنا چاہتی ہے۔ پہلے حصّہ کو ہم مقدم رکھیں گے اور دوسرے حصّے سے آخر میں بحث کریں گے۔

جو لوگ اِس وقت آزادیٔ وطن کے علمبردار بنے ہوئے ہیں ان کے مطمحِ نظر کو سمجھنے کے لیے تمہید کے طور پر ایک مختصر تاریخی بیان ضروری ہے تاکہ یہ معلوم کیا جا سکے کہ ان کے تخیلات کا اصلی ماخذ اور ان کے جذباتِ حریت طلبی کا اصلی محرک کیا ہے۔

یہ ہر شخص جانتا ہے کہ ہندوستان کی موجودہ وطنی تحریک براہِ راست انگریزی تعلیم

سے پیدا ہوئی ہے۔ مخالف اور موافق دونوں اِس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں۔ انگریزی حکومت کی قائم کی ہوئی یونیورسٹیوں میں ہندوستانیوں نے تعلیم حاصل کی۔ وہاں یہ تاریخ، سیاسیات، اور معاشیات سے روشناس ہوئے۔ انگریزی زبان کے توسط سے مغربی افکار ان تک پہنچے اور ان میں آہستہ آہستہ وہ سیاسی شعور پیدا ہوا جو حکومت خود اختیاری کی خواہش کا مورث ہوا کرتا ہے۔ تقریباً پچاس سال تک ان جدید اثرات کے تحت پرورش پانے کے بعد جب ان کے اندر سیاسی اختیارات حاصل کرنے کا جذبہ اُبھرنے لگا، تو خود ان کے انگریز مربّیوں ہی نے اس جذبہ کے لیے خروج کا راستہ پیدا کیا۔ پہلا شخص جس کے دماغ میں "انڈین نیشنل کانگریس" قائم کرنے کا خیال آیا وہ ایک انگریز مسٹر ہیوم (Hume) تھا۔ ابتداءً اس کے پیشِ نظر محض ایک ایسی انجمن بنانے کا تصور تھا جس میں ہندوستان کے سیاسی دماغ مجتمع ہو کر تبادلۂ خیالات کیا کریں اور اِس طرح حکمرانوں کو اپنے محکوموں کے داعیات سے واقف ہونے کا موقع ملتا رہے۔ اِس غرض کے لیے اس کی تجویز تھی کہ جس صوبہ میں اِس انجمن کا اجتماع ہو وہاں کا گورنر اس کی صدارت کرے۔ مگر لارڈ ڈفرن نے، جو اس وقت ہندوستان کا وائسرائے تھا اُس کے خیالات کو بدل کر ایک دُوسری راہ پر ڈال دیا۔ اس نے یہ رائے دی کہ:-

"ہندوستان میں ایک ایسی جماعت ہونی چاہیئے جس کی حیثیت یہاں وہی ہو جو انگلستان میں حزب الاختلاف (Opposition) کی ہے تاکہ وہ حکومت پر نکتہ چینی کر کے اس کے نقائص کو دُور کرتی رہے۔ نیز اس جماعت کو مستقل بالذات ہونا چاہیئے۔ گورنر کی صدارت اس کی آزادیِ رائے میں خلل انداز ہو گی۔"

انگلستان میں لارڈ رپن، لارڈ ڈلہوزی، سرجیمز کیرڈ (Caird)، جان برائٹ، مسٹر ریڈ، مسٹر سلیگ (Slagg)، اور دوسرے سیاسی مبصرین نے بھی لارڈ ڈفرن کی اِس رائے کو پسند کیا، اور اس طرح ۱۸۸۵ء میں کانگریس کی تاسیس[1] ہوئی۔

---

[1] ڈاکٹر پتابھی سیتارامیا کی تاریخ کانگریس (انگریزی) صفحہ ۲۳-۲۴

سیاسی عمل کی یہ ابتداء جس طرح انگریزی افکار اور انگریزی تدبر کی رہنمائی میں ہوئی، اسی طرح مقاصد اور ان کے حصول کی صورت کا تعین بھی آپ سے آپ انگریزی اثرات کے تحت اور انگریزی دستورِ حکومت کے نمونے پہ ہوتا رہا۔ کانگریس کو اوّل یوم پیدائش ہی میں "انڈین نیشنل کانگریس" کے نام سے موسوم کیا گیا، گویا کہ "انڈین نیشن" کے نام سے کوئی قوم موجود تھی اور یہ اس کی ایک اجتماعی ہیئت (کانگریس) بنائی جا رہی تھی۔ انگریزی تعلیم کے جو اثرات ان لوگوں کے دماغ پر پڑ رہے تھے، ان کا اثر اتنا گہرا تھا کہ انھوں نے ایک ملک کی آبادی کا ایک قوم ہونا، بطور ایک بدیہی کلیہ کے تسلیم کر لیا تھا، اور اس کے لیے وہ واقعات کی شہادت کو بھی غیر ضروری سمجھتے تھے۔ کانگریس کے پہلے اجلاس میں جو مقاصد اس جمعیت کے لیے تجویز ہوئے تھے ان میں سے دوسرا مقصد یہ تھا:۔

"قومی وحدت کے اُن داعیات کا نشوو ارتقاء اور استحکام جو ہمارے محبوب لارڈ رپن کے ہمیشہ یادگار رہنے والے عہدِ حکومت میں پیدا ہوتے ہیں[1]"

دوسرے اجلاس کے خطبۂ صدارت میں ہم کو یہ الفاظ ملتے ہیں:۔

"ایک قومی کانگریس کو اُن امور تک اپنے تئیں محدود رکھنا چاہیے جن میں پوری قوم براہِ راست حصّہ دار ہو اور اصلاحِ معاشرت اور دوسرے طبقہ وار مسائل کو طبقات کی کانگریسوں کے لیے چھوڑ دینا چاہیے[2]"

یہ وطنی قومیت اور واحد قومیت کا تخیل اس تحریک کے مایۂ خمیر کا پہلا عنصر ہے۔

---

[1] ڈاکٹر پتابھی سیتارامیہ کی تاریخ کانگریس (انگریزی) صفحہ ۲۷۔

[2] How India Wrought for Freedom by Annie Basant. P. 18

جس طرح ۱۸۸۵ء میں بنیرجی اور نوروجی "ہندوستانی قوم" کا ذکر کرتے تھے اسی
طرح آج گاندھی جی اور نہرو جی بھی کرتے ہیں، بلکہ وہ محض ذکر کرتے تھے اور یہ اس
کو زبردستی مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ گاندھی جی استفہام انکاری کے لہجہ میں پوچھتے
ہیں کہ "ہندوستان ایک ملک اور ایک قوم ہے یا بہت سے ملک اور بہت سی قومیں؟"[1]
اور خود ہی اس کا جواب دیتے ہیں کہ جو لوگ اس کو ایک ملک اور ایک قوم سمجھتے ہیں
انہیں اس پر اعتراض نہ ہونا چاہیئے کہ اگر مدراس کا وزیر اعظم ایک قوم کے لیے ایک
زبان بنانے میں کرمنیل لا امنڈمنٹ ایکٹ کی جابرانہ طاقت استعمال کرے۔ نہرو جی
استفہام کی بھی ضرورت نہیں سمجھتے اور قطعی طور پر اعلان کرتے ہیں کہ ہندوستان میں
صرف ایک قوم بستی ہے جس کا نام ہندوستانی ہے۔ جدا جدا مستقل قوموں کا یہاں
وجود ہی نہیں ہے۔

دوسرا بنیادی تصور جو انگریزی تعلیم اور انگریزی مربیوں کی سیاسی تربیت
سے اخذ کیا گیا وہ "قومی جمہوریت" (National Democracy) کا تصور تھا۔ جمہوری
ادارات کی مختلف صورتیں جو دنیا میں رائج ہیں اور رائج رہی ہیں، ان میں ایک نہایت
ناقص اور قدامت پرستانہ صورت وہ ہے جو انگلستان میں قائم ہے۔ لیکن ہمارا
ہندوستانی وطن پرست چونکہ انگریز کا شاگرد ہے، اسی سے جمہوریت کا نام اس نے
سنا ہے، اور اسی کے جمہوری نظام کا نقشہ اس نے دیکھا ہے، اس لیے یہ جب
"جمہوریت" کا لفظ بولتا ہے تو اس کے سامنے جمہوری دستور کے وہی اصول اور وہی
طریقے ہوتے ہیں جو انگلستان میں رائج ہیں۔ نمائندگی، انتخاب، ذمہ دار حکومت اور دستور
سلطنت کی ساری تفصیلات کو یہ جوں کا توں انگلستان سے ہندوستان اٹھا لانا چاہتا ہے۔ یہ
اس حقیقت کو نہیں جانتا کہ قوموں اور ملکوں کے حالات مختلف ہوتے ہیں۔ جس قسم کے

---

[1] *"Congress man Beware" Gandhi in the Harijan dated 10th Sept. 1938.*

ادارات ایک ملک کے مناسب حال ہوں، لازم نہیں کہ وہ دوسرے ملک کے قامت پر بھی راست آسکیں۔ قوت تمیز اور اجتہاد فکر کے بغیر محض دوسروں کی نقالی کرنا اصولاً بھی غلط ہے اور عملاً بھی مشکل، بلکہ مضرت رساں۔ مگر مختلف اسباب ایسے پیدا ہو گئے ہیں جو اس حقیقت کے بار بار سامنے لائے جانے پر بھی ہمارے وطن پرستوں کو اس کے ادراک سے روکتے ہیں۔ ایک گروہ غلامانہ ذہنیت اور محدود انقیت کی بنا پر یہ سمجھتا ہے کہ "جمہوری ادارات" کا اطلاق صرف انگریزی طرز کے ادارات پر ہی ہوتا ہے اور ہو سکتا ہے۔ لہذا اس طرز کی مخالفت گویا نفس جمہوری ادارات کی مخالفت کرنا ہے۔ دوسرا گروہ انگریزی نمونہ کی جمہوریت کو غلط سمجھتا ہے مگر اس پر شکست خوردہ ذہنیت کا غلبہ ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ جمہوری نظام جو ہمارے برطانوی آقا اپنے ملک سے لاتے ہیں اور جس کی پشت پر مشین گن کی طاقت ہے، ہندوستان میں رائج ہونا ہے اور ہو کر رہے گا۔ لہذا عافیت اسی میں ہے کہ اس کے آگے سپر رکھ دو۔ تیسرا گروہ جو کانگریس کا اصلی کار فرما اور کارکن گروہ ہے غلامانہ ذہنیت کے ساتھ خودغرضانہ ذہنیت سے بھی ماؤف ہے۔ انگریزی طرز جمہوریت کو قبول کرنے میں سراسر اُسی کا فائدہ ہے، کیونکہ یہ طرز جمہوریت اکثریت کو مالک الملک لاشریک لہا بنا دیتا ہے۔ اور اتفاق سے یہی گروہ یہاں اکثریت میں ہے۔ لہذا یہ کہتا ہے کہ ہندوستان میں واحد قومیت کی بنیاد پر ایک "ڈیموکریٹک اسٹیٹ" قائم ہونا چاہیے۔ ۱۸۸۵ء سے ۱۹۳۸ء تک ۵۲ سال کی مدت میں کانگریس کے مطالبات کی صورتیں بہت کچھ بدلی ہیں۔ پہلے سرکار سے مطالبہ کیا جاتا تھا کہ ہمارے لیے ایک ایسا دستورِ حکومت بنا دو جس میں گورنمنٹ اہلِ ملک کے سامنے جوابدہ ہو۔ اب یہ مطالبہ ہے کہ ہم خود اپنا دستور بنائیں گے۔ بظاہر پہلے موقف سے دوسرا موقف بہت آگے بڑھا ہوا ہے۔ مگر اصولی حیثیت سے "ڈیموکریسی" کا جو تصور ۱۸۸۵ء میں تھا، بعینہٖ آج بھی وہی ہے۔ خواہ دستور حکومت سرکار بنائے یا خود بنائیں۔

وطن پرستی کی اس تحریک میں انگریزی آقاؤں کا اثر محض علمی ونظری حیثیت ہی سے نہیں ہے بلکہ تقریباً ۵۰ سال سے جو سیاسی تربیت ہندوستانیوں کو ان

کے بیرا نکا دیے رہے ہیں۔ وہ عملاً بھی انہی اصولوں پر مبنی ہے۔ ۱۸۹۱ء سے ۱۹۳۵ء تک جتنے دستوری تغیرات اس ملک میں ہوتے ہیں، اور نظم ونسق حکومت میں ہندوستانیوں کو شریک کرنے کی جتنی صورتیں اختیار کی گئی ہیں، ان سب میں انگریز کی اس فطری کمزوری کا اثر نمایاں نظر آتا ہے کہ وہ اپنے ملک کے جمہوری ادارات کو آئیڈیل سمجھتا ہے، اور اس میں اتنی اجتہادی صلاحیت نہیں ہے کہ مختلف حالات کے لیے مختلف اصول وضع کر سکے۔ اگرچہ ابتدا سے اب تک ہر زمانہ میں انگریز مدبرین نے اس بات کو اصولاً تسلیم کیا ہے کہ ہندوستان انگلستان نہیں ہے اور یہاں آنکھیں بند کر کے انگریزی طرز کے جمہوری ادارات قائم کرنا درست نہیں۔ مگر وہ سب کچھ جاننے اور سمجھنے کے باوجود اپنی فطرت سے مجبور ہیں کہ ان کے ذہن میں ہر پھر کر جمہوریت کے وہی تصورات اور وہی رنگ ڈھنگ آجاتے ہیں جن کے ماحول میں خود انہوں نے پرورش پائی ہے۔ وہ غیر شعوری طور پر اہلِ ہند کو ایک قوم فرض کر لیتے ہیں جس طرح اہلِ انگلستان ایک قوم ہیں۔ وہ جائز سمجھتے ہیں کہ یہاں ڈیموکریسی کے وہی اصول اختیار کیے جائیں جو واحد قومیت ہی کے لیے موزوں ہو سکتے ہیں۔ حالات کی رعایت زیادہ سے زیادہ ان کو جس چیز کے لیے آمادہ کر سکتی ہے وہ بس جداگانہ انتخاب ہے یعنی یہ کہ ہندوستان کی مختلف قوموں کو ——— جنہیں وہ ایک قوم کے مختلف فرقے سمجھتے ہیں ——— اپنے ہی منتخب کردہ نمائندوں کے ذریعہ سے اپنی خواہشات کے اظہار کا موقع مل جائے۔ مگر کوئی شخص کسی دلیل سے بھی یہ بات ان کے ذہن میں نہیں بٹھا سکتا کہ جداگانہ انتخاب اُس وقت بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے جب ان مختلف قوموں کے مجموعہ کو ایک قوم فرض کر کے اکثریت کی حکومت کا جمہوری قاعدہ نافذ کر دیا جائے۔ انہوں نے میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں سے لے کر صوبوں اور مرکز کی قانون ساز مجالس تک جتنے جمہوری ادارے اس ملک میں قائم کیے، ان سب میں کثرت رائے کے غلبہ کا اصول یکساں طور پر رائج کر دیا۔ اور اس کا نتیجہ صرف یہی نہیں ہوا کہ ہندوستان میں جو قوم کثیر التعداد واقع ہوئی ہے وہ زیادہ سے زیادہ سیاسی طاقت کی مالک ہوتی چلی گئی، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر اس

کا بدترین نتیجہ یہ ظاہر ہوا کہ کثیر التعداد قوم اس سیاسی غلبہ کو اپنا فطری اور اخلاقی حق سمجھنے لگی اور قلیل التعداد قومیں اس فریب میں مبتلا ہو گئیں کہ جمہوریت کا مفہوم غلبۂ اکثریت کے سوا اور کچھ نہیں، اُن کو خود بھی اپنی مغلوبیت پر راضی ہونا چاہیئے۔ کیونکہ انگلستان سے جو چیز آئے اس کے بجا حق ہونے میں تو کلام ہی نہیں ہو سکتا۔

جس ملک میں ذہنی غلامی اس حد تک پہنچ چکی ہو کہ کسی چیز کے بجا و درست ہونے کے لیے محض صاحب بہادر کے قول و فعل کی سند کافی سمجھی جائے، حتیٰ کہ کسی ریلوے اسٹیشن پر صاحب بہادر چائے میں برف ڈال کر پیتے ہوئے دیکھے جائیں تو غلام ہندوستانی گھر پہنچ کر برف زدہ چائے پینے لگے، وہاں یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ صاحب نے جمہوریت کا جو مفہوم بتایا ہے اس کے درست ہونے میں شک کیا جائے گا۔ یہاں آزادی کے مدعی ایک سے ایک بڑھ کر موجود ہیں، مگر دماغوں کی غلامی ان سب کا مشترک سرمایہ ہے۔ جو لوگ یہاں آزاد خیالوں کے سرتاج سمجھے جاتے ہیں، ان کی غلام فطرتی بھی یہاں تک بڑھی ہوئی ہے کہ جب تک ایک وزیر ہند (لارڈ آلیویر) نے جداگانہ انتخاب کو جمہوریت و قومیت کے منافی قرار دیا تھا اس وقت تک یہ غریب اس حقیقت سے بالکل ناواقف تھے کہ واقعی یہ چیز اس درجہ منافیٔ قومیت و جمہوریت ہے۔ اور جب یہ بات صاحب کی زبان سے سن لی گئی تو ڈاکٹر مونجے سے لے کر پنڈت جواہر لال نہرو تک ہر ایک اس زعم کے ساتھ اس کا اعلان کرنے لگا کہ جس قول کو سرکار ابد الاعتبار کی سند حاصل ہے اس کے برحق ہونے میں کس کو کلام کی جرأت ہو سکتی ہے۔ پھر جو صاحب یہاں آزاد خیالوں کے امام ہیں ان کا حال بھی یہی ہے کہ سرکار کے قائم کیے ہوئے جمہوری ادارات کو جمہوریت کی ایک ہی فطری و برحق صورت سمجھتے ہیں، اور ان ادارات کے اصول سے اختلاف کرنا ان کے نزدیک سیاسی اصلاح و ترقی کی مخالفت کرنا ہے، کیونکہ سیاسی اصلاح و ترقی کی صراطِ مستقیم ایک ہی ہے جس کی طرف غلاموں کے ہادیٔ برحق ——— صاحب بہادر ——— نے ان کی رہنمائی کی ہے، اور وہ بس یہ ہے کہ مختلف قوموں کو ایک مجموعہ قرار دے کر اس میں غلبۂ

اکثریت کا جمہوری اصول نافذ کر دیا جائے۔ صاحب کے دیے ہوئے اس علم پر غلام دماغوں کا یقین وادعان اور انشراح و اطمینان اتنا بڑھا ہوا ہے کہ وہ ریاضی کے اصول موضوعہ کی طرح اسے بیان کرتے ہیں اور اپنی ذہنی غلامی کے داغ کو چھپانے کی بھی کوشش نہیں کرتے۔ اس لیے کہ انہیں اپنی ذہنی غلامی کا احساس تک نہیں رہا۔

قومیت اور جمہوریت کے ساتھ ایک تیسرا اساسی تخیل جو ہے جو انہوں نے صاحب کی تعلیم و تربیت سے حاصل کیا ہے اور وہ یہ کہ اسٹیٹ کو سیکولر (Secular) یعنی غیر دینی ہونا چاہیے۔

غیر دینی کا ایک سادہ مفہوم یہ ہے کہ اسٹیٹ کا اپنا کوئی مذہب نہ ہو بلکہ وہ مجرد دنیوی ہو۔ اس کی اساس کسی مخصوص شریعت پر نہ ہو، نہ وہ کسی خاص مذہب کی نصرت و حمایت کرے گا۔ اس کے ساتھ ہی وہ مخالفِ دین (Anti Religious) بھی نہ ہو بلکہ اپنے دائرے میں مذہبی نظامات کو تسلیم کرے اور ان کو حکومت کے اختیارات میں سے کم از کم اتنے اختیارات تفویض کر دے جو اندرونی تنظیم کے لیے ضروری ہیں۔ مثلاً اپنے پیروؤں پر ٹیکس عاید کرنا، مذہبی قوانین کو ان پر نافذ کرنا اور ان کی دینی تعلیم کا انتظام کرنا، عام اس سے کہ وہ علیحدہ مدارس کی شکل میں ہو یا مشترک تعلیمی نظام کے ماتحت ہو۔ نازی دور سے پہلے تک جرمنی میں غیر دینی اسٹیٹ کا یہی مفہوم تھا اور اب بھی یوگوسلیویا، پولینڈ، لتھوانیا، فن لینڈ، اور ایستھونیا میں یہی مفہوم ہے غیر دینی اسٹیٹ کا۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ وہ دین کی نفی (Negation) پر قائم ہو، مخالفِ دین ہو، اس میں کسی دینی نظام کو تسلیم نہ کیا جائے۔ باشندوں کی اس حیثیت کو کہ وہ کسی خاص دین کے پیرو ہیں بالکل نظر انداز کر دیا جائے اور عمومی حاکمیت (Popular Sovereignty) کی تعبیر یہ کی جائے کہ باشندگانِ ملک ہونے کی حیثیت سے تو سب باشندے حاکمیت میں حصہ دار ہیں مگر ایک مذہب کے پیرو ہونے کی حیثیت سے اس حاکمیت میں ان کا کوئی حصہ نہیں، لہٰذا وہ خود اپنی حکومت سے بھی اپنے دینی نظام کی ترقی و استحکام کے لیے کوئی طاقت حاصل نہیں کر سکتے۔ اور یہی

کے اس مفہوم نے یورپ میں دو مختلف صورتیں اختیار کی ہیں۔ ایک ظالمانہ (Aggressive)، جس میں حکومت کا ارادہ یہ ہوتا ہے کہ مذہبی لوگوں کو لامذہب بنایا جائے۔ اس کی مثال روس ہے۔ دوسری صورت معتدل ہے جس میں حکومت کی پالیسی یہ ہوتی ہے کہ مذہبی نظامات کو زندگی کی طاقت پیدا کرنے والے تمام وسائل سے محروم کر دیا جائے تاکہ وہ خود سوکھ کر مر جائیں۔ اس کی مثال چیکوسلواکیا ہے جہاں تعلیم کا نظام کلیۃً حکومت کے ہاتھ میں ہے، اور اس سے دینی عنصر کو قطعاً خارج کر دیا گیا ہے، اور حکومت سرکاری طور پر کسی قوم کے دینی نظام کو تسلیم نہیں کرتی۔

ہندوستان میں ہمارے آقاؤں نے جو طریق کار اختیار کیا ہے وہ ایک عجیب قسم کی معجون مرکب ہے۔ بادشاہ سلامت حامیٔ دین (Defender of the Faith) بھی ہیں اور اسٹیٹ کی طرف سے ایک مذہبی محکمہ (Ecclesiastical Department) بھی قائم ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سلطنت کا کوئی مذہب نہیں ہے اور اس کا مذہب نہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ مذہبی رواداری کے اصول پر قائم ہے۔ لادینی کا پہلا مفہوم، اگر عملاً باشندگانِ ملک کے مذہب سے وہ برتاؤ کیا جاتا ہے جو چیکوسلواکیا کی روش سے ملتا جلتا ہے۔ اس عجیب کھچڑی کی تحلیل اگر سائنٹیفک طریقہ سے کی جائے تو اس کے تین اجزا برآمد ہوں گے۔

۱۔ مذہبی رواداری کا اعلان و اظہار۔

۲۔ ایک خاص عقیدہ و مسلک کی طرف نظرِ عنایت۔

۳۔ دوسرے تمام عقائد و مسلک کے ساتھ سنگدلانہ سرد مہری۔

ہندوستان میں "دنیوی" اسٹیٹ کا یہ مرکب تصورِ فکر و عمل دونوں حیثیتوں میں ڈیڑھ سو برس سے پرورش پا رہا ہے اور ہمارے وطن پرستوں نے بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر اسی تصور کو اپنے اندر جذب کر لیا ہے۔ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ ہماری تحریک غیر دینی ہے اور ہم ایسا دنیوی اسٹیٹ بنانا چاہتے ہیں جس کی بنا کسی مذہب پر نہ ہو گی، مگر اس میں مذہبی رواداری ہو گی۔ یہ آقایانِ نامدار کے بنائے ہوئے کھچڑ کا

پہلا جزو ہے۔ اور دوسرا جزو یہ ہے کہ ان کا لیڈر "ایک مہاتما" ہے جو صداقت (Truth) اور اہنسا (Non-Violence) کے خالص ہندوانہ تصورات کا علمبردار اور مبلغ بن کر اٹھا ہے جس کے تصورات جنگ آزادی کی فکری بنیاد ہیں جو صاف کہتا ہے کہ عدم تشدد پالیسی نہیں بلکہ دین و ایمان ہے۔ اس کی رہنمائی میں تمام باشندگان ہند کے لیے سرکاری طور پر عمومی تعلیم کے خاکے بنائے جاتے ہیں اور ان سب میں اس کے دین و ایمان کو اساسی حیثیت دی جاتی ہے[2]۔ اب رہ گیا تیسرا جزو تو اس کی بھی پوری مقدار اس مضمون میں شریک کی گئی ہے۔ صاف صاف کہا جا چکا ہے کہ باشندوں کی مذہبی تعلیم کا انتظام کرنا اسٹیٹ کے فرائض سے خارج ہے، اور اس کے برعکس یہ چیز اسٹیٹ کے فرائض میں داخل ہے کہ باشندوں کو بجبر ایسی تعلیم دے جو ان کے ذہن سے اپنے مذہب کی برتری کا خیال نکال دے۔ خود مہاتما گاندھی جنہوں نے اپنے مذہب کو با صرار وردھا سکیم کا جزو لاینفک بنوایا ہے، اپنے مذہب کے سوا دوسرے تمام مذاہب کو نظامِ تعلیم سے خارج کر دینے کے لیے یہ دلیل ارشاد فرماتے ہیں:۔

"تمام مذاہب کا یکساں لحاظ رکھنے کی تعلیم دینا ایک ایسی ضرورت ہے جس کے حق میں میرے خیالات بہت سخت ہیں۔ جب تک ہم اس خوش گوار حالت (یعنی سب مذاہب کو ایک نظر سے دیکھنے اور سب کو مساوی طور پر برحق سمجھنے کی حالت) کو نہ پہنچ جائیں گے، اس وقت تک مختلف فرقوں میں حقیقی وحدت پیدا ہونے کی مجھے کوئی توقع نظر نہیں آتی۔ میرے نزدیک یہ بات مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے بچوں کے درمیان دوستانہ اسپرٹ کے نشوونما کو غارت کرنے والی ہوگی اگر ان کو یہ سکھایا

---

[1] پنڈت جواہر لال کے بقول کانگریس سے عظیم تر (Greater than Congress itself)

[2] وردھا سکیم، ودیا مندر سکیم اور اصلاح دیہات کی اسکیم (جسے ڈاکٹر سید محمود نے بہار میں جاری کیا ہے) تینوں میں اہنسائی تعلیم کو اساس کی حیثیت دی گئی ہے۔

جائے کہ ان کا مذہب دوسرے مذاہب سے بہتر ہے یا یہ کہ وہی ایک سچا مذہب ہے۔ اگر قوم (؟ ہندوستانی قوم) پر یہی اختصاصی جذبہ مستولی رہے تو اس سے لازم آئے گا کہ یا تو ہر مذہب والوں کے الگ الگ مدرسے ہوں جن میں ہر ایک کو دوسرے پر طعن کرنے کی آزادی حاصل رہے، یا پھر مذہب کا نام لینے ہی کو کلیتہً ممنوع قرار دے دیا جائے۔ اس قسم کا طرزِ عمل اختیار کرنے کے نتائج اتنے خوفناک ہیں کہ ان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اخلاق کے بنیادی اصول تمام مذاہب میں مشترک ہیں۔ وہ ضرور بچوں کو سکھائے جانے چاہئیں اور جہاں تک واردھا اسکیم کے ماتحت مدارس کا تعلق ہے۔ ان میں بس اتنی ہی مذہبی تعلیم کو کافی سمجھنا چاہیے۔[1]

اسی خیال کی ترجمانی ایک دوسرے ذمہ دار شخص مسٹر سمپورنانند (یو۔ پی کے وزیر تعلیم) نے اپنی ایک تقریر میں کی ہے جو انہوں نے ۴ر اپریل ۳۸ء کو یو۔ پی کی لیجسلیٹو اسمبلی میں ارشاد فرمائی تھی:-

"ہر وہ شخص جو ہندو یا مسلم تہذیب کے قائم رکھنے اور اس کو مدارس میں جاری کرنے پر زور دیتا ہے، وہ یقینی طور پر ملک کو نقصان پہنچاتا ہے۔" میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ موجودہ ہندوستان میں یہ چیز مفقود ہونی چاہیئے۔ ہم ایک ہندوستانی تہذیب چاہتے ہیں جو ہندوؤں اور مسلمانوں اور دوسروں کے لیے جو اس ملک میں آئے ہیں اور جنہوں نے اس کو اپنا گھر بنا لیا ہے بالکل ایک ہے۔ اگر کوئی شخص واقعی ملک کی ترقی میں کوشاں رہے تو اس کو ایسی بات پر زور دینا چاہیے جس سے ہم میں تفرقے پیدا نہ ہوں جو سب کے لیے مضر رساں ہیں۔ بلکہ ایسے امور پر جن سے

---

[1] ہریجن، مورخہ ۱۶ر جولائی ۳۸ء۔

ہندوستانی تہذیب کی تعمیر و ترکیب ہوتی ہو۔ تمام وہ باتیں جن سے ہم میں
تفرقہ اور کشیدگی پیدا ہوتی ہے۔ یقیناً ملک کے ساتھ دشمنی کرتی ہیں۔
اس لیے ملک کا عام مفاد مدِ نظر رکھتے ہوئے مجھے امید ہے کہ وہ لوگ جو
لڑکوں اور لڑکیوں کے مدارس میں ہندو اور مسلم تہذیب قائم رکھنا چاہتے
ہیں اس بات پر زور نہ دیں گے"[1]
اسی تقریر کا ایک فقرہ یہ بھی ہے:۔
"جب ہندو مسلم تہذیبیں مٹ جائیں گی تب ہی ہندوستانی
تہذیب زندہ رہ سکے گی۔"[2]

ان تحریروں اور تقریروں سے صاف طور پر واضح ہوتا ہے کہ ہندوستانی
وطن پرست جو اسٹیٹ بنانا چاہتے ہیں وہ ایک معنی میں دینی اسٹیٹ ہے اگر دین
سے مراد مہاتما گاندھی کا دین لیا جائے، اور ایک معنی میں لادینی بلکہ مخالفِ دین
(Anti Religious) اسٹیٹ ہے اگر دین سے مراد ہندوستان کے ان باشندوں کا
دین لیا جائے جو دینِ گاندھی کے پیرو نہیں ہیں۔ انکے حق میں اس اسٹیٹ کا رویہ غیر جانبدارانہ
رواداری کا نہ ہوگا بلکہ چیکوسلواکیہ کی طرح غیر ہمدردانہ اور ایک حد تک مخالفانہ ہوگا۔ اس کا
مطمحِ نظر یہی بتایا جا رہا ہے کہ مختلف قوموں کی تہذیبیں کسی نہ کسی طرح فنا ہو جائیں،
ان کا مذہبی زاویۂ نظر بدل جائے، اور وہ تمام مذاہب کو برابر سمجھنے لگیں، یعنی کسی مذہب
کے پیرو نہ رہیں، کیونکہ ایک مذہب کی پیروی کے لیے اس کو سب سے بہتر اور صحیح تر جاننا
فطری طور پر ناگزیر ہے۔ اس کے بعد یہ خیال کرنے کا کوئی موقع ہی نہیں رہتا کہ ایسا اسٹیٹ
کسی مذہبی نظام کو قانوناً تسلیم کرے گا اور اس کو تعلیم اور اندرونی تنظیم کے لیے وہ حقوق
اور اختیارات دے گا جن کی مثالیں ہم نے اوپر یورپ کے متعدد ممالک سے پیش کی

---

[1] مدینہ۔ مورخہ ۲۱ اپریل ۳۸ء
[2] ٹریبیون مورخہ ۱۰ اپریل ۳۸ء

ہیں۔

ان تشریحات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ہمارے وطن پرست ہندوستان[1] کے لیے جس قسم کی آزاد حکومت حاصل کرنا چاہتے ہیں اس کی بنیادی خصوصیات تین ہیں:-

۱۔ "نیشنل اسٹیٹ" اس معنی میں کہ باشندگان ہندوستان کی پوری آبادی کو ایک قوم قرار دیا جائے اور جداگانہ قومیتوں کی نفی کردی جائے۔

۲۔ "جمہوری اسٹیٹ" اس معنی میں کہ باشندگانِ ہند کو ایک مجموعہ قرار دے کر اس میں غلبۂ اکثریت کا اصول نافذ کیا جائے۔

۳۔ "دنیوی اسٹیٹ" اس معنی میں کہ جہاں تک ہندوستان کی مختلف قوموں کے مذہب کا تعلق ہے ان کے لحاظ سے وہ ایک لادینی اسٹیٹ ہو۔

اب ہم کو دیکھنا چاہیئے کہ اس نوعیت کا اسٹیٹ دراصل کیا معنی رکھتا ہے؟ کیا مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم اس کو اپنا مطمح نظر بنا سکتے ہیں؟ کیا ایسے اسٹیٹ میں ہمارے مسلمان ہونے کی حیثیت برقرار بھی رہ سکتی ہے؟ کیا ہمارے لیے یہ جائز ہے کہ ہم اس کو قائم کرنے کی جدوجہد میں حصّہ لیں، یا صبر و سکون کے ساتھ اس کے قیام کو گوارا کریں؟ آئندہ باب میں ہم ان سوالات پر بحث کریں گے۔

---

[1] ۲۹ اگست ۳۸ء کو مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی (سنٹرل اسمبلی کی کانگریسی پارٹی کے لیڈر) نے شملہ میں ایک تقریر فرمائی تھی جس میں اسٹیٹ کی انھی تین بنیادوں کو پوری طرح تشریح کے ساتھ بیان کیا تھا۔ یہ تقریر یکم ستمبر ۳۸ء کے اخبارات میں شائع ہوئی ہے اور اس کا مطالعہ ہندوستانی وطن پرستوں کے طریق فکر اور نصب العین کو سمجھنے میں بہت کچھ مدد دیتا ہے۔

قومی، جمہوری، لادینی اسٹیٹ

کیا مسلمان اس کو قبول کرسکتے ہیں ؟

اس بحث کو شروع کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ عام ناظرین کی سہولت کے لیے چند اصطلاحات کی تشریح کردی جائے۔

لفظ اسٹیٹ جس کا مترادف ہماری زبان میں "ریاست" کا لفظ ہے۔ علم سیاست کی اصطلاح میں اُس نظام کو کہتے ہیں جو ایک متعین رقبۂ زمین میں رہنے والی آبادی کو قاہرانہ طاقت (Coercive Power) سے ضبط میں رکھتا ہو۔ قوت قاہرہ کا وجود ایک طرف، اور اطاعت کا پایا جانا دوسری طرف، ان دو چیزوں کے بہم ہو جانے سے وہ نظمی ہیئت بن جاتی ہے جسے اسٹیٹ یا ریاست کہا جاتا ہے۔

اسٹیٹ کی اِس تعریف کو سمجھنے کے بعد قدرتی طور پر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ وہ قوت قاہرہ جس کی اطاعت ایک آبادی کر رہی ہے خود اِس آبادی کے اندر اس کے مجموعہ میں سے اُبھرتی ہے یا کہیں باہر سے آتی ہے ؟ اگر اس کے اجتماعی وجود سے الگ کوئی طاقت ایسی ہے جو اس پر حاکمانہ اختیار استعمال کرتی ہے تو وہ غلام ہے۔ اور اگر وہ آبادی خود حاکمیت (Sovereignty) کی مالک ہے اور اپنی رضامندی سے

ایک نظمی ہیئت کو قوت قاہرہ فراہم کر کے دیتی ہے تاکہ وہ اس کے معاملات کی تنظیم کرے تو وہ خود مختار جماعت ہے۔ کسی آبادی کا اس طور پر اپنے اوپر حکمراں ہونا، یا بالفاظِ دیگر حاکمیت سے متمتع ہونا، جمہوریت کا اصل الاصول ہے۔ جب ہم کسی اسٹیٹ کو "جمہوری اسٹیٹ" کہتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ اسٹیٹ جن باشندوں سے مرکب ہے وہی اس کی حاکمیت کے مالک ہیں۔ گورنمنٹ جو ان کے اسٹیٹ کا انتظام کرتی ہے، ان کی اجتماعی رضامندی کی تابع ہے، اور اس کا منصب اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ان کی خواہشات کو وضعِ قوانین اور تنفیذِ قوانین میں روبعمل لائے۔

مغرب کے جمہوری نظام کا عمل اس کے نظریہ سے بہت مختلف ہوتا ہے۔ نظری حیثیت سے تو اسٹیٹ کے ہر فرد کو حاکمیت حاصل ہے اور وہ اس کے استعمال کا حق رکھتا ہے۔ لیکن عملاً یہ ممکن نہیں ہے کہ ہر ہر شخص کی خواہش کے مطابق قوانین بنیں اور حکومت کی جائے۔ لہٰذا عملی اغراض کے لیے جمہوریت کا قاعدہ یہ قرار دیا گیا کہ حکومت ہمیشہ اکثریت کی خواہشات کے مطابق ہوگی۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے مشکلات کا آغاز ہوتا ہے۔ جمہوری حکومت جن خوشنما نظریات سے شروع ہوتی ہے، عمل کی سرحد میں آ کر وہ رخصت ہو جاتے ہیں اور ان سب کا خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ مملکت کے باشندوں کا ایک حصہ دوسرے حصہ کو حاکمیت سے عملاً محروم کر کے ان پر اپنی خواہشات مسلط کر دے۔ ہر ملک میں مختلف گروہ مختلف قسم کے مفاد، مذاق، خواہشات اور اغراض رکھنے والے ہوتے ہیں۔ ان سب کے اشتراکِ عمل ہی سے تمدن کی مشین چلتی ہے۔ ان میں سے ہر ایک مملکت کی اجتماعی خوش حالی اور فلاح و بہبود میں کسی نہ کسی حیثیت سے اپنا حصہ ادا کرتا ہے۔ ہر ایک کے لیے اس کی اغراض اور خواہشات اتنی ہی اہمیت رکھتی ہیں جتنی دوسرے کے لیے اس کی اغراض و خواہشات۔ لیکن جمہوری نظام میں جب اکثریت کی حکومت کا اصول اختیار کیا جاتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ جو گروہ کثیر تعداد میں ہے وہ حاکم بن جائے اور حکومت کے زور سے اپنی اغراض و خواہشات حاصل کرنے اور جو

گروہ قلیل تعداد میں ہے وہ غلام بنا لیا جائے اور اکثریت کی اغراض و خواہشات پر اس کی اغراض و خواہشات اُسی طرح قربان کی جائیں جس طرح کسی زار یا کسی قیصر کی انتہائی ظالمانہ حکومت میں کی جا سکتی ہیں۔ یہی چیز ہے جس کو اکثریت کا استبداد (Tyranny of the Majority) کہتے ہیں اور جو اس زمانہ کی جمہوریتوں کے چہرے پر سب سے زیادہ بدنما داغ ہے۔

اکثریت کی حکومت کا اصول صرف اس جگہ صحیح ہو سکتا ہے جہاں کے باشندے اساسی اصول (Fundamentals) میں متفق ہوں اور ان کے درمیان اختلاف محض آراء کا ہو، نہ کہ اغراض کا۔ ایسی جگہ تو یہ ممکن ہے کہ آج کی اقلیت کل اکثریت بن جائے، اور آج کی اکثریت کل اقلیت بن جائے۔ رائے عام اگر محض رائے عام ہے تو وہ بدل سکتی ہے اور بدلی جا سکتی ہے۔ کل رائے عام لبرل پارٹی کی مؤید تھی تو آج وہ لیبر پارٹی کے حق میں ہموار ہو سکتی ہے۔ ایسی حالت میں کوئی اکثریت نہ مستقل اور دائمی اکثریت ہو گی نہ کبھی ظلم و جور کا طریقہ اختیار کر سکے گی، اور نہ اقلیت کو اس سے یہ اندیشہ ہو گا کہ وہ اساسی امور پر ضرب لگائے گی ——— لیکن اغراض ——— یا خود غرضی ——— کا اختلاف، اور مذہبی اصولوں کا، یا قومی جذبات کا، یا طرزِ زندگی کا اختلاف وہ چیز نہیں ہے جو دلائل سے دُور کیا جا سکے۔ اس اعتبار سے جو گروہ اکثریت میں ہے وہ مستقل طور پر اکثریت میں رہے گا۔ ایسی اکثریت کو حکومت کا حق دینے کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک زار کی جگہ لاکھوں زار اور ایک قیصر کی جگہ کروڑوں قیصر پیدا ہو جائیں اور محض اس بنا پر کہ ان کے سروں کی تعداد زیادہ ہے، ان کے لیے یہ جائز ہو جائے کہ اپنے ہی ہم وطن لوگوں کی ایک معتد بہ جماعت پر جس طرح چاہیں ظلم و ستم کریں۔ یہ جمہوریت کے بنیادی اصولوں کی صریح اور کھلی نفی ہے۔ اس چیز پر لفظ جمہوریت کا اطلاق ہی غلط ہے۔ اسے بڑے پیمانہ پر چنگیزیت کہنا چاہیئے۔

جن ممالک میں باشندوں کے درمیان قومی تفریق موجود ہے، یعنی مذہب، نسل، زبان، رنگ وغیرہ امور میں اختلاف پایا جاتا ہے، اور اسی طرح جہاں نظریات

اور اصول زندگی کا اساسی اختلاف ہے، یا باشندوں کے مختلف گروہوں کی اغراض باہم متصادم ہیں، وہاں مختلف عناصر کو ملا کر ایک اسٹیٹ بنانے اور اس میں جمہوریت کا اصول نافذ کر دینے کا نتیجہ ظلم کے سوا کچھ نہیں نکلا، اور ہمیں دنیا کی پوری تاریخ میں ایک مثال بھی نہیں ملی جس کو مستثنیٰ قرار دیا جا سکتا ہو۔

روس میں مزدوروں کی حکومت قائم ہونے کے بعد متوسط طبقہ کے لوگ، چھوٹے زمیندار، تجارت پیشہ اور دکاندار، اور ان سب سے زیادہ مذہبی گروہ جس بُری طرح پیسے گئے اور آج بھی جس طرح وہ غلام بنا کر رکھے گئے ہیں، اس حالت کا تقابل اگر زار کی حکومت کے مظالم سے کیا جائے تو شاید زاریت ہی کو اشتراکیت کے آگے سر نیاز جھکا دینا پڑے۔ یہ اس امر کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ جہاں خود غرضی بنائے اختلاف ہو وہاں ایک قسم کی اغراض رکھنے والوں کا حکمران بن جانا یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ دوسرے تمام گروہوں کا خون چوس لیں اور ان کو اپنی خود غرضی کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیں۔

مغرب میں وطنیت کے تجربات

چیکوسلوواکیہ میں اب سے ۲۰ سال قبل مختلف چھوٹی اور بڑی قوموں کو ملا کر ایک جمہوری اسٹیٹ بنایا گیا تھا۔ اس سیاسی حماقت کا جو انجام ہوا آج اُسے ساری دنیا دیکھ رہی ہے۔ سب سے بڑھ کر جن قوموں سے توقع تھی کہ ان کو مل کر ایک قوم بن جائے گی انہی نے مصنوعی قوم سازی کے نظریہ کی دھجیاں بکھیر دیں۔ اس نئی ریاست کے اصل اجزائے ترکیبی دو ہیں۔ ایک چیک (Czech)، دوسرے سلاوک (Slavaks)۔ نسل اور قومی روایات کے لحاظ سے دونوں بالکل مختلف ہیں۔ گزشتہ ہزار برس کی تاریخ میں کہیں ان کے درمیان کسی اور ارتباط کا نشان نہیں ملتا۔ صرف ایک چیز ان کے درمیان مشترک تھی۔ اور وہ یہ تھی کہ دونوں آسٹریا ہنگری کے غلام تھے۔ اور دونوں کو ظالم سلطنت کی نفرت اور آزادی کی خواہش نے ایک دوسرے سے قریب تر کر دیا تھا۔ سیاسی مدبرین یہ سمجھے کہ مشترک دشمن کی عداوت اور اس کے پنجہ سے آزادی حاصل کرنے کا مشترک جذبہ دو قوموں کو ایک قوم بنا دینے کے لیے کافی بنیاد ہے۔ چنانچہ انہوں نے

ان دونوں کو ملا کر ایک نئی قوم "چیکوسلاوک" وضع کر دی اور اس کو بالفعل موجود فرض کر کے
ان کی ایک قومی جمہوری ریاست بھی بنا دی۔ لیکن اس جدید ریاست کی تشکیل پر کچھ زیادہ
زمانہ نہ گزرا تھا کہ تجربے نے ثابت کر دیا کہ دو قوموں کو ساتھ ملا کر باندھ دینے سے ایک قوم
نہیں بن جایا کرتی۔ مصنوعی قومیت آزمائش کی کسوٹی سے رگڑ کھاتے ہی کھوٹی ثابت ہو گئی۔
چیک کثیر التعداد تھے، زیادہ تعلیم یافتہ اور زیادہ سرمایہ دار تھے، اور آسٹریا ہنگری کے مظالم
نے ان کو سلطنت کے ساتھ مذہب سے بھی متنفر کر دیا تھا۔ ان کے برعکس سلاوک لوگ سخت
پابند مذہب، تعلیم میں بہت پیچھے، زیادہ تر زراعت پیشہ اور خستہ حال، اور تعداد میں
بھی چیکوں کی بہ نسبت کم۔ اس تفاوت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر چیک اکثریت نے دستور
حکومت میں یہ طے کر دیا کہ قومی اسٹیٹ بالکل ایک غیر مذہبی اسٹیٹ (Secular State)
ہو گا۔ اس میں تمام مذاہب کے ساتھ رواداری تو ضرور برتی جائے گی، مگر کسی مذہب یا
مذہبی نظام کو سرکاری طور پر تسلیم نہ کیا جائے گا۔ تعلیم کا پورا نظام اسٹیٹ کے ہاتھ میں ہو گا۔
اور ایسی تعلیم دی جائے گی جو سائنٹیفک تحقیقات کے نتائج سے متصادم نہ ہوتی ہو۔[1]
دستور العمل کی ان دفعات سے فائدہ اٹھا کر چیک اکثریت کی حکومت نے سلاوک علاقے
کے مدارس میں لامذہب اسکول ماسٹر بھیجنے شروع کر دیئے اور نظام تعلیم سے مذہبی تعلیم کو
قطعی خارج کر دیا۔ سلاوک لوگوں نے اپنی مذہبی تعلیم کے لیے جداگانہ خود کوئی انتظام کرنا چاہا
تو اسے سرکاری امداد دینے سے انکار کر دیا گیا۔ حکومت کے نظم و نسق اور خصوصاً ذمہ
داری کے مناصب کو چیکوں کے لیے مخصوص کر دیا گیا، اور خود سلاوک علاقوں میں چیک
افسر حکمران بن کر آنے لگے۔ ان ہی باتوں نے آخرکار سلاوک لوگوں کو اس بات کا قائل کر دیا
کہ ایک چھوٹی اور ایک بڑی قوم کو ملا کر ایک قومی جمہوری اسٹیٹ بنانا دراصل چھوٹی قوم
کو بڑی قوم کی غلامی میں دینا ہے۔ چنانچہ اب وہ کئی سال سے اپنے علاقہ کے لیے
حکومت خود اختیاری (Autonomous Self Government) کا

---

[1] ملاحظہ ہو ۱۹۲۰ء کا چیکوسلاوک کانسٹی ٹیوشن دفعات ۱۱۹-۱۲۱-۱۲۲-۱۲۴۔

مطالبہ کر رہے ہیں[1]

اسی "قومی جمہوری ریاست" میں تقریباً ۲۵ لاکھ جرمن بھی شامل کر دیے گئے تھے (یعنی کل آبادی کا ۱/۴ حصہ) جن کی قومیت، نسل، زبان، تاریخی روایات چیک اور سلاوک دونوں قوموں سے بالکل مختلف تھیں، بلکہ صدیوں سے چیک اور جرمن نسل میں کھلی عداوت چلی آتی تھی۔ مدارس میں، کارخانوں میں، کلیساؤں میں، جہاں کہیں چیک اور جرمن جمع ہوتے وہاں اکثر ہنگامے ہو جایا کرتے تھے۔ ایک دوکان میں دونوں سے یکجا کام لینا مشکل تھا۔ حتیٰ کہ ایک اسٹیشن سے ان کا ریل پر سوار ہونا بھی دشوار تھا جس کی وجہ سے اکثر چھوٹے چھوٹے مقامات پر بھی دو اسٹیشن بنائے جاتے تھے۔ تاکہ ایک سے چیک سوار ہوں اور دوسرے سے جرمن[2]۔ اس قدر شدید اختلافات کے باوجود ان دونوں کو ایک قومیت میں شامل کر کے ایک قومی جمہوری اسٹیٹ بنا دیا گیا جس میں چیک اپنی اکثریت کی بنا پر حاکم اور جرمن اپنی اقلیت کی بنا پر محکوم تھے، حالانکہ صدیوں تک اسی سرزمین میں جرمن حاکم اور چیک محکوم رہ چکے تھے۔ اس کا نتیجہ جو کچھ ہوا اسے ابھی حال ہی میں ساری دنیا دیکھ چکی ہے۔ ثابت ہو گیا کہ محض ایک قومی اسٹیٹ بنا دینے سے دو مختلف قومیں ایک قوم نہیں بن سکتیں اور نہ ان میں ایک جمہوری اسٹیٹ بنا دینے سے جمہوریت کی حقیقی روح پیدا ہو سکتی ہے۔ البتہ مصنوعی طور پر دو قوموں کی ایک قومیت اور ایک جمہوریت بنا دینے کا یہ اور صرف یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ کثیر التعداد قوم عملاً قلیل التعداد قوم کو غلام اور جمہوری نظام میں اس کو حاکمیت کے فطری حقوق سے محروم کر کے رکھ دے۔ چیک اکثریت نے جرمن اقلیت کے ساتھ یہی کیا۔ تعلیم کے ذریعہ سے جرمنوں کو چیک قومیت میں جذب کرنے کی کوشش کی گئی۔ جرمن زبان و ادب کو مٹانے اور دبانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی گئی۔ سرکاری ملازمتوں میں جرمن اور چیک کا قومی امتیاز کبھی نہ بھولا گیا اور ہمیشہ چیکوں کو

---

[1] *The New Slavakia ; R. W. Seton Watson*

[2] *Europe Since 1815, by C. D. Hazen*

جرمنوں پر ترجیح دی گئی۔ تجارتی کاروبار اور سرکاری کاموں کے ٹھیکوں تک میں جرمنوں کو دبانے اور چیکوں کو بڑھانے کا ہر ممکن طریقہ اختیار کیا گیا۔ حتیٰ کہ خاص اُن علاقوں میں جہاں ۸۰ اور ۹۰ فی صدی جرمن آبادی تھی، سرکاری ضروریات کے لیے چیکوں کو ٹھیکے دیے جانے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سُڈٹین جرمنوں کی معاشی حالت روز بروز گرنی شروع ہو گئی اور ان کے کاروبار بیٹھنے لگے۔ یہ سب کچھ اُس قومی جمہوری اسٹیٹ میں ہوا جس کی "متحدہ وطنی قومیت" کا ایک جُزو یہ جرمن بھی تھے۔ جس کے جمہوری نظام میں ان کو دستور کی رُو سے پُورے شہری حقوق عطا کیے گئے تھے اور جس کی دولت مشترکہ (Common-Wealth) کی ملکیت میں یہ بھی ازروئے دستور یکساں حصہ دار تھے۔ لیکن ۲۰ سال کے تجربے نے بتا دیا کہ "قومی" اور "جمہوری" کے معنی لغت میں کچھ اور ہوتے ہیں اور حقیقت میں کچھ اور۔ آخر کار جرمنوں میں وہ عظیم الشان ہیجان رُونما ہوا جو قریب تھا کہ تمام دنیا کے امن و امان کو پھونک دیتا اگر عین وقت پر عقلمندی سے کام لے کر جرمنوں کو جرمنی کے حوالہ نہ کر دیا جاتا۔

اسی قسم کے حالات ان دوسرے ممالک کے بھی ہیں جہاں مختلف قوموں کو ایک قومیت فرض کر کے ایک جمہوری اسٹیٹ میں ضم کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر یوگوسلافیا کو لیجیے۔ انیسویں صدی کے آخری دور میں آسٹریا ہنگری کے غلامانہ تسلط سے نجات حاصل کرنے کے لیے کروٹ (Croats) اور سلافینی (Slovenes) قوموں میں آزادی کا زبردست جذبہ پیدا ہوا، اور انہوں نے اپنے ہمسایہ سربیوں (Serbs) سے اتحاد کر لیا۔ ان مختلف عناصر کے درمیان آسٹریا کی عداوت اور آزادی کی مشترک خواہش کے سوا اور کوئی وجہِ اتحاد نہ تھی۔ نسل میں اختلاف، مذہب میں اختلاف، زبان میں اختلاف، اور طرزِ زندگی میں اختلاف، مگر طلبِ آزادی کے نشے میں ان سب اختلافات کو نظر انداز کر کے یہ سب گھل مل گئے۔ اپنی متحدہ قومیت کا نام انہوں نے "یوگوسلافیا" رکھ لیا، اور اپنی الگ زبانوں کے نام ملا کر ایک متحدہ قومی زبان کا عجیب و غریب نام (Serbo-Croation Solovene) رکھا، جس کا مسمیٰ کہیں دنیا میں موجود

رہتا بلکہ تین الگ الگ زبانیں مختلف رسم الخطوں اور مختلف لسانی خصوصیات کے ساتھ موجود تھیں اور "ہندوستانی" کی طرح بس ان کا ایک متحدہ نام رکھ دیا گیا۔ جنگ عظیم کے دوران میں جب یہ تینوں قومیں آسٹریا ہنگری کے خلاف برسرپیکار ہوئیں تو جولائی ۱۹۱۷ء میں سربیا کے وزیر اعظم اور جگو سلاو کمیٹی کے صدر کا ایک مشترک بیان اس مضمون کا شائع ہوا کہ:

> "سرب کروٹ اور سلوینی ایک قوم ہیں۔ آئندہ کے لیے یہ اپنا ایک قومی اسٹیٹ بنانا چاہتے ہیں جو جمہوری اسٹیٹ ہوگا۔ اس متحدہ اسٹیٹ کا جھنڈا الگ ہوگا اور تینوں شرکا کے جھنڈے الگ الگ ہوں گے جن کی حیثیت مساویانہ ہوگی۔ اسی طرح سریلک (Cyrillic) اور لیٹن (latin) دونوں رسم الخط سرکاری طور پر مساوی ہوں گے اور مذاہب یعنی آرتھوڈوکس کیتھولک اور اسلام کا درجہ بھی مساویانہ تسلیم کیا جائے گا۔"

مگر جنگ ختم ہونے کے بعد جب آزادی ملی اور نومبر ۱۹۲۰ء میں نئی ریاست کی بنا رکھی گئی تو صورتِ حال کچھ اور ہی تھی۔ ریاست کی ایک کروڑ بیس لاکھ آبادی میں پچاس لاکھ کے قریب سرب تھے، تیس لاکھ کیتھولک کروٹس اور دس لاکھ سلاوینی۔ ان کے علاوہ جرمن، ہنگیرین، رومانی، بلغاری اور البانوی بھی کئی کئی لاکھ کی تعداد میں شامل ہو گئے تھے۔ اگرچہ ان سب کو ملا کر سربی گروہ اقلیت میں تھا، لیکن الگ الگ ہر گروہ کے مقابلہ میں اس کی بڑی اکثریت تھی، اور ان اقلیتوں کے درمیان کامل اتفاق نہ ہونے کی وجہ سے اس کی پوزیشن اور زیادہ مضبوط ہو گئی تھی۔ اس پوزیشن سے فائدہ اٹھا کر سربیوں نے عملاً حاکم قوم کی حیثیت اختیار کر لی، تمام اقلیتوں کو محکوم بنا لیا، متحدہ قومیت کا تخیل ہوا میں اڑ گیا، اور حکومت کے زور سے سربی قومیت تمام قلیل التعداد جماعتوں پر مسلط کی جانے لگی۔ تاسیسِ ریاست کے بعد پہلی مرتبہ جب ملک کا دستور بنانے کے لیے نیشنل کونسل منعقد ہوئی تو سربی قوم پرستوں نے یوگوسلافی قومیت کا لبادہ اتار کر

پھینک دیا اور خود مختار صوبوں کا ایک وفاق بنانے کے بجائے ایک مضبوط مرکزی طاقت رکھنے والی بادشاہی کی بنا رکھدی جس کا فرمانروا سربیا کا بادشاہ تھا اور جس کا پایۂ تخت سربیا کا پایۂ تخت تھا۔ آج اس "قومی جمہوری حکومت" کا کھلا ہوا مسلک یہ ہے کہ اقلیتوں کی قومیت کے ایک ایک نشان کو مٹا دے[1] اور تمام اقلیتیں تقریباً ۱۰ سال سے پیہم کوشش کر رہی ہیں کہ اس پھندے سے، جس کو خود انہوں نے خوشی خوشی پہنا تھا کسی طرح نکلیں۔

جمہوریت کے بڑے مرکز

ان چھوٹی ریاستوں کو چھوڑ کر ان بڑے ممالک کو لیجئے جو آج جمہوریت اور دستوریت کے ابوالآباء سمجھے جاتے ہیں۔ ان میں بھی جہاں کہیں مختلف مذاہب یا مختلف نسلی قومیتوں کو ملا کر ایک قومیت بنی ہے، جبر اور ظلم ہی سے بنی ہے اور قومی جمہوری اسٹیٹ وہاں اسی طرح بنا ہے کہ آبادی کے ایک کثیر التعداد اور منظم گروہ نے چھوٹے گروہوں پر زبردستی اپنی خواہشات اور اپنے اصولوں کو مسلط کیا اور ان کے امتیازی وجوہ کو مٹا کر رکھ دیا۔

سوئس قوم اور اس کی جمہوری وفاقی ریاست کس طرح بنی؟ ابتداءً ۲۲ آزاد جمہوری ریاستوں کا محض ایک تحالف (Confederation) تھا۔ انیسویں صدی کی ابتداء میں مذہبی آزاد خیالی کے اثرات سوئٹزرلینڈ پہنچے اور مذہب کو تعلیم اور سیاست دونوں سے خارج کرنے کا ارادہ کیا گیا۔ سات کیتھولک ریاستوں نے اس کی مخالفت کی،

---

[1] تفصیلات کے لیے حسب ذیل کتابیں ملاحظہ ہوں:-

۱:- *Europe Since 1815 by C. D. Hazen*

۲:- *The New Democratic Constitution of Europe by A. H. Morley*

۳:- *Encyclopaedia Britannica, Article Yogoslovia*

۵ آزاد خیال ریاستوں نے ان پر زبردستی اپنے خیالات کو مسلط کرنا چاہا جس کا انہیں ازروئے آئین کوئی حق نہ تھا۔ آخر ۱۸۴۷ء میں ساتوں کیتھولک ریاستیں تحالف سے الگ ہوگئیں اور تحالف کے اصول کی رو سے وہ پوری طرح اس کی مجاز تھیں۔ مگر آزاد خیال ریاستوں نے اپنی غالب اکثریت سے ان کے اس فعل کو ناجائز ٹھیرایا اور ان کے علاقوں پر حملہ کر کے انہیں زبردستی ایک وفاقی اسٹیٹ میں شامل ہونے پر مجبور کر دیا۔ پھر ۱۸۴۸ء میں جو نیا دستور بنایا گیا اس میں وفاقی ریاستوں کے اختیارات محدود کر کے مرکز کے اختیارات نہایت وسیع کر دیے گئے، تا کہ اکثریت پوری طرح اقلیت پر اپنی مرضی اور اپنے اصولوں کو نافذ کر سکے اور اقلیت مجبور ہو کر اس واحد قومیت میں اپنے آپ کو گم کر دے جسے آزاد خیال لوگ (Radicals) وجود میں لانا چاہتے تھے[1]

برطانیہ میں کیا ہوا؟ انیسویں صدی کے ثلث اول تک برطانیہ عظمیٰ میں انتخاب کا قانون اس قسم کا تھا کہ انگلینڈ کو، اسکاٹ لینڈ، ویلز اور آئرلینڈ تینوں کی مجموعی طاقت سے قریب قریب تین گنی زیادہ اکثریت پارلیمنٹ میں حاصل ہوتی تھی۔ انگلستان کی صرف ایک کاؤنٹی (کارنوال) کے نمائندے پورے اسکاٹ لینڈ کے نمائندوں کے برابر تھے حالانکہ اسکاٹ لینڈ کی آبادی کارنوال سے آٹھ گنی تھی۔ کوئی یہودی اور کوئی ایسا شخص جو اینگلیکن چرچ کو نہ مانتا ہو ازروئے قانون نہ تو پارلیمنٹ کا ممبر بن سکتا تھا، نہ کسی سرکاری عہدے پر مامور ہو سکتا تھا اور نہ کسی میونسپلٹی میں داخل ہو سکتا تھا۔ ان سب فرقوں کو چرچ آف انگلینڈ کے لیے عشر دینا پڑتا تھا۔ نکاح کے لیے چرچ آف انگلینڈ کے پادری کے پاس جانا ہوتا تھا۔ اپنی عبادت گاہ کو چرچ آف انگلینڈ میں رجسٹر کرانا پڑتا تھا۔ آکسفورڈ اور کیمبرج میں داخلہ کے لیے ایسی مذہبی شرائط رکھی گئی تھیں جنہیں اینگلیکن چرچ کے پیروؤں کے سوا کوئی پورا نہ کر سکتا تھا اس لیے ان دونوں یونیورسٹیوں کے دروازے گویا دوسرے فرقوں کے لیے بند تھے۔ چرچ آف

---

[1] Cambridge Modern Hisosry

انگلینڈ کو نہ ماننے والے لوگ ووٹ دینے کے حق دار تو تھے مگر وہ اپنے ہم مذہب لوگوں کو ووٹ نہ دے سکتے تھے کیونکہ انہیں پارلیمنٹ میں داخل ہونے کی اجازت ہی نہ تھی۔ ۱۸۲۸ء میں ان قیود کو اٹھانے اور نرم کرنے کا میلان پیدا ہوا اور قریب قریب ۹۰ برس کی مسلسل اور تدریجی اصلاح نے بالآخر ان کو بالکلیہ منسوخ کیا۔ اس قسم کی تھی وہ جابرانہ طاقت، اور اس قسم کا تھا وہ مادی و اخلاقی غلبہ جس سے انگلینڈ کے لوگوں نے برطانیہ عظمیٰ کی مختلف قوموں اور مختلف مذہبی جماعتوں کو مغلوب کر کے اپنی تہذیب اور اپنی قومیت میں جذب کیا اور وہ واحد قومیت بنائی جسے آج "ایک ملک اور ایک قوم" کا نعرہ بلند کرنے والے سب سے پہلے مثال میں پیش کرتے ہیں۔ شاید کہ ان کے پیش نظر بھی ایک قوم بنانے کے ایسے ہی طریقے ہوں گے۔

یہاں مثالوں کا استقصاء مقصود نہیں ہے۔ اگرچہ عہدِ حاضر کی تاریخ اور خود ہمارے موجودہ دور کے واقعات سے ایسی ہی بکثرت مثالیں اور بھی پیش کی جاسکتی ہیں۔ مگر جو بات میں ثابت کرنا چاہتا ہوں اس کے لیے یہی مثالیں بہت کافی ہیں۔ ان سے بآسانی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مختلف قوموں کو ایک قوم قرار دے کر ایک جمہوری اسٹیٹ بنانے کے معنی کیا ہیں۔ اور یہ بات جو بظاہر نہایت معصوم الفاظ میں بیان کی جاتی ہے اس میں کس قدر غیر معصوم مقصد پوشیدہ ہوتا ہے۔

اب ذرا ہندوستان کے حالات پر ایک نظر ڈالیے اور دیکھیے کہ یہاں ایک قومی، جمہوری، لادینی اسٹیٹ بنانے کے معنی کیا ہو سکتے ہیں۔

ہندوستان اور قومی ریاست

جمہوری اسٹیٹ کے معنی یہ ہیں کہ تمام باشندگانِ ہند کو اسٹیٹ میں حاکمیت حاصل ہو مگر عملاً اس حاکمیت کو وہ جماعت استعمال کرے جو اکثریت میں ہو۔

جمہوری کے ساتھ "قومی" کی قید لگانے سے یہ نتیجہ نکلا کہ یہاں مختلف قومیتوں کے وجود کی نفی کر دی جائے اور تمام باشندوں کو ایک قوم قرار دیا جائے۔ دوسرے الفاظ میں اس کے معنی یہ ہوتے کہ ہندوستان کی حکومت میں کسی شخص کا حصہ اس حیثیت سے نہ

ہوگا کہ وہ ہندو یا مسلمان ہے۔ اسٹیٹ کی رکنیت میں شامل ہونا خود بخود اس امر کو مستلزم ہوگا کہ وہ اپنے ہندو یا مسلمان ہونے کی حیثیت کی خود نفی کر دے۔ اس کی جُداگانہ قومی حیثیت خواہ بالفعل برقرار رہے، مگر وہ اس حیثیت میں اسٹیٹ سے کسی چیز کا مطالبہ نہ کر سکے گا، بلکہ اسے اُن فیصلوں کو قبول کرنا ہوگا جو مجموعی طور پر ملک کے باشندوں کی اکثریت ملک کی مجالس قانون ساز میں طے کر دے۔

لادینی کی قید اس میں ایک اور چیز کا اضافہ کرتی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص اور کوئی گروہ کسی مذہب کا پیرو ہونے کی حیثیت سے اسٹیٹ میں حصہ دار نہیں ہے۔ وہ اسٹیٹ کے دائرے میں اپنی اس حیثیت کو لے کر بھی نہیں آ سکتا۔ اس دائرے میں اس کو خود اپنی اس حیثیت کی نفی کرنی ہوگی۔ اخلاق، تمدّن، معاشرت، معیشت، تعلیم اور زندگی کے دوسرے مسائل کے متعلق اس کے اپنے نظریات خواہ کچھ ہوں، وہ ان سب کو اس وقت بھلا دینے پر مجبور ہوگا جب باشندوں کی اکثریت ان مسائل میں کوئی دوسرا نظریہ اختیار کرے گی، وہ اس وقت یہ نہ کہہ سکے گا کہ میرے مذہب اور میری تہذیب کا نظریہ دوسرا ہے اور میں اکثریت کے نظریہ کو قبول نہیں کر سکتا۔ اگر وہ ایسا کہے گا تو اس کو جواب دیا جائے گا کہ اسٹیٹ میں جناب کا حصہ اس حیثیت سے ہے ہی کہاں کہ آپ فلاں مذہب اور فلاں تہذیب کے پیرو ہیں، مجلس قانون ساز میں آپ ایک مذہبی آدمی کی حیثیت سے آئے کب ہیں کہ آپ کو اس قسم کے عذرات پیش کرنے کا حق حاصل ہو۔ یہاں تو آپ کی حیثیت محض ہندوستانی ہونے کی ہے اور جمہوریت کا اصول آپ تسلیم کر چکے ہیں۔ لہذا ہندوستانیوں کی اکثریت جو نظریہ رکھتی ہے اسے طوعاً و کرہاً آپ کو قبول ہی کرنا ہوگا۔ اس پر مزید یہ کہ اگر وہ اپنے گروہ کی حد تک اپنی مذہبی تنظیم کرنے کے لیے حکومت کے وسائل و ذرائع میں سے کوئی حصہ مانگے گا تو اس سے کہہ دیا جائے گا کہ جناب یہ کوئی مذہبی اسٹیٹ نہیں ہے، ایک دنیوی لادینی اسٹیٹ ہے۔ اس کی حاکمیت میں جب آپ کا کوئی حصہ مذہبی آدمی ہونے کی حیثیت سے ہے ہی نہیں تو آپ کو مذہبی تنظیم کے لیے حکومت کے اختیارات اور وسائل و ذرائع میں سے کوئی حصہ کیسے مل سکتا ہے۔ آپ کو یہ کام کرنا ہے تو

جاہیئے، خود اپنے مذہبی گروہ کے وسائل سے کیجئے۔

یہ نتائج تو محض ان تین اصطلاحوں کے معانی پر غور کرنے سے حاصل ہوتے ہیں۔ اب عملی حیثیت سے دیکھیے تو یہ تصویر اور زیادہ خوفناک ہو جاتی ہے۔ اوپر میں بیان کر چکا ہوں کہ جمہوری نظام کے صحیح یا غلط ہونے کا تمام تر انحصار اس سوال پر ہے کہ اس میں اکثریت اور اقلیت کس طرح بنتی ہے، اگر باشندوں کے درمیان زندگی کے بنیادی مسائل (Fundamentals) میں اتفاق ہے، اور صرف وسائل و طریقہ ہائے کار (Means and Methods) میں اختلاف آرا پایا جاتا ہے، تب تو اکثریت اقلیت میں اور اقلیت اکثریت میں تبدیل ہوتی رہے گی۔ نہ کوئی اکثریت مستقل اور دائمی ہوگی نہ اقلیت۔ ایسی حالت میں اس امر کا کوئی خطرہ نہیں کہ اکثریت ظلم و استبداد کا طریقہ اختیار کرے اور اقلیت کو حاکمیت سے محروم کر کے اسے غلام اور محکوم بنا لے۔ لیکن اگر صورتِ حال برعکس ہو۔ اگر باشندوں کے درمیان زندگی کے اساسی امور میں اختلاف ہو، اور اس اختلاف نے ان کو الگ الگ ممتاز گروہوں میں تقسیم کر دیا ہو اور ان گروہوں میں ترجیح ہم جنس کی اسپرٹ پائی جاتی ہو، اور اس گروہ بندی نے ان کی دنیوی اغراض کو بھی بڑی حد تک ایک دوسرے سے متصادم کر دیا ہو، تو ایسی جگہ اکثریت دائمی اکثریت ہو گی اور اقلیت دائمی اقلیت ہوگی۔ وہاں رائے عام کو ہموار کر کے اقلیت کا اکثریت بن جانا غیر ممکن ہے۔ وہاں سب باشندوں کو ایک قوم قرار دینے اور اس بنیاد پر جمہوری لادینی اسٹیٹ بنانے کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں کہ اکثریت کو اقلیت پر ظلم کرنے اور اس کو غلام بنا کر رکھنے اور تباہ و برباد کرنے کا لائسنس دیا جاتا ہے۔ وہاں قومی اسٹیٹ دراصل اکثریت کی قوم کا اسٹیٹ ہوگا، اور لادینی ہوگا تو اس میں اکثریت کو نہیں بلکہ صرف اقلیت کو اپنی جداگانہ قومی حیثیت اور اپنی مذہبیت کی نفی کرنی ہوگی۔ اکثریت اپنی ان سب حیثیتوں کو برقرار رکھ کر سب کچھ کر سکے گی، مگر اقلیت اپنے مذہب کا یا اپنی تہذیب یا زبان و ادب و فلسفہ کا نام نہ لے سکے گی۔ ایسی جگہ تمام باشندوں کو ایک قوم قرار دینے کے معنی یہ نہیں کہ وہ فی الواقع ایک قوم ہیں، بلکہ اس کے معنی دراصل یہ ہیں کہ جو قوم کثیر التعداد

ہے وہ جمہوری اسٹیٹ کی تمام طاقتوں پر قابض ہو کر قلیل التعداد جماعتوں کی قومیتوں کو مٹانا اور اپنی قومیت میں جذب کر کے ایک قوم بنانا چاہتی ہے۔

آنکھیں کھول کر انصاف کی نظر سے دیکھئے۔ کیا ہندوستان میں فی الواقع یہی صورت حال موجود نہیں ہے[1]؟

۱- ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ یہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان قومیت کا اختلاف اُس اختلاف سے بھی زیادہ نمایاں پایا جاتا ہے جو یورپ میں جرمن اور فرنچ اور انگریز اور اطالوی قوموں کے درمیان ہے۔ وہاں کم از کم اخلاقی شعور ایک سا ہے تہذیب کے بنیادی اصول ایک ہیں، اور آداب و اطوار اور طرز زندگی میں بھی اساسی اختلافات موجود نہیں ہیں، یا اگر ہیں بھی تو بہت خفیف۔ مگر یہاں آٹھ سو برس تک ایک آب و ہوا اور ایک خطۂ زمین میں پہلو بہ پہلو رہنے کے باوجود قوموں کی زندگی کے دھارے الگ الگ بہ رہے ہیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو دیہاتی ہندوؤں اور مسلمانوں کو کچھ ایک جیسے لباس پہنتے دیکھ کر اور معیشت کے میدان میں ایک ساتھ محنت مزدوری کرتے دیکھ کر حکم لگا سکتے ہیں کہ یہ ایک قوم ہیں۔ وہ ہندوستان میں پیدا تو بے شک ہوئے ہیں مگر ان کا دماغ انگلستان میں بنا ہے اور اس پر روسی دانش تازہ تازہ چڑھا ہے، اس لیے وہ رات دن ہندوستانیوں میں رہ کر بھی ان کو صرف اُوپر سے اور باہر سے ہی دیکھ سکتے ہیں جس طرح کوئی امریکن سیاح دیکھ لیتا ہے۔ وہ ان کے دل میں اُتر کر اور ان کی زندگی میں گھس کر نہیں دیکھ سکتے کہ ان کے درمیان کتنا بڑا اور گہرا تفاوت ہے۔ دونوں قوموں کے جذبات و احساسات ایک دوسرے سے

---

[1] آزادی کے بعد سے بھارت میں اقلیتوں اور خصوصاً مسلمانوں کے ساتھ جو سلوک ہو رہا ہے وہ اس صورتِ حال کا کھلا ثبوت ہے۔ جماعت اسلامی اور مسلم لیگ کو لال بہادر شاستری وزیر داخلہ ہند نے جو دھمکی دی ہے وہ پاکستان ٹائمز مورخہ ۳ جون ۶۲ء آخری صفحہ پر ملاحظہ ہو۔ (مرتب)

اس قدر مختلف بلکہ باہم متصادم ہیں کہ ہندو جس چیز کو الٰہی تقدیس و احترام کی نظر سے دیکھتا ہے، مسلمان اس کو شوق سے کھاتا ہے۔ اور یہ فرق گاندھی جی اور مولانا ابوالکلام سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے گاؤں کے جلاہے اور پاسی تک کے درمیان یکساں ہے بلکہ مہاتما اور مولانا تو اس باب میں مدارات سے بھی کام لے سکتے ہیں، لیکن گاؤں والے اس پر لٹھ چلا بیٹھتے ہیں۔ شہری ہندو اور مسلمان تو کبھی کبھار ایک میز پر کھا بھی لیتے ہیں، مگر دیہاتی ہندو تو مسلمانوں کا ہاتھ لگا ہوا پانی تک نہیں پیتا۔ وہ ریل میں بھی اس تختہ پر جہاں مسلمان کھانا کھا چکا ہو بادلِ نخواستہ ہی بیٹھتا ہے، اور دل میں چھی چھی کرتا رہتا ہے۔ ان دونوں کی زندگی کے اندر داخل ہونے والے دروازے ایک دوسرے کے لیے بالکل بند ہیں۔ پیدائش سے لے کر موت تک ہر رسم، ہر تہوار، ہر خوشی اور ہر غمی میں ہندو ہندو کے ساتھ ہوتا ہے اور مسلمان مسلمان کے ساتھ۔ ان بیّن اختلافات کے ہوتے ہوئے کون انہیں ایک کہہ سکتا ہے؟

۲۔ منڈی اور دفتر اور کارخانے میں یہ دونوں یکجا ضرور ہوتے ہیں، مگر کیا ان کے قومی اختلاف کا اثر ان کے معاشی مفاد اور کاروباری اغراض میں ظاہر نہیں ہوتا؟ تخیل کی بلندیوں پر پہنچ کر کہنے والا جو چاہے کہہ دے اور لکھنے والا جو چاہے لکھ دے، مگر روزمرہ کے کاروبار میں جو کچھ ہو رہا ہے اسے کاروباری زندگی کے اندر اتر کر دیکھیے اور جو لوگ یہاں کام کر رہے ہیں ان سے پوچھیے کیا آدمی کو ملازم رکھنے میں اور مزدور سے خدمت لینے میں اور دوسرے چھوٹے اور بڑے معاملات میں ہندو اور مسلمان کی تمیز نہیں کی جاتی؟ کیا دیہاتی آبادیوں تک میں مسلمانوں کا تمدنی اور اقتصادی بائیکاٹ نہیں ہو رہا ہے؟ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ جو پیشے مسلمانوں کے ہاتھ میں تھے ان کے لیے ہندو تیار کیے جاتے ہیں تاکہ مسلمانوں سے کام نہ لینا پڑے؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ آڑھت کے کاروبار میں مسلمانوں کا گھسنا قریب قریب ناممکن کر دیا گیا ہے، اور اگر کوئی مسلمان آڑھتیہ منڈی میں آتا ہے تو پوری ہندو برادری اس کا دیوالہ نکلوانے کے لیے متحد ہو جاتی ہے؟ پھر کیا ابھی حال ہی میں سارے ہندوستان میں

یہ نہیں دیکھا کہ پنجاب کے جدید زرعی قوانین پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے معاشی مفاد مرتبا ایک دوسرے کی ضد نکلے؟ سود خواروں کے غاصبانہ تسلط سے زمینداروں کا نکلنا مسلمانوں کے نزدیک رحمت تھا تو ہندو کے نزدیک لعنت، اور اس تقسیم میں ہندو اور مسلمان اس طرح ایک دوسرے کے مقابل آکھڑے ہوئے کہ بہت سے کانگریسی خیال کے مسلمان مسلمانوں کے ساتھ تھے اور قریب قریب تمام کانگریسی ہندو ——— بھولا بھائی ڈیسائی تک ——— ہندوؤں کے ساتھ کیا یہ اس امر کا صریح ثبوت نہیں ہے کہ معاشی معاملات میں بھی دونوں قوموں کی اغراض بڑی حد تک متصادم ہیں؟

۳- پھر کیا کسی سیاسی معاملہ میں یہ لوگ قومی امتیاز اور ترجیح ہم جنس کا طریقہ برتنے سے بچے ہوئے ہیں؟ بیشمار مثالوں کو چھوڑ کر میں صرف کانگریس کے حدودِ عمل سے چند مثالیں پیش کرتا ہوں، اس لیے کہ یہی جماعت ہندوستانی قومیت کی مدعی ہے، اور اس لیے بھی کہ اس کے دائرے میں جو قومی امتیاز پایا جاتا ہے اس کا الزام برطانوی سامراج کے سر تھوپنے کی جرأت شاید پنڈت جواہر لال بھی نہیں کر سکتے۔

۱: بہار اسمبلی میں ۲۹ اپریل ۳۸ء کو خود کانگریسی حکومت نے سوال نمبر ۶۶۹ کا جواب دیتے ہوئے اعتراف کیا کہ صوبہ بہار کی ۲۲ میونسپل کمیٹیوں میں مخلوط انتخاب کے ذریعہ ۲۹۹ نشستوں میں سے ۴۷ نشستیں مسلمانوں کو ملیں اور ۲۵۲ ہندوؤں کو، درانحالیکہ تناسب آبادی کے لحاظ سے کم از کم ۹۲ نشستیں مسلمانوں کو ملنی چاہیے تھیں، کیونکہ ان میونسپلٹیوں کے حدود میں مسلمانوں کی آبادی تقریباً ۳۲ فی صدی ہے۔ یہ تو انتخابی نشستوں کا حال تھا۔ خود اس کانگریسی حکومت نے نامزدگی سے جو نشستیں پُر کیں ان کے متعلق خود اس کا اپنا اعتراف ہے کہ ۷۵ میں سے ۶۱ غیر مسلموں کو اور صرف ۱۴ مسلمانوں کو دی گئیں، حالانکہ تناسب آبادی کے لحاظ سے ۲۵ نشستیں مسلمانوں کو ملنی چاہیے تھیں (ملاحظہ ہو سوال نمبر ۷۰۲ کا جواب۔ مورخہ ۲۹ اپریل ۳۸ء)

۲: سی۔ پی کے ضلع بلڈانہ میں تعلقہ بورڈ کے ۷۲ حلقے ہیں اور ان میں سے کسی حلقہ میں بھی مخلوط انتخاب کے ذریعہ سے کوئی مسلمان منتخب نہ ہو سکا (ملاحظہ ہو

قاضی سید محمود علی صاحب ملکاپوری کا خط مہاتما گاندھی کے نام جو ۵ ستمبر ۳۸ء کے اخبار "مدینہ" میں شائع ہوا ہے)

۳۔ سی پی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ارکان کا جو انتخاب ہوا اس میں مخلوط انتخاب کی وجہ سے ایک مسلمان بھی منتخب نہ ہو سکا اور نہ کسی اچھوت پر کانگریسی ہندوؤں کی نظرِ انتخاب پڑ سکی۔ (ملاحظہ ہو سی پی کے کانگریسی مسلمانوں کا شکایت نامہ۔ مدینہ ۸ جولائی ۳۸ء)

۴۔ اسی صوبۂ متوسط میں ایک درجن سے زیادہ میونسپل کمیٹیاں ایسی ہیں جن میں ایک مسلمان بھی مخلوط انتخاب کی وجہ سے منتخب نہیں ہوا۔ یہی حال اکثر لوکل اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کا ہے کہ وہ منتخب شدہ مسلمان نمائندوں سے بالکل خالی ہیں (ملاحظہ ہو مسٹر تاج الدین کا مراسلہ۔ اسٹار آف انڈیا مورخہ ۲ جولائی ۳۸ء۔ نیز یہ خیال رہے کہ صاحب مراسلہ صوبۂ متوسط کے مشہور نیشنلسٹ مسلمان ہیں)

۵۔ خود کانگریس ہائی کمانڈ انتخاب کے معاملہ میں جو ذہنیت رکھتی ہے اس کا حال کانگریسی صوبوں کی وزارتوں پر ایک نظر ڈالنے ہی سے کھل جاتا ہے۔ جن صوبوں میں ہندو اکثریت ہے وہاں ہندو وزیراعظم ہیں اور جہاں مسلمان اکثریت ہے وہاں مسلمان کو وزیر انتخاب کیا گیا ہے۔ ہندو اکثریت کے کسی صوبے میں کوئی کٹے سے کٹا وطن پرست بھی اسلامی نام سے موسوم ہونے اور اسلامی سوسائٹی کے تعلق رکھنے سے متہم ہونے کی بدولت وزارتِ عظمیٰ پر بار نہ پا سکا۔ حتیٰ کہ بچارے ڈاکٹر سید محمود بھی اس شرف سے محروم رہے حالانکہ اگر ان کا نام محمود کے بجائے سنہا ہوتا تو یقیناً ان کی وطن پرستانہ خدمات ایسی تھیں کہ وہی وزیراعظم بنائے جاتے۔ اس کے بعد وزیروں اور پارلیمنٹری سکرٹریوں کی فہرست اٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ زیادہ تر اسی تناسب آبادی کا لحاظ کیا گیا ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ صرف فرقہ پرست ہی اس کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ بلکہ بعض جگہ تناسب آبادی سے بھی کم مسلمان لیے گئے ہیں۔

کیا یہ کھلی ہوئی علامات اس امر کی نہیں ہیں کہ جماعات کے دائرے میں بھی خود

متحدہ قومیت کے علمبرداروں کے ہاں قومی امتیاز اور ترجیح ہم جنس کی اسپرٹ پوری طرح موجود ہے۔ ایسی حالت میں واحد قومیت کے اصول پر جمہوری اسٹیٹ بنانے کے معنی اس کے سوا کیا ہو سکتے ہیں کہ جہاں مسلمان کثیر التعداد ہیں وہاں وہ ہندوؤں کو اور جہاں ہندو کثیر التعداد ہوں وہاں مسلمانوں کو اسٹیٹ کے کاروبار سے بے دخل کر دیں، اور چونکہ مجموعی طور پر ہندوؤں کی اکثریت ہے اس لیے وہ قومی اسٹیٹ کو ہندو قوم کا اسٹیٹ بنانے میں کامیاب ہو جائیں۔

۱۴۔ متحدہ قومیت کے اس سراسر جھوٹے دعوے پر جو قومی، جمہوری، لادینی اسٹیٹ بنایا جاتا ہے وہ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں مسلمانوں کے لیے تو بلاشبہ غیر مسلم اسٹیٹ ہو گا، مگر ہندوؤں کے لیے لازم نہیں کہ وہ غیر ہندو اسٹیٹ ہو، بلکہ اپنی اکثریت کے بل پر وہ اس کو ایک ہندو اسٹیٹ بنا سکتے ہیں، اور واقعات سے روز بروز عیاں ہوتا جاتا ہے کہ وہ ایسا ہی کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس کے ثبوت میں صرف ایک صوبہ کے چند واقعات بطور نمونہ پیش کروں گا۔

الف۔ سی۔ پی کی کانگریسی حکومت کے متعلقہ بورڈ چاندور کا ہندو چیرمین ۲۲ ستمبر ۱۹۳۸ء کو تمام مدارس کے نام سرکلر (نمبر ۳۳۶) جاری کرتا ہے جس میں حکم دیا جاتا ہے کہ "مہاتما گاندھی کی سالگرہ کے دن بچے اور استاد سب مل کر ان کی پوجا کریں۔" یہ سرکلر بلا امتیاز ہندو مسلم سب مدارس کو سرکاری طور پر بھیجا جاتا ہے اور اس پر کوئی باز پرس نہیں ہوتی۔

ب۔ اسی صوبہ کی کانگریسی حکومت محکمہ پولیس کے حکام کو (جن میں ہندو اور مسلمان سب شامل ہیں) ہدایت نامہ بھیجتی ہے کہ جس جلسہ یا تقریب میں "بندے ماترم" کا گیت گایا جاتے اور وہ وہاں موجود ہوں تو انہیں بھی عام حاضرین کے ساتھ قیام تعظیمی کرنا چاہیے۔ اس واقعہ کو خود وزیر اعظم نے اپنے ایک پریس نوٹ میں تسلیم کیا ہے (ٹائمز آف انڈیا مورخہ ۹ جون ۱۹۳۸ء)

ج۔ ساگر (صوبہ متوسط) کی میونسپل کمیٹی کا صدر مسلمان طلبہ کو تنبیہ کرتا ہے کہ اگر وہ

بندے ماترم گانے میں شریک نہوں گے تو انہیں مدرسے سے نکال دیا جائے گا۔ اس واقعہ کو بھی خود سی۔ پی کے وزیر اعظم نے مذکورہ بالا پریس نوٹ میں تسلیم کیا ہے۔

د :۔ اسی صوبہ کے ایک سرکاری مدرسہ میں انجمن ترقی اردو کے نمائندے نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ مسلمان بچے ہندو بچوں کے ساتھ سرسوتی کی پوجا کر رہے تھے، اور ان کو سلام کرنے کے بجائے ہاتھ جوڑ کر "جے رام جی کی" کہنا سکھا دیا گیا تھا (ملاحظہ ہو مولوی عبدالحق صاحب سیکرٹری انجمن ترقی اردو کا خط گاندھی جی کے نام۔ اخبار "پیام" مورخہ یکم ستمبر ۳۸ء)

ہ :۔ خود کانگریس کا نسٹی ٹیوشن میں برار کو اس کا مشہور و معروف نام چھوڑ کر "ودربھا" اور صوبہ متوسط کو "مہا کوشل" سے موسوم کیا گیا ہے۔ گویا کہ اب رامائن کا عہد ہندوستان میں واپس آ رہا ہے۔

و :۔ مسٹر شریف، وزیر صوبہ متوسط کا واقعہ ابھی سب کے حافظہ میں موجود ہے۔ انہوں نے ایک مسلمان کو رہا کر دیا تھا جسے ایک ہندو لڑکی کے ساتھ زنا کرنے کے الزام میں عدالت سے سزا ہوئی تھی۔ اس جرم کی پاداش میں کانگریس ہائی کمانڈ نے ان کو وزارت سے معزول کر دیا۔ مگر فسادات جبل پور کے سلسلہ میں جو ہندو ملزمین ۴ مسلمانوں کے قتل کے الزام میں ماخوذ تھے، ان کو سی۔ پی کی ہندو وزارت نے حکماً رہا کر دیا اور اس پر ڈسپلن کے ان دیوتاؤں کو جن سے ہائی کمانڈ مرکب ہے، کسی باز پرس کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ حال ہی میں ہوشنگ آباد کے ایک ہندو بابو سنگھ کو جسے ایک جوان لڑکی کو زہر دے کر مار ڈالنے کی پاداش میں ہائیکورٹ سے سزائے موت کا حکم ہوا تھا، سی۔ پی کے ہندو وزیر مسٹر ڈی کے مہتا نے رہا کر دیا، اور اس پر بھی ہائی کمانڈ کو کسی تحقیقات اور کسی تادیبی کارروائی کا خیال نہ آیا۔

ز :۔ اسی صوبہ میں محض اکثریت کے زور پر ودیا مندر اسکیم نافذ کی جا رہی ہے، اور مسلمانوں کی مخالفت کا استخفاف کرنے میں گاندھی اور شکلا اور ہائی کمانڈ سب متفق ہیں۔

ان واقعات کے علاوہ بہار، یو۔ پی، مدراس اور سی۔ پی میں قربانی گاؤ کو حکماً بند کرنے، اور ہندی کو "ہندوستانی" کے پر فریب نام کی آڑ میں بزور رائج کرنے، اور زبان سے عربی و فارسی زبان زد عام الفاظ کو نکال کر نئے غیر مانوس الفاظ گھڑنے، اور سرکاری ملازمتوں

میں کھلم کھلا امتیاز برتنے کے واقعات اس قدر کثیر ہیں کہ ان سب کو یہاں نقل کرنا موجب تطویل ہوگا۔ جو کچھ ہمیں ثابت کرنا تھا اس کے لیے مذکورۂ بالا شواہد کافی ہیں۔

اب ہر شخص خود بخود یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ جس "جنگِ آزادی" کی منزلِ مقصود مسلمانوں کے قومی مفاد بلکہ ان کی قومی ہستی ہی سے منافات کی نسبت رکھتی ہو اس میں کوئی مسلمان کس طرح حصہ لے سکتا ہے۔ مسلمانوں کو آخر اتنا بیوقوف کیوں فرض کیا گیا ہے کہ وہ اس نوعیت کے اسٹیٹ کو خود اپنے سر پر مسلط کرنے کے لیے جنگ کریں گے؟ کہیں وہ لوگ خود ہی تو عقل باختہ و حواس ربودہ نہیں ہو گئے ہیں جو ایک قوم سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ جانتے بوجھتے اپنی قبر آپ کھودنے میں جانفشانی دکھائے گی؟

بنیادی حقوق

کہا جاتا ہے کہ اِس قومی، جمہوری، لادینی اسٹیٹ میں مسلمانوں کے مفاد کی حفاظت کے لیے وہ بُنیادی حقوق (Fundamental Rights) بالکل کافی ہوں گے جن کا اعلان کراچی کانگریس میں کیا گیا تھا۔ مگر کیا یہ حقیقت ہے؟

بنیادی حقوق کا ماخذ ۱۶۸۹ء کا اعلان اہلِ انگلستان ہے جسے ایک طویل نزاع اور کشمکش کے بعد رعایا کے نمائندوں کی ایک مجلس (Convention) نے وضع کیا تھا تاکہ حکومت کے مستبدانہ افعال کی روک تھام کی جائے اور حکومت و رعیت کے درمیان کچھ حدود متعین کر دیئے جائیں جنہیں توڑا نہ جا سکے۔ اس کے بعد امریکہ کے "اعلانِ آزادی" اور "اعلان حقوقِ انسانی" میں انہیں حقوق کو بطور اصولِ عامہ کے درج کیا گیا۔ پھر ۱۸۳۱ء کے دستور نامہ بلجیم میں ان کو شامل کیا گیا، اور اس کے بعد سے یہ گویا ایک قاعدہ سا بن گیا ہے کہ ہر دستور میں باشندوں کے ان حقوق کی تصریح کر دی جاتی ہے۔ چنانچہ جدید زمانہ کا کوئی دستور ان سے خالی نہیں ہوتا، بلکہ ہر بعد کے دستور میں چند حقوق کا اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ خلاصہ ان سب کا یہ ہے کہ:-

"قانون کی نگاہ میں سب باشندے مساوی ہیں کسی شخص کو کسی قسم

کی سزا نہیں دی جا سکتی۔ جب تک کہ وہ قانون کی خلاف ورزی نہ کرے، اور سزا قانون ہی کے مطابق دی جا سکتی ہے۔ حکومت رعایا کی شخصی آزادی اور جائداد میں صرف قانون ہی کے ذریعہ سے مداخلت کر سکتی ہے۔ تقریر اور نشر و اشاعت کی عام آزادی ہوگی بشرطیکہ وہ قانون تہذیب (Law of Libel) کے خلاف نہ ہو۔ ڈاک اور تار کے پیغامات میں رازداری قائم رکھی جائے گی۔ باشندوں کو اجتماع کا حق حاصل ہوگا، بشرطیکہ غیر مسلح ہوں اور امنِ عام کو نقصان نہ پہنچائیں۔ انتخابات آزاد ہوں گے۔ پارلیمنٹ کے ارکان باز پرس سے محفوظ رہیں گے۔ ان کو گرفتار نہیں کیا جا سکتا اِلّا یہ کہ کوئی ممبر قانون کی خلاف ورزی کرتا ہوا پکڑا جائے۔"

ان کے علاوہ جدید زمانہ کے دستوروں میں جن باتوں کا اضافہ کیا گیا ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ :-

"عورت اور مرد مساوی ہیں"

یہ حقوق دراصل اس لیے وضع کیے گئے تھے کہ جب کبھی حکومت اپنی حدود سے تجاوز کرنے لگے تو رعایا کے پاس اپنی آزادی اور اپنے ذاتی حدود کی حفاظت کے لیے کوئی قانونی بنیاد رہے جس کی بنا پر وہ حکومت سے اپنے حقوق کا مطالبہ کر سکے یا اگر حکومت نہ مانے اور رعایا کو لڑنا پڑے تو حکومت کا اخلاقی پہلو کمزور ہو۔ لیکن اوّل تو زمانۂ حال میں سیاسی تصوّرات کے انقلاب نے حکومت اور رعایا کے درمیان ہر اُس حد بندی کو توڑ دیا ہے جس کا خیال کیا جا سکتا ہے، حتیٰ کہ اب یہ بتانا قریب قریب محال ہو گیا ہے کہ حکومت کے حدود کہاں جا کر ختم ہوتے ہیں اور افرادِ رعیّت کے حدود کہاں سے شروع ہوتے ہیں۔ ثانیاً یہ اعلانِ حقوق صرف اُس صورت میں کام آ سکتا ہے جب کہ جمہورِ قوم کی مرضی کے خلاف حکومت کی طرف سے کوئی ناروا مداخلت ہو اور باشندوں کی ایک کثیر تعداد اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے کھڑی ہو جائے۔

مگر جہاں اکثریت کی حکومت ہو۔ اور وہ اقلیت کے حقوق میں مداخلت کرے وہاں یہ اعلانِ حقوق قطعی بیکار ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً کراچی کے ریزولیوشن میں جن بنیادی حقوق کا ذکر کیا گیا ہے ان کا تجزیہ کر کے دیکھئے تو معلوم ہو جائے گا کہ وہ بجائے خود بھی ہمارے کسی مرض کی دوا نہیں۔

ان تینوں نکات کی مختصر تشریح ضروری ہے تاکہ عام ناظرین اس بحث کو بآسانی سمجھ سکیں۔

۱۔ دَورِ جدید میں حکومت کا دائرۂ عمل

حکومت کے حدودِ عمل کیا ہیں؟ اس باب میں دنیا کے نظریات اور عملیات اٹھارویں اور انیسویں صدی میں جو کچھ تھے، آج ان سے بالکل مختلف ہیں۔ اٹھارویں صدی میں شخصی حکومتوں کا دَور دَورہ تھا، اور لوگ ان کے استبداد سے نجات حاصل کرنے کے لیے جدّوجہد کر رہے تھے۔ اِس لیے لوگوں کے ذہن پر حکومت اور رعیت کے تعلق کا مشینی نظریہ (Mechanical Theory) مستولی تھا، یعنی ان کا تصوّر یہ تھا کہ افراد کا مجموعہ ایک الگ چیز ہے اور اسٹیٹ ایک دوسری چیز، اور ان دونوں میں باہم کچھ اس طور پر معاملہ ہوتا ہے جیسے بائع اور مشتری یا اجیر اور مستاجر کے درمیان ہوا کرتا ہے۔ اِسی خیال نے اسٹیٹ کے حدودِ عمل کا انفرادی نظریہ (Individualism) پیدا کیا جس کا منشا یہ ہے کہ اصل چیز فرد کی آزادی ہے، اُسی کی حفاظت کے لیے فرد اس معاہدۂ عمرانی (Social Contract) میں شریک ہوتا ہے جس کی بدولت اسٹیٹ وجود میں آیا ہے۔ لہٰذا اسٹیٹ کا کام اس کے سوا کچھ نہیں کہ افراد کی شخصی آزادی کی حفاظت کرے اور ایک فرد کی آزادی میں دوسرے کی مداخلت کو روکے۔ جان و مال کی حفاظت، امن قائم کرنا، انصاف کرنا، اور حدودِ مملکت کو بیرونی حملوں سے بچانا، بس یہ اس کے فرائض ہیں۔ ان حدود سے آگے بڑھ کر اشخاص کے ذاتی معاملات میں مداخلت کرنا، خواہ وہ اشخاص کی بھلائی ہی کے لیے ہو اور کیسی ہی نیک نیّتی کے ساتھ ہو، بہرحال ناجائز ہے۔ اٹھارہویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے آغاز میں یہ عام خیال تھا

اور اسی بنا پر بعض علمائے سیاست نے ان کاموں کی ایک فہرست بھی بنا دی تھی جو حکومت کے دائرہ عمل میں آسکتے ہیں۔

یہ تخیلات اُس زمانے میں بھی قائم رہے، اور کافی مدت تک چلتے رہے، جب شخصی حکومتوں کی جگہ جمہوری حکومتیں لے رہی تھیں۔ مدتوں تک لوگوں کو محسوس نہ ہو سکا کہ جمہوریت اور دائرۂ حکومت کی حد بندی دونوں باہم متضاد ہیں۔ جب سوسائٹی خود اسٹیٹ بناتی ہے تو وہ اپنے اوپر خود کس طرح پابندی عائد کر سکتی ہے؟ اور اس کو اپنے اوپر پابندی عائد کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے؟ وہ اسٹیٹ کو اسی لیے تو وجود میں لاتی ہے کہ جبر و زور اور تنظیم کی طاقت سے اپنی اُن اجتماعی ضروریات کو پُورا کرے جن کے لیے تنظیمی طاقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر آخر کون سی معقول وجہ ہے کہ وہ اس تنظیمی طاقت کے استعمال کو اپنی بعض ضروریات کے لیے جائز اور بعض کے لیے ناجائز ٹھیرائے؟ اس حد بندی کی ضرورت تو اس وقت تھی جب حکومت سوسائٹی سے بالکل الگ ایک چیز ہوتی تھی اور کہیں اُوپر سے آکر مسلط ہو جایا کرتی تھی۔ مگر جب خود سوسائٹی ہی سے حکومت پیدا ہو تو ایسی صورت میں اس حد بندی کی کیا حاجت؟

فرد، سوسائٹی اور اسٹیٹ کو ایک زندہ نظامِ جسمانی کی طرح سمجھنے کا تخیل (Organic Theory of State and Society) جمہوری افکار کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ برابر ترقی کرتا چلا گیا اور سوشلزم نے آکر اسے پایۂ تکمیل کو پہنچا دیا۔ اب دنیا میں ہر جگہ حکومت کے دائرہ عمل کی حدیں ٹوٹ کر پُوری اجتماعی زندگی پر پھیل رہی ہیں۔ تمدن، معاشرت اور معیشت کی جڑوں تک میں اُترتی جا رہی ہیں، اور جزئی سے جزئی معاملات تک کو اپنی لپیٹ میں لیتی چلی جاتی ہیں۔ باشندوں کی روٹی کا بندوبست کرنا، ان کے لیے کام مہیا کرنا، ان کے معیارِ زندگی کو بلند کرنا، اور ان کے لیے زیادہ سے زیادہ آسائش بہم پہنچانا، یہ ہیں اب حکومت کے فرائض۔ ان فرائض کو انجام دینے کے لیے وہ ملک کے معاشی ذرائع کو زیادہ سے زیادہ بہتر طریقہ سے استعمال کرنے پر مجبور ہے، اور اس طرح گویا پوری معاشی زندگی اپنے صنعتی اور تجارتی اور مالی شعبوں سمیت حکومت کے

دائرے میں آجاتی ہے۔ پھر وہ اپنے ان فرائض کی انجام دہی کے لیے تعلیم کا بھی پورا انتظام اپنے ہاتھ میں لینے پر مجبور ہے تاکہ باشندوں کو ان اغراض کے لیے کارآمد بنا سکے۔ مزید برآں ان فرائض کی بجاآوری میں یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ افراد یا افراد کے مختلف مجموعوں کی شخصی آزادی یا ان کی انفرادی خواہشات، یا ان کے مخصوص حقوق کا ہر حال میں لحاظ کیا جا سکے۔ ان سب چیزوں کا صرف اسی حد تک خیال رکھا جا سکتا ہے اور اسی شرط کے ساتھ رکھا جا سکتا ہے کہ وہ حکومت کے فرائض کی ادائیگی میں حائل نہ ہوں۔ جہاں وہ حائل ہوں گے وہاں ان کی انفرادیت کو پامال کر دیا جائے گا۔ اب یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی شخص یا کوئی گروہ اس فیصلہ میں خود مختار ہو کہ اپنے بچوں کو کس قسم کی تعلیم دلائے۔ یہ حکومت کا کام ہے کہ اجتماعی فلاح کے نقطۂ نظر سے جس طرح مناسب سمجھے ان کو تیار کرے۔ تمدنی اور معاشرتی معاملات میں بھی اب انفرادی آزادی کا حق مسلّم نہیں ہے۔ حکومت اجتماعی فلاح کے لیے تمدن و معاشرت میں جس قسم کا تغیر ضروری سمجھے کر سکتی ہے حتّٰی کہ وہ یہ بھی کہہ سکتی ہے کہ فلاں طرز کا لباس پہنو اور فلاں طرز کا لباس نہ پہنو۔ فلاں رسم الخط استعمال کرو اور فلاں کو چھوڑ دو۔ اس عمر میں شادی کرو اور اس عمر میں نہ کرو، وقس علیٰ ہٰذا۔ اسی طرح جب کہ وہ باشندوں کی معاشی فلاح و ترقی کی ذمہ دار ہے تو وہ تجارت، صنعت و حرفت، زراعت اور اموال و املاک کے باب میں بھی لوگوں کے شخصی حقوق کی رعایت ہمیشہ ملحوظ نہیں رکھ سکتی۔ وہ مجبور ہے کہ معیشت کی پوری مشین کو اجتماعی مقصد کے مطابق چلائے اور جو شخصی حقوق اس راہ میں حائل ہوں انہیں پامال کر دے۔ چنانچہ جنگِ عظیم کے بعد جتنے جمہوری دساتیر بنائے گئے ہیں[۱] قریب قریب ان سب میں اس قسم کی دفعات رکھی گئی ہیں جن کی بنا پر حکومت کو شخصی املاک اور شخصی کاروبار میں دخل دینے کے نہایت وسیع اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ مثلاً تاجر کے مال کو جبرًا فروخت کرا دینا۔ شخصی املاک پر بمعاوضہ یا بلا معاوضہ قبضہ کر لینا۔ باشندوں کی سکونت یا نوآبادکاری یا ترقی زراعت کے لیے اگر ضرورت ہو تو

---

[۱] دستور جرمنی دفعہ ۱۵۳ پارہ دوم۔ دستور پولینڈ دفعہ ۹۹ و دستور چیکوسلوواکیہ دفعہ ۱۰۹۔

زمینوں کو بلامعاوضہ ضبط کر لینا[1]۔ موروثی جائداد اگر ایک حدِ خاص سے زیادہ ہو تو اسے چھین کر تقسیم کر دینا[2]۔ وراثت میں اسٹیٹ کا حصہ مقرر کرنا[3]۔ حتیٰ کہ پرائیویٹ کاروبار کی تنظیم اور مراسلت و مخابرت میں بھی مداخلت کرنا اگر اجتماعی مفاد کے لیے اس کی حاجت ہو[4]۔

حکومت کے دائرے کی اس وسعت اور لامحدودیت نے اوّل تو بنیادی حقوق کو محض بے معنی بنا دیا ہے۔ کیونکہ جن حقوق کو انسان کے بنیادی اور پیدائشی حقوق کہا جاتا ہے، ان سب کو آج کی حکومت اجتماعی فلاح کے نام سے سلب کر سکتی ہے۔ دوسری اور زیادہ اہم بات یہ ہے کہ جمہوری نظام میں حکومت کے قوانین بنانے اور نافذ کرنے والی چیز اکثریت ہوتی ہے، اور یہ فیصلہ کرنا بھی اکثریت کا کام ہوتا ہے کہ اجتماعی فلاح کیا ہے اور اس کا اقتضا کیا ہے۔ لہٰذا اب اکثریت کے ظلم و جبر اور استبداد کی کوئی حد نہیں رہ جاتی۔ اقلیت کی پوری زندگی کے دروازے اس کی قاہرانہ مداخلت کے لیے کھل جاتے ہیں، وہ اس کے تمدن، اس کی معیشت و معاشرت اور اس کے مذہبی قوانین میں اجتماعی مفاد کے نام سے جس طرح اور جتنی چاہے مداخلت کر سکتی ہے، وہ تعلیم کے نظام کو اپنے ہاتھ میں لے کر اس کی قومیت کو بالکل مٹا دینے کی بھی کوشش کر سکتی ہے۔

۲۔ بنیادی حقوق کی افادیت

بنیادی حقوق اگر کسی حد تک کام آ سکتے ہیں تو صرف اس صورت میں جب کہ باشندگانِ ملک کی بڑی اکثریت ان کی حفاظت کا ارادہ رکھتی ہو اور اتفاقاً کوئی ایسی

---

[1] ایضاً دفعہ ۱۵۵۔

[2] دستور یوگوسلیویا دفعہ ۲۴۔ ایستونیا، لٹویا اور لتھوانیا میں بھی اس مضمون کے قوانین پاس کیے گئے ہیں۔

[3] دستور جرمنی دفعہ ۱۵۴۔ دستور یوگوسلیویا دفعہ ۲۹۔

[4] دستور یوگوسلیویا دفعہ ۲۵۔

حکومت ملک پر مسلط ہوگئی ہو جو ان حقوق کو سلب کرنا چاہتی ہو۔ رہی یہ صورت کہ خود
وہ اکثریت ہی ظلم پر اتر آئے جو حکومتِ جمہوریہ کو چلا رہی ہو، تو ایسی صورت میں بنیادی
حقوق کی کوئی لمبی سے لمبی فہرست بھی تحفظ کے کام نہیں آ سکتی۔

خود برطانیہ عظمیٰ کی مثال لے لیجیے جہاں سے ان بنیادی حقوق کی ابتدا ہوئی ہے۔
۱۸۲۸ء تک وہاں پارلیمنٹ اور مجالس بلدیہ اور سرکاری ملازمتوں میں داخل ہونے
کے لیے چرچ آف انگلینڈ کے طریقہ پر عشائے ربانی (Lord's Supper) لینا لازم تھا۔
۱۸۲۹ء تک کیتھولکس ہر قسم کی نمائندگی سے محروم تھے۔ ۱۸۷۰ء تک یہودی پارلیمنٹ
میں نہ جا سکتے تھے۔ ۱۸۵۴ء تک آکسفورڈ اور کیمبرج کے دروازے ان لوگوں کے لیے
بند تھے جو پروٹسٹنٹ مذہب کے ۳۹ اصولوں پر ایمان نہ لاتے ہوں اور ۱۸۷۱ء
تک ان دونوں یونیورسٹیوں میں ایسے کسی شخص کو کسی قسم کا عہدہ یا امتیاز یا وظیفہ تعلیمی
نہ مل سکتا تھا۔ ۱۸۸۰ء تک چرچ آف انگلینڈ کی پیروی نہ کرنے والوں کے لیے دفن
اموات کے بارے میں طرح طرح کی قیود موجود تھیں۔ ۱۸۸۸ء تک عدالت میں
شہادت دینے والوں کے لیے حلف کی ناروا قیود پائی جاتی تھیں۔ اور آئرلینڈ کی
اقلیت کے ساتھ تو ۱۹۲۰ء تک جو کچھ ہوتا رہا وہ ساری دنیا پر عیاں ہے۔

ممالک متحدہ امریکہ کی مثال اس سے بھی زیادہ سبق آموز ہے۔ وہاں ایک
کروڑ ۲۰ لاکھ حبشی آباد ہیں جن کا تناسب کل آبادی میں ۹ فی صدی سے کچھ زیادہ
ہے۔ دستور کی رو سے ان کو سفید فام امریکنوں کے برابر پورے شہری حقوق حاصل ہیں۔
جمہوری دولت مشترکہ میں وہ بھی برابر کے حصہ دار ہیں اور قانون میں کوئی چیز ایسی
نہیں جس کی بنا پر سفید فام اور سیاہ فام میں امتیاز کیا جا سکتا ہو۔ مگر عملاً کیا ہو رہا ہے؟
سفید فاموں کی اکثریت ان کے ساتھ کھلم کھلا امتیازی برتاؤ کر رہی ہے۔ شہری حقوق
تو درکنار ان کے معمولی انسانی حقوق تک علانیہ سلب کیے جا رہے ہیں اور دستور کے
عطا کردہ بنیادی حقوق ان کے کسی کام نہیں آتے۔ سفید فاموں کے کلیساؤں میں وہ
گھس نہیں سکتے۔ ان کے ہوٹلوں، ریسٹورانوں اور تھیٹروں میں وہ قدم نہیں رکھ

سکتے۔ ان کی تفریح گاہوں میں کوئی حبشی اگر چلا جاتا ہے تو سخت ذلت کے ساتھ نکالا جاتا ہے۔ موٹر بسوں اور ریل کے ڈبوں میں بھی سفید فام کے ساتھ حبشی کا بیٹھنا جائز نہیں رکھا جاتا۔ سفید فاموں کے محلوں میں کوئی حبشی مکان نہیں لے سکتا۔ ان کے بچوں کے ساتھ حبشی بچہ ایک مدرسہ میں بیٹھ نہیں سکتا۔ ان کی جان، مال، عزت، آبرو، کسی چیز کی کوئی قیمت نہیں۔ حتیٰ کہ ان کے ساتھ انتہائی وحشیانہ برتاؤ کرنے سے بھی مہذب گوروں کا ضمیر ایا نہیں کرتا۔ اور بہت ہی کم کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی حبشی کی خاطر کسی گورے کے خلاف قانون کی مشین حرکت میں آتی ہو۔

یہاں اس برتاؤ کی تفصیلات بیان کرنے کا موقع نہیں جو امریکہ کی اکثریت حبشی اقلیت کے ساتھ کر رہی ہے۔ مگر میں اختصار کے ساتھ یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ جہاں اکثریت اور اقلیت کو نسل یا رنگ یا مذہب یا کسی اور چیز نے حقیقتہً ایک دوسرے سے جُدا کر رکھا ہو وہاں اکثریت کی حکومت کیا رنگ ڈھنگ اختیار کرتی ہے اور دستور اور اس کے بنیادی حقوق اور قانون اور اس کی کاغذی دفعات کا کیا حشر ہوا کرتا ہے۔

امریکہ میں حبشیوں کے متعلق بغیر کسی سائنٹفک بنیاد کے یہ نظریہ قائم کیا گیا تھا کہ حیاتی نقطۂ نظر سے (Biologically) وہ تعلیم کے لیے نااہل ہیں اور عمرانی نقطۂ نظر سے (Socially) ان کو تعلیم دینا انہیں ناکارہ بنا دینا ہے، یعنی پھر وہ خدمت گار بننے کے بجائے برابر والے بننے لگیں گے۔ اس بنا پر بعض ریاستوں میں انہیں تعلیم دینا حکماً ممنوع تھا اور بعض ریاستوں میں اسے بُرا سمجھا جاتا تھا۔ کئی سال تک حبشی خود اپنی کوششوں سے اپنے روپے سے مدارس قائم کرتے اور اپنے بچوں کو تعلیم دلواتے رہے۔ یہاں تک کہ جب انہوں نے اپنی دماغی قابلیت دنیا پر ثابت کر دی تب ۱۹۰۵ء سے ان کے مدارس کو سرکاری امداد ملنے کا سلسلہ شروع ہوا۔

قانون کی نگاہ میں حبشی اور سفید امریکی عملاً برابر نہیں ہیں اگرچہ لفظاً برابر ہیں۔ حبشی کے لیے قید کی مدت ہمیشہ زیادہ رکھی جاتی ہے۔ ۱۹۱۰ء کے اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ حبشیوں کو اوسطاً ۱۰ مہینہ اور سفید فاموں کو اوسطاً ۵ مہینہ

کی سزائیں دی گئیں۔ آبادی میں تو حبشیوں کا تناسب ۹ فی صدی ہے مگر جیل خانوں کی آبادی میں ان کا تناسب ۳۱ فی صدی۔

۱۸۸۰ء میں حبشی قیدی فی لاکھ آبادی میں ۳۴۴ تھے اور سفید فام ۹۶

۱۸۹۰ء " " " " " ۲۴۴ " " " ۸۴

۱۹۰۴ء " " " " " ۲۷۸ " " " ۷۷

۱۹۱۰ء " " " " " ۲۸۴ " " " ۸۹

۱۹۲۲ء " " " " " ۳۲۷ " " " ۷۷

اسی طرح سفید فاموں کی تعداد تو جیل خانوں کی آبادی میں برابر کم ہوتی جا رہی ہے مگر حبشیوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ حبشی زیادہ جرائم کرتے ہیں۔ شکاگو میں ایک کمیشن نسلی تعلقات کی تحقیق کے لیے مقرر کیا گیا تھا جو (Chicago Commission on Racial Relations) کے نام سے مشہور ہے[2]۔ اس کمیشن کے سامنے ایک جج نے بیان دیتے ہوئے کہا "جس شہادت کو مجبوری ایک حبشی کو مجرم قرار دینے کے لیے کافی سمجھتی ہے وہی شہادت ایک سفید فام کو سزا دینے کے لیے ناکافی سمجھی جاتی ہے"۔ ایک دوسرے جج نے کہا کہ ایک ہی طرح کے حالات اور واقعات میں سیاہ فام کو سزا دینا آسان ہے اور سفید فام کو سزا دینا مشکل۔ حبشیوں اور سفید فاموں کے فسادات میں پولیس تمام تر حبشیوں کو پکڑتی ہے اور سفید فام پر شاذ و نادر ہی ہاتھ ڈالا جاتا ہے۔" شکاگو کمیشن اپنی تحقیقات کے نتائج بیان کرتے ہوئے کہتا ہے :-

"تمام شہادتیں قریب قریب متفق ہیں کہ حبشی بہ نسبت سفید

---

[1] Encyclopaedia Britannica, Article Negroes in America

[2] اس کمیشن کی رپورٹ (Negroes in Chicago) کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔

فاموں کے زیادہ پکڑے جاتے ہیں۔ کیونکہ پولیس کا عام مفروضہ یہ ہے کہ حبشی زیادہ جرائم پیشہ ہوتے ہیں۔ اور پولیس یہ بھی جانتی ہے کہ حبشی کو گرفتار کر لینے میں کوئی خطرہ نہیں، رہا سفید فام تو اس پر ذرا احتیاط ہی سے ہاتھ ڈالنا چاہیے .... ایک ایک جرم میں بہت سے حبشی پکڑ لیے جاتے ہیں۔ لہٰذا محض قید خانوں میں حبشیوں کی آبادی زیادہ دیکھ کر یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ وہ زیادہ جرم کرتے ہیں۔ سفید فاموں کی بہ نسبت حبشی کم ہی گرفتاری سے بچ سکتا ہے۔

یہ تو قانون کا حال ہوا۔ اور وہ اکثریت جو جمہوری نظام کو چلا رہی ہے اس کا کیا حال ہے؟ حق رائے دہی پر عملاً ایسی پابندیاں عائد کر دی گئی ہیں کہ حبشیوں کی ایک بڑی تعداد شہری (Citizens) ہونے کے باوجود خود بخود ووٹ دینے کے حق سے محروم ہو جاتی ہے۔ سرکاری ملازمتوں کے دروازے ان کے لیے گویا بند ہیں۔ آج تک کوئی حبشی کسی ذمہ داری کے منصب پر فائز نہ ہو سکا۔ البتہ جنگ میں توپوں کا ایندھن بننے کے لیے وہ ضرور بھیج دیے گئے تھے۔ اور اب بھی اس کام کے لیے تیار کیے جا رہے ہیں۔

عام آدمی بس ان کو صرف حقیر ہی نہیں سمجھتے بلکہ بات بات پر فساد ہوتے ہیں اور ان کو نہایت بے دردی سے قتل کیا جاتا ہے۔ ۱۹۱۹ء کا واقعہ ہے کہ شکاگو میں یہ ایک افواہ اڑی کہ کسی حبشی نے ایک اطالین لڑکی کو مار ڈالا ہے۔ اس پر سفید فام لوگوں کا ایک مجمع اکٹھا ہو گیا اور اس نے ایک راہ چلتے حبشی پر حملہ کر دیا۔ کارونر کی عدالت میں جب اس کی لاش پیش ہوئی تو چھ گولیاں اس کے جسم سے نکلیں، کھوپڑی چور چور پائی گئی اور پسلیوں کے ٹکڑے ہو چکے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اطالین لڑکی کے واقعہ کی کوئی اصلیت نہ تھی۔ پریذیڈنٹ ولسن جب پیرس میں بیٹھے ہوئے جرمنوں

ٹھیک یہی کچھ ان دنوں پنڈت جواہر لال نہرو کے بھارت میں مسلمانوں کے ساتھ ہو رہا ہے۔ (مرتب)

کے مظالم پر محاکمہ فرما رہے تھے اس وقت شکاگو میں ایک حبشی زندہ آگ پر بھونا جا رہا تھا۔ امریکہ میں انصاف کا ایک نرالا طریقہ رائج ہے جسے لنش کرنا (Lynaching) کہتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ عوام جب عدالت کے فیصلے سے مطمئن نہ ہوں یا قانون کی سست رفتار مشین کو آہستہ چلتے دیکھ کر صبر نہ کر سکیں تو قانون کو خود اپنے ہاتھ میں لے لیں اور جس شخص کو وہ مجرم سمجھتے ہوں اسے اپنے نزدیک جو منصفانہ سزا چاہیں دے دیں۔ اس طریق انصاف کا وار عموماً حبشیوں پر ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ نیو یارک ورلڈ نے ۱۸۸۵ سے ۱۹۲۶ تک کے جو اعداد و شمار شائع کیے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ۴۱ سال کی مدت میں ۳۲۰۵ حبشی بر سر عام لنش کیے گئے۔ لنشنگ عموماً اس قصور میں ہوتا ہے کہ کسی گوری عورت سے کسی حبشی کا تعلق پایا جاتا ہے یا ایسے تعلق کا شبہ کیا جاتا ہے۔ لیکن سفید فام امریکن کا ضمیر صرف اسی وقت آمادۂ شورش ہوتا ہے جب کالا مرد گوری عورت کے پاس پایا جائے۔ رہی کالی عورت تو اس پر گوروں کے پیدائشی حقوق ہیں۔ حبشی کے متعلق عام رائے گورے صاحبان کی یہ ہے کہ وہ وحشی جانور (Brute) ہوتا ہے۔ اس کا معیار اخلاق بہت پست ہوتا ہے بلکہ اس میں اخلاقی احساس ہوتا ہی نہیں۔ عورتوں اور بچوں پر حملہ آور ہونا اور بدمعاشی کرنا اس کی سرشت میں داخل ہے گویا ہمارے ملک کے ہندو اخبارات کی زبان میں وہ ایک پیدائشی "غنڈا" ہوتا ہے لیکن شکاگو کمیشن نے باقاعدہ تحقیقات کر کے ثابت کیا ہے کہ حبشی کا معیار اخلاق صاحب لوگوں سے بہت بلند ہوتا ہے اور صاحب لوگ خود اپنی قوم کی عورتوں پر حملہ کرنے میں جس قدر بیباک ہیں، حبشی غریب اس کا عشر عشیر بھی نہیں۔ البتہ حبشی سے جب یہ قصور ہو جاتا ہے (اور وہ بھی زیادہ تر میم صاحبات ہی کی دعوت اور اشتعال کا نتیجہ ہوتا ہے) تو صاحب لوگوں میں اس پر شور برپا ہو جایا کرتا ہے۔ اور یہی حبشی کے بدنام ہونے کی اصلی وجہ ہے۔ کمیشن کے سامنے ایک جج نے بیان دیتے ہوئے کہا کہ نابالغ لڑکیوں کے ساتھ زنا بالجبر کرنے والا حبشی تو میری عدالت میں کبھی آیا ہی نہیں۔ البتہ سفید فام بہت سے آتے۔ ایک

دوسرے جج نے بیان کیا کہ میری کل مدتِ ملازمت میں صرف ایک حبشی اس جرم میں ماخوذ ہو کر آیا ہے، حالانکہ سفید فام اکثر پکڑے ہوتے آتے ہیں۔

۱۸۶۵ء سے امریکہ میں ایک خفیہ جماعت کام کر رہی ہے جس کا نام کوکلکس کلان (Ku Klux Klan) ہے۔ اس کے قیام کا مقصد یہ ہے کہ سیاہ فاموں پر سفید فاموں کے تفوق کی حفاظت کی جائے اور امریکہ میں کالی نسل کے مسئلہ (Negroes Problem) کو اس طرح حل کیا جائے کہ ریڈ انڈین قوم کی طرح یہ قوم بھی رفتہ رفتہ فنا ہو جائے۔ یہ امریکہ کی سب سے زیادہ طاقت ور تنظیم ہے جس کے ارکان کی تعداد ۱۹۲۳ء میں پندرہ لاکھ تھی۔ ملک کے اعلیٰ تعلیم یافتہ، اونچی سوسائٹی والے، اور حکومت کے حلقوں سے قریبی تعلق رکھنے والے لوگ اس میں شریک ہیں۔ صوبوں کے گورنر، پولیس اور جیل اور عدالت کے حکام تک ان سے ساز باز رکھتے ہیں۔ اسی وجہ سے یہ بڑے بڑے ہولناک جرائم کر جاتے ہیں اور کبھی نہیں پکڑے جاتے۔ جیل کی کوٹھڑیوں تک سے قیدیوں کو نکال لے جاتے ہیں اور قانون کی مشین ساکت و صامت کھڑی رہتی ہے۔ امریکہ کمز آف ایج (America Comes of age) کا مصنف لکھتا ہے کہ وہی مہذب و شائستہ جنٹلمین جن سے آپ گفتگو کر رہے ہیں، ہو سکتا ہے کہ رات کو وہ جنگل میں کسی آدمی کو قتل کر کے آیا ہو اور اس کے ساتھ اس جرم میں بہت سے وہ لوگ شریک ہوں جنہیں آپ دن کے وقت نہایت عزت و افتخار سے ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں۔ چند ہولناک جرائم کے سلسلہ میں ریاست ٹکساس (Texas) کے گورنر نے تحقیقات کرائی تو پتہ چلا کہ

لہ ۔ ۱۷۹۰ء سے اب تک امریکہ کی گوری نسل میں ۱۳ سو فی صدی اضافہ ہوا ہے، اور ریڈ انڈین نسل کی آبادی میں ۵۰ فی صدی کمی ہوئی ہے۔ اور توقع کی جاتی ہے کہ اس صدی کے خاتمہ تک ایک بھی ریڈ انڈین باقی نہ رہے گا۔ یہ وہ قوم ہے جو سفید فاموں سے پہلے اس ملک میں آباد تھی۔

مجرموں میں ایک نزاپوزی صاحب تھے اور متعدد ایسے لوگ تھے جو خود گورنر صاحب کے احباب سے تعلق رکھتے تھے۔

یہ مہذب لوگ حبشیوں کے مسئلہ کو کس طرح حل کر رہے ہیں؛ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

"ایک حبشی کو مارتے مارتے بیہوش کر دیا اور ننگا کر کے جنگل میں چھوڑ آئے تاکہ سردی سے مر جائے۔ ایک حبشی کی ہنٹروں سے کھال ادھیڑ دی، یہاں تک کہ مجبور ہو کر اس نے اپنی زمین کم قیمت پر ایک سفید فام شخص کے ہاتھ بیچ دی۔ ایک حبشی کو پکڑ کر جنگل لے گئے۔ رسیوں اور خار دار تاروں سے اسے باندھا۔ ہنٹر مار مار کر اس کی کھال ادھیڑی۔ پھر اس کے زخموں پر کریازوٹ چھڑک کر چل دیئے۔ اور وہ گھنٹوں تڑپ تڑپ کر مرا۔ ایک حبشی اور اس کے لڑکے کو پکڑ لے گئے اور دونوں کو ایک ریل کے پل سے باندھ دیا۔ ایک غریب کو ہسپتال سے اٹھا لے گئے اور اس کو زندہ آگ پر بھون ڈالا۔ ایک بیچارے کو ٹیلیفون کے کھمبے سے باندھا اور مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دی[1]۔"

حبشی کا سب سے بڑا قصور جسے معاف نہیں کیا جا سکتا، یہ ہے کہ وہ سفید فام آبادی میں یا اس کے قریب جائداد رکھتا ہو، یا سکونت اختیار کرے۔ ۱۹۱۷ء اور ۱۹۲۱ء کے درمیان صرف شہر شکاگو میں ۵۰ مرتبہ ایسے مکانات کو بم سے اُڑایا گیا جو حبشیوں نے خریدے تھے یا جو کسی سفید فام نے حبشی کو کرایہ پر دیئے تھے۔ ایک حبشی بینگر (Binga) کے مکان اور دفتر پر ایک سال کے اندر ۶ مرتبہ بم پھینکا گیا صرف اس قصور میں کہ وہ حبشیوں کے لیے مالی تقویت کا موجب بن گیا ہے۔ اس کے بینک سے حبشیوں کو اچھی شرائط پر روپیہ مل جاتا ہے۔ اور اس کی بدولت حبشی لوگ جائدادیں خریدنے لگے ہیں۔ یہ واقعات ہیں جن کا نتیجہ یہ ہے کہ جو حبشی ۱۹۰۰ء میں ممالک متحدہ امریکہ

---

[1] یہ واقعات رسالہ "نیوایج" میں شائع ہوئے ہیں۔

کی آبادی کا ۱۹ فی صدی حصّہ تھے وہ آج ۹ فی صدی رہ گئے ہیں[1]۔ اور لطف یہ ہے کہ امریکہ کے کانسٹی ٹیوشن میں حبشی اقلیت کے بنیادی حقوق بالکل محفوظ ہیں۔

جرمنی کی ایک اور مثال آپ کے سامنے ہے۔ جرمن کانسٹی ٹیوشن کی رُو سے تمام باشندگانِ مُلک کے بنیادی حقوق مسلّم ہیں۔ مگر آج وہاں کی غیر آریہ نسل کیساتھ جو کچھ ہوتا رہا ہے[2] وہ کس سے پوشیدہ ہے۔ ان کے لیے جرمنی کی حدود میں عزت کی روٹی کمانا قریب قریب محال ہو گیا ہے اور وہاں سے نکل جانا بھی اتنا ہی محال ہے۔ سرکاری اور خانگی دونوں قسم کی ملازمتوں کے دروازے ان کے لیے بند ہیں۔ تجارت بھی وہ آزادی سے نہیں کر سکتے۔ دوسرے آزاد پیشوں سے بھی ان کو نکالا جا رہا ہے۔ عدالتوں میں ان کے ساتھ کھُلم کھُلا نسلی امتیاز برتا جاتا ہے۔ ان کے لیے انصاف کا نظریہ یہ قائم کیا گیا ہے کہ ہر غیر آریہ ناپاک اور پیدائشی مجرم ہے تاوقتیکہ وہ اپنے آپ کو غیر مجرم نہ ثابت کر دے۔ عام باشندے اگر ان سے لین دین یا کسی قسم کا معاملہ کرتے ہیں تو ان پر حکومت کا عتاب ہوتا ہے۔ مُلک کے مدارس میں ان کے بچّوں پر ناقابلِ برداشت پابندیاں ہیں اور اگر وہ مُلک سے باہر تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجے جاتے ہیں تو ان کو صرف ہجرت کا پاسپورٹ دیا جاتا ہے تاکہ واپس نہ آسکیں۔ ان کے والدین اگر ان سے ملنے کے لیے باہر جانا چاہتے

---

[1] تفصیلات کے لیے کُتب ذیل ملاحظہ ہوں۔

۱۔ Lynch Lawby J. E. Cutter

۲۔ The Negroes in our History by C. G. Woods

۳۔ The American Race Problem by E. B. Reuter

۴۔ The American Negro by M. T. Hersko

[2] بخصوصیت سے ۱۹۳۱ء سے ۱۹۴۵ء تک — مرتب

ہیں تو انہیں بھی مہاجر کی حیثیت سے جانے کی اجازت دی جاتی ہے اور مہاجر کے لیے یہ قانون بنا دیا گیا ہے کہ وہ اپنے مال و دولت کا صرف دس فی صدی حصہ جرمنی سے باہر لے جا سکتا ہے، باقی سب ضبط۔

یورپ کے دوسرے ممالک میں بھی کون سا ملک ایسا ہے جس کے دستور اساسی میں بنیادی حقوق موجود نہیں ہیں؟ اور کون سا ملک ایسا ہے جہاں دستور کے بنیادی حقوق نے اقلیت کو اکثریت کے ظلم سے بچایا ہو؟ ہر جگہ ملک کی پوری آبادی کو ایک قوم فرض کر کے ایک جمہوری اسٹیٹ بنا دیا گیا اور دستور اساسی میں بنیادی حقوق مقرر کر دیے گئے۔ مگر جہاں بھی اکثریت اور اقلیت کے درمیان مذہب یا نسل یا زبان کی بنیاد پر قومی امتیاز موجود ہے، وہاں اکثریت کی یہی کوشش ہے کہ یا تو اقلیت اپنے قومی وجود کو اکثریت کی قومیت میں گم کر دے یا پھر اسے شودر بنا کر رکھا جائے یا مختلف طریقوں سے اس کو فنا کر دیا جائے۔ یوگوسلاویا میں جب کروٹس نے مطالبہ کیا کہ ان کی قوم کا ایک الگ صوبہ بنایا جائے اور اسے اٹانومی (حکومت خود اختیاری) دے دی جائے، تو آپ کو معلوم ہے کہ سربیوں نے ان کو کیا جواب دیا؟ اس جواب کو لفظ بلفظ سن لیجیے۔

- "سرب، کروٹ اور سلانینی در حقیقت ایک قوم ہیں۔ غیر ملکی سامراج نے ان کو زبردستی الگ کر رکھا تھا۔ اب جب کہ بیرونی جوا ہمارے کندھوں پر سے اتر گیا ہے تو قومی وحدت کا احساس فتحیاب ہو کر ابھر آیا ہے اور اس نے ان تمام حد بندیوں کو توڑ دیا ہے جو سیاسی ادارات اور زبان اور مذہب نے پیدا کر دی تھیں۔ وحدت کے اس احساس کو برقرار رکھنے اور بڑھانے کے لیے ضروری ہے کہ قدیم جغرافی تقسیم، جس کے ذریعہ سے غیر ملکی حکمرانوں نے قوم کو تقسیم کر دیا تھا، منسوخ کر دی جائے۔ مقامی نظم و نسق کے لیے صوبوں کی بالکل نئی تقسیم ہونی چاہیے تاکہ پرانے صوبوں کی حد بندیاں

نسلی حلقے (Racial Groups) نہ بنا سکیں لے۔"

بالکل یہ معلوم ہوتا ہے یا نہیں کہ آزاد ہندوستان میں جواہر لال نہرو تقریر فرما رہے ہیں؟ یہ گویا ایک قاعدۂ کلیہ سا بن گیا ہے کہ واحد قومیت کا جوشیلا وعظ وہی قوم کیا کرتی ہے جس کا سو فی صدی فائدہ اسی وعظ میں ہوتا ہے، اور وہ بے وقوف لوگ بعد میں پچھتاتے ہیں جو آزادی کے جوش میں "۱ ایک قوم ایک ملک" کی صدائیں بلند کیا کرتے ہیں مگر جب آزادی کے بعد واحد قومیت اژدہے کی طرح ان کو نگلنا شروع کرتی ہے تو غیظ و غضب کے مارے بل کھاتے ہیں اور قدرت کا بے لاگ قانون ان احمقوں سے پکار کر کہتا ہے کہ موتوا بغیظکم۔ جس وقت یوگوسلیویا کی نیشنل اسمبلی میں کروٹس کے اعتراضات کا مذکورۂ بالا جواب دیا گیا تو سنا ہے کہ کروٹ نمائندے احتجاجاً اسمبلی سے اُٹھ گئے اور جانے کے بعد سربی اکثریت نے اور زیادہ آسانی کے ساتھ وہ سب کچھ پاس کر لیا جو پاس کرنا چاہتی تھی۔ اس وقت بنیادی حقوق دُور کھڑے ہنستے رہے اور کہتے رہے کہ "کہو! کیسا بیوقوف بنایا!"

۴۔ کراچی ریزولیوشن کا تجزیہ

اب ذرا ان بنیادی حقوق کا بھی تجزیہ کر دیکھیے جو کراچی ریزولیوشن میں تجویز کیے گئے ہیں اور جن کی بنا پر ہمارے بہت سے سادہ لوح بھائی ملک بھر میں مسلمانوں کو سمجھاتے پھرتے ہیں کہ بھائیو! کانگریس تو پہلے ہی تمہارے حقوق کی حفاظت کا ذمہ لے چکی ہے، اب تم کیوں متحدہ قومیت کی بنیاد پر ایک آزاد جمہوری اسٹیٹ کی تعمیر میں حصہ نہیں لیتے؟

پہلی دفعہ میں ہندوستان کے ہر باشندے کو اظہارِ رائے اور اجتماع کی آزادی

لے The New Democratic Constitution of Europe by H. Morley

دی گئی ہے۔ بشرطیکہ وہ ایسے مقاصد کے لیے جو قانون اور اخلاق کے خلاف نہ ہوں۔ قانون اور اخلاق کی شرط اس آزادی کو باطل کر سکتی ہے۔ اصولِ جمہوریت کی بنا پر قانون بنانا اور اخلاق کا معیار مقرر کرنا مطلقاً اکثریت کے اختیار میں ہوگا، اور اکثریت ہی کی حکومت اس کو نافذ کرے گی۔ لہٰذا اقلیت کی آزادی کے حدود گھٹانا یا بڑھانا محض ان کے اختیارِ تمیزی پر موقوف ہوگا۔

دوسری دفعہ میں ہر باشندۂ ہند کو ضمیر کی آزادی، اور اپنے مذہب پر اعتقاد رکھنے اور اس پر عمل کرنے کی آزادی عطا کی گئی ہے، بشرطیکہ وہ امن عام اور اخلاق کے خلاف نہ ہو۔۔۔۔۔۔۔ یہاں پھر وہی شرط ہے اور یہ شرط اس آزادی کو ہر وقت سلب کر سکتی ہے۔ تاہم اگر اکثریت نے بڑی فیاضی سے کام لیا اور یہ آزادی ہم کو پوری طرح بخش بھی دی، تو اس سے ہمارا مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ ایسی آزادی تو انگریزی حکومت نے بھی ہم کو دے رکھی ہے، مگر اس کے باوجود ڈیڑھ سو برس کے اندر ہماری مذہبیت مضمحل اور ہماری تہذیب نیم مُردہ ہو کر رہ گئی۔ جب کہ حکومت کے اختیارات ہمارے ہاتھ میں نہ ہوں، اور ایک ایسی جماعت ان اختیارات کو استعمال کرے جو ہمارے اصولِ تہذیب سے قطعاً ناآشنا اور بالکل مختلف قسم کے نظریاتِ تہذیب و اخلاق و تمدن کی گرویدہ ہو، تو اس حکومت کے ماتحت ہمیں مذہبی آزادی حاصل ہونے کا فائدہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ ہمیں زبردستی نماز پڑھنے سے نہیں روکا جائے گا بلکہ ہمارے اندر وہ ارتداد آہستہ آہستہ اُتارا جائے گا جس سے ہم خود نماز پڑھنا چھوڑ دیں۔ ہماری مسجدیں توڑی نہیں جائیں گی بلکہ ہمارے دل و دماغ کو اندر سے بدلا جائے گا تاکہ یہ مسجدیں ویران ہو کر خود بخود آثارِ قدیمہ میں تبدیل ہو جائیں۔ ہماری عورتوں کے چہروں سے پولیس کے سپاہی زبردستی نقاب نہ نوچیں گے بلکہ مدرسہ کے معلم نہایت شفقت و رحمت کے ساتھ ان کے ذہن میں وہ معیارِ اخلاق پیوست کریں گے جس کی بنا پر وہ گھر کی ملکہ بننے کے بجائے اسٹیج کی رقاصہ بننا زیادہ پسند کریں گی۔ یہ آزادی

محض ایک افیون ہے تاکہ اس کی پینک میں ہم پڑے سوتے رہیں، اور ہمارے گرد و پیش زمین و آسمان بدلتے چلے جائیں۔ اس آزادی کے پروانے کو لے کر حضرات یہ سمجھ رہے ہیں کہ آئندہ کے قومی جمہوری لادینی اسٹیٹ میں ان کے مذہب اور ان کی تہذیب کا پورا تحفظ ہوگا، انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ تحفظ اسی نوعیت کا تحفظ ہے جیسا کہ پرانی تاریخی عمارتوں کا ہوا کرتا ہے۔ یہ محض اس امر کی ضمانت ہے کہ موجودہ نسل کے جو لوگ اپنی مذہبیت کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں ان کی گردن پر چھری رکھ کر زبردستی کلمۂ کفر نہیں کہلوایا جائے گا۔ مگر یہ اس امر کی ضمانت نہیں ہے کہ ان کی آئندہ نسل کو غیر مسلم بنانے والی تعلیم و تربیت نہ دی جائے گی۔ اس تحفظ کے معنی صرف یہ ہیں کہ آپ اگر چاہیں تو قال اللہ و قال الرسول میں مشغول رہیں۔ آپ کی داڑھی زبردستی نہیں مونڈی جائے گی۔ نہ آپ کی عبا ضبط کی جائے گی نہ آپ کی تسبیح چھینی جائے گی۔ نہ آپ کی زبان درس حدیث و قرآن سے روکی جائے گی۔ مگر اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آئندہ نسل کو بھی اس "غلط فہمی" میں مبتلا رہنے دیا جائے گا کہ اسلام ہی سچا دین ہے اور تمام مذاہب سے برتر و بر اصلح ہے۔ مذہبی آزادی کا یہ پروانہ لے کر جو صاحب خوش ہونا چاہتے ہیں، وہ خوش ہو لیں۔ ہمیں تو اس پروانہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے مذہب اور ہماری تہذیب کی فطرت تو مفعولانہ نہیں بلکہ فاعلانہ آزادی مانگتی ہے۔ ہم تو استقلالِ وطن اس لیے اور صرف اسی لیے چاہتے ہیں کہ ہماری حکومت ہمارے اپنے ہاتھ میں ہو، اپنا نظام تعلیم ہم خود بنائیں، اپنی تہذیب و تمدن کے مسخ شدہ نظام کو ہم خود اپنی طاقت سے درست کر سکیں۔ اگر یہ نہیں تو ہمارے لیے یکساں ہے، چاہے حکومت باہر کے کفار کی ہو یا گھر کے کفار کی۔

تیسری دفعہ اس امر کا اطمینان دلاتی ہے کہ قلیل التعداد جماعتوں اور مختلف لسانی علاقوں کی کلچر، زبان اور رسم الخط کی حفاظت کی جائے گی ——————

حکومت کے روپے اور اس کی طاقت سے ہندی کو ہندوستان کی "قومی" زبان بنانا اس

دفعہ کے خلاف نہیں ہے۔ اگر نظامِ تعلیم ایسا بنایا جائے کہ اقلیتوں کی تہذیب کا رنگ اس سے بالکلیہ خارج کر دیا گیا ہو، بلکہ اگر نظامِ تعلیم کو اس قصد کے ساتھ ایسے نقشہ پر مرتب کیا جائے کہ اقلیتوں کی تہذیب اپنی موت آپ مر جائے، تو ایسا کرنا بھی اس دفعہ کے خلاف نہیں۔ درحقیقت اس دفعہ کا یہ مطلب ہے ہی نہیں کہ اقلیتوں کی زبان اور ان کی کلچر کو حکومت کے رسد خانے سے زندگی کی غذا دی جائے گی، بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ان کو زبردستی قتل نہ کیا جائے گا۔ باقی رہی یہ بات کہ کمی غذا سے وہ خود سوکھ کر مر جائیں تو حکومت پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں! بلکہ یو۔ پی کے وزیرِ اعظم کی زبان سے ہم کو بتایا جاتا ہے کہ ان کا سوکھ کر مر جانا ہی مطلوب ہے تاکہ ان کی راکھ سے "ہندوستانی تہذیب" کا ققنس پیدا ہو سکے۔ ظاہر ہے کہ اس نوعیت کا بنیادی حق بھی ہم کو انگریزی حکومت میں حاصل ہے۔ اس نے بھی ہم کو اُردو بولنے اور لکھنے سے نہیں روکا (بلکہ ورناکیولر اسکول قائم کیے) اور کوئی ایسا آرڈی ننس پاس نہیں کیا کہ ہم اپنی کلچر کے مطابق زندگی بسر نہ کریں۔ لیکن اس بنیادی حق نے ہماری زبان اور ہماری کلچر کو زندگی کی طاقت نہیں بخشی۔ اگر یہی اس حکومت میں بھی ہو جس کو "قومی حکومت" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے تو ہمارے لیے ایسی "قومی حکومت" بعینہٖ غیر قومی حکومت ہو گی۔ ہمیں قومی حکومت کی ضرورت تو اس لیے ہے کہ ہم حکومت کے وسیع ذرائع سے اپنی زبان اور اپنی کلچر کو اس طرح غذا دے سکیں جس طرح آزاد قومیں دیا کرتی ہیں۔ ورنہ بطورِ خود اپنی ضروریات کا انتظام کر لینے کی آزادی تو ہمیں اب بھی حاصل ہے۔ اس کے لیے ہمیں کسی جنگِ آزادی کی کیا ضرورت ہے۔

چوتھی دفعہ کہتی ہے کہ قانون کی نظر میں تمام شہری مساوی ہیں۔ جات پات، مذہب اور صنف کا کوئی امتیاز ان کے درمیان نہ ہو گا ——— یہ نہایت عمدہ

دفعہ ہے لیکن مساوات کا تصور ہر تہذیب میں مختلف ہوتا ہے۔ اگر جمہوری اصول پر کل کوئی اکثریت میراث میں عورت اور مرد کا حصہ برابر کرنے کا قانون پاس کردے اور اس کی مخالفت کرنے والی اقلیت کا اسی طرح مذاق اُڑائے جس طرح مسٹر داس کے بل کی مخالفت کرنے والوں کا مذاق سنٹرل اسمبلی میں اُڑایا جا چکا ہے، تو یہ دفعہ ہمارے کس کام آئے گی۔

پانچویں دفعہ اس امر کی ضمانت دیتی ہے کہ کسی باشندۂ ملک پر اس کے مذہب یا جات پات یا عقیدہ و مسلک، یا کسی جنس کی وجہ سے ایسی پابندی عائد نہ کی جائے گی کہ وہ سرکاری ملازمت یا عزت و اقتدار کے کسی منصب یا کسی پیشے اور کاروبار میں داخل نہ ہو سکے۔ اس دفعہ کے اچھے اور بُرے دونوں پہلو ہیں۔ اگر نظامِ حکومت کسی ایسی جماعت کے ہاتھ میں ہو جو ہماری تہذیب سے کوئی ہمدردی نہ رکھتی ہو تو اس دفعہ کے عطا کردہ حقوق شریف مسلمان بہو بیٹیوں کو فلم ایکٹرس کے مرتبہ عالی تک بھی پہنچا سکتے ہیں۔

چھٹی دفعہ تمام باشندوں کو سڑکوں اور تالابوں اور کنوؤں اور مدرسوں وغیرہ سے استفادہ کا مساوی حق دیتی ہے۔ یہاں "بشرطیکہ امن عام اور اخلاق کے خلاف نہ ہو" کی قید نہیں لگائی گئی جس طرح پہلی اور دوسری دفعہ میں لگائی گئی ہے۔ دوسری دفعہ کی رُو سے گائے کی قربانی بند کی جا سکتی ہے۔ مگر چھٹی دفعہ سڑکوں کے استعمال پر کوئی ایسی پابندی عائد نہیں کرتی کہ نماز کے وقت باجا بجا کر مسلمانوں کو پریشان نہ کیا جائے۔

یہ ہیں وہ بنیادی حقوق جن کے اعلان کو ایک نعمتِ عظمیٰ قرار دیا جاتا ہے اور ہم سے کہا جاتا ہے کہ اس اعلان کے معاوضہ میں ایک ایسی حکومت کو خود اپنے اُوپر مسلط کرنے کے لیے جنگ کریں جس کی پالیسی کی تشکیل، جس کے قوانین کی تشریع اور جس کے احکام کی تنفیذ میں ہم واحد قومیت اور اصولِ جمہوریت کی بنیاد پر کسی طرح

اپنا اثر استعمال نہیں کر سکتے ۔ دوسرے الفاظ میں ہماری خدمات اس لیے حاصل کی جا رہی ہیں کہ بس فرعون کی جگہ اس کے بیٹے کو تخت نشین کرا دیں ۔ رہا ہمارا اپنا حال تو جو بنی اسرائیل کی سی پوزیشن ہمیں فرعون کے عہد میں حاصل ہے ۔ ابنِ فرعون اطمینان دلاتا ہے کہ وہ میرے عہد میں بھی حاصل رہے گی ۔

"متحدہ قومیت اور اسلام"

اِس عنوان سے جناب مولانا حسین احمد صاحب صدر دار العلوم دیوبند کا ایک رسالہ حال میں شائع ہوا ہے[1] ایک نامور عالم دین اور ہندوستان کی سب سے بڑی دینی درس گاہ کے صدر ہونے کی حیثیت سے مصنف کا جو مرتبہ ہے، اس کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہمیں توقع تھی کہ اِس رسالہ میں "قومیت" کے اہم اور نہایت پیچیدہ مسئلہ کی تنقیح و تحقیق خالص علمی طریقہ پر کی گئی ہوگی، اور اس باب میں اسلام کا نقطۂ نظر پوری طرح واضح کر دیا گیا ہوگا۔ لیکن ہمیں افسوس ہے کہ ہم نے اس رسالہ کو اپنی توقعات سے اور مصنف کی ذمہ دارانہ حیثیت سے بہت فروتر پایا۔ یہ ایسا زمانہ ہے جس میں جاہلی تصورات نے ہر طرف سے اسلامی حقائق پر نرغہ کر رکھا ہے اور اسلام اپنے گھر ہی میں غریب ہو رہا ہے۔ خود مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ وہ خالص اسلامی نگاہ سے مسائل کو نہیں دیکھتے اور قلتِ علم کی وجہ سے نہیں دیکھ سکتے۔ پھر قومیت کا مسئلہ اتنا اہم ہے کہ اس

---

[1] واضح رہے یہ مضمون فروری ۳۹ء میں لکھا گیا تھا اور مسئلہ قومیت نامی کتاب میں شائع ہو چکا ہے۔ یہاں اسے موضوع کی مناسبت سے شامل کیا جا رہا ہے ـــــ مرتب

کے صاف اور واضح فہم و ادراک ہی پر ایک قوم کی زندگی کا مدار ہوتا ہے۔ اگر کوئی قوم اپنی قومیت کے اساسیات ہی کو اجنبی اصول و مبادی میں خلط ملط کر دے تو وہ قوم سرے سے قوم ہی نہیں رہ سکتی۔ ایسے نازک مسئلہ پر قلم اٹھاتے ہوئے مولانا حسین احمد صاحب جیسے شخص کو اپنی ذمہ داری کا پورا احساس ہونا چاہیئے تھا۔ اس لیے کہ وہ امانت انبیاء کے امین ہیں اور جب اسلامی حقائق جاہلیت کے گرد و غبار میں چھپ رہے ہوں، تو ان ہی جیسے لوگوں کا کام ہے کہ انہیں صاف اور منقح کر کے روشنی میں لائیں۔ ان کو یہ سمجھنا چاہیئے تھا کہ اس فتنہ کے دور میں ان کی ذمہ داری عام مسلمانوں کی ذمہ داری سے زیادہ سخت ہے اور اگر مسلمان کسی گمراہی میں مبتلا ہوں تو سب سے پہلے اور سب سے بڑھ کر وہی ماخوذ ہونے والے ہیں۔ لیکن ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مولانا کا یہ سارا رسالہ اس ذمہ داری کے احساس سے بالکل خالی ہے۔

غیر علمی زاویۂ نظر

ایک مصنف کی تصنیف میں سب سے پہلے جس چیز کو تلاش کرنا چاہیئے وہ اس کا زاویۂ نظر ہے۔ اس لیے کہ اپنے موضوع کے ساتھ مصنف کا برتاؤ، اور اس کا صحیح یا غلط نتائج پر پہنچنا، تمام تر اس کے زاویۂ نظر ہی پر منحصر ہوتا ہے۔ سیدھا اور صحیح زاویۂ نظر یہ ہے کہ آدمی محض امر حق کا طالب ہو اور مسئلہ کو، جیسا کہ وہ فطرۃً و حقیقۃً ہے، اس کے اصلی رنگ میں دیکھے، اور حقیقت کا یہ مشاہدہ جس نتیجہ پر پہنچاتا ہو اس پر پہنچ جائے بلا اس لحاظ کے کہ وہ کس کے خلاف پڑتا ہے اور کس کے موافق۔ یہ بحث و تحقیق کا فطری اور علمی زاویۂ نظر ہے اور اسلامی زاویۂ نظر بھی اس کے سوا کوئی نہیں کہ اسلام کی روح ہی الحب فی اللہ و البغض فی اللہ ہے۔ اس سیدھے زاویۂ نظر کے علاوہ بہت سے ٹیڑھے زاویہ ہائے نظر بھی ہیں۔ مثلاً ایک یہ کہ آپ کسی کی محبت میں مبتلا ہیں اس لیے صرف اسی نتیجہ پر جانا چاہتے ہیں جو اس کے موافق ہو۔ اور دوسرا یہ کہ آپ کو کسی سے بغض و عداوت ہے اس لیے آپ کو تلاش صرف ان

ہی چیزوں کی ہے جو آپ کے معوض کی مخالف ہوں۔ اِس قسم کے ٹیڑھے زاویے جتنے بھی ہیں سب کے سب خلافِ حق ہیں۔ انہیں اختیار کرکے کوئی بحث کسی صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتی۔ کسی عالم اور حقیقی انسان کے لیے زیبا نہیں کہ ایسے کسی زاویہ سے کسی مسئلہ پر نگاہ ڈالے، اِس لیے کہ یہ اسلامی نہیں بلکہ جاہلی زاویۂ نظر ہے۔

اب ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ مولانا نے اس رسالہ میں کون سا زاویۂ نظر اختیار فرمایا ہے۔ اپنی بحث کے آغاز میں وہ فرماتے ہیں:۔

"ضروری معلوم ہوا کہ ان غلطیوں کا ازالہ کردوں جو اس قسم کی قومیتِ متحدہ سے مخالفت اور اس کو خلافِ دیانت قرار دینے کے متعلق شائع ہوئی ہیں یا شائع کی جارہی ہیں، کانگریس ۱۸۸۵ء سے اہلِ ہندستان سے بنا بر وطنیت اِس اتحادِ قومی کا مطالبہ کرتی ہوئی بیش از بیش جدوجہد عمل میں لارہی ہے۔ اور اس کی مقابل و مخالف قوتیں اس کے غیر قابلِ قبول ہونے بلکہ ناجائز اور حرام ہونے کی انتہائی کوششیں عمل میں لارہی ہیں۔ یقیناً برٹش شہنشاہیت کے لیے اِس سے بڑھ کر کوئی خطرناک چیز نہیں ہے۔ یہ چیز میدان میں آج سے نہیں بلکہ تقریباً ۱۸۸۸ء یا اس سے پہلے سے لائی گئی ہے اور مختلف عنوانوں سے اس کی وری ہندستانیوں کے دل و دماغ پر عمل میں لائی جاتی ہے۔" (ص ۵-۶)

پھر چند سطروں کے بعد فرماتے ہیں:۔

"اگرچہ بہت سے ان لوگوں سے جن کو برطانیہ سے گہرا تعلق ہے یا جن کے دماغ اور قلب برطانوی مدبّرین کے سحر سے ماؤف ہو چکے ہیں امید نہیں ہے کہ وہ اس کو قبول کریں گے۔"

اسی سلسلہ میں ڈاکٹر اقبال مرحوم کے متعلق فرماتے ہیں کہ "اُن کی ہستی کوئی معمولی ہستی نہ تھی۔ وہ لیسے اور ایسے تھے مگر باوجود کمالاتِ گوناگوں کے ساحرینِ برطانیہ کے سحر میں مبتلا ہو گئے تھے۔"

پھر ایک طویل بحث کے بعد اپنے زاویۂ نظر کا صاف صاف اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں :۔

"ہندوستانیوں کا وطنیت کی بنا پر متحدہ قومیت بنا لینا انگلستان کے لیے جس قدر خطرناک ہے وہ ہماری اس شہادت سے ظاہر ہے جو ہم نے پروفیسر سیلے کے مقالہ سے نقل کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جذبہ ضعیف سے ضعیف بھی اگر ہندوستانیوں میں پیدا ہو جائے تو اگرچہ ان میں انگریزوں کے نکالنے کی طاقت موجود نہ بھی ہو مگر فقط اس وجہ سے کہ ان میں یہ خیال جاگزیں ہو جائے گا کہ اجنبی قوم کے ساتھ ان کے لیے اشتراکِ عمل شرمناک امر ہے، انگریزی شہنشاہیت کا خاتمہ ہو جائے گا۔" (ص ۲۸)

آگے چل کر ایک حیرت انگیز رائے کا اظہار فرماتے ہیں جسے پڑھ کر آدمی ششدر رہ جاتا ہے کہ کیا یہ کسی حقیقی عالم کی تحریر ہو سکتی ہے :۔

"اگر قومیت ایسی ہی ملعون اور بدترین چیز ہے تو چونکہ یورپ نے اس کو استعمال کر کے اسلامی پادشاہوں اور عثمانی خلافت کی جڑ کھودی ہے، مسلمانوں کو چاہیے تھا کہ اسی ملعون ہتھیار کو برطانیہ کی جڑ کھودنے کے لیے استعمال کرتے۔" (ص ۲۸)

اسی بحث کے دوران میں مولانا پہلے تو اس امر کا اعتراف فرماتے ہیں کہ پچھلی دو صدیوں میں مسلمان سلطنتوں کو جس قدر بھی نقصان پہنچا ہے اسی وجہ سے پہنچا ہے کہ یورپ نے اسلامی وحدت کے خلاف سخت پراپیگنڈا کیا " اور مسلمانوں میں نسلی، وطنی، لسانی امتیاز و افتراق پیدا کر دیا" اور ان میں یہ اسپرٹ پیدا کی کہ " جہاد مذہبی و روحانی نہ ہو بلکہ نسلوں اور اوطان کے لیے کیا جائے اور مذہبیت کی اسپرٹ درمیان سے نکال دی جائے" (صفحہ ۲۵-۲۶) لیکن امرِ حق کے اس قدر قریب پہنچ جانے کے بعد پھر وہی برطانیہ کا ہوّا مولانا کے سامنے آن کھڑا ہوتا ہے اور وہ فرماتے ہیں :۔

"افسوس مسلمانوں میں اُس وقت کوئی شخص مسلمانوں کی متحدہ قومیت اور التماسِ وطنیت، نسل ولسان وغیرہ کا واسطہ کھڑا نہ ہوا۔ اور نہ یورپ کے اخبار ورسائل اور لکچراروں کی بے حد وبے شمار آندھیوں کا مقابلہ کیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پان اسلام ازم ایک قصۂ پارینہ ہو کر فنا کے گھاٹ اُتر گیا اور ممالکِ اسلامیہ یورپین اقوام کے لیے لقمۂ تر بن کر رہ گئے۔ اب جب کہ مسلمانوں کو افریقہ، یورپ، ایشیاء وغیرہ میں پارہ پارہ کر کے فنا کی گود میں ڈال دیا گیا ہے تو ہم کو کہا جاتا ہے کہ اسلام صرف ملی اتحاد کی تعلیم دیتا ہے۔ وہ کسی غیر مسلم جماعت سے متحد نہیں ہو سکتا اور نہ کسی غیر مسلم قوم کے ساتھ متحدہ قومیت بنا سکتا ہے۔" (ص ۳۶-۳۷)

مندرجہ بالا عبارات سے صاف ظاہر ہے کہ موصوف کی نگاہ میں حق اور باطل کا معیار صرف برطانیہ بن کر رہ گیا۔ وہ مسئلہ کو نہ تو علمی زاویۂ نظر سے دیکھتے ہیں کہ حقائق اپنے اصلی رنگ میں نظر آسکیں، نہ وہ مسلمانوں کی خیرخواہی کے زاویۂ نظر سے اس پر نگاہ ڈالتے ہیں کہ جو کچھ مسلمانوں کے لیے زہر ہے وہ انہیں زہر دکھائی دے سکے۔ ان دونوں زاویوں کے بجائے اُن پر فقط برطانیہ کی عداوت کا زاویۂ نظر مستولی ہو گیا ہے جس کی وجہ سے ہر وہ چیز ان کو تریاق نظر آتی ہے جس کے متعلق کسی طرح ان کو معلوم ہو جاتے کہ وہ برطانیہ کے لیے زہر ہے۔ اب اگر کوئی شخص اسی چیز کو مسلمانوں کے لیے زہر سمجھتا ہو اور اس بنا پر اس کی مخالفت کرے تو وہ ان کے نزدیک برطانیہ پرست کے سوا کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا، کیونکہ ان کو مسلمانوں کی زندگی سے اتنی دلچسپی نہیں جتنی برطانیہ کی موت سے ہے۔ اور جب یہ بات ان کے دل میں بیٹھ چکی ہے کہ "متحدہ قومیت" برطانیہ کے لیے مہلک ہے تو جو شخص اس کی مخالفت کرتا ہے وہ "برطانیہ پرست" کے سوا اور ہو ہی کیا سکتا ہے ——— خیریت یہ ہو گئی کہ کسی نے مولانا کو برطانیہ کی ہلاکت کا ایک دوسرا نسخہ نہ بتا دیا جو متحدہ قومیت سے بھی زیادہ کارگر ہے، یعنی یہ کہ ہندوستان کی ۳۵ کروڑ آبادی یک بارگی خودکشی کر لے جس سے برطانوی سلطنت آن کی آن میں ختم کی جا

سکتی ہے۔ یہ تیر بہدف تدبیر اگر مولانا کے دل میں بیٹھ جاتی تو وہ بے تکلف فرماتے کہ جو شخص ہندوستان کے باشندوں کو خودکشی سے روکتا ہے وہ برطانیہ پرست ہے۔ خودکشی اگرچہ "ملعون" اور "بدترین" فعل ہی مگر جب کہ اس سے برطانیہ کی جڑ کھودی جاسکتی ہے تو فرض ہو جاتا ہے کہ اس فعلِ قبیح کا ارتکاب کیا جائے!_____

ایسی ہی باتوں سے یہ راز سمجھ میں آتا ہے کہ دین میں الحب فی اللہ والبغض فی اللہ کو معیارِ حق کیوں قرار دیا گیا ہے۔ اگر خدا کا واسطہ درمیان سے ہٹ جائے اور بجائے خود کوئی شے محبوب یا مبغوض بن جائے تو عصبیت جاہلیہ کی سرحد شروع ہو جاتی ہے، جس میں وہ تمام ذرائع و وسائل جائز کر لیے جاتے ہیں جن سے انسان کے جذبات محبت و عداوت کی تشفی ہو سکے، بقطع نظر اس سے کہ وہ قانونِ الٰہی کے مطابق ہوں یا اس کے خلاف۔ اسی لیے کہنے والے نے کہا کہ ذاتی عداوت تو شیطان سے بھی نہ ہونی چاہیے۔ اس میں بھی خدا کا واسطہ بیچ میں رہنا ضروری ہے، ورنہ وہ خود ایک قانون بن جائے گی اور تم شیطان کی دشمنی میں خدا کے حدود توڑ دو گے، یعنی اپنے دشمن شیطان ہی کا کام کرو گے۔

اثباتِ مدعا کے لیے حقائق سے چشم پوشی

اسی ذہنیت کا نتیجہ ہے کہ مولانا اپنے مدعا کو ثابت کرنے کے لیے تاریخ کے مشہور اور بیّن واقعات کو بھی صاف نظر انداز کر جاتے ہیں۔ یورپ جب مسلمانوں میں نسلی، وطنی اور لسانی قومیتوں کی تبلیغ کر رہا تھا تو کیا مسلمانوں میں کوئی اس کا مقابلہ کرنے کے لیے کھڑا نہیں ہوا؟ کیا ٹیپو سلطان، جمال الدین افغانی، مفتی محمد عبدہٗ، مصطفیٰ کامل مصری، امیر شکیب ارسلان، انور پاشا، جلال نوری بے، شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی، محمود الحسن، محمد علی، شوکت علی، اقبال، ابوالکلام مرحوم کسی کا نام بھی مولانا نے نہیں سُنا؟ کسی کے کارنامے ان تک نہیں پہنچے؟ کیا ان میں سے کسی نے بھی مسلمانوں کو متنبہ نہیں کیا کہ جاہلیت کی تفریق تم کو تباہ کرنے کے لیے برپا کرائی جا رہی ہے؟ شاید مولانا ان سوالات کا جواب نفی میں نہ دیں گے مگر

وہاں سب واقعات کی طرف سے آنکھیں بند کر کے فرماتے ہیں کہ "افسوس مسلمانوں میں اُس وقت کوئی مسلمانوں کی متحدہ قومیت کا واعظ نہ ہوا" ـــــــ ایسا غلط دعویٰ کرنے کی آخر ضرورت کیا تھی ؟ مقصود صرف یہ ثابت کرنا تھا کہ پہلے مسلمانوں کی قومی وحدت برطانوی مفاد کے خلاف تھی اس لیے سب مسلمان نسلی، وطنی اور لسانی امتیازات پھیلانے میں لگے ہوئے تھے، اور اب اسلامی وحدت برطانوی اغراض کے لیے مفید ہوگئی ہے، اس لیے اُس کا وعظ ابھی ابھی شروع ہوا ہے۔ لہذا ثابت ہوا کہ وطن پرستی کے مخالف سب کے سب برطانیہ پرست ہیں اور محض ساحرِ برطانیہ ... بول رہا ہے ! ـــــــ یہ ہے نتیجہ عصبیتِ جاہلیہ کا۔ چونکہ حق و باطل کا معیار "برطانیہ" ہو گیا ہے اس لیے خلافِ واقعہ باتوں کی تصنیف بھی جائز ہو گئی، اگر ان سے برطانیہ کے خلاف کوئی کام لیا جا سکے۔

یہی ذہنیت ہے جو ہمیں پورے رسالہ میں کارفرما نظر آتی ہے۔ لغت کو، آیات قرآنی کو، اخبار و احادیث کو، تاریخی واقعات کو، غرض ہر چیز کو توڑ مروڑ کر اپنا مدعا ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اور ہر اُس چیز کو بلا تکلف نظر انداز کر دیا گیا ہے جو مدعا کے خلاف ہو، چاہے وہ کیسی ہی ظاہر و باہر حقیقت کیوں نہ ہو۔ حد یہ ہے کہ لفظی مغالطے دینے اور قیاس مع الفارق اور بناء فاسد علی الفاسد کا ارتکاب کرنے میں بھی تامل نہیں فرمایا گیا۔ ایک عالم اور متقی عالم کا یہ کارنامہ دیکھ کر آدمی انگشت بدنداں رہ جاتا ہے کہ اسے کیا کہیے۔

قومیں اوطان سے کہاں بنتی ہیں ؟

مولانا فرماتے ہیں کہ "فی زماننا قومیں اوطان سے بنتی ہیں" لیکن یہ ایک قطعی غلط اور سراسر بے بنیاد دعویٰ ہے۔ پوری انسانی تاریخ سے ایک مثال بھی ایسی پیش نہیں کی جا سکتی کہ کوئی قوم محض وطن سے بنی ہو۔ آج اس زمانہ میں بھی دنیا کی تمام قومیں مولانا کے سامنے موجود ہیں۔ وہ فرمائیں کہ ان میں سے کون سی قوم وطن سے بنی ہے ؟ کیا امریکہ کے حبشی اور ریڈ انڈین اور سفید فام ایک قوم ہیں ؟ کیا جرمنی کے یہودی اور جرمن ایک

قوم ہیں؟ کیا پولینڈ، روس، ٹرکی، بلغاریہ، یونان، یوگوسلاویہ، چیکوسلواکیہ، لتھوانیا، فن لینڈ، کسی جگہ بھی خاکِ وطن کے اشتراک نے ایک قوم بنائی؟ کیا انگلستان، فرانس، اٹلی اور جاپان میں وحدت کا رنگ محض خاکِ وطن نے پیدا کیا ہے؟ کیا ڈیڑھ کروڑ سے زیادہ یہودی جو رُوئے زمین کے اطراف و اکناف میں منتشر ہیں، کسی جگہ بھی وطنی قومیت میں جذب ہو گئے ہیں؟ کیا یورپ کے مختلف ممالک میں جرمن، سلاف، مورادین وغیرہ مختلف قومی اقلیتیں کسی جگہ بھی وطنی رشتہ اشتراک میں گم ہو گئیں؟

واقعات تو بہرحال واقعات ہیں۔ آپ ان کو اپنی خواہشات کا تابع نہیں بنا سکتے۔ آپ کو یہ کہنے کا حق ہے، اگر آپ ایسا کہنا چاہیں کہ اب قوموں کو اوطان سے بننا چاہیئے۔ لیکن آپ کو ثبوت اور شہادت سے بے نیاز ہو کر دنیا کو یہ غلط خبر دینے کا کیا حق ہے کہ اب قومیں اوطان سے بننے لگی ہیں؟

هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۔ (البقرہ - ۱۱۱)

اگر (اپنے دعویٰ میں) سچے ہو تو اس کی دلیل لاؤ۔

اس میں شک نہیں کہ ایک مُلک کے باشندوں کو باہر والے ان کے ملک کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ مثلاً امریکن، خواہ حبشی ہو یا فرنگی، باہر والے اس کو امریکن ہی کہیں گے۔ مگر کیا اس سے یہ حقیقت بدل جاتی ہے کہ امریکہ میں یہ دو الگ الگ قومیں ہیں نہ کہ ایک قوم؟ یہ بھی صحیح ہے کہ بین الاقوامی تعلقات میں ایک شخص اصطلاحاً اس سلطنت کا "نیشنل" کہلاتا ہے جس کی وہ رعایا ہو۔ مثلاً اگر مولانا حسین احمد صاحب بیرونِ ہند تشریف لے جائیں تو ان کو "برٹش نیشنلٹی" (برطانوی قومیت) سے منسوب کیا جائے گا۔ لیکن کیا یہ اصطلاحی قومیت حقیقت میں بھی مولانا کی قومیت بدل دے گی؟ پھر بھلا علمی حیثیت سے اس استدلال کی کیا وقعت ہو سکتی ہے کہ "اس وطن کے رہنے والے کی حیثیت سے سب (یعنی ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی وغیرہ) ایک ہی قوم شمار ہوتے ہیں"؟ شمار ہونے اور فی الواقع ہونے میں بڑا فرق ہے۔ ایک کو دوسرے کے لیے نہ تو دلیل بنایا جا سکتا ہے، اور نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کو فی الواقع وہی ہونا چاہیئے جیسے وہ شمار

کیے جاتے ہیں۔

لغت اور قرآن سے غلط استدلال

اس کے بعد مولانا لغتِ عربی کی طرف رجوع فرماتے ہیں اور شواہد سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ عربی زبان میں قوم کے معنی ہیں "مردوں کی جماعت" یا "مردوں اور عورتوں کا مجموعہ" یا "ایک شخص کے اقرباء" یا "دشمنوں کی جماعت"۔ اس کا ثبوت انہوں نے آیاتِ قرآنی سے بھی پیش فرمایا ہے۔ مثلاً وہ آیات جن میں کفار کو نبی کی یا مسلمانوں کی قوم" قرار دیا گیا ہے جو صریحاً تیسرے اور چوتھے معنی پر دلالت کرتا ہے۔ یا وہ آیات جن میں لفظ "قوم" پہلے یا دوسرے معنوں میں مستعمل ہوا ہے۔ لیکن اس پوری بحث میں مولانا کو ایک مرتبہ بھی یہ خیال نہ آیا کہ اس وقت جو بحث درپیش ہے وہ لفظ قوم کے لغوی معنی یا قدیم معنی سے متعلق نہیں ہے بلکہ موجودہ زمانہ کی اصطلاح سے تعلق رکھتی ہے۔ جواہر لال اور سید محمود لغتِ عرب اور قرآنی زبان میں کلام نہیں کرتے۔ نہ کانگریس کی کارروائیوں میں یہ پرانی زبان استعمال ہوتی ہے۔ ان کے الفاظ کا تو وہی مفہوم ہے اور وہی ہو سکتا ہے جو آج کل ان سے مراد لیا جاتا ہے۔ آج کل اردو زبان میں "قوم" اور "قومیت" کے الفاظ انگریزی زبان کے الفاظ (Nation) اور (Nationality) کے مقابلہ میں بولے جاتے ہیں جن کی تشریح لارڈ برائس نے اپنی کتاب "بین الاقوامی تعلقات" (International Relations) میں بدیں الفاظ کی ہے:-

> "ایک قومیت سے مراد اشخاص کا ایسا مجموعہ ہے جن کو چند مخصوص جذبات (Sentiments) نے ملا کر باہم مربوط کر دیا ہو۔ ان میں سے بڑے اور طاقتور جذبے تو دو ہیں۔ ایک جاذبۂ نسل، دوسرا جاذبۂ دین۔ لیکن ایک مشترک زبان کے استعمال اور مشترک لٹریچر سے دلچسپی اور زمانۂ ماضی کے مشترک قومی کارناموں اور مشترک مصائب کی یاد اور مشترک رسوم و عوائد، مشترک تخیلات و افکار اور مشترک مقاصد اور حوصلوں کا

بھی اِس احساس جمعیت کی پیدائش میں بہت کچھ دخل ہوتا ہے کبھی
یہ سب رابطے یک جا موجود ہوتے ہیں اور مجموعۂ افراد کو بستہ و پیوستہ
رکھتے ہیں۔ اور کبھی ان میں سے بعض رابطے موجود نہیں ہوتے لیکن
قومیت پھر بھی موجود ہوتی ہے۔" (صفحہ ۱۱)

اسی کی تشریح اخلاق و ادیان کی دائرۃ المعارف (Encyclopaedia of Religion and Ethics) میں یُوں کی گئی ہے:۔

"قومیت وہ وصفِ عام یا متعدد اوصاف کا ایسا مرکب ہے
جو ایک گروہ کے افراد میں مشترک ہو اور ان کو جوڑ کر ایک قوم بنا دے۔
ہر ایسی جماعت ان افراد پر مشتمل ہوتی ہے جو نسل، مشترک روایات،
مشترک مفاد، مشترک عادات و رسوم اور مشترک زبان کے رابطوں سے
باہم مربوط ہوتے ہیں، اور ان سب سے اہم رابطہ ان کے درمیان یہ ہوتا
ہے کہ وہ باہم ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھتے ہیں، بلا ارادہ ایک دوسرے
کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں، اور ان کے درمیان مختلف حیثیات سے الفت و
موانست ہوتی ہے۔ غیر قوم کا آدمی ان کو غیر اور اجنبی محسوس ہوتا
ہے اس لیے کہ اس کی دلچسپیاں اور اس کی عادات انہیں نرالی معلوم
ہوتی ہیں اور ان کے لیے اس کے اندازِ طبیعت اور اس کے خیالات و
جذبات کو سمجھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے قدیم زمانہ کے لوگ
غیر قوم والوں کو شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے، اور اسی وجہ سے آج کا
مہذّب آدمی بھی غیر قوم والے کی عادات اور طرزِ زندگی کو اپنے مذاق
کے خلاف پا کر ناک بھوں چڑھاتا ہے۔"

کیا کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ قرآن مجید نے اس معنی میں کفار و مشرکین اور مسلمانوں کا ایک قومیت میں جمع ہونا جائز رکھا ہے؟ یا کوئی نبی دنیا میں کبھی اِس غرض کے لیے بھی بھیجا گیا ہے کہ مومن اور غیر مومن سب کو اس معنی میں ایک قوم بنائے؟ اور اگر نہیں تو یہ

فضول لفظی بحث آخر کیوں چھیڑی جاتی ہے ؟ لفظ اپنے معنی تاریخ کے دوران میں بار بار بدلتا ہے ۔ کل ایک لفظ کسی معنی میں استعمال ہوتا تھا ۔ آج کسی اور معنی میں ہوتا ہے ۔ اب یہ لفظی مغالطہ نہیں تو اور کیا ہے کہ آپ معنوی تغیرات کو نظر انداز کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش فرمائیں کہ قرآن کی رُو سے قومیت میں اشتراک مسلم اور کافر کا ہو سکتا ہے ؟ دراں حالیکہ قومیت کا جو مفہوم قرآن کی زبان میں تھا اس کو آج کے مفہوم سے ذرہ برابر کوئی علاقہ نہیں ۔ متقدمین نے " مکروہ " اور " حرام " میں اصطلاحی فرق نہیں کیا تھا اس لیے اکثر مقامات پر ان کی عبارتوں میں مکروہ بمعنی حرام مستعمل ہوا ہے ۔ لیکن اب کہ ممنوعیت کے ان دونوں مدارج کے لیے الگ اصطلاحیں بن چکی ہیں اگر کوئی شخص کسی حرام کو محض مکروہ بمعنی اصطلاحی ٹھیرائے اور حجت کے طور پر سلف کی کوئی عبارت پیش کرے تو کیا یہ مغالطہ کے سوا کچھ اور ہوگا ؟ اسی طرح لفظ قومیت بھی اب اصطلاح بن چکا ہے ۔ اب مسلم وکافر کے لیے مشترک قومیت کا لفظ استعمال کرنا ، اور معترض کا منہ بند کرنے کے لیے اس لفظ کے پُرانے استعمالات کو حجت میں پیش کرنا بھی محض ایک مغالطہ ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں ۔

ایک اور لفظی مغالطہ

آگے چل کر مولانا دعویٰ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ میں یہود اور مسلمانوں کی متحدہ قومیت بنائی تھی ۔ اور اس کے ثبوت میں وہ معاہدہ پیش کرتے ہیں جو ہجرت کے بعد حضور اکرم اور یہودیوں کے درمیان ہوا تھا ۔ اس معاہدہ میں کہیں یہ فقرہ مولانا کے ہاتھ آگیا کہ :

وان یہود بنی عوف امۃ مع المومنین ۔

" بنی عوف کے یہودی مسلمانوں کیساتھ ایک امت ہوں گے ۔ "

بس یہ فقرہ کہ " یہودی اور مسلمان ایک امت ہوں گے " یہ دعویٰ کرنے کے لیے کافی سمجھ لیا گیا کہ آج بھی مسلمانوں اور غیر مسلموں کی متحدہ قومیت بن سکتی ہے لیکن یہ پھر لفظی مغالطہ ہے ۔ لُغتِ عرب میں امت سے مراد وہ جماعت ہے جس کو کوئی چیز جمع کرتی ہو ، عام اس سے کہ وہ زمانہ ہو ، مقام ہو ، دین ہو یا کوئی اور چیز ——— اس لحاظ سے اگر دو مختلف قومیں

کسی ایک مشترک مقصد کے لیے عارضی طور پر متفق ہو جائیں تو ان کو بھی ایک اُمّت کہا جا سکتا ہے۔ چنانچہ صاحب لسان العرب لکھتے ہیں:

وقوله فی الحدیث ان یهود بنی عوف امة من المومنین یرید انهم بالصلح الذی وقع بینهم وبین المومنین کجماعة منهم کلمتهم و ایدیهم واحدة۔

حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ ان یهود بنی عوف امة من المومنین اس سے مراد یہ ہے کہ یہودیوں اور مسلمانوں کے درمیان جو صلح واقع ہوئی ہے اس کی وجہ سے وہ گویا مسلمانوں ہی کی ایک جماعت ہو گئے ہیں اور ان کا معاملہ واحد ہے۔

اس لغوی "اُمّت" کو آج کی اصطلاحی "متحدہ قومیت" سے کیا واسطہ؟ زیادہ سے زیادہ اس کو آج کل کی سیاسی زبان میں فوجی اتحاد (Military Alliance) کہہ سکتے ہیں یہ محض ایک تحالف تھا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ یہود اپنے دین پر رہیں گے، دونوں کی تمدنی و سیاسی ہیئتیں الگ الگ رہیں گی، البتہ ایک فریق پر جب کوئی حملہ کرے گا تو دونوں فریق مل کر لڑیں گے، اور دونوں اس جنگ میں اپنا اپنا مال خرچ کریں گے۔ دو تین سال کے اندر ہی اس تحالف کا خاتمہ ہو گیا اور مسلمانوں نے کچھ یہودیوں کو جلا وطن کیا اور کچھ کو ہلاک کر دیا۔ کیا اسی کا نام "متحدہ قومیت" ہے؟ کیا کسی معنی میں بھی یہ چیز اس "متحدہ قومیت" سے مماثلت رکھتی ہے جو اس وقت معرضِ بحث میں ہے؟ کیا وہاں کوئی مشترک اسٹیٹ بنایا گیا تھا؟ کیا وہاں کوئی مشترک مجلسِ قانون ساز بنائی گئی تھی اور یہ طے ہوا تھا کہ یہودی اور مسلمان ایک مجموعہ ہوں گے اور اس مجموعہ میں سے جس کی اکثریت ہو گی وہی مدینہ پر حکومت کرے گا اور اسی کے منظور کیے ہوئے قوانین مدینہ میں نافذ ہوں گے؟ کیا وہاں مشترک عدالتیں قائم ہوتی تھیں جن میں یہودیوں اور مسلمانوں کے قضایا کا یکجا اور ایک ہی ملکی قانون کے تحت فیصلہ ہوتا ہو؟ کیا وہاں کوئی وطنی کانگریس بنائی گئی تھی جس میں یہودی اکثریت کا منتخب کیا ہوا ہائی کمانڈ اپنی انگلیوں پر یہودی اور مسلمان سب کو رقص کراتا ہو؟ کیا وہاں رسول اللہ سے

معاہدہ کرنے کے بجائے کعب بن اشرف اور عبد اللہ بن اُبی براہِ راست افرادِ مسلمین سے ماس کانٹیکٹ (Muslim Mass Contact) کرنے گئے تھے؟ کیا وہاں بھی وردھا اسکیم کے طرز کی کوئی تعلیمی اسکیم تصنیف کی گئی تھی تاکہ مسلمان اور یہودی بچے ایک مشترک سوسائٹی بنانے کے لیے تیار کیے جائیں اور ان کو یہودیت اور اسلام کے بجائے صرف مشترک سچائیاں ہی پڑھائی جائیں؟ کیا وہاں بھی کسی ابو رافع نے کوئی "منصوبہ اسکیم" تمام اہلِ مدینہ کے لیے بنائی تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تعلیمی صومعوں میں مسلمان بچوں کا بھیجا جانا قبول فرمایا تھا؟ مولانا آخر فرمائیں تو کہ جس "متحدہ قومیت" کو وہ رسولِ خدا کی طرف منسوب کر رہے ہیں اس میں آج کل کی "متحدہ قومیت" کے عناصرِ ترکیبی میں سے کون سا عنصر پایا جاتا تھا؟ اگر وہ کسی ایک عنصر کا بھی پتہ نہیں دے سکتے، اور میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ ہرگز نہیں دے سکتے، تو کیا مولانا کو خدا کی بازپرس کا خوف نہیں کہ محض امة المومنین یا امة مع المومنین کے الفاظ معاہدۂ نبوی میں دیکھ کر وہ مسلمانوں کو باور کرانا چاہتے ہیں کہ جیسی متحدہ قومیت آج کانگریس بنا رہی ہے، وہی متحدہ قومیت کل نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی بنا چکے ہیں، لہٰذا آؤ اور اطمینان سے اس میں جذب ہو جاؤ۔ الفاظ کا سہارا لے کر مولانا نے اپنا مدعا ثابت کرنے کی کوشش تو بہت خوبی کے ساتھ کر دی، مگر انہیں یہ خیال نہ آیا کہ حدیث کے الفاظ کو مفہومِ نبوی کے خلاف کسی دوسرے مفہوم پر چسپاں کرنا، اور اس مفہوم کو نبی کی طرف منسوب کر دینا من کذب علیّ متعمداً کی زد میں آجاتا ہے۔ مولانا خود ایک جلیل القدر عالم اور محدث ہیں۔ میں ان سے پوچھتا ہوں کہ اگر کوئی شخص حدیثِ عائشہؓ کان النبی یقبل ویباشر وھو صائم کے لفظ مباشرت کو اردو کے معروف معنوں میں لے لے اور اس سے یہ استدلال کرے کہ روزے میں مباشرت کرنا نعوذ باللہ سنت سے ثابت ہے، لہٰذا سب مسلمانوں کو روزے میں مباشرت کرنی چاہیے، تو آپ اس پر کیا حکم لگائیں گے؟ دونوں استدلالوں کی نوعیت ایک ہے لہٰذا ان کا حکم بھی ایک ہی ہونا چاہیے اور کوئی وجہ نہیں کہ مستدل کی شخصیت کو دیکھ کر اس باب میں رعایت کی جائے۔ بلکہ اگر مستدل ان لوگوں میں سے ہے جن کی طرف مسلمان اعتماد اور بھروسے کے ساتھ اپنے دین کا علم حاصل کرنے کے لیے رجوع کرتے ہیں، تو معاملہ

اور زیادہ اشد ہو جاتا ہے۔ جب شفاخانہ ہی سے زہر تقسیم ہونے لگے تو امرت کہاں تلاش کیا جائے؟

بناء فاسد علی الفاسد

پھر مولانا اس متحدہ قومیت کے جواز میں ایک اور دلیل پیش کرتے ہیں اور وہ یہ ہے :-

"ہم روزانہ مفادہائے مشترکہ کے لیے ہیئات اجتماعیہ بناتے ہیں اور ان میں نہ صرف شریک ہوتے ہیں بلکہ ان کی ممبری اور شرکت کے لیے انتہائی جدوجہد کرتے ہیں۔...... ٹاؤن ایریا، نوٹیفائڈ ایریا، میونسپل بورڈ، ڈسٹرکٹ بورڈ، کونسلات، اسمبلیاں، ایجوکیشنل ایسوسی ایشن اور اس قسم کی سینکڑوں ایسوسی ایشنیں اور انجمنیں ہیں جو کہ انہی اصولوں اور قواعد سے عبارت ہیں جو کہ خاص مقصد کے ماتحت ہیئت اجتماعیہ کے لیے بنائے گئے ہیں۔ تعجب ہے کہ ان میں حصہ لینا اور مکمل یا غیر مکمل جدوجہد کرنا ممنوع قرار نہیں دیا جاتا۔ مگر اسی قسم کی کوئی انجمن آزادی ملک اور برطانوی اقتدار کے خلاف قائم ہو تو وہ حرام، خلافِ دیانت، خلافِ تعلیماتِ اسلامیہ اور خلافِ عقل و دانش وغیرہ ہو جاتی ہے۔" (صفحہ ۱۶)

یہ بناءِ فاسد علی الفاسد ہے۔ ایک گناہ کو جائز فرض کر کے اس کی حجت پر مولانا اسی قسم کے دوسرے گناہ کو جائز ثابت کرنا چاہتے ہیں، حالانکہ دونوں میں ایک ہی علتِ حرمت پائی جاتی ہے اور مقیس و مقیس علیہ دونوں ناجائز ہیں تاوقتیکہ یہ علت ان سے دور نہ ہو۔ علماء کرام مجھے معاف فرمائیں، میں صاف کہتا ہوں کہ ان کے نزدیک کونسلوں اور اسمبلیوں کی شرکت کو ایک دن حرام اور دوسرے دن حلال کر دینا ایک کھیل بن گیا ہے، اس لیے کہ ان کی تحلیل و تحریم حقیقت نفس الامری کے ادراک پر تو مبنی ہے نہیں، محض گاندھی جی کی جنبشِ لب کے ساتھ ان کا فتویٰ گردش کیا کرتا ہے۔ لیکن میں اسلام کے غیر تغیر پذیر اصولوں کی بنا پر یہ کہتا ہوں کہ ہر اس اجتماعی ہیئت کو تسلیم کرنا مسلمانوں کے لیے ہمیشہ گناہ تھا، آج

بھی گناہ ہے اور ہمیشہ گناہ رہے گا جس کا دستور انسانوں کو اس امر کا اختیار دیتا ہو کہ وہ ان مسائل کے متعلق قانون بنائیں یا ان مسائل کا تصفیہ کریں، جن پر خدا اور اس کا رسول پہلے اپنا ناطق فیصلہ دے چکا ہے۔ اور یہ گناہ اِس صورت میں اور زیادہ شدید ہو جاتا ہے جبکہ ایسے اختیارات رکھنے والی اجتماعی ہیئت میں اکثریت غیر مسلموں کی ہو اور فیصلہ کا مدار کثرتِ رائے پر ہو۔ ان اجتماعی ہیئتوں کے حدودِ اختیار و عمل کو خدا کی شریعت کے حدود سے الگ کر دینا مسلمانوں کا اوّلین فرض ہے اور اصلی جنگِ آزادی ان کے لیے یہی ہے۔ اگر یہ حدود الگ ہو جائیں تو البتہ کسی ایسی جماعت سے دوستی یا معاہدہ اور تعاون کرنا مسلمانوں کے لیے جائز ہو گا جو مسلمانوں اور غیر مسلموں کی مشترک اغراض کے لیے بنائی جائے، عام اس سے کہ وہ کسی مشترک دشمن کے مقابلہ میں مدافعت کے لیے ہو، یا کسی معاشی یا صنعتی کاروبار کے لیے۔ لیکن جب تک حدود ایک دوسرے سے گڈمڈ ہیں، اشتراک و تعاون تو درکنار، ایسے دستور کے تحت تندگی بسر کرنا بھی مسلمانوں کے لیے گناہ ہے۔ اور یہ اجتماعی گناہ ہے جس میں مَن و تُو کی تمیز نہیں۔ ہماری قوم اس وقت تک گناہگار رہے گی جب تک کہ وہ اس دستور کو پارہ پارہ نہ کر دے۔ اور اس میں ان لوگوں کا گناہ شدید تر ہو گا جو اس دستور پر راضی ہوں گے اور اسے چلانے میں حصّہ لیں گے۔ اور اس شخص کا گناہ شدید ترین ہو گا جو خدا کی شریعت اور اس کے رسول کی سنّت کو اس کے لیے دلیلِ جواز بنائے گا۔ کائنًا من کان۔

میرے نزدیک یہ نہ تفقہ ہے اور نہ تقویٰ کہ جس چیز میں ایک علّتِ حرمت کی اور دوسری علّت جواز کی بیک وقت پائی جاتی ہو اس میں سے محض علّتِ جواز کو الگ نکال کر حکم لگایا جائے اور علّتِ حرمت کی طرف سے آنکھیں بند کر لی جائیں۔ آپ آزادی ملک اور برطانوی اقتدار کے خلاف جدّوجہد کا نام لے کر بحث نے دیتے ہیں کہ اسے کون ناجائز کہہ سکتا ہے۔ لیکن یہ نام لیتے وقت آپ کو یہ یاد نہیں آتا کہ جو انجمن اس نام کے مطابق آزادی کے لیے جدوجہد کر رہی ہے، وہی انجمن اس دستور کو قبول کرتی ہے، اسے چلاتی ہے اور اسی کو حدِّ کمال تک پہنچانے کے لیے کوشاں ہے جو انسانی مجلس قانون ساز کو خدا کے قانون میں ترمیم کرنے کا اختیار دیتا ہے۔ جس کی رو سے خدا کا قانون اگر نافذ ہو بھی سکتا ہے تو صرف

اس وقت جب کہ اسے لیجس لیچر (Legislature) کی منظوری حاصل ہو جاتے جس کے تحت غیر مسلم اکثریت کو مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کا نقشہ بنانے اور بگاڑنے کے پورے اختیارات حاصل ہوتے ہیں اور وہ اُن کے اخلاق، ان کی معاشرت، اور اُن کی آئندہ نسلوں کی تعلیم و تربیت پر ہر قسم کے اثرات ڈال سکتی ہے۔ ایسے دستور کے ساتھ جو آزادی ملک حاصل ہوتی ہو آپ اس کے پیچھے دوڑ سکتے ہیں، کیونکہ آپ کو صرف برطانوی اقتدار کا زوال مطلوب ہے، عام اس سے کہ وہ کسی صورت میں ہو۔ اسی لیے آپ ایسی انجمن کے معاملہ میں صرف علتِ جواز ہی ڈھونڈتے ہیں اور علتِ حرمت جو سامنے منہ کھولے کھڑی ہے، آپ کو کسی طرح نظر نہیں آتی۔ لیکن ہم مجبور ہیں کہ ان دونوں پہلوؤں کو ساتھ ساتھ دیکھیں اور علتِ حرمت کو دفع کیے بغیر علتِ جواز کو قبول نہ کریں۔ اس لیے کہ ہم کو برطانوی اقتدار کا زوال اور اسلام کا بقا دونوں ساتھ ساتھ مطلوب ہیں۔ اس کا نام اگر کوئی برطانیہ پرستی رکھتا ہے تو رکھے، ہمیں اس کے طعن کی ذرہ برابر پروا نہیں۔

افسوسناک بے خبری

مولانا ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں:

"(متحدہ وطنی قومیت) کی مخالفت کا فتویٰ صرف اس بنا پر کہ وطنیت کا مفہوم مغرب کی اصطلاح میں کچھ ایسے اصولوں پر اطلاق کیا جاتا ہے جو کہ ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ سے تعلق رکھتے ہیں اور وہ یکسر مخالف مذہب ہیں، اسی مفہوم مصطلح سے مخصوص ہوگا۔ مگر یہ مفہوم نہ عام طور پر لوگوں کے ذہن نشین ہے اور نہ اس کا کوئی مسلمان دیانت دار قائل ہو سکتا ہے اور نہ ایسے مفہوم کی اس وقت تحریک ہے۔ کانگریس اور اس کے ارکان اس کے محرک نہیں ہیں اور نہ اس کو ہم ملک کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔" (صفحہ ۴۱)

اس دعوے کے ثبوت میں وہی پامال چیز پھر سامنے لائی گئی ہے جس کی حقیقت ایک سے زیادہ مرتبہ کھولی جا چکی ہے، یعنی "بنیادی حقوق کا اعلان" اور اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ:۔

"خود کانگریس بھی جس متحدہ قومیت کو ہندوستان میں پیدا کرنا چاہتی ہے اس میں کوئی ایسی بات نہیں چاہتی جس سے اہل ہند کے مذاہب یا ان کے کلچر و تہذیب اور پرسنل لا پر کسی قسم کا ضرر رساں اثر پڑے۔ وہ فقط انہی امور کو درست کرنا اور سلجھانا چاہتی ہے جو کہ مشترکہ مفاد اور ضروریات ملکیہ سے تعلق رکھتے ہیں اور جن کو پردیسی حکومت نے اپنے قبضہ میں لے کر عام باشندگانِ ہند کو فنا کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ گویا یہ امور وہی ہیں جو کہ نوٹیفائڈ ایریا، میونسپل بورڈوں، ڈسٹرکٹ بورڈوں، کونسلوں، اسمبلیوں وغیرہ میں داخلی اور خارجی حیثیات سے طے کیے جاتے ہیں۔ ان میں کسی قوم یا مذہب میں جذب ہو جانا ملحوظِ نظر نہیں ہے" (صفحہ ۵)

یہ تحریر ایک روشن نمونہ ہے اس امر کا کہ اس نازک وقت میں کیسی سطح بینی اور سہل انگاری کے ساتھ مسلمانوں کی پیشوائی کی جا رہی ہے۔ جن مسائل پر آٹھ کروڑ مسلمانوں کے صلاح و فساد کا انحصار ہے، جن میں ایک ذرا سی چوک بھی اُن کی آئندہ صورتِ اجتماعی و اخلاقی کو بگاڑ کر کچھ سے کچھ کر سکتی ہے، ان کے تصفیہ کو ایسا ہلکا اور آسان کام سمجھ لیا گیا ہے کہ اس کے لیے اتنے مطالعہ اور غور و خوض اور تدبر کی بھی ضرورت نہیں سمجھی جاتی جس کا اہتمام ایک فردِ واحد کو طلاق اور وراثت کا کوئی جزئی مسئلہ بتانے میں کیا جاتا ہے۔ عبارت کا ایک ایک لفظ شہادت دے رہا ہے کہ مولانا نہ تو قومیت کے اصطلاحی مفہوم کو جانتے ہیں، نہ کانگریس کے مقصد و مدعا کو سمجھتے ہیں، نہ بنیادی حقوق کے معنی پر انہوں نے غور کیا ہے، نہ ان کو خبر ہے کہ جن اجتماعی مجلسوں کا وہ بار بار اس قدر سادگی کے ساتھ ذکر فرما رہے ہیں ان کے حدودِ اختیار و عمل موجودہ دستور کے تحت کن کن راہوں سے اُس دائرے میں نفوذ کرتے ہیں جس کو تہذیب و تمدن اور عقائد و اخلاق کا دائرہ کہا جاتا ہے۔ حد یہ ہے ——— اور یہ بات میں خوب سوچ سمجھ کر کہہ رہا ہوں ——— کہ مولانا بایں ہمہ علم و فضل کلچر، تہذیب، پرسنل لا وغیرہ الفاظ کو جس طرح استعمال کر رہے ہیں اس سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ وہ ان کے معنی و مفہوم سے ناآشنا ہیں۔ میری یہ صاف گوئی ان حضرات کو یقیناً بُری معلوم ہوگی جو رجال کو حق

سے پہچاننے کے بجائے حق کو رجال سے پہچاننے کے خوگر ہیں، اور اس کے جواب میں چند اور گالیاں سُننے کے لیے میں نے اپنے آپ کو پہلے ہی تیار کر لیا ہے۔ مگر میں جب دیکھتا ہوں کہ مذہبی پیشوائی کی مسندِ مقدس سے مسلمانوں کی غلط رہنمائی کی جا رہی ہے، ان کو حقائق کے بجائے اوہام کے پیچھے چلایا جا رہا ہے، اور خندقوں سے بھری ہوئی راہ کو شاہراہِ مستقیم بنا کر انہیں اس کی طرف دھکیلا جا رہا ہے، تو میں کسی طرح اس پر صبر نہیں کر سکتا، کوشش بھی کروں تو میرے اندر اس پر صبر کی طاقت نہیں ہے۔ لہٰذا مجھے اس پر راضی ہو جانا چاہیے کہ جو کوئی میری صاف گوئی پر ناراض ہوتا ہو تو ہو جائے وَ اُفَوِّضُ اَمْرِیْ اِلَی اللّٰہِ۔ میں اپنا کام اللہ کو سونپتا ہوں۔

وطنی قومیت کا حقیقی مدعا

معنیِ قومیت کی تشریح کے لیے ان عبارات پر پھر ایک نظر ڈال لیجیے جو اسی مضمون میں لارڈ برائس کی کتاب "بین الاقوامی تعلقات" اور "اخلاق و ادیان کی دائرۃ المعارف" سے نقل کی گئی ہیں۔ اس معنی کے اعتبار سے افراد کو قوم بنانے والی چیز اصلاً اور ابتداءً ایک ہی ہے اور وہ کوئی ایسا جاذبہ ہے جو ان سب میں رُوح بن کر پھیل جائے اور ان کو ایک منصوبہ سے مربوط کر دے۔ لیکن محض اس جاذبہ کا موجود ہونا قوم بنانے کے لیے کافی نہیں ہے بلکہ اس کو اتنا طاقت ور ہونا چاہیے کہ وہ تمام ان داعیات کو مٹا دے جو افراد کو یا افراد کے چھوٹے چھوٹے مجموعوں کو ایک دوسرے سے الگ کرنے والے ہوں۔ اس لیے کہ علیحدہ کرنے والی چیزیں اگر جوڑنے والے جاذبہ کی مزاحمت کرنے کے لیے کافی مضبوط ہوں تو وہ جوڑنے کے عمل میں کامیاب نہیں ہو سکتا، یا بالفاظِ دیگر "قوم" نہیں بنا سکتا۔ علاوہ بریں تشکیلِ قومیت کے لیے زبان، ادب، تاریخی روایات، رسوم و عادات، معاشرت اور طرزِ زندگی، افکار و تخیلات، معاشی مفاد اور مادی اغراض کی مدد بھی درکار ہوتی ہے۔ یہ سب چیزیں ایسی ہونی چاہئیں جو اس جوڑنے والے جاذبے کی فطرت سے مناسبت رکھتی ہوں، یعنی ان کے اندر کوئی عنصر ایسا نہ ہو جو علیحدگی کے احساس کو زندہ رکھنے والا ہو۔ اس لیے کہ یہ سب کی سب ایسی طاقتیں ہیں جو افراد کو جمع کرنے میں اثر رکھتی ہیں

اور یہ جوڑنے کے عمل میں اُس کلمۂ جامعہ کی مددگار صرف اسی طرح ہو سکتی ہیں کہ ان سب کا میلان اسی مقصود کی طرف ہو جو اس کلمۂ جامعہ کا مقصود ہے، ورنہ بصورتِ دیگر یہ دوسرے ڈھنگ پر جماعت سازی کریں گی اور قوم بنانے کا عمل ناقص رہے گا۔

اب غور کیجیے کہ جس مُلک میں اِس معنی کے لحاظ سے مختلف قومیں رہتی ہوں ان کو متفق کرنے کی کیا صورتیں ممکن ہیں۔ آپ جتنا بھی غور کریں گے، آپ کو صرف دو ہی ممکن العمل صورتیں نظر آئیں گی:۔

ایک یہ کہ ان قوموں کو ان کی قومیتوں کے ساتھ برقرار رکھ کر ان کے درمیان واضح اور متعین شرائط کے ساتھ ایک ایسا وفاقی معاہدہ ہو جاتے جس کی رو سے وہ صرف مشترک اغراض و مقاصد کے لیے مل کر عمل کریں اور باقی اُمور میں بالفعل مختار ہوں ـــ کیا کانگریس نے فی الواقع یہ طریقہ اختیار کیا ہے؟ اس کا جواب نفی میں ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ اِن قوموں کو "ایک قوم" بنا دیا جاتے۔ یہی دوسری صورت کانگریس چاہتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ یہ قومیں ایک قوم کس طرح بن سکتی ہیں؟ لامحالہ ان کے لیے سب سے پہلے تو ایک مشترک جاذبہ، ایک کلمۂ جامعہ درکار ہے، اور وہ جاذبہ یا کلمہ صرف تین چیزوں ہی سے مرکب ہو سکتا ہے:۔

وطن پرستی، بیرونی دشمن سے نفرت، اور معاشی مفاد سے دلچسپی۔ پھر جیسا کہ میں اوپر کہہ چکا ہوں، قوم بنانے کے لیے شرط لازم یہ ہے کہ یہ جاذبہ اتنا قوی ہو کہ دوسرے تمام جاذبے جنہوں نے ان قوموں کو الگ الگ اقوام بنا رکھا ہے اس کے سامنے دب جائیں۔ کیونکہ اگر مسلمان کو اسلام سے، ہندو کو ہندویت سے، سکھ کو سکھیت سے اتنی دلچسپی ہو کہ جب مذہب یا قومیت کا معاملہ سامنے آتے تو مسلمان، مسلمان کے ساتھ اور ہندو ہندو کے ساتھ اور سکھ سکھ کے ساتھ جُڑ جاتے اور اس قومی (یا وطن پرستوں کی زبان میں فرقہ وارانہ) معاملہ کی حمایت کے لیے ایک جماعت بن کر اُٹھ کھڑا ہو، تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ جاذبۂ وطنی نے اُن کو ایک قوم نہیں بنایا۔ یہ امر دیگر ہے کہ مسلمان اسلام کا قائل رہے اور نماز بھی

پڑھ لیا کرے، اور ہندو ہندویت کا معتقد رہے اور مندر بھی چلا جایا کرے، لیکن ایک قوم بننے کے لیے شرط اول یہ ہے کہ اس کی نگاہ میں وطنیت کی کم از کم اتنی اہمیت ضرور ہو کہ اسلام کو اور ہندویت یا سکھیت کو وہ اس پر قربان کر سکتا ہو۔ اس کے بغیر "وطنی قومیت" قطعاً بے معنی ہے۔

یہ تو وطنی قومیت کا تخم ہے۔ مگر یہ تخم بار آور نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کے لیے مناسب آب و ہوا اور مناسب موسم نہ ہو۔ اوپر یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ جذبۂ قومی کی مدد کے لیے ضروری ہے کہ زبان، ادب، تاریخی روایات، رسوم و عادات، معاشرت اور طرز زندگی، افکار اور تخیلات، معاشی اغراض اور مادی مفاد، غرض تمام وہ چیزیں جو انسانی جماعتوں کی تالیف و ترکیب میں فی الجملہ اثر رکھتی ہیں، اسی ایک جذبۂ قومی کی فطرت میں ڈھلی ہوئی ہوں۔ اس لیے کہ افراد کو جوڑنے والی ان مختلف طاقتوں کا میلان اگر علیحدگی کی جانب ہو تو یہ جذب اور تالیف اور اجتماع کے عمل میں اس جذبہ کی الٹی مزاحمت کریں گی اور متحد قوم نہ بننے دیں گی۔ لہٰذا ایک وطنی قوم بنانے کے لیے یہ بالکل ناگزیر ہے کہ ان سب چیزوں میں سے ان عناصر کو نکالا جائے جو مختلف قوموں کے اندر جداگانہ قومیت کی روح پیدا کرتے اور زندہ رکھتے ہیں اور ان کے بجائے اپنے رنگ میں ان کو ڈھالا جائے کہ وہ آہستہ آہستہ تمام افراد اور طبقوں اور گروہوں کو ہم رنگ کر دیں، ان کو ایک سوسائٹی بنا دیں، ان کے اندر ایک مشترک اجتماعی مزاج اور مشترک اخلاقی روح پیدا کر دیں، ان کے اندر ایک طرح کے جذبات و احساسات پھونک دیں، اور ان کو ایسا بنا دیں کہ ان کی معاشرت ایک ہو، طرز زندگی ایک ہو، ذہنیت اور انداز فکر ایک ہو، ایک ہی تاریخ کے سرچشمے سے وہ افتخار کے جذبات اور روح کو حرکت میں لانے والے محرکات حاصل کریں اور ان کے درمیان ایک دوسرے کے لیے کسی چیز میں بھی کوئی امتیاز باقی نہ رہے۔

اسی مقصد کے لیے وردھا اسکیم بنائی گئی ہے اور یہی مقصد ودیا مندر اسکیم کا ہے، جیسا کہ دونوں اسکیموں میں صاف صاف کہہ بھی دیا گیا ہے۔ مگر مولانا نے ان

اسکیموں اوران کے نصاب کو نہیں دیکھا۔ اس قومیت کا صور برسوں سے پنڈت جواہر لال پھونک رہے ہیں مگر ان کی بھی کوئی تحریر و تقریر مولانا کی سماعت وبصارت تک پہنچنے کا موقع نہ پاسکی۔ یہی چیز کانگریس کا ایک ایک ذمہ دار آدمی کہہ رہا ہے، لکھ رہا ہے، اور اس کے لیے ان حاکمانہ طاقتوں سے کام لے رہا ہے جو نئے دستور نے عطا کی ہیں، مگر نہ مولانا کے کان ان باتوں کو سنتے ہیں اور نہ ان کی آنکھیں ان چیزوں کو دیکھتی ہیں۔ اسی چیز کے لیے ان تمام اجتماعی ہیئتوں اور مجلسوں سے کام لیا جارہا ہے جن کی فہرست مولانا بار بار گنایا کرتے ہیں، اور یہ مجالس محض اس وجہ سے اس کام میں ان کی مددگار بن گئی ہیں کہ ان کا دائرہ عمل ان تمام معاملات پر چھایا ہوا ہے جن کو آپ تہذیب، کلچر، پرسنل لا وغیرہ ناموں سے یاد فرماتے ہیں۔ مگر یہ عمل جو ہر آن ہندوستان کے ہر حصے میں ہو رہا ہے، اس کی بھی کسی جنبش کو مولانا کے حواس خمسہ تک رسائی حاصل نہ ہو سکی۔ اس پورے مواد میں سے صرف ایک ہی دستاویز ان تک پہنچی ہے جس کا نام "بنیادی حقوق"[1] ہے اور بس اسی کے اعتماد پر مولانا اس "متحدہ قومیت" کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ سے تشبیہ دینے کی جرأت فرما رہے ہیں، حالانکہ ان بنیادی حقوق کی حیثیت طرہ دگمونیہ کے مشہور اعلان سے کچھ بھی مختلف نہیں ہے اور مغربی ڈپلومیسی کی ایسی چالوں کا رشتہ رسول پاکؐ کے عمل سے جوڑنے کی جسارت ہم جیسے گنہگاروں کے بس کی بات نہیں۔ ہاں جن کے پاس تقوے کا زادِ راہ اتنا زیادہ ہے کہ وہ ایسی جسارتیں کرنے پر بھی بخشے جانے کی امید رکھتے ہیں، انہیں اختیار ہے کہ جو چاہیں کہیں اور جو چاہیں لکھیں۔

اشتراکِ لفظی کا فتنہ

مولانا نے اپنے ذہن میں "متحدہ قومیت" کا ایک خاص مفہوم متعین کر رکھا ہے جس کے حدود انھوں نے تمام شرعی خرابیوں کو خارج رکھ کر اور تمام امکانی اعتراضات سے پہلو بچا کر خود مقرر فرمائے ہیں، حالانکہ وہ ایسی پر احتیاط منفیانہ زبان میں بیان فرماتے ہیں کہ قواعد

---

[1] بنیادی حقوق پر مفصل بحث اس سے پہلے کے باب میں گزر چکی ہے ــــ مرتب

تشریح کے لحاظ سے کوئی اس پر حرف نہ لاسکے، لیکن اس میں خرابی بس اتنی سی ہے کہ اپنے مفہومِ ذہنی کو مولانا کانگریس کا مفہوم و مدعا قرار دے رہے ہیں۔ حالانکہ کانگریس کا اس سے بدل مقصد ہے۔ اگر مولانا صرف اتنا کہنے پر اکتفا کرتے کہ "متحدہ قومیت سے میری مراد یہ ہے" تو ہمیں ان سے جھگڑا کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن وہ آگے قدم بڑھا کر فرماتے ہیں کہ "یہی کانگریس کی مراد بھی یہی ہے اور کانگریس بالکل نبی صلعم کے اسوہ پر چل رہی ہے، اور مسلمانوں کو مامون و مطمئن ہو کر اپنے آپ کو اس متحدہ قومیت کے حوالے کر دینا چاہیے جسے کانگریس بنانا چاہتی ہے۔" یہیں سے ہمارے اور ان کے درمیان نزاع کا آغاز ہوتا ہے۔ فرض کیجیے کہ "پانی ڈالنے" سے آپ کا مفہوم ذہنی "پانی ڈالنا" ہی ہو، لیکن دوسرے نے "آگ لگانے" کا نام "پانی ڈالنا" رکھ چھوڑا ہو، تو آپ کتنا ظلم کریں گے اگر اختلاف معنی کو نظر انداز کر کے لوگوں کو مشورہ دینے لگیں کہ اپنا گھر اس شخص کے حوالے کر دو جو "پانی ڈالنے" کے لیے کہتا ہے۔ ایسے ہی موقع کے لیے تو قرآن مجید میں ہدایت کی گئی تھی کہ جب ایک لفظ ایک صحیح معنی اور ایک غلط معنی میں مشترک ہو جائے اور تم دیکھو کہ اعدائے دین اس اشتراک لفظی سے فائدہ اٹھا کر فتنہ برپا کر رہے ہیں تو ایسے لفظ ہی کو چھوڑ دو۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعِنَا وَقُولُوا انْظُرْنَا
وَاسْمَعُوا وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ۔ (بقرہ۔ ۱۰۴)

"اے ایمان لانے والو! رَاعِنَا نہ کہا کرو بلکہ اُنْظُرْنَا کہا کرو اور توجہ سے بات سنو، کافر تو عذاب الیم کے مستحق ہیں۔"

لہٰذا مولانا کو اپنے مفہوم ذہنی کے لیے تحالف یا وفاق یا اسی قسم کا کوئی مناسب لفظ اختیار کرنا چاہیے تھا، اور اس وفاق یا تحالف کو بھی اپنی تجویز کی حیثیت سے پیش کرنا چاہیے تھا، نہ اس حیثیت سے کہ یہ کانگریس کا عمل ہے۔ کم از کم اب وہ اُمت پر رحم فرما کر اپنی غلطی محسوس فرمالیں ورنہ اندیشہ ہے کہ ان کی تحریریں ایک فتنہ بن کر رہ جائیں گی اور اس پرانی سنت کا اعادہ کریں گی کہ ظالم امرا اور فاسق اہل سیاست نے جو کچھ کیا اس کو علماء کے ایک گروہ نے قرآن و حدیث سے درست ثابت کر کے ظلم و طغیان کے لیے مذہبی ڈھال

فراہم کردی۔

رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ۔ (یونس۔ ۸۵)

"اے ہمارے رب! ہمیں ظالم لوگوں کے لیے فتنہ نہ بنا۔"

مولانا کے اس رسالہ کی اشاعت کے بعد یہ ضروری ہو گیا ہے کہ خالص علمی حیثیت سے "قومیت" کے مسئلہ کی تحقیق کی جائے اور اس باب میں اسلامی نظریات اور غیر اسلامی یا جاہلی نظریات کے درمیان جو اصلی فرق ہے اسے پوری طرح نمایاں کر دیا جائے، تاکہ جو لوگ غلط فہمی کی بنا پر دونوں کو خلط ملط کرتے ہیں ان کے ذہن کا الجھاؤ دور ہو اور وہ دونوں راستوں میں سے جس راستے کو بھی اختیار کریں علیٰ وجہ البصیرت کریں۔ اگرچہ یہ کام علمائے کرام کے کرنے کا تھا۔ مگر جب ان کے سرخیل تک "متحدہ قومیت اور اسلام" لکھنے میں مصروف ہوں اور ان میں سے کوئی بھی اپنے اصلی فرض کو انجام دینے کے لیے آگے نہ بڑھے، تو مجبوراً ہم جیسے عامیوں ہی کو یہ خدمت اپنے ذمہ لینی پڑے گی۔

(ترجمان القرآن۔ ذی الحجہ ۱۳۵۷ھ (فروری ۱۹۳۹ء)

کیا ہندوستان کی نجات نیشنلزم میں ہے؟[1]

جناب مولانا عبید اللہ سندھی ایک طویل مدت کی جلا وطنی کے بعد جب ہندوستان واپس تشریف لائے تو جمعیت علمائے بنگال نے ان کو اپنے کلکتہ کے اجلاس میں خطبہ صدارت ارشاد فرمانے کی دعوت دی، اور اس خطبہ کے ذریعہ سے ہندوستان میں پہلی مرتبہ لوگ ان کے مخصوص نظریات سے رُوشناس ہوئے۔ خصوصیت کے ساتھ ان کے جن فقروں پر مسلمانوں میں عموماً ناراضی پھیلی وہ حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ "اگر میرا وطن اُس انقلاب کے نقصان سے بچنا چاہتا ہے جو اس وقت دنیا پر چھا گیا ہے اور روز بروز چھاتا جا رہا ہے تو اسے یورپین اصول پر نیشنلزم کو ترقی دینا چاہیئے۔ پچھلے زمانہ میں ہمارا ملک جس قدر نامور رہا ہے اُسے دُنیا جانتی ہے مگر اس سے ہم کوئی فائدہ نہیں اُٹھا سکتے جب تک ہم آج کی قوموں میں اپنا وقار ثابت نہ کر سکیں۔"

---

[1] یہ مضمون ترجمان القرآن میں ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا تھا۔ موضوع کی مناسبت سے اسے یہاں شامل کیا جا رہا ہے۔ (مرتب)

"۲۰۔ میں سفارش کرتا ہوں کہ ہمارے اکابر نے بہت وقت برٹش گورنمنٹ کے دو صد سالہ عہد سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کی کوشش کریں۔ جس طرح ہم نے یورپ سے متنفر ہو کر اپنی ترقی کو معدوم کر لیا ہے اسے اب خیر باد کہیں اس معاملہ میں مَیں نے ترکی قوم کے اُس انقلاب کا پوری طرح مطالعہ کیا ہے جو سلطان محمود سے شروع ہو کر مصطفیٰ کمال کی جمہوریت پر ختم ہوتا ہے ...... میں چاہتا ہوں کہ یورپ کے انٹرنیشنل اجتماعات میں ہمارا وطن ایک معزز ممبر مانا جائے۔ اس کے لیے ہمیں اپنی معاشرت میں انقلاب کی ضرورت محسوس ہوگی۔"

اس معاشرتی انقلاب کی تشریح آگے چل کر مولانا نے اپنے اُس انقلابی پروگرام میں کی ہے، جو اُنہوں نے صوبہ سندھ کے لیے تجویز کیا ہے۔ چنانچہ اس میں فرماتے ہیں:۔

"سندھی اپنے وطن کا بنا ہوا کپڑا پہنے گا مگر وہ کوٹ پتلون کی شکل میں ہوگا یا کالر دار قمیص اور نکر کی صورت میں۔ مسلمان اپنا نکر گھٹنے سے نیچے تک استعمال کر سکتے ہیں۔ ہیٹ دونوں صورتوں میں بے تکلف استعمال کیا جائے گا۔ جب مسلمان مسجد میں آئے گا ہیٹ اُتار کر ننگے سر نماز پڑھ لیگا۔"

مولانا سندھی ایک تجربہ کار اور جہاں دیدہ عالم دین ہیں۔ انہوں نے جو قربانیاں اپنے اصول اور مشن کی خاطر سالہا سال تک کی ہیں وہ ان کے خلوص کو ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ثابت کرتی ہیں۔ لہذا اگر اُن جیسا ایک مخلص اور جہاں دیدہ عالم ہمارے سامنے بعض اجتماعی مسائل پر اپنے کچھ نظریات ——— جو ظاہر ہے کہ اس کے طویل تجربات اور برسوں کے غور و فکر پر مبنی ہیں ——— پیش کرتا ہے، تو ہمارے لیے مناسب ترین بات یہ ہے کہ اپنے ذہن کو شکوہ و شکایت یا شبہات میں اُلجھانے کے بجائے اس کے نظریات کو علمی حیثیت سے جانچ کر دیکھیں، اور سنجیدگی کے ساتھ ان پر تنقید کریں۔ ایک ذی علم اور فہیم آدمی جو نیک نیت بھی ہو، اُس سے ہم بجا طور پر یہ توقع رکھتے ہیں کہ جب اس کی غلطی اس پر واضح ہو جائے گی تو وہ اس سے رجوع کرے گا۔ اور بالفرض اگر وہ اپنی غلطی کا معترف نہ

بھی ہو، تب بھی اس کے غلط نظریے کو ذہن میں جڑ پکڑنے سے صرف سنجیدہ علمی تنقید ہی روک سکتی ہے۔ شکوہ و شکایت اور طنز و تعریض سے اس کا سدِ باب نہیں کیا جاسکتا۔

نیشنلزم بر بنائے مصلحت

یورپین اصول پر نیشنلزم کو ترقی دینے کا مشورہ مولانا نے جن وجوہ و دلائل کی بنا پر دیا ہے وہ خود ان کے الفاظ میں یہ ہیں :

۱۔ "اگر میرا وطن اس انقلاب کے نقصان سے بچنا چاہتا ہے جو اس وقت دنیا پر چھا گیا ہے اور چھاتا چلا جارہا ہے تو .... اسے ایسا کرنا چاہیے۔

۲۔ پچھلے زمانہ میں ہمارا ملک جس قدر نامور رہا ہے اسے دنیا جانتی ہے مگر اس سے ہم کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے جب تک ہم آج کی قوموں میں اپنا وقار ثابت نہ کرسکیں ....

اور وقار اسی طرح قائم ہوسکتا ہے جس طرح آج کل کی مغربی اقوام نے قائم کیا ہے۔

۳۔ ہماری ہندوستانی تہذیب کا عہد قدیم جو ہندو تہذیب کہلاتا ہے اور عہد جدید جسے اسلامی تہذیب سمجھا جاتا ہے، دونوں مذہبی اسکول ہیں۔ لیکن آج کل کا یورپین اسکول مذہب سے قطعی نابلد ہے۔ اس کا مدار صرف سائنس اور فلسفہ پر ہے۔ اس لیے ہمارے وطن میں اگر اس انقلاب کو سمجھنے (۹) کی استعداد پیدا نہ ہوئی تو سراسر نقصان ہمارے حصہ میں آئیگا۔"

سمجھنے سے مراد غالباً صرف سمجھنا نہیں بلکہ سمجھ کر اختیار کرلینا بھی ہے۔ کیونکہ مولانا کے سابق مقدمات اسی نتیجہ کی طرف لے جاتے ہیں۔

ان تینوں وجوہ پر غور کیجیے۔ ایک چیز کو اختیار کرنے کا مشورہ اس بنا پر نہیں دیا جارہا ہے کہ وہ حق اور صداقت ہے یا اخلاقاً بجا اور درست ہے، بلکہ محض مصلحت اور ضرورت (Expediency) کی بنا پر دیا جارہا ہے۔ اس کے بعد ایک مسلمان کی نگاہ میں، بلکہ کسی بااصول شخص کی نگاہ میں بھی مولانا کے مشورے کی کیا قدر و قیمت ہوسکتی ہے؟ کسی مسلک کی

کسی اصول کو اس دلیل سے قبول کرنا کہ فلاں نقصان سے بچنا ہے یا فلاں فائدہ حاصل کرنا ہے، اور فلاں چیز اب دنیا میں نہیں چل رہی ہے بلکہ اس کی جگہ یہ چیز چل پڑی ہے، کسی ایسے شخص کا کام نہیں ہو سکتا جو خود اپنا کوئی اخلاقی اور عقلی نظریہ رکھتا ہو اور اپنے ضمیر کے تقاضے سے اپنے آپ کو اس کے پھیلانے اور قائم کرنے پر مامور سمجھتا ہو۔ یہ تو نری مصلحت پرستی اور ابن الوقتی (Opportunism) ہے۔ اس کو عقلیت اور اخلاقیت سے کیا واسطہ؟ عقلیت اور اخلاقیت کا تقاضا تو یہ ہے کہ تحقیق سے جس اصول کو ہم نے حق پایا ہے اور اخلاقاً جس کے برحق ہونے کا ہم یقین رکھتے ہیں اس پر سختی کے ساتھ قائم رہیں۔ اگر دنیا میں اس کے خلاف کوئی غلط اصول چل پڑا ہے تو ہمارا کام دنیا کے پیچھے دوڑنا نہیں ہے بلکہ دنیا کو کھینچ کر اپنے اصول کی طرف لانا ہے۔ اپنے اعتقاد میں ہماری راستی کا امتحان اسی میں ہے کہ دنیا کے پیچھے نہ چلنے سے جو نقصان ہمیں پہنچتا ہو اسے صبر و ثبات کے ساتھ برداشت کریں۔ اگر دنیا ہماری وقعت اس لیے نہیں کرتی کہ ہم اس کے پیچھے نہیں چلتے تو ایسی دنیا کو ہمیں ٹھوکر مارنی چاہیے۔ دنیا ہمارا معبود نہیں ہے کہ اس کی خوشامد کرتے ہوئے ہم ہر اس راستے پر دوڑتے پھریں جس پر اس کی جھلک نظر آتے۔ اگر اس چیز کا زمانہ گزر گیا ہے جو ہمارے اعتقاد میں حق ہے تو ہم میں اتنا بل بوتا ہونا چاہیے کہ زمانہ کا کان پکڑ کر اسے پھر سے حق کی طرف کھینچ لائیں۔ یہ سوچنا پست ہمت، شکست خوردہ لوگوں کا کام ہے کہ اب زمانہ میں فلاں چیز کا چلن ہے تو چلو، اس کو سمجھیں اور بے سمجھے حلق سے نیچے ہی اتار لیں۔

اس باب میں ہم مسلمان کو اتنی استقامت تو دکھانی چاہیے جتنی مارکس کے پیروؤں نے جنگِ عظیم کے موقع پر دکھائی تھی۔ ۱۹۱۴ء میں جب جنگ چھڑی تھی تو سیکنڈ انٹرنیشنل کے ارکان میں اسی نیشنلزم کے سوال پر زبردست اختلاف برپا ہوا تھا۔ بہت سے وہ سوشلسٹ جو اشتراکیوں کے بین الاقوامی محاذ پر مجتمع تھے، اپنی اپنی قوموں کو میدانِ جنگ میں کودتے دیکھ کر قوم پرستی کے جذبہ سے مغلوب ہو گئے اور انہوں نے جنگ میں اپنی قوم کا ساتھ دینا چاہا۔ مگر مارکس کے پیروؤں نے کہا کہ ہم ایک ایسے اصول کے لیے جنگ کرنے

اُٹھے ہیں جس کے لحاظ سے تمام قوموں کے سرمایہ دار ہمارے دشمن اور تمام قوموں کے مزدور ہمارے دوست ہیں۔ پھر ہم کس طرح اس نیشنلزم کو قبول کر سکتے ہیں جو مزدوروں کو تقسیم کرتا ہے اور انہیں سرمایہ دار کے ساتھ ملا کر ایک دوسرے کے مقابلہ میں لڑاتا ہے۔ اس بنا پر مارکسیوں نے اپنے سالہاسال کے پرانے رفیقوں سے تعلقات منقطع کر لیے۔ انہوں نے سیکنڈ انٹرنیشنل کا ٹوٹ جانا گوارا کر لیا مگر اپنے اصول سے دستبردار ہونا گوارا نہ کیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ جو سچے کمیونسٹ تھے انہوں نے عملاً خود اپنے ہاتھوں سے قوم پرستی کے بُت کو توڑا۔ جرمن کمیونسٹ نے اپنے اصول کی خاطر جرمنی کے خلاف اور روسی کمیونسٹ نے اپنے اعتقاد کی خاطر روس کے خلاف اور اسی طرح ہر ملک کے کمیونسٹ نے اپنے مسلک کی خاطر اپنے ملک کی حکومت کیخلاف کام کیا۔

جس طرح کمیونسٹ اپنا ایک نظریہ رکھتا ہے، اسی طرح مسلمان بھی اپنا ایک نظریہ رکھتا ہے۔ پھر وہ کیوں اتنا ادنیٰ اور پست ہو جائے کہ کسی نقصان سے بچنے یا کسی کی نگاہ میں وقار قائم کرنے کے لیے اپنے مقام سے ہٹ جائے؟ اور اگر وہ اپنے مقام سے ہٹتا ہے تو اس میں کم از کم اس بات کا شعور تو ہونا چاہیئے کہ وہ کس چیز سے ہٹ رہا ہے اور کس چیز کی طرف جا رہا ہے۔ کیونکہ اپنی جگہ چھوڑنا تو محض کمزوری ہے۔ مگر ایک جگہ سے ہٹ جانے کے باوجود اپنے آپ کو اسی جگہ سمجھنا کمزوری کے ساتھ بے شعوری بھی ہے۔ میں "مسلمان" صرف اُس وقت ہوں جب تک میں زندگی کے ہر معاملہ میں اسلامی نظریہ رکھتا ہوں۔ جب میں اس نظریہ سے ہٹ گیا اور کسی دوسرے نظریہ کی طرف چلا گیا تو میری جانب سے یہ سراسر بے شعوری ہو گی اگر میں یہی سمجھتا رہوں کہ اس نئے مقام پر بھی مسلمان ہونے کی حیثیت میرے ساتھ لگی چلی آئی ہے۔ مسلمان ہوتے ہوئے غیر اسلامی نظریہ اختیار کرنا صریح بے معنی بات ہے۔ "مسلمان نیشنلسٹ" اور "مسلمان کمیونسٹ" ایسی ہی متناقض اصطلاحیں ہیں جیسے "کمیونسٹ فاشسٹ" یا "جینی قصائی" یا "اشتراکی مہاجن" یا "موحد بُت پرست"۔

نیشنلزم اور اسلام

سرسری نظر میں جو شخص نیشنلزم کے معنی اور اس کی حقیقت پر غور کرے گا اس سے یہ بات چھپی نہیں رہ سکتی کہ اسلام اور نیشنلزم، دونوں اسپرٹ اور اپنے مقصد کے لحاظ سے ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اسلام کا خطاب انسان من حیث الانسان سے ہے۔ وہ سارے انسانوں کے لیے ایک اعتقادی و اخلاقی بنیاد پر عدل اور تقویٰ کا ایک اجتماعی نظام پیش کرتا ہے اور سب کو اس کی طرف بلاتا ہے۔ پھر جو اس نظام کو قبول کرلے اسے مساویانہ حقوق کے ساتھ اپنے دائرہ میں لے لیتا ہے۔ اس کی عبادات میں، اس کی معیشت میں، اس کی سیاست میں، اس کی معاشرت میں، اس کے قانونی حقوق اور فرائض میں، غرض اس کی کسی چیز میں بھی ان لوگوں کے درمیان کسی قسم کی قومی یا نسلی یا جغرافی یا طبقاتی تفریقات کی گنجائش نہیں ہے جو اسلام کے مسلک کی پیروی اختیار کرلیں۔ اس کا منتہائے نظر ایک ایسا جہانی معاشرہ اور ریاست (World State) ہے جس میں نسلی اور قومی تعصبات کی زنجیریں توڑ کر تمام انسانوں کو مساوی حقوق اور مساوی مواقع ترقی کے ساتھ ایک تمدنی و سیاسی نظام میں حصہ دار بنایا جائے اور مخاصمانہ مقابلہ کی جگہ دوستانہ تعاون پیدا کیا جائے تاکہ لوگ ایک دوسرے کی مادی خوشحالی اور روحانی ترقی میں مددگار ہوں۔ اسلام انسانی فلاح کے لیے جو اصول اور نظام حیات پیش کرتا ہے وہ عام انسانوں کو اپیل ہی اس وقت کر سکے گا جب کہ ان کے اندر جاہلیت کے تعصبات نہ ہوں، اور وہ اپنی قومی روایات کی وابستگی سے، نسلی تفاخر کے جذبات سے، خونی اور خاکی رشتوں کی محبت سے پاک ہو کر محض انسان ہونے کی حیثیت سے یہ جانچنے کے لیے تیار ہوں کہ حق کیا ہے، عدل و انصاف اور راستی کس چیز میں ہے، ایک طبقہ یا ایک قوم یا ایک ملک کی نہیں بلکہ مجموعی حیثیت سے انسانیت کی فلاح کا راستہ کون سا ہے۔

برعکس اس کے نیشنلزم انسان اور انسان کے درمیان اس کی قومیت کے لحاظ سے تمیز کرتا ہے۔ نیشنلزم کے معنی ہی یہ ہیں کہ ہر قوم کا نیشنلسٹ اپنی قومیت کو دوسری تمام قومیتوں پر ترجیح دے۔ اگر وہ جفاکار قوم پرست (Aggressive Nationalist)

نہ بھی ہو تب بھی قوم پرستی کا کم سے کم تقاضا یہ ہے کہ وہ تمدنی، سیاسی اور قانونی حیثیت سے "قومی" اور غیر قومی میں فرق کرے، اپنی قوم والوں کے لیے زیادہ سے زیادہ فوائد محفوظ کرے، قومی مفاد کے لیے معاشی امتیازات کی دیواریں کھڑی کرے، جن تاریخی روایات اور روائتی تعصبات پر اس کی قومیت قائم ہے ان کی سختی کے ساتھ حفاظت کرے اور اپنے اندر قومی تفاخر کے جذبات پرورش کرے۔ وہ دوسری قومیت کے لوگوں کو مساوات کے اصول پر زندگی کے کسی شعبہ میں بھی اپنے ساتھ شریک نہ کرے گا۔ جہاں اس کی قوم دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ فوائد و منافع سے متمتع ہو رہی ہو یا ہو سکتی ہو وہاں عدل و انصاف کے لیے اس کا دل اندھا ہو جائے گا۔ اس کا منتہائے نظر جہانی ریاست کے بجائے قومی ریاست (National State) ہوگا۔ اور اگر وہ کوئی جہانی نظریہ اختیار کرے گا بھی تو اس کی صورت لازماً امپیریلزم یا قیصریت کی صورت ہوگی، کیونکہ اس کے اسٹیٹ میں دوسری قومیتوں کے لوگ کسی طرح برابر کے حصہ دار کی حیثیت سے داخل نہیں ہو سکتے، بلکہ صرف غلام کی حیثیت ہی سے داخل ہو سکتے ہیں۔

ان دونوں مسلکوں کے اصول، مقاصد اور روح کا یہ محض ایک سرسری ساخاکہ ہے جس کو دیکھ کر بآسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ دونوں مسلک ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ جہاں نیشنلزم ہے وہاں اسلام کبھی پھل پھول نہیں سکتا، اور جہاں اسلام ہے وہاں نیشنلزم کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ نیشنلزم کی ترقی کے معنی یہ ہیں کہ اسلام کے لیے پھیلنے کا راستہ بند ہو جائے، اور اسلام کی ترقی کے معنی یہ ہیں کہ نیشنلزم جڑ بنیاد سے اکھاڑ دیا جائے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ ایک شخص ایک وقت میں ان دونوں میں سے کسی ایک ہی کی ترقی کا حامی ہو سکتا ہے۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ وہ بیک وقت دونوں کشتیوں پر سوار رہ سکے۔ ایک مسلک کی پیروی کا دعویٰ کرنا اور پھر ساتھ ہی اس کے بالکل مخالف مسلک کی حمایت و وکالت کرنا صاف طور پر نظر کے انجھاؤ اور ذہن کی پراگندگی کا پتہ دیتا ہے، اور جو لوگ ایسی باتیں کرتے ہیں ان کے متعلق مجبوراً ہمیں یہ رائے قائم کرنی پڑتی ہے کہ وہ یا تو اسلام کو نہیں سمجھتے یا نیشنلزم سے ناواقف ہیں۔

یورپین نیشنلزم کی حقیقت

یہ تو وہ بات تھی جو نیشنلزم کے بالکل ابتدائی مفہوم پر غور کرنے سے نکلتی ہے۔ اب ہمیں ذرا آگے بڑھ کر یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ "یورپین نیشنلزم" کیا چیز ہے جس کے اصول پر مولانا سندھی ہندوستان میں نیشنلزم کی ترقی چاہتے ہیں۔

قدیم جاہلیت میں قومیت کا تصور اچھی طرح پختگی کو نہیں پہنچا تھا۔ قوم کی جگہ انسان کے جذبات زیادہ تر نسل یا قبیلہ کے ساتھ وابستہ ہوتے تھے۔ اس لیے اُس زمانہ میں قوم پرستی کے بجائے نسل پرستی کا زور تھا، اور اس نسلی عصبیت میں بڑے بڑے عالی دماغ فلسفی اور حکیم تک اندھے ہو جاتے تھے۔ ارسطو جیسا بلند پایہ مفکر اپنی کتاب "السیاست" میں یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ "فطرت نے وحشی قوموں کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ غلام بن کر رہیں"[1]۔ اس کے نزدیک دولت حاصل کرنے کے فطری اور جائز ذرائع میں سے ایک یہ بھی ہے کہ "نوعِ انسانی کے ایسے طبقات کو غلام بنانے کے لیے جنگ کی جائے جنہیں فطرت نے اسی غرض کے لیے پیدا کیا ہے"[2]۔ یہ نظریہ اور زیادہ بھیانک ہو جاتا ہے جب ہم اس کے ساتھ اس حقیقت کو بھی پیشِ نظر رکھتے ہیں کہ یونانیوں کے نزدیک وحشی (Barbarians) کے معنی محض "غیر یونانی" کے تھے اور ان کا بنیادی تصور یہ تھا کہ یونانی لوگوں کے اخلاق اور عقلی حقوق دوسرے انسانوں سے بالکل مختلف ہیں۔

یہ اُس نیشنلزم کا ابتدائی چربہ تھا جس نے بعد کو یورپ میں ترقی کی۔ مگر اس چربہ کے نشوونما کو جو طاقت ایک مدت تک روکے رہی وہ مسیحیت کی طاقت تھی۔ ایک نبی کی تعلیم اگرچہ کیسی ہی بگڑی ہوئی صورت میں موجود ہو، بہرحال نسل پرستی اور قوم پرستی کی جگہ ایک وسیع انسانی نقطۂ نظر ہی لیے ہوئے ہو سکتی تھی۔ اس کے ساتھ رومن ایمپائر (Roman Empire) کے عالمگیر سیاسی نظام نے بھی کم و بیش اتنا کام کیا کہ بہت سی چھوٹی

---

[1] کتاب اوّل۔ باب سوم و ہشتم

[2] کتاب اوّل۔ باب ہشتم۔

قوموں کو ایک مشترک اقتدار کا مطیع و فرمانبردار بنا کر قومی اور نسلی تعصبات کی شدت کو کم کر دیا۔ اس طرح صدیوں تک پوپ کا روحانی اور شہنشاہ کا سیاسی اقتدار، دونوں مل جل کر عالم مسیحی کو ایک رشتے میں باندھے رہے۔ مگر بعد کی صدیوں میں یہ دونوں ظلم و ستم میں اور علمی و عقلی ترقی کی مخالفت میں ایک دوسرے کی مددگار تھیں، اور دنیوی اقتدار اور مادی فوائد کی تقسیم میں باہم حریف و معاند تھیں۔ ایک طرف ان کی آپس کی کش مکش نے، دوسری طرف ان کی بداعمالیوں اور ظلم و ستم نے اور تیسری طرف جدید علمی بیداری نے سولھویں صدی میں وہ سیاسی اور مذہبی تحریک پیدا کی جسے تحریک اصلاح (Reformation) کہتے ہیں۔

اس تحریک کا یہ فائدہ تو ضرور ہوا کہ پوپ اور شہنشاہ کے اس اقتدار کا خاتمہ ہو گیا جو ترقی اور اصلاح کا دشمن تھا۔ لیکن اس سے یہ نقصان بھی ہوا کہ جو قومیں ایک رشتہ میں بندھی ہوئی تھیں وہ بکھر گئیں۔ ریفارمیشن اس روحانی رابطہ کا بدل فراہم نہ کر سکا جو مختلف مسیحی اقوام کے درمیان قائم تھا۔ مذہبی اور سیاسی وحدت کا تعلق ٹوٹنے کے بعد جب قومیں ایک دوسرے سے الگ ہوئیں تو ان کی جدا جدا خود مختار قومی ریاستیں وجود میں آنے لگیں۔ ہر قوم کی زبان اور لٹریچر نے الگ الگ ترقی کرنی شروع کی۔ اور ہر قوم کے معاشی مفاد دوسری ہمسایہ قوموں سے مختلف ہوتے گئے۔ اس طرح نسلی، سیاسی، معاشی اور تہذیبی بنیادوں پر قومیت کا ایک نیا تصور پیدا ہوا جس نے نسلی عصبیت کے قدیم جاہلی تصور کی جگہ لے لی۔ پھر مختلف قوموں ... جنگ اور مسابقت (Competition) کا سلسلہ شروع ہوا، لڑائیاں ہوئیں۔ ایک قوم نے دوسری قوموں کے حقوق پر ڈاکے ڈالے۔ ظلم اور شقاوت کے بدترین مظاہرے کیے گئے۔ جن کی وجہ سے قومیت کے جذبات میں روز بروز تلخی پیدا ہوتی چلی گئی، یہاں تک کہ قومیت کا احساس رفتہ رفتہ ترقی کر کے قوم پرستی (نیشنلزم) میں تبدیل ہو گیا۔

یہ قوم پرستی جس کا نشو و نما اس طور پر یورپ میں ہوا ہے، چونکہ ہمسایہ قوموں کے ساتھ مسابقت اور تصادم سے پیدا ہوئی ہے، اس لیے اس میں لا محالہ چار عناصر پائے جاتے ہیں۔

(۱) قومی افتخار کا جذبہ جو اپنی قومی روایات اور خصوصیات کی محبت کو پرستش کی حد تک بڑھا لے جاتا ہے، اور تمام قوموں کے مقابلہ میں اپنی قوم کو ہر لحاظ سے بالا و برتر قرار دیتا ہے اور ہر طرح کے اصلی اور جعلی مفاخر اپنی قوم کے لیے مخصوص کرتا ہے[1]

(۲) قومی عصبیت کا جذبہ جو حق اور انصاف کے سوال کو نظر انداز کر کے آدمی کو ہر حال میں اپنی قوم کا ساتھ دینے پر آمادہ کرتا ہے خواہ وہ حق پر ہو یا ناحق پر۔

(۳) قومی تحفظ کا جذبہ جو قوم کے واقعی اور خیالی مفادات کی حفاظت کے لیے ہر قوم کو ایسی تدابیر اختیار کرنے پر آمادہ کرتا ہے جو مدافعت سے شروع ہو کر حملہ پر ختم ہوتی ہیں۔ مثلاً معاشی مفاد کی حفاظت کے لیے محصولات درآمد و برآمد کو گھٹانا بڑھانا، غیر قوموں کی مہاجرت پر پابندیاں عائد کرنا، اپنے حدود میں دوسروں کے لیے کسبِ معاش اور شہری حقوق کے دروازے بند کرنا، مدافعِ ملکی کے لیے دوسروں سے بڑھ چڑھ کر فوجی طاقت فراہم کرنا، اور دوسروں کے ملک میں اپنی قوم والوں کے حقوق کی حفاظت کے لیے دوڑ جانا۔

(۴) استیلاء و استکبار (National Aggrendisment) کا جذبہ جو ہر ترقی یافتہ اور طاقت ور قوم کے اندر یہ داعیہ پیدا کرتا ہے کہ وہ دنیا کی دوسری قوموں پر غالب اور برتر ہو، دوسروں کے خرچ پر اپنی خوش حالی بڑھائے، اپنے آپ کو پسماندہ قوموں میں تہذیب پھیلانے کی خدمت پر خود بخود مامور سمجھے اور دوسرے ممالک کی قدرتی دولت سے استفادہ کرنے کو اپنا پیدائشی حق قرار دے۔

یہی ہے وہ یورپ کا نیشنلزم جس کے نشہ میں سرشار ہو کر کوئی پکارتا ہے "جرمنی سب سے اوپر" کوئی نعرہ بلند کرتا ہے "امریکہ خدا کا اپنا ملک ہے" کوئی اعلان کرتا ہے "اٹلی ہی مذہب ہے" کسی کی زبان سے دنیا کو یہ پیغام دیا جاتا ہے کہ "حکومت

---

[1] اس کی ایک دلچسپ مثال ہم کو مصطفےٰ کمال کے دور کے ترکی میں ملتی ہے۔ وہاں ابتدائی تعلیم کے نصاب میں بچوں کو یہ سکھایا جانے لگا کہ حضرت آدم ترک تھے۔

کرنا برطانیہ کا حق ہے" اور ہر قوم پرست اسی مذہبی عقیدے پر ایمان رکھتا ہے کہ "میرا ملک خواہ حق پر ہو یا ناحق پر"۔ یہ قوم پرستی کا اخلاق آج دنیا میں انسانیت کے لیے سب سے بڑی لعنت ہے۔ انسانی تہذیب کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ یہ انسان کو اپنی قوم کے سوا ہر دوسری قوم کے لیے درندہ بنا دیتا ہے۔

اس نیشنلزم کے معنی صرف یہی نہیں ہیں کہ کوئی اپنی قوم سے محبت رکھتا ہے اور اس کو آزاد، خوش حال اور پر بہار ترقی دیکھنا چاہتا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ ایک شریف جذبہ ہوتا۔ لیکن درحقیقت محبت سے زیادہ عداوت، نفرت اور انتقام کے جذبات اس کو جنم دیتے اور پرورش کرتے ہیں۔ اس کا مادۂ حیات دراصل وہ آگ ہے جو قومیت کے مجروح جذبات اور کچلے ہوئے قومی حوصلوں سے دل میں بھڑک اٹھتی ہے۔ اور یہ آگ بہ حیثیت جاہلیہ، قومی محبت کے شریفانہ جذبہ کو بھی حد سے بڑھا کر ایک ناپاک چیز بنا دیتی ہے۔ بظاہر اس کا آغاز ان بے انصافیوں کی تلافی کرنے کی غرض سے ہوتا ہے جو کسی قوم کے ساتھ کسی دوسری قوم یا قوموں نے، واقعی یا خیالی طور پر کی ہوں۔ لیکن چونکہ کوئی اخلاقی ہدایت، کوئی روحانی تعلیم، کوئی الہٰی شریعت اس کی رہنمائی کرنے والی اور اس کو ضابطہ میں رکھنے والی نہیں ہوتی اس لیے یہ اپنی حد سے گزر کر قیصریت (Imperialism)، معاشی قوم پرستی (Economic Nationalism)، نسلی منافرت، جنگ اور بین الاقوامی بدامنی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ زمانۂ حال کا ایک مصنف فرانسس کوکر (Francis, W. Coker) لکھتا ہے:-

> "بعض قوم پرست اہل قلم دعویٰ کرتے ہیں کہ آزادانہ زندگی بسر کرنے کا حق دنیا کی صرف ترقی یافتہ قوموں کو ہے ——— اُن قوموں کو جو ایسا اعلیٰ درجہ کا تہذیبی اور روحانی سرمایہ رکھتی ہیں جو اس کا مستحق ہے کہ دنیا میں باقی رکھا جائے اور پھیلایا جائے۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ ایک اعلیٰ درجہ کی تہذیب قوم کا حق اور فریضہ صرف یہی نہیں ہے کہ وہ اپنی آزادی کی حفاظت کرے اور اپنے اندرونی معاملات کو دوسروں کی مداخلت کے بغیر سرانجام دے،

بلکہ اس کا حق اور فرض یہ بھی ہے کہ اپنے دائرہ اثر کو اُن قوموں پر پھیلائے جو نسبتاً پس ماندہ ہیں، خواہ اس کے لیے قوت ہی کیوں نہ استعمال کرنی پڑے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک اونچے درجے کی قوم اپنا ایک عالمگیر منصب رکھتی ہے۔ اسے اپنی قابلیتوں کو صرف اپنی ہی سرزمین میں مدفون کر دینے یا خود غرضی کے ساتھ صرف اپنی ہی ترقی کے لیے استعمال کرنے کا حق نہیں ہے ——

یہی نظریہ اور یہی استدلال تھا جسے عموماً انیسویں صدی کے آخری دَور میں ملک گیری کی تائید کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ اسی حجت کو پیش کر کے افریقہ اور بحر الکاہل کی "نیم مہذب" قوموں کو یورپ اور امریکہ کی سلطنتوں کا تابع فرمان بنایا گیا تھا......"

آگے چل کر وہ لکھتا ہے:

"یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ایک بڑی قوم صرف یہی حق نہیں رکھتی کہ براہ راست جو حملہ اس پر کیا جائے اس کی مدافعت کرے، بلکہ یہ بھی اس کا حق ہے کہ ہر اس چیز کی مزاحمت کرے جس سے اس کے ایسے مفاد پر زد پڑتی ہو جو اس کی آزادانہ زندگی اور خوش حالی کے لیے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اس کی زندگی کے لیے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ بس اپنی سرحدوں کی حفاظت کرے، اور اپنے مادی وسائل پر خود قابو یافتہ رہے، اور اپنی عزت کو پامال نہ ہونے دے۔ نہیں، اگر اسے زندہ رہنا ہے تو اس سے زیادہ بھی کچھ کرنا پڑے گا۔ اس کو بڑھنا چاہیے، پھیلنا چاہیے، اپنی قوت بڑھانی چاہیے، اپنا قومی دبدبہ قائم کرنا چاہیے، ورنہ وہ رفتہ رفتہ گرتی چلی جائے گی اور بالآخر قوموں کی مسابقت میں اس کا وجود محو ہو کر رہ جائے گا۔ جو قومیں اپنے مفاد کی حفاظت کرنے اور اپنے سیاسی و معاشی نفوذ و اثر کا دائرہ بڑھانے میں زیادہ کامیاب ہوتی ہیں وہی زندہ رہنے کی زیادہ حق دار ہیں۔ جنگ قومی توسیع کا فطری ذریعہ ہے، اور جنگ میں

فتح یاب ہونا قوم کے اصلح (Fittest) ہونے کی دلیل ہے۔ ڈاکٹر ریچ ہاٹ کے
بقول وہ جنگ ہی ہے جو قوموں کو بناتی ہے؟
اس کے بعد وہ لکھتا ہے :۔

ڈارون کے نظریہ ارتقاء کو بھی ان خیالات کی تائید میں غلط طور پر
استعمال کیا گیا ہے) ارنسٹ ہیکل (Ernest Haeckel) جو جرمنی میں
ڈارونیت کا پہلا اور سب سے زیادہ با اثر پیغمبر گزرا ہے، اور جس نے
اپنے علم الحیات کے (Biological) نظریات کو نہایت ہوشیاری
کے ساتھ فلسفہ اور اجتماعیات (Socialogy) میں استعمال کیا ہے،
خود غرضی و خود پرستی کو عالمگیر قانونِ حیات قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ
قانون انسانی سوسائٹی کے اندر ایک طرح کی نسلی مردم خوری کی صورت میں
جاری ہوتا ہے۔ اس کی رائے میں زمین اُن تمام نسلی گروہوں کے لیے
کافی سامانِ زندگی نہیں رکھتی جو اس کی آغوش میں جنم لیتے ہیں۔ لہذا کمزور
گروہ فنا ہو جاتے ہیں، نہ صرف اس وجہ سے کہ زمین کے محدود وسائلِ
زندگی سے فائدہ اُٹھانے کے لیے جو عام تنازع برپا ہوتا ہے اس میں
وہ دوسرے گروہوں کا کامیاب مقابلہ نہیں کر سکتے، بلکہ اس وجہ سے بھی
کہ زیادہ طاقتور گروہوں کے فاتحانہ اقدامات کی مدافعت کا کس بل
ان میں نہیں ہوتا۔ اسی طرح کارل پیرسن (Karl Pearson) بین الاقوامی
کش مکش کو نوعِ انسانی کی فطری تاریخ کا ایک شعبہ قرار دیتا ہے۔ اس
کا دعویٰ یہ ہے کہ زندگی کے علمی تصور (Scientific View of Life)
کی رُو سے انسانی تہذیب و تمدن کا ارتقاء دراصل اُس نزاع و جدال
کی وجہ سے ہوتا ہے جو صرف افراد ہی کے درمیان نہیں بلکہ قوموں کے
درمیان بھی دائماً برپا رہتی ہے۔ جب ایک اعلیٰ درجہ کی قوم اپنی کمزور
نسلوں کو مٹانے اور صرف طاقتور نسلیں پیدا کرنے کا انتظام کر کے اندرونی

حیثیت سے اپنی صلاحیت بڑھالیتی ہے۔ تب وہ دوسری قوموں سے مقابلہ کرکے بیرونی حیثیت سے اپنی صلاحیت (Fitness) کو ترقی دینا شروع کرتی ہے۔ اس نزاع میں کمزور (غیر صالح) قومیں ... (صالح) قومیں باقی رہتی ہیں۔ اور اس طرح مجموعی حیثیت سے پوری نوعِ انسانی کا قدم ترقی کی طرف بڑھتا ہے۔ ایک قوم دوسری عالی مقام قوموں کے ساتھ اپنی برابری کا ثبوت اسی طرح دے سکتی ہے کہ وہ ان سے تجارتی راستوں اور خام پیداوار کے وسائل اور سامانِ غذا کے ذخائر کے لیے پیہم مجاہدہ کرتی رہے۔ فروتر درجہ کی قوموں (کمزور قوموں) سے واسطہ پڑنے کی صورت میں اگر وہ ان کے ساتھ مساوات کا برتاؤ کرتی اور ان سے گھلتی ملتی ہے تو گویا خود ہی اپنے دعوائے بالاتری سے دست بردار ہو جاتی ہے۔ اور اگر وہ انہیں زمین سے نکال کر خود قبضہ کر لیتی ہے، یا انہیں زمین میں باقی رکھ کر اپنے فائدے کے لیے استعمال کرتی ہے تو اپنی بالاتری ثابت و قائم کر دیتی ہے۔"[1]

ایک دوسرا مصنف جوزف لیٹن (Joseph Lighten) لکھتا ہے:-

"پندرہویں صدی سے دنیا کی تاریخ زیادہ تر قومی ریاستوں کے درمیان معاشی رقابتوں کی داستان ہے۔ معاشی قوم پرستی روز بروز قوموں کے درمیان تصادم کا سبب بنتی چلی گئی ہے۔ پہلے تجارت کے میدان میں مزاحمت کا سلسلہ چلتا ہے، پھر جنگ ہوتی ہے۔ امریکہ، افریقہ، سات سمندروں کے جزائر، اور ایشیا کے ایک بڑے حصے پر تسلط، نو آبادیوں کا قیام اور ان ممالک کے معاشی وسائل سے استفادہ (Exploitation)، یہ سب کچھ اسی داستانِ قوم پرستی کے مختلف ابواب ہیں۔ اگرچہ یہی سب نورا

---

[1] *Recent Political thought, Newyork-1943, P. 433-48*

چھوٹے پیمانہ پر اس وقت بھی ہوا تھا جب زوالِ روما کے بعد وحشی قومیں تاخت و تاراج کرتی ہوئی پھیل گئی تھیں۔ مگر فرق یہ ہے کہ رومن ایمپائر کے باقیات سے تو مذہبی، اخلاقی اور تہذیبی بنیادوں پر ایک بین الاقوامی نظام تعمیر ہو گیا تھا، لیکن دنیائے جدید میں یہ نہ ہو سکا۔[1]

"جب ایک ایسی قوم جو تہذیبی وحدت رکھتی ہو، سیاسی حیثیت سے خود مختار، اور معاشی حیثیت سے متحد الاغراض ہوتی ہے، اور اس میں تہذیبی و سیاسی اور معاشی قومیت میں اپنی عظمت اور برتری کے احساسات اُبھر آتے ہیں، تب معاشی قوم پرستی اپنی شدید تر صورت میں رُونما ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ کیونکہ دنیا کی مختلف قوموں کے درمیان مسابقت و مزاحمت کا جو سسٹم اس وقت قائم ہے اس کا لازمی نتیجہ یہی قوم پرستی ہے۔ اور یہ قوم پرستی بہت جلدی معاشی امپیریلزم میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ قومیں تجارتی فوائد کے لیے ایک دوسرے کے خلاف جدّ و جہد کرتی ہیں اور بیرونی ممالک کی منڈیوں اور پس ماندہ ممالک کی معاشی دولت پر قبضہ کرنے کے لیے ان کے درمیان کش مکش ہوتی ہے......"

"سیاسی اور معاشی نیشنلزم کی گتھی (جس کو سلجھانے کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوتی) یہ ہے کہ ایک طرف قومی ریاست کا وجود ایک قوم کی فلاح و بہبود کے لیے ضروری ہے، اور اس کی محض معاشی خوشحالی ہی نہیں بلکہ اس کی تہذیبی ترقی، اس کی تعلیم، اس کے سائنس، اس کے فنون، غرض اس کی ہر چیز کے نشوونما کا انحصار قومی ریاست کے پھلنے پھولنے ہی پر ہے۔ لیکن دوسری طرف موجودہ مسابقت کے ماحول میں خود بخود معاشی نیشنلزم پیدا ہو جاتا ہے۔ ہر قوم دوسری قوموں کے نقصان پر پھلنے پھولنے کی کوشش

---

[1] Social Philosophies in Conflict New York, 1937, P. 439

کرتی ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قوموں کے درمیان رقابت، شبہات،
خوف، اور نفرت کے جذبات پرورش پاتے ہیں۔ معیشت کے میدان میں
بین الاقوامی مسابقت سے لے کر جنگ کے میدان میں فوجی تصادم تک سیدھا راستہ
جاتا ہے۔ اور یہ بہت قریب کا راستہ ہے[1]۔

مغربی نیشنلزم اور خدائی تعلیم کا بنیادی اختلاف

میں نے مغربی نیشنلزم اور اس کے اندازِ فکر اور طریقِ کار کو اپنے الفاظ میں بیان کرنے کے بجائے خود اہلِ مغرب کے الفاظ میں نقل کرنا زیادہ پسند کیا ہے تاکہ اس کی پوری تصویر خود گھر والوں کے موقلم سے کھنچی ہوئی آپ کے سامنے آجائے۔ اُوپر کے اقتباسات اس امر کی بیّن شہادت پیش کرتے ہیں کہ یورپ میں جن تخیلات اور جن اصولوں پر نیشنلزم کا نشوونما ہوا ہے وہ انسانیت کی عین ضد ہیں۔ انہوں نے انسان کو حیوانیت بلکہ درندگی کے مقام تک گرا دیا ہے۔ وہ خدا کی زمین کو فساد، ظلم، اور خونریزی سے بھرنے والے اور انسانی تہذیب کے پُرامن نشوو ارتقاء کو روکنے والے اصول ہیں۔ ابتدا سے خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبر دنیا میں جن پاک مقاصد کے لیے سعی کرتے رہے ہیں، یہ اصول ان سب پر پانی پھیر دیتے ہیں۔ الٰہی شریعتیں جن اغراض کے لیے دنیا میں آئی ہیں، اور آسمانی کتابیں جن اخلاقی و روحانی تعلیمات کو لے کر نازل ہوئی ہیں، یہ شیطانی اصول ان کے مدِ مقابل، ان کے مزاحم، اور معاند واقع ہوئے ہیں۔ یہ انسان کو تنگ دل، تنگ نظر[2] اور متعصب بناتے ہیں۔ یہ قوموں اور نسلوں کو ایک دوسرے کا دشمن بنا کر حق اور انصاف اور انسانیت کی طرف سے اندھا کر دیتے ہیں۔ یہ مادی طاقت اور حیوانی زور کو اخلاقی حق کا قائم مقام قرار دے کر شرائع الٰہیہ کی عین بنیاد پر ضرب لگاتے ہیں۔

---

[1] حوالۂ مذکور صفحہ ۳-۵۰۲۔

[2] قوم پرستانہ تنگ نظری کی انتہا یہ ہے کہ جاپان میں ہندوستان کے آم کا داخلہ بند ہے۔ گویا ایک نعمت جو اللہ نے زمین پر پیدا کی ہے، ایک قوم کے لوگ اپنے اوپر اس کو صرف اس لیے حرام کر لیتے ہیں کہ وہ دوسری قوم کے ملک میں کیوں پیدا ہوئی۔

الٰہی شریعتوں کا مقصد ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ انسانوں کے درمیان اخلاقی و روحانی رشتے قائم کرکے انہیں وسیع پیمانے پر ایک دوسرے کا معاون بنایا جائے۔ مگر نیشنلزم نسلی اور وطنی امتیاز کی قینچی سے کر ان رشتوں کو کاٹ دیتا ہے اور قومی منافرت پیدا کرکے انسانوں کو ایک دوسرے کا معاون بنانے کے بجائے مزاحم اور دشمن بنا دیتا ہے۔

الٰہی شریعتیں چاہتی ہیں کہ انسان اور انسان کے درمیان آزادانہ ربط کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کیے جائیں کیونکہ انہی پر انسانی تہذیب و تمدن کی ترقی کا انحصار ہے۔ مگر نیشنلزم اس ترقی کی راہ میں ہر قسم کی رکاوٹیں پیدا کرتا ہے، حتیٰ کہ ایک قوم کے حلقۂ اثر میں دوسری قوم والوں کے لیے سانس لینا تک مشکل کر دیتا ہے۔

الٰہی شریعتوں کا منشا یہ ہے کہ ہر فرد، ہر قوم اور ہر نسل کو اپنی طبعی خصوصیات اور پیدائشی قابلیتوں کے نشو و نما کا پورا موقع ملے تاکہ وہ مجموعی حیثیت سے انسانیت کی ترقی میں اپنا حصہ ادا کر سکے۔ مگر نیشنلزم ہر قوم اور ہر نسل میں یہ داعیہ پیدا کرتا ہے کہ وہ طاقت حاصل کرکے دوسری قوموں اور نسلوں کو ادنیٰ اور ذلیل اور بے قدر و قیمت قرار دے، اور انہیں غلام بنا کر ان کی پیدائشی قابلیتوں کو بڑھنے اور کام کرنے کا موقع ہی نہ دے۔ بلکہ ان سے زندگی کا حق ہی سلب کرکے چھوڑے۔

ؔ ابھی پچھلے ہی سال نیشنلزم کا یہ کرشمہ ساری دنیا نے دیکھا کہ برما کے ہولناک فسادات میں جو چیز محرک بنی نیشنلزم کا جذبہ تھا، برمی بودھوں نے عام ہندوستانیوں کی طرح ہندوستانی بودھوں کو بھی نہایت بیدردی کے ساتھ قتل و غارت کیا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ نیشنلزم کی مقراض نے اس گروحانی و اخلاقی رشتہ کو قطع کرکے رکھ دیا جسے بودھ مت نے ایک ہندوستانی اور ایک برمی کے درمیان قائم کیا تھا۔ یہ نیشنلزم کا فطری خاصہ ہے۔ اس نے مسیحی اقوام کے درمیان بھی رشتۂ اخوت کو اسی طرح کاٹا تھا، اور اب مسلمان قوموں کے درمیان بھی کاٹ رہا ہے۔ چنانچہ شام کی سرحد پر ترکوں اور عربوں کے درمیان جو صورتِ حال اس وقت رونما ہے وہ اسی نیشنلزم کا نتیجہ ہے۔

الہٰی شریعتوں کا اساسی اصول یہ ہے کہ طاقت کے بجائے اخلاق پر انسانی حقوق کی بنیاد قائم ہو۔ حتیٰ کہ ایک طاقت ور شخص یا گروہ کمزور شخص یا گروہ کے حق کو بھی ادا کرے جبکہ قانونِ اخلاق اس کی تائید میں ہو۔ لیکن نیشنلزم اس کے مقابلہ میں یہ اصول قائم کرتا ہے کہ طاقت ہی حق ہے اور کمزور کا کوئی حق نہیں، اس لیے کہ وہ اُسے حاصل کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔

شرائع الٰہیہ جس طرح اخلاقی حدود کے اندر نفس پروری کی مخالف نہیں ہیں اسی طرح وہ قوم پروری کی بھی مخالف نہیں ہیں۔ درحقیقت وہ اس کی تائید کرتی ہیں، کیونکہ ایک ایک قوم کے اپنی اپنی جگہ ترقی کرنے ہی پر مجموعی حیثیت سے انسانیت کی ترقی کا مدار ہے۔ لیکن آسمانی شریعتیں ایسی قوم پروری چاہتی ہیں جو انسانیت عامہ (Humanity at Large) کی طرف ہمدردی، معاونت اور خیرخواہی لیے ہوئے بڑھے اور وہ خدمت انجام دے جو سمندر کے لیے زمین کے دریا انجام دیتے ہیں۔ برعکس اس کے نیشنلزم انسان کے اندر یہ ذہنیت پیدا کرتا ہے کہ وہ اپنی تمام قوتیں اور قابلیتیں صرف اپنی قوم کی بڑائی کے لیے مخصوص کرے اور انسانیتِ عامہ کا نہ صرف یہ کہ مددگار نہ ہو بلکہ اپنی قوم کے مفاد پر انسانیت کے عمومی مفاد کی قربانی چڑھا دے۔ انفرادی زندگی میں جو حیثیت "خود غرضی" کی ہے اجتماعی زندگی میں وہی حیثیت "قوم پرستی" کی ہے۔ ایک قوم پرست فطرۃً تنگ دل ہوتا ہے۔ وہ دنیا کی ساری خوبیاں صرف اپنی قوم یا اپنی نسل ہی میں دیکھتا ہے۔ دوسری قوموں یا نسلوں میں اسے کوئی چیز ایسی قابلِ قدر نظر نہیں آتی جو زندگی اور بقا کی مستحق ہو۔ اس ذہنیت کا مکمل نمونہ ہم کو جرمنی کے نیشنل سوشلزم میں نظر آتا ہے۔ ہٹلر کی زبان میں نیشنل سوشلسٹ کی تعریف یہ ہے کہ:

> "ہر وہ شخص جو قومی نصب العین کو اس حد تک اپنانے کے لیے تیار ہو کہ اس کے نزدیک اپنی قوم کی فلاح سے بالاتر کوئی نصب العین نہ ہو، اور جس نے ہمارے قومی ترانے "جرمنی سب سے اوپر" کے معنی و مقصود کو اچھی طرح سمجھ لیا ہو، یعنی اس وسیع دنیا میں جرمن قوم اور جرمنی سے بڑھ کر

کوئی چیز اس کی نگاہ میں عزیز اور محترم نہ ہو۔ ایسا شخص نیشنل سوشلسٹ ہے۔[1] ہٹلر اپنی کتاب "میری جدوجہد" میں لکھتا ہے:

"اس زمین میں جو کچھ قابلِ قدر ہے ـــــ سائنس، آرٹ، فنی کمالات اور ایجادات ـــــ وہ سب کا سب چند گنی چنی قوموں کی تخلیقی قابلیتوں کا نتیجہ ہے۔ اور یہ قومیں اصل میں ایک ہی نسل سے تعلق رکھتی ہیں...... اگر ہم نوعِ انسانی کو تین قسموں میں تقسیم کریں ـــــ کلچر بنانے والے، اس کی حفاظت کرنے والے، اس کو غارت کرنے والے ـــــ تو صرف آریہ نسل ہی کا شمار پہلی قسم میں کیا جا سکے گا۔"[2]

اس نسلی تفاخر کی بنیاد پر جرمنی میں غیر آریہ لوگوں کے لیے عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا ہے اور اسی بنیاد پر جرمنی کی جہانگیری کا نظریہ قائم ہے۔ ایک نیشنل سوشلسٹ کے نزدیک دنیا میں جرمن قوم کا مشن یہ ہے کہ وہ "ادنیٰ درجہ" کی قوموں کو غلام بنا کر "تہذیب" پھیلانے میں آلہ کے طور پر استعمال کرے۔ اور یہ محض جرمنی ہی کی خصوصیت نہیں ہے۔ جمہوریت پسند امریکہ میں بھی رنگ کا امتیاز اسی بنیاد پر ہے ـــــ سفید فام امریکن سیاہ فام حبشی کو انسان سمجھنے کے لیے کسی طرح تیار نہیں ـــــ اور یہی مسلک یورپ کی ہر قوم کا ہے، خواہ وہ برطانیہ ہو یا فرانس یا اٹلی یا ہالینڈ۔

پھر اس قوم پرستی کی ایک لازمی خصوصیت یہ ہے کہ یہ انسان کو مطلب پرست بناتی ہے۔ شرائع الٰہیہ تو دنیا میں اس لیے آئی ہیں کہ آدمی کو اصول پرست بنائیں اور اس کے طرزِ عمل کو ایسے مستقل اصولوں کا پابند بنا دیں جو اغراض اور خواہشات کے ساتھ بدلنے والے نہ ہوں۔ لیکن قوم پرستی اس کے برعکس آدمی کو بے اصولا بنا دیتی ہے۔ قوم پرست کے لیے دنیا میں کوئی اصول اس کے سوا نہیں ہے کہ وہ اپنی قوم کا فائدہ چاہتا ہے۔ اگر اخلاق کے

---

[1] History of National Socialism by Konrad Helden, P. 85

[2] "My Struggle" London, PP 120-121

اصول، مذہب کے احکام اور تہذیب کے نظریات اس مقصد میں اس کے مددگار ہوں تو وہ ان پر ایمان لانے کا خوشی سے دعویٰ کرتا رہے گا۔ اور اگر وہ اس کے راستے میں حائل ہوں تو ان سب کو بالائے طاق رکھ کر کچھ دوسرے اصول و نظریات اختیار کرے گا۔ مسولینی کی سیرت میں ہم کو ایک قوم پرست کے کیرکٹر کا پورا نمونہ ملتا ہے۔ جنگِ عظیم سے پہلے وہ اشتراکی تھا۔ جنگِ عظیم میں اس لیے اشتراکیوں سے الگ ہو گیا کہ اٹلی کے شریکِ جنگ ہونے میں اس کو قومی فائدہ نظر آتا تھا۔ پھر جب غنائمِ جنگ میں اٹلی کو مطلوبہ فوائد حاصل نہ ہوئے تو اس نے جدید فاشستی تحریک کا علم بلند کیا۔ اس نئی تحریک میں بھی وہ برابر اپنے اصول بدلتا چلا گیا۔ ۱۹۱۹ء میں وہ لبرل سوشلسٹ تھا۔ ۱۹۲۰ء میں انارکسٹ بنا۔ ۱۹۲۱ء میں چند مہینے تک سوشلسٹ اور جمہوری طبقوں کا مخالف رہا۔ چند مہینے ان کے ساتھ اتحاد کی کوشش کرتا رہا۔ اور بالآخر ان سے کٹ کر اس نے ایک نئی پالیسی وضع کر لی۔ یہ تلوّن، یہ بے اصولی اور یہ ابن الوقتی مسولینی کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ نیشنلزم کی فطرت کا طبعی خاصہ ہے۔ انفرادی زندگی میں جو کچھ ایک خود غرض آدمی کرتا ہے وہی قومی زندگی میں قوم پرست کرتا ہے۔ کسی اصول اور نظریہ پر مستقل ایمان رکھنا اس کے لیے ناممکن ہے۔

مگر نیشنلزم اور الٰہی شریعتوں میں سب سے زیادہ کھلا ہوا تصادم ایک اور صورت سے ہوتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ خدا کی طرف سے جو نبی بھی آئے گا وہ بہرحال کسی ایک قوم اور کسی ایک سرزمین ہی میں پیدا ہوگا۔ اسی طرح جو کتاب اس نبی کو دی جائے گی وہ بھی لامحالہ اسی ملک کی زبان میں ہوگی جس میں وہ مبعوث ہوا ہے۔ پھر اس نبوت کے مشن سے تعلق رکھنے والے جن مقامات کو عزت و احترام اور تقدیس کی حیثیت حاصل ہوگی وہ بھی زیادہ تر اسی ملک میں واقع ہوں گے۔ مگر ان سب محدودیتوں کے باوجود وہ صداقت اور تعلیم ہدایت جو ایک نبی خدا کی طرف سے لے کر آتا ہے، کسی قوم اور ملک کے لیے محدود نہیں ہوتی بلکہ تمام انسانوں کے لیے عام ہوتی ہے۔ پوری نوعِ انسانی کو اس نبی پر اور اس کی لائی ہوئی صداقت پر ایمان لانے کا حکم دیا جاتا ہے۔ خواہ کسی نبی کا مشن محدود ہو

جیساکہ ہود اور صالح علیہما السلام اور بہت سے پیغمبروں کا تھا، یا اس کا مشن عام ہو جیساکہ حضرت ابراہیم اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا، بہرصورت ہر نبی پر ایمان لانے اور اس کا احترام کرنے کے لیے تمام انسان مامور ہیں۔ اور جب کہ کسی نبی کا مشن عالمگیر ہو تو یہ قدرتی بات ہے کہ اس کی لائی ہوئی کتاب کو بین الاقوامی حیثیت حاصل ہو گی۔ اس کی زبان کا تہذیبی اثر بین الاقوامی ہوگا۔ اس کے مقدس مقامات ایک ملک میں واقع ہونے کے باوجود بین الاقوامی مرکزیت حاصل کریں گے۔ اور نہ صرف وہ نبی بلکہ اس کے حواری اور اس کے مشن کی اشاعت میں نمایاں حصہ لینے والے ابتدائی لوگ بھی ایک قوم سے تعلق رکھنے کے باوجود تمام قوموں کے ہیرو قرار پائیں گے ــــــــ یہ سب کچھ ایک نیشنلسٹ کے مذاق، اُس کی افتادِ طبع، اس کے جذبات اور اس کے نظریات کے خلاف ہے۔ نیشنلسٹ کی غیرتِ قومی اس کو کسی طرح گوارا نہیں کر سکتی کہ وہ ایسے لوگوں کو ہیرو بنائے جو اس کی اپنی قوم کے نہیں ہیں، ایسے مقامات کی مرکزیت اور تقدیس و احترام قبول کرے جو اس کے اپنے وطن کے نہیں ہیں، ایسی زبان کا تہذیبی اثر قبول کرے جو اس کی اپنی زبان نہیں ہے، اُن روایات سے روحانی تحریک (Inspiration) حاصل کرے جو باہر سے آئی ہوں۔ وہ ان سب چیزوں کو نہ صرف اجنبی (Foreign) قرار دے گا بلکہ انہیں اُس نفرت اور ناگواری کی نگاہ سے دیکھے گا جس سے بیرونی حملہ آوروں کی ہر چیز دیکھی جاتی ہے، اور ان تمام خارجی اثرات کو اپنی قوم کی زندگی سے نکال دینے کی کوشش کرے گا۔ اس کے جذبۂ قومیت کا فطری اقتضاء یہ ہے کہ اپنے جذبات تقدیس و احترام کو اپنے ہی وطن کی سرزمین سے وابستہ کرے، اپنے ہی وطن کے دریاؤں اور پہاڑوں کی حمد میں گیت گائے، اپنی ہی قوم کی پرانی تاریخی روایات کو (انہی روایات کو جنہیں یہ باہر سے آنے والا مذہب "عہدِ جاہلیت" سے تعبیر کرتا ہے) زندہ کرے اور ان پر فخر کرے، اپنے حال کا رشتہ اپنے ہی ماضی سے جوڑے اور اپنی ثقافت کا تسلسل اپنے اسلاف ہی کی ثقافت کے ساتھ قائم کرے، اپنی ہی قوم کے تاریخی یا افسانوی بزرگوں کو اپنا ہیرو بنائے اور انہی کے خیالی یا واقعی کارناموں سے روحانی تحریک حاصل کرے۔

غرض یہ بات نیشنلزم کی عین طبیعت میں شامل ہے کہ وہ ہر اُس چیز سے جو باہر کی ہو، منہ موڑ کر اُن چیزوں کی طرف رُخ کرے جو اس کے اپنے گھر کی ہوں۔ یہ راستہ جس آخری منزل پر پہنچتا ہے وہ یہ ہے کہ باہر سے آئے ہوئے مذہب کو بھی کلی طور پر چھوڑ دیا جائے اور ان مذہبی روایات کو زندہ کیا جائے جو خود اپنی قوم کے عہد جاہلیت سے کسی نیشنلسٹ کو پہنچی ہوں۔ ممکن ہے کہ بہت سے نیشنلسٹ اس آخری منزل تک نہ پہنچے ہوں، اور ابھی بیچ ہی کی کسی منزل میں ہوں، مگر جس راستے پر وہ گامزن ہیں وہ جاتا اسی طرف ہے۔

آج[1] جرمنی میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ نیشنلزم کے اِس فطری خاصّہ کی مکمل توضیح و تبیین ہے۔ نازیوں میں سے ایک گروہ تو علانیہ حضرت عیسٰی علیہ السّلام سے بیزاری کا اظہار کر رہا ہے، اس لیے کہ وہ یہودی النسل تھے اور کسی شخص کا یہودی ہونا اِس بات کے لیے کافی وجہ ہے کہ ایک آریہ نسل پرست اس کی تمام تہذیبی، اخلاقی اور روحانی قدر و قیمت سے انکار کر دے۔ چنانچہ اس گروہ کے لوگ بلا تکلف کہتے ہیں کہ "مسیح ایک پرولتاری یہودی تھا، مارکس کا پیشرو، اِسی لیے تو اس نے کہا کہ جو مسکین ہیں وہی زمین کے وارث ہوں گے"۔ اس کے برعکس جن نازیوں کے دل میں ابھی تک مسیح کے لیے جگہ باقی ہے وہ ان کو نارڈک نسل کا ثابت کرتے ہیں۔ گویا ایک جرمن قوم پرست یا تو مسیح کو مانے گا نہیں، کیونکہ وہ یہودی تھے، یا اگر مانے گا تو اسرائیلی مسیح کو نہیں بلکہ نارڈک نسل کے مسیح کو مانے گا۔ بہرصورت اس کا مذہب اس کی نسل پرستی کے تابع ہے۔ کسی غیر آریہ کو رُوحانی و اخلاقی تہذیب کا پیشوا ماننے کے لیے کوئی جرمن قوم پرست تیار نہیں[2]۔ حد یہ ہے کہ جرمن قوم پرستوں کے لیے وہ خدا بھی قابلِ قبول نہیں جس کا تصور باہر سے درآمد ہوا ہے۔ بعض نازی حلقوں میں کوشش ہو رہی ہے کہ ان دیوتاؤں کو پھر زندہ کیا جائے جنہیں پُرانے ٹیوٹن قبائل پُوجا کرتے تھے۔

---

[1] یہ مضمون ۱۹۳۹ء میں لکھا گیا تھا۔ مرتب

[2] ٹھیک یہی ذہنیت عرب کے ان یہودیوں کی تھی جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان لانے سے صرف اس لیے انکار کر دیا تھا کہ آپؐ بنی اسرائیل میں سے نہیں ہیں۔

چنانچہ تاریخِ قدیم کی چھان بین کر کے پوری دیومالا تیار کرلی گئی ہے اور ووٹان (Wotan) نامی دیوتا کو، جسے عہدِ جاہلیت کے ٹیوٹن لوگ "طوفان کا خدا" کہتے تھے، مہادیو قرار دیا گیا ہے۔ یہ مذہبی تحریک تو ابھی نئی نئی شروع ہوئی ہے۔ لیکن سرکاری طور پر نازی نوجوانوں کو آج کل جس عقیدہ کی تعلیم دی جا رہی ہے اس میں بھی خدا کو رب العالمین کی حیثیت سے نہیں بلکہ محض رب الالمانیین کی حیثیت سے خدا تسلیم کیا گیا ہے۔ اس عقیدے کے الفاظ یہ ہیں:۔

"ہم خدا پر اس حیثیت سے ایمان رکھتے ہیں کہ وہ قوت وحیات کا ازلی مظہر ہے، زمین میں اور کائنات میں خدا کا خیال جرمن انسان کے لیے فطری ہے۔ خدا اور ازلیت کے متعلق ہمارا تصور کسی دوسرے مذہب یا عقیدے کے تصورات سے کسی قسم کی مماثلت نہیں رکھتا۔ ہم جرمن قوم اور جرمنی کی ازلیت پر ایمان رکھتے ہیں کیونکہ قوت وحیات کی ازلیت پر ہمارا ایمان ہے۔ ہم زندگی کے نیشنل سوشلسٹ تصور پر ایمان رکھتے ہیں۔ ہم اپنے قومی مقاصد کی حقانیت پر ایمان رکھتے ہیں۔ ہم اپنے قائد اڈولف ہٹلر پر ایمان رکھتے ہیں"

یعنی خدا اس قوت وحیات کا نام ہے جو جرمن قوم میں حلول کر گئی ہے۔ جرمن قوم اس خدا کا ارضی ظہور ہے۔ ہٹلر اس کا رسول ہے اور "قومی مقاصد" اس رسول کا لایا ہوا مذہب ہے۔ ایک قوم پرست کی ذہنیت سے اگر کوئی مذہبی تصور مناسبت رکھتا ہے تو وہ بس یہی ہے۔

مغربی نیشنلزم کا انجام

یورپین اصول پر جب نیشنلزم کو ترقی دی جائے گی تو وہ بالآخر اسی مقام پر پہنچ کر دم لے گی۔ جو لوگ ابھی بیچ کی منزلوں میں ہیں اور اس حد تک نہیں پہنچے ہیں، ان کے نہ پہنچنے کی وجہ صرف یہ ہے کہ ابھی تک ان کے جذباتِ قومیت کو ویسی سخت ٹھیس نہیں لگی ہے جیسی جرمنی کو گزشتہ جنگ عظیم میں لگی تھی۔ لیکن یقین رکھیے کہ جب وہ نیشنلزم کے راستہ پر گامزن ہوتے ہیں تو ان کی آخری منزلِ مقصود بہرحال وہی کمال درجہ کی جاہلی عصبیت ہے

جو خدا اور مذہب تک کو قومی بنائے بغیر مطمئن نہیں ہو سکتی۔ یہ نیشنلزم کی فطرت کا تقاضا ہے۔ نیشنلزم اختیار کر کے اس کے فطری تقاضے سے کون بچ سکتا ہے؟ غور کیجیے، آخر وہ کیا چیز ہے جو قوم پرستانہ طرزِ فکر اختیار کرتے ہی ایک مصری نیشنلسٹ کا رُخ خود بخود عہدِ فراعنہ کی طرف پھیر دیتی ہے؟ جو ایرانی کو شاہنامے کی افسانوی شخصیتوں کا گرویدہ بنا دیتی ہے؟ جو ہندوستانی کو "پراچین سمے" کی طرف کھینچ لی جاتی ہے اور گنگ و جمن کی تقدیس کے ترانے اس کی زبان پر لاتی ہے؟ جو ترک کو مجبور کرتی ہے کہ اپنی زبان، اپنے ادب اور اپنی تمدنی زندگی کے ایک ایک شعبے سے عربی اثرات کو خارج کرے اور ہر معاملہ میں عہدِ جاہلیت کی ترکی روایات کی طرف رجوع کرے؟ اس کی نفسیاتی توجیہ بجز اس کے آپ اور کیا کر سکتے ہیں کہ نیشنلزم جس دل و دماغ میں پیدا ہوتا ہے اس کی تمام دلچسپیاں قومیت کے دائرے میں محدود ہو جاتی ہیں اور اس دائرے سے باہر کی ہر چیز سے اس کا رُخ پھر جاتا ہے۔

میرے سامنے اس وقت انقرہ کے ڈائرکٹر جنرل آف پریس کا ایک مضمون رکھا ہے جس کا عنوان ہے "ترکی عورت تاریخ میں"۔ اس کے ابتدائی فقرے حسبِ ذیل ہیں:-

"قبل اس کے کہ ہم اس بلند اور معزز رتبے سے بحث کریں جو ہماری زبردست جمہوریت نے ترکی عورتوں کو دینا پسند کیا ہے، ہمیں ایک نظر یہ دیکھ لینا چاہیے کہ تاریخ کے مسلسل ادوار میں ترکی عورت کی زندگی کیسی رہی ہے۔ اس مختصر تبصرے سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ آج ترکی مردوں اور عورتوں میں جو مساوات پائی جاتی ہے وہ ہماری قومی تاریخ میں نئی چیز نہیں ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ جب ترکی خاندان اور ترکی نظامِ تمدن بیرونی اثرات سے آزاد تھا، ترکی عورت ہمیشہ ہر تمدنی تحریک میں حصہ لیتی تھی۔ ہمارے مشہور ماہرِ اجتماعیات ضیاء گوک الپ نے اس مضمون کی خوب تحقیق کی ہے، اور اس کی تحقیقات سے ان بہت سے حقوق کا پتہ چلا ہے جو ترکی عورت کو پرانی ترکی تہذیب (ترکی کے عہدِ جاہلیت) میں حاصل تھے۔ ان شہادتوں سے یہ بات صاف ہو جاتی

ہے کہ قدیم ترکی عورت اور آج کی ترکی عورت کے درمیان تمدنی اور
سیاسی اٹھان (Emancipation) کے اعتبار سے گہری مماثلت
پائی جاتی ہے۔"

اِن فقروں کو دیکھیے ۔ قوم پرست ترک کس طرح اپنی تاریخ کے اُس دور سے منہ موڑتا ہے جس میں اس کی قوم اِس "بیرونی اثر" میں آگئی تھی ، اور کس طرح اپنے حال کے لیے اپنے اُس ماضی کو "اُسوہ حسنہ" بناتا ہے جب کہ اس کی قوم اِس بیرونی اثر سے آزاد تھی ۔ یُوں یہ نیشنلزم آدمی کے دماغ کو اسلام سے جاہلیت کی طرف پھیر دیتا ہے ۔ گوک الپ ضیا، جو دراصل تمدنی اور تہذیبی اعتبار سے ترکی جدید کا بانی ہے ، اور جس کے بناتے ہوئے راستے پر آج ترکی قوم چل رہی ہے ، وہ خالدہ ادیب کے الفاظ میں :-

> "ایک نئی ترکی بنانا چاہتا تھا جو عثمانی ترکوں اور ان کے تورانی اسلاف کے درمیان کی خلیج کو پُر کر سکے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ اُس مواد کی بنا پر تمدنی اصلاح کرنا چاہتا تھا جو اس نے ترکوں کے زمانۂ قبلِ اسلام کی سیاسی و تمدنی تنظیمات کے متعلق فراہم کیا تھا ۔ اسے یقین تھا کہ عربوں کا قائم کیا ہوا اسلام ہمارے مناسبِ حال نہیں ہو سکتا ۔ اگر ہم اپنے "عہدِ جاہلیت" کی طرف رجعت نہ کریں تو پھر ہمیں ایک مذہبی اصلاح (Reformation) کی ضرورت ہے جو ہماری طبائع سے مناسبت رکھتی ہو ۔"

یہ الفاظ کسی مغربی پروپیگنڈسٹ کے نہیں ہیں جو ترکوں کو بدنام کرنا چاہتا ہو ، بلکہ خود ایک قوم پرست ترک عورت کے ہیں ۔ ان میں آپ صاف طور پر یہ منظر دیکھ سکتے ہیں کہ مسلمان کے دل و دماغ میں جب ایک راستہ سے قوم پرستی گھسنی شروع ہوتی ہے تو کس طرح دوسرے راستے سے اِسلام نکلنے لگتا ہے ۔ اور یہ چیز کچھ بیچارے ترکوں ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے ۔ جس مسلمان نے بھی نیشنلزم کے شیطان سے بیعت کی ہے ، اسلام کے فرشتوں سے اُس کا رخصتی مصافحہ ہو گیا ہے ۔ ابھی حال میں ہندوستان کے ایک "مسلمان" شاعر نے ترانۂ وطن کے عنوان سے ایک نظم لکھی ہے ، جس میں وہ اپنی بھارت ماتا

کو خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے ؎

جس کا پانی ہے امرت وہ مخزن ہے تو　　جس کے دانے ہیں بجلی وہ خرمن ہے تو
جس کے کنکر ہیں ہیرے وہ معدن ہے تو　　جس سے جنت ہے دُنیا وہ گلشن ہے تو
دیویوں دیوتاؤں کا مسکن ہے تو
تجھ کو سجدوں سے کعبہ بنا دیں گے ہم

آخری بیت کو پڑھ کر اس امر میں کیا شبہ باقی رہ جاتا ہے کہ نیشنلزم اور اسلام، دو بالکل الگ اور قطعی متضاد ذہنیتوں سے تعلق رکھتے ہیں اور ان دونوں کا ایک جگہ جمع ہو جانا محالات سے ہے۔ درحقیقت نیشنلزم خود ایک مذہب ہے جو شرائع الٰہیہ کا مخالف ہے۔ بلکہ عملی حیثیت سے بھی وہ انسان کی زندگی کے اُن تمام پہلوؤں پر ملکیت کا دعوےٰ کرتا ہے جنہیں شرائع الٰہیہ اپنی گرفت میں لینا چاہتی ہیں[1] اب ایک مرد عاقل کے لیے صرف یہی ایک صورت باقی ہے کہ دل و دماغ اور جسم و جان کا مطالبہ کرنے والے اِن دونوں مدعیوں میں سے کسی ایک کو پسند کر کے اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دے، اور جب ایک کی آغوش میں چلا جائے تو دوسرے کا نام تک نہ لے۔

دنیا نیشنلزم کی لعنت میں کیوں مبتلا ہے؟

اس میں شک نہیں کہ موجودہ زمانہ میں آزادی اور ترقی اور وقار و شرف حاصل کرنے کا ایک ہی مجرب نسخہ دنیا کی قوموں کو معلوم ہے، اور وہ یہی نیشنلزم کا نسخہ ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ ہر وہ قوم جو ابھرنا چاہتی ہے، اس نسخہ کی طرف دوڑنے لگتی ہے۔ مگر قبل اس

---

[1] پروفیسر لسٹن کہتا ہے "نیشنلزم نے مذہب اور عقل و ضمیر دونوں کی جگہ چھین لی ہے۔ وہ انسان کی زندگی کے تمام شعبوں پر اسی طرح حاوی ہونا چاہتا ہے جس طرح کہ مذہب۔ آج جو شخص اُس خدا کے سامنے، جس کا نام قومی اسٹیٹ ہے، جھکنے اور اپنے ضمیر کو قربان کر کے اس کی عبادت بجا لانے سے انکار کرتا ہے، وہ شخصی آزادی اور حقوق شہریت سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

Social Philosophies in Conflict, P. 450

کے کہ دوسروں کو اس کی طرف دوڑتے دیکھ کر ہم بھی اسی کی طرف دوڑ جائیں، ہمیں سوچنا چاہیے کہ دنیا کی یہ حالت کیوں ہے —— دنیا اس حالت میں صرف اس لیے مبتلا ہے کہ انفرادی اور اجتماعی خواہشات کو ضابطہ میں لانے والی، حوصلوں اور تمناؤں کو جائز حدود میں رکھنے والی، سعی وعمل کی قوتوں کو سیدھا راستہ دکھانے والی، اور آزادی، ترقی اور عزت ووقار کے حصول کا صحیح طریقہ بتانے والی کوئی تعلیم حکمت واخلاق دنیا کے پاس نہیں ہے۔ اسی چیز نے قوموں کو بھٹکا دیا ہے۔ یہی محرومی اور یہی نقدان ہے جس نے قوموں کو جاہلیت اور ظلم وعدوان کی طرف دھکیل دیا ہے۔ خود ہمارے اپنے ملک کے ہندو اور سکھ اور پارسی وغیرہ بھی جس وجہ سے مغرب کے قوم پرستانہ خیالات قبول کر رہے ہیں، وہ یہی ہے کہ یہ بیچارے اس ہدایت ورہنمائی سے محروم ہیں۔ اس مصیبت، علاج اور گمراہی کی اصلاح اگر کہیں ہے تو وہ شرائع الٰہیہ میں ہے، اور دنیا میں صرف مسلمان ہی وہ جماعت ہے جو شرائع الٰہیہ کی نمائندگی کرتی ہے۔ دراصل یہ مسلمان کا کام تھا کہ وہ آگے بڑھ کر اس عصبیت جاہلیہ کی جڑیں کاٹتا جو اکاس بیل کی طرح دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رہی ہے، اور دنیا کی ہر قوم کو بتاتا کہ تمہارے لیے نہ صرف آزادی، ترقی اور وقار وشرف کا بلکہ اس کے ساتھ سلامتی، امن اور حقیقی خوشحالی کا راستہ بھی وہی ہے جو خدا کی طرف سے اس کے رسول لائے ہیں، نہ کہ وہ جو شیطان کی طرف سے فتنہ وشر کے امام تمہیں دکھا رہے ہیں۔ لیکن یہ دورِ حاضر کا سب سے زیادہ دردناک المیہ ہے کہ دنیا کو تباہی اور گمراہی سے بچانے والی وہ ایک ہی جماعت، مسلمان، جس کو اللہ نے زمین پر انبیاء علیہم السلام کا مشن قائم کرنے اور پھیلانے پر مامور کیا تھا، اپنے فرائضِ منصبی کو فراموش کر بیٹھی ہے، اور اب بجائے اس کے کہ وہ ہدایت کی شمع لے کر تاریکیوں میں بھٹکنے والی دنیا کو روشنی دکھائے، وہ خود ان بھٹکنے والوں ہی کے پیچھے چلنے پر آمادہ ہو رہی ہے۔ افسوس اس بیمارستان میں ایک ہی ڈاکٹر تھا اور وہ بھی بیماروں میں شامل ہوا جاتا ہے۔

مژدہ باد اے مرگ عیسیٰ آپ ہی بیمار ہے

نیشنلزم ہندوستان میں

پچھلے صفحات میں یہ بات اصولی حیثیت سے ہم ثابت کر چکے ہیں کہ اجتماعیات میں نیشنلزم کا نقطۂ نظر اسلام کے نقطۂ نظر سے کلی طور پر متناقض ہے۔ لہذا مسلمان اگر اس شخص کا نام ہے جو زندگی کے ہر معاملہ میں اسلامی نقطۂ نظر رکھتا ہو، اور اگر اس کے سوا لفظ مسلمان کا کوئی دوسرا مفہوم نہیں ہے، تو یہ بات آپ سے آپ لازم ہو جاتی ہے کہ مسلمان جہاں اور جس حال میں بھی ہو، اسے ہر نیشنلزم کی مخالفت کرنی چاہیئے۔ یہ اصول طے ہو جانے کے بعد درحقیقت اس سوال میں کوئی خاص اہمیت باقی نہیں رہتی کہ کسی خاص ملک کی تحریک قوم پرستی میں مسلمان کا رویہ کیا ہو۔ لیکن جب ہم سے یہ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں نیشنلزم کو فروغ دینا چاہیئے، اور یہ کہ اسی چیز کے فروغ پانے پر اس ملک کی نجات منحصر ہے، تو ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ مخصوص طور پر ہندوستان کے حالات کو سامنے رکھتے ہوئے ہم یہ دیکھیں کہ یہاں نیشنلزم کے فروغ پانے کا نتیجہ کیا ہے، یا کیا ہو سکتا ہے اور یہ کہ آیا فی الواقع ہندوستان کی نجات اسی طریقہ میں ہے؟

نیشنلزم کے لوازم

کسی ملک میں نیشنلزم پیدا ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہاں پہلے سے ایک قومیت موجود ہو اور اگر وہ پہلے سے موجود نہیں ہے تو اب وجود میں آئے۔ کیونکہ جہاں قومیت ہی سرے سے موجود نہ ہو وہاں قوم پرستی کسی طرح پیدا نہیں ہو سکتی۔ قوم پرستی تو قومیت کے اشتعال ہی کا دوسرا نام ہے۔ جب شعلہ ہی موجود نہ ہو گا تو اشتعال کیسے ہو گا۔

اب دیکھنا چاہیئے کہ قوم پرستی کا شعلہ بھڑکنے کے لیے کس قسم کی قومیت درکار ہے۔

قومیت کی ایک قسم وہ ہے جسے سیاسی قومیت (Political Nationality) کہتے ہیں، یعنی جو لوگ ایک سیاسی نظام سے وابستہ ہوں وہ محض اس وحدت سیاسی کے لحاظ سے ایک قوم سمجھے جاتے ہیں۔ اس نوع کی قومیت کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ جو لوگ اس میں شریک ہوں ان کے جذبات و حسیات، ان کے خیالات و نظریات، ان کے

اخلاقی خصائص، ان کی روایات، ان کی زبان اور لٹریچر اور ان کے طرزِ زندگی میں کسی قسم کی یکسانی پائی جائے۔ ان تمام حیثیات سے بالکل مختلف ہونے کے باوجود ان کی ایک سیاسی قومیت ہوتی ہے اور اس وقت تک رہتی ہے جب تک کہ وہ ایک سیاسی نظام سے وابستہ رہیں۔ اگر ان کے مختلف گروہ آپس میں مختلف ہی نہیں بلکہ مخالف بھی ہوں، حتیٰ کہ اگر ان کے مقاصد اور قومی حوصلے باہم متضاد ہوں اور وہ ایک دوسرے کے خلاف عملاً جدوجہد کر رہے ہوں، تب بھی ان کی سیاسی قومیت ایک ہی رہتی ہے ـــــ قومیت کا لفظ ایسی وحدت کے لیے بولا ضرور جاتا ہے، مگر ظاہر ہے کہ یہ وہ قومیت نہیں ہے جس کی بنیاد پر کہیں قوم پرستی پیدا ہو سکتی ہو۔

دوسری قسم کی قومیت وہ ہے جسے تہذیبی قومیت (Cultural Nationality) کہا جاتا ہے۔ یہ قومیت صرف اُن لوگوں میں پائی جاتی ہے جن کا مذہب ایک ہو۔ جن کے خیالات و نظریات اور جذبات و حسیات یکساں ہوں۔ جن میں ایک ہی طرح کے اخلاق اوصاف پائے جاتے ہوں۔ جو زندگی کے تمام اہم معاملات میں ایک مشترک زاویہ نگاہ رکھتے ہوں اور اسی زاویۂ نگاہ کے اثر سے ان کی زندگی کے تہذیبی و تمدنی مظاہر میں بھی یک رنگی پیدا ہو گئی ہو۔ جو پسندیدگی و ناپسندیدگی اور حرمت و حلت اور تقدیس و استکراہ کے مشترک معیار رکھتے ہوں۔ جو ایک دوسرے کے احساسات کو سمجھتے ہوں۔ جو ایک دوسرے کی عادات و خصائل اور دلچسپیوں سے مانوس ہوں۔ جن میں آپس کی شادی بیاہ اور مشترک معاشرت کی وجہ سے خونی اور قلبی رشتے پیدا ہو گئے ہوں۔ جنہیں ایک ہی قسم کی تاریخی روایات حرکت میں لا سکتی ہوں۔ مختصر یہ کہ جو ذہنی، روحانی، اخلاقی اور تمدنی و معاشرتی حیثیت سے ایک گروہ، ایک جماعت، ایک وحدت بن گئے ہوں ـــــ قوم پرستی اگر پیدا ہو سکتی ہے تو صرف اسی قومیت کی بنیاد پر ہو سکتی ہے ـــــ جن لوگوں میں یہ قومیت پائی جاتی ہے صرف انہی کے درمیان ایک مشترک نیشنل ٹائپ (Joint National Type) اور ایک مشترک نیشنل آئیڈیا (Joint National Idea) کا نشوونما ہوتا ہے۔ اسی نیشنل ٹائپ کے عشق اور نیشنل آئیڈیا کے استحکام سے نیشنلزم کا آغاز ہوتا ہے۔ یہی چیز آگے بڑھ کر وہ قومی

خودی (National Self) پیدا کردیتی ہے جس میں فرد اپنی انفرادی خودی کو جذب کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ پھر جب قومی خودی کے ارتقاء میں کوئی واقعی یا خیالی چیز مانع ہوتی ہے تو اس کو دفع کرنے کے لیے وہ جذبہ مشتعل ہوتا ہے جس کا نام نیشنلزم ہے۔

کیا ہندوستان کی نجات نیشنلزم میں ہے؟

اس تجزیہ کو سامنے رکھ کر ہندوستان کے حالات پر نظر ڈالیے۔ کیا فی الواقع یہاں نیشنلزم کی بنیاد موجود ہے؟ بلاشبہ سیاسی قومیت یہاں ضرور پائی جاتی ہے، کیونکہ یہاں کے باشندے ایک سیاسی نظام کے تابع ہیں، ایک قسم کے قوانین ان کی تمدنی و معاشی زندگی پر حکمران ہیں، اور ایک فولادی ڈھانچہ ان سب کو اپنی گرفت میں لیے ہوتے ہے۔ مگر جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں محض سیاسی قومیت، قوم پرستی پیدا کرنے کے لیے کافی نہیں ہے۔ یہ قومیت آسٹریا ہنگری، برطانیہ و آئرلینڈ، سلطنت روس، سلطنتِ عثمانیہ، چیکوسلواکیا، یوگوسلاویا، اور بہت سی دوسری سلطنتوں میں بھی پائی جاتی تھی، اور اب بھی بکثرت ملکوں میں پائی جاتی ہے۔ مگر کہیں بھی اس نے نیشنلزم پیدا نہیں کیا۔ آزادی کے جذبہ میں مشترک ہونا، یا مصائب و خطرات میں مشترک ہونا بھی نیشنلزم کی پیدائش کے لیے ناکافی ہے۔ نیشنلزم اگر پیدا ہو سکتا ہے تو صرف تہذیبی قومیت ہی سے پیدا ہو سکتا ہے، اور ہر وہ شخص جو آنکھیں رکھتا ہو اس حقیقت کو دیکھ سکتا ہے کہ ہندوستان کے باشندوں میں تہذیبی قومیت موجود نہیں ہے۔

پھر جب امر واقعی یہ ہے تو یہاں نیشنلزم کا ذکر کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟ جہاں سرے سے ماں ہی نہیں ہے وہاں بچے کا ذکر کرنا ظاہر ہے کہ نادانی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ جو لوگ اس ملک میں نیشنلزم کو فروغ دینے کا خیال ظاہر کرتے ہیں انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ بچہ تہذیبی قومیت ہی کے بطن سے پیدا ہو سکتا ہے۔ اور اس کے پیدا ہونے سے پہلے اس کی ماں کا پیدا ہونا ضروری ہے۔ اس حقیقت کو جب وہ اچھی طرح جان لیں گے تو انہیں اپنے دعوے میں ترمیم کرنی پڑے گی۔ قبل اس کے کہ وہ ہندوستان میں نیشنلزم کو فروغ دینے کا نام لیں، انہیں یہ کہنا پڑے گا کہ یہاں ہم ایک تہذیبی قومیت پیدا کرنا

چاہتے ہیں تاکہ ہندوستانی نیشنلزم فروغ پاسکے۔

ہندوستانی نیشنلزم کس طرح پیدا ہو سکتا ہے؟

اچھا اب اس سوال پر غور کیجیے کہ یہاں ایک تہذیبی قومیت کس طرح پیدا ہو سکتی ہے اور اس کے امکانی نتائج کیا ہوں گے؟

جس ملک میں مختلف تہذیبی قومیتیں پائی جاتی ہوں، وہاں ایک قومیت کی پیدائش دو ہی صورتوں سے ممکن ہے :-

(۱) ایک قوم کی تہذیب باقی سب قوموں کو فنا کر دے۔ یا

(۲) سب کے اختلاط اور امتزاج سے ایک مشترک تہذیب پیدا ہو جائے۔

پہلی صورت یہاں خارج از بحث ہے، کیونکہ ہندوستانی نیشنلزم کے حامی اس کو اپنا نصب العین نہیں بنا سکتے۔ یہ چیز اگر نصب العین بن سکتی ہے تو "ہندو نیشنلزم" یا "مسلم نیشنلزم"[1] کے حامیوں کی بن سکتی ہے۔ رہے ہندوستانی نیشنلسٹ تو ان کے درمیان

---

[1] بظاہر یہ لفظ "مسلم" اور "نیشنلزم" کا اجتماع نہایت عجیب معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس عجائب کی دنیا میں ایسی عجیب چیزیں بھی پیدا ہو ہی جاتی ہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں میں اس وقت دو قسم کے نیشنلسٹ پائے جاتے ہیں۔ ایک "نیشنلسٹ مسلم" یعنی وہ لوگ جو مسلمان ہونے کے باوجود ہندوستان کی مشترک قومیت کے قائل اور اس کے پرستار ہیں۔ دوسرے "مسلم نیشنلسٹ" یعنی وہ لوگ جنہیں اسلام کے اصول و مقاصد سے تو کوئی دلچسپی نہیں، مگر "مسلمان" کے نام سے جو ایک قوم یہاں بن گئی ہے اس کے سیاسی و معاشی مفاد اور اس کی انفرادیت (Individuality) سے محض اس بنا پر ان کو دلچسپی ہے کہ وہ اس قوم میں پیدا ہوئے ہیں۔ اسلام کے نقطۂ نظر سے یہ دونوں قوم پرست یکساں گمراہ ہیں۔ کیونکہ اسلام صرف حق پرستی کا قائل ہے اور کسی قسم کی قوم پرستی کو جائز نہیں رکھتا۔ لیکن بدقسمتی سے یہ دونوں قوم پرست اپنی اس غیر اسلامی حیثیت کے شعور سے محروم ہیں، خصوصاً دوسری قسم کے لوگ تو اپنے آپ کو اس وقت ہندوستان میں اسلام کا علمبردار سمجھ رہے ہیں، حالانکہ ان کی پوزیشن ہندو نیشنلسٹ کی پوزیشن سے کچھ بھی مختلف نہیں۔ ہندو نیشنلسٹ چونکہ ہندو قوم میں پیدا ہوا ہے اس لیے وہ

(باقی صفحہ ۳۶۶ پر)

اتفاق صرف دوسری صورت پر ہی ہو سکتا ہے ، چنانچہ ان کے حلقوں میں اکثر اس مسئلہ پر بحث بھی ہوتی ہے کہ اس مُلک کی مختلف قوموں کے امتزاج سے کسی طرح ایک قومیت پیدا کی جائے ۔ لیکن اس سلسلہ میں وہ ایسی طفلانہ باتیں کرتے ہیں جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ نہ تو وہ تہذیبی قومیت کے حقیقی مفہوم کو سمجھتے ہیں ، نہ انہیں یہ خبر ہے کہ اس قسم کی قومیتوں کا امتزاج کس طرح کن قوانین کے تحت ہوتا ہے ، اور نہ انہوں نے کبھی اس پہلو پر غور کیا ہے کہ ایسے امتزاج سے کس شان کی قومیت بنتی ہے ۔ وہ اسے بچوں کا کھیل سمجھتے ہیں اور بچوں ہی کی طرح اس کھیل کو کھیلنا چاہتے ہیں ۔

تہذیبی قومیت دراصل نام ہے ایک قوم کے مزاجِ عقلی اور نظامِ اخلاقی کا ۔ اور یہ چیز مصنوعی طور پر ایک دو دن میں نہیں بن جاتی ، بلکہ صدیوں میں اس کا نشو ونما فطری تدریج کے ساتھ ہوتا ہے ۔ صدہا برس تک جب کچھ لوگ نسلاً بعد نسلٍ ایک قوم کے عقائد اور رسوم و عادات کے تحت زندگی بسر کرتے ہیں ، تب کہیں جا کر ان میں ایک مشترک روح پیدا ہوتی ہے ، مشترک اخلاقی اوصاف مستحکم ہوتے ہیں ، ایک مخصوص مزاجِ عقلی بنتا ہے ، وہ روایات جڑ پکڑتی ہیں جن سے ان کے جذبات وحسیات (Sentiments) وابستہ ہوتے ہیں ، وہ لٹریچر پیدا ہوتا ہے جو ان کے دل و دماغ کا ترجمان ہوتا ہے ، اور وہ ذہنی و روحانی یک رنگی رونما ہوتی ہے جس سے ان میں باہمی اُنس اور تفاہم (Mutual — Intelligibility) — پیدا ہوتا ہے ۔ پھر جب ان گہرے اور مضبوط اثرات کے تحت کسی گروہ کی مستقل قومیت بن جاتی ہے ، یا دوسرے الفاظ میں جب اس کا اخلاقی اور

(بقیہ صفحہ ۳۶۵ سے) ان لوگوں کا بول بالا کرنا چاہتا ہے جو ہندو ہوں ۔ اور یہ مسلم نیشنلسٹ چونکہ مسلمان نامی قوم میں پیدا ہوتے ہیں اس لیے یہ ان لوگوں کا بول بالا کرنا چاہتے ہیں جو اس قوم سے تعلق رکھتے ہوں ۔ کسی اخلاقی مقصد اور کسی اصولی مسلک کو نہ وہ سے کر اٹھتا ہے نہ یہ ۔ اُس کی طرح ان کو بھی یہ بات مطمئن کر دے گی کہ اقتدار کی مسند پر مسلمان ، متمکن ہوں ، خواہ ان کی حکومت سراسر غیر اسلامی اصولوں پر ہی کیوں نہ قائم ہو اور ان کا طرزِ عمل غیر مسلموں کے طرزِ عمل سے کچھ بھی مختلف نہ ہو ۔

عقلی مزاج مستحکم ہو جاتا ہے، تو اس کے لیے کسی دوسرے گروہ کے ساتھ خلط ملط ہو کر کسی دوسری قومیت میں تبدیل ہو جانا تقریباً محال ہوتا ہے۔ بسا اوقات ایسے گروہ سیکڑوں برس تک ایک ہی آب و ہوا اور ایک ہی سرزمین میں پہلو بہ پہلو رہتے ہیں، مگر کسی قسم کا امتزاج واقع نہیں ہوتا۔ یورپ میں جرمن، ہنگیار، پول، چیک، یہودی، سلافی اور ایسی دوسری قومیں مدتوں سے ایک جگہ زندگی بسر کر رہی ہیں مگر آج تک ان کے درمیان امتزاج پیدا نہیں ہوا۔ انگریز اور آئرش صدیوں ایک ساتھ رہے مگر کسی طرح مل کر ایک نہ ہو سکے۔ کہیں کہیں ایسے گروہوں کی زبانیں بھی مشترک ہوتی ہیں۔ مگر زبان کے اشتراک سے دل و دماغ کا اشتراک رونما نہیں ہوتا۔ الفاظ مشترک ہوتے ہیں مگر وہ ہر قوم کے دل میں جو جذبات و خیالات پیدا کرتے ہیں وہ ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔

یکجا بود و باش اور طویل مدت تک باہمی اختلاط سے مختلف تہذیبی گروہوں کا مل کر ایک صحیح قسم کی مکمل اور متحدہ قومیت پیدا کرنا اُس صورت میں ممکن ہے، اور صرف اسی صورت میں وہ اعلیٰ درجہ کے تمدنی نتائج پیدا کر سکتا ہے، جب کہ ایسے گروہوں کے نظامِ اخلاقی اور مزاجِ عقلی میں کوئی بڑا اور اہم تفاوت نہ ہو، بلکہ وہ بڑی حد تک متشابہ الاخلاق ہوں۔ اس صورت میں ان کی الگ الگ خصوصیات اور ان کے جداگانہ قومی تشخصات مٹ جاتے ہیں اور ایک متحد نظامِ اخلاق بن جاتا ہے۔ مگر یہ عمل بھی اس طرح نہیں ہوتا جیسے ہتھیلی پر سرسوں جمائی جائے، بلکہ مدت ہائے دراز تک کسر و انکسار ہوتا رہتا ہے۔ تب کہیں مختلف اجزاء میں گھل مل کر ایک مزاج پیدا ہوتا ہے۔ انگلستان میں برٹن، سیکسن اور نارمنڈی قوموں نے ایک قوم بنتے بنتے سیکڑوں برس لیے ہیں۔ فرانس میں دس صدیوں سے یہ عمل جاری ہے اور اب تک قومیت کا خمیر پوری طرح تیار نہیں ہو سکا ہے۔ اٹلی میں اس وقت تک کوئی قومی رُوح پیدا نہیں ہو سکی ہے۔ حالانکہ وہ مختلف عناصر جن سے اطالوی قومیت کی ترکیب ہوئی ہے اخلاقی حیثیت سے باہم کوئی بیّن تفاوت نہیں رکھتے۔ ممالکِ متحدہ امریکہ میں ایک قومیت صرف اُن عناصر کے امتزاج سے بن سکی ہے جو بہت کچھ متشابہ الاخلاق تھے اور جن کو مشترک اغراض نے مجبور کر دیا تھا کہ اپنے خفیف

سے اختلاف و تفاوت کو جلدی سے دفن کرکے یک جان ہو جائیں۔ تاہم اس عمل نے بھی پایۂ تکمیل کو پہنچتے پہنچتے ڈھائی تین سو برس لیے ہیں۔

متشابہ الاخلاق قوموں کے امتزاج سے ایک صحیح اور عمدہ قسم کی قومیت بنا صرف اس لیے ممکن ہوتا ہے کہ انہیں اس عمل امتزاج کے دوران میں اپنے عقائد و نظریات اور اپنے اخلاقی معیاروں کو طلاق دینے اور اپنے اعلیٰ درجہ کے اخلاقی اوصاف کو جڑ سے اکھاڑنے کی ضرورت نہیں پیش آتی۔ یہ چیزیں ان کے درمیان پہلے ہی سے مشترک ہوتی ہیں۔ صرف روایات کے ردّ و بدل اور جذبات و حسیات اور مقاصد و اغراض کی جدید تعصیب (Readjustment) سے ہی ان کی نئی قومیت بن جاتی ہے۔ بخلاف اس کے جہاں مختلف الاخلاق قوموں میں کسی مصنوعی دباؤ، کسی جعلی کوشش اور بعض ادنیٰ درجہ کے محرکات سے امتزاج واقع ہوتا ہے وہاں ایک نہایت ذلیل قسم کی قومیت پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ اس صورت میں ان کے عقائد کی جڑیں ہل جاتی ہیں، ان کے اعلیٰ درجہ کے اخلاقی خصائص (جو ان کے امتیازی اوصاف تھے اور جن کی موجودگی میں امتزاج ممکن نہ تھا) مٹ جاتے ہیں، ان کے حسیاتِ ملی (جن پر ان کی قومیت کی اساس قائم تھی) فنا ہو جاتے ہیں، ان میں سے ہر قوم کو اپنے اپنے معیاراتِ فضل و شرف بدلنے پڑتے ہیں، اور ان کی نئی قومیت ان میں سے ہر ایک کے رذائلِ اخلاق کا مجموعہ بن کر رہ جاتی ہے۔ اس نوعیت کا امتزاج قوموں کے نظامِ اخلاق کو درہم برہم کر دیتا ہے اور نیا نظامِ اخلاق بننے کے لیے ایک طویل مدت درکار ہوتی ہے۔ اپنی اپنی سابق روایات سے ان کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے، اور نئی روایات بننے میں بہت دیر لگتی ہے۔ اپنے اپنے نیشنل ٹائپ کو وہ خود مسمار کر دیتے ہیں اور نیا ٹائپ ڈھلنے کے لیے بڑا وقت لیتا ہے۔ اس خطرناک حالت میں جو لوگ مبتلا ہو جاتے ہیں ان کی سیرت میں کوئی مضبوطی نہیں ہوتی۔ وہ دنیٔ الاخلاق، کم ظرف، تنگ حوصلہ، چھچھورے، متلون اور بے اصول ہوتے ہیں۔ ان کی حالت اُس پتے کی سی ہوتی ہے جو درخت سے ٹوٹ کر میدان میں جا پڑا ہو اور ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ اُڑتا پھرتا ہو، کہیں اس کو قرار نہ ہو۔ برازیل (جنوبی امریکہ) میں مختلف الاخلاق قوموں کے اختلاط و امتزاج کا حال جن لوگوں نے دیکھا

ہے وہ گواہی دیتے ہیں کہ یہ بلا تمام ان قوموں کے محاسن کو یکساں طور پر برباد کر رہی ہے جو اس کے زیرِ اثر آگئی ہیں، اور اس کی بدولت وہاں عقلی اور جسمانی حیثیت سے نہایت گھٹیا درجہ کی نسل پیدا ہو رہی ہے۔

ہندوستان میں جو تہذیبی قومیتیں پائی جاتی ہیں انہیں کوئی ایسا شخص متشابہ الاخلاق نہیں کہہ سکتا جو اجتماعیات میں کچھ بھی بصیرت رکھتا ہو، اور جو سیاسی خواہشات سے قطع نظر کرکے محض حقائق نفس الامری کی بنا پر رائے قائم کرتا ہو۔ ان قوموں کے درمیان اُس سے زیادہ گہرے اختلافات پائے جاتے ہیں جتنے یورپ کی مختلف تہذیبی قومیتوں کے درمیان موجود ہیں۔ یہاں عقائد میں بعد المشرقین ہے۔ اصولِ تہذیب ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ نظامِ اخلاق میں بیّن تفاوت ہے۔ روایات کے سرچشمے قطعی طور پر الگ ہیں۔ جذبات و حسیات باہم متناقض ہیں۔ اور ایک کا نیشنل ٹائپ اپنے خط و خال میں دوسرے کے نیشنل ٹائپ سے کوئی مماثلت نہیں رکھتا۔ یہاں محض سیاسی و معاشی اغراض کی خاطر ان مختلف قومیتوں کو مٹا کر ایک ممزوج و مخلوط قومیت پیدا کرنے کی کوشش لامحالہ وہی نتیجہ پیدا کرے گی جس کی طرف ہم نے پہلے اشارہ کیا ہے۔ بدقسمتی سے ڈیڑھ سو سال کے انگریزی اقتدار نے ان قوموں کو پہلے ہی اخلاقی انحطاط میں مبتلا کر دیا ہے۔ غلامی کا گھن ان کے جوہرِ شرافت کو پہلے ہی کھا چکا ہے۔ ان کی سیرتیں کمزور ہو چکی ہیں۔ ان کے عقائد جڑوں سے ہل چکے ہیں۔ ان کا تعلق اپنی روایات سے بہت کچھ ٹوٹ گیا ہے۔ ان کے نیشنل ٹائپ مضمحل ہو گئے ہیں۔ ان کا معیارِ اخلاق پست ہو گیا ہے۔ ان کے اخلاقی خصائص میں استحکام باقی نہیں رہا ہے۔ اور نئی نسلوں میں اس تنزل و انحطاط کے نہایت مکروہ نتائج دیکھے جا رہے ہیں۔ اس حالت میں قوم سازی کا عمل جاری کرنے کے لیے جب ان کی رہی سہی تہذیبی بنیادوں پر ضرب لگائی جائے گی تو یقین رکھیے کہ پورے مُلک کا نظامِ اخلاق درہم برہم ہو جائے گا اور اس کے نتائج نہایت ہولناک ہوں گے۔

کیا ہندوستان کا کوئی بہی خواہ یہاں نیشنلزم کا خواہشمند ہو سکتا ہے؟

وہ محض طفلانہ خام خیالی ہے جس کی بنا پر اس ملک کے سیاسی لیڈر بغیر سوچے سمجھے

رائے قائم کر لیتے ہیں کہ اجنبی طاقت کے تسلط سے نجات حاصل کرنے کے لیے یہاں نیشنلزم پیدا کرنے کی ضرورت ہے، اور نیشنلزم پیدا کرنے کے لیے ایک قومیت بنانے کی حاجت ہے، لہٰذا تمام موجودہ قومیتوں کو مٹا دو اور سب کی ایک قومیت بنا ڈالو۔ حالانکہ اگر ان لوگوں میں صحیح بصیرت موجود ہو اور یہ مغرب کی ذہنی غلامی سے آزاد ہو کر خود سوچنے سمجھنے کی کوشش کریں تو انہیں معلوم ہو جائے کہ یہ راستہ ہندوستان کی نجات کا نہیں، اس کی تباہی کا ہے۔

اوّلاً اس راستے سے آزادی حاصل کرنا درحقیقت نہایت دیر طلب کام ہے۔ سینکڑوں ہزاروں برس کی روایات پر جو تہذیبی قومیتیں قائم ہیں ان کا مٹنا، ان کی جگہ ایک نئی قومیت کا وجود میں آنا، اور پھر اس قومیت کا مستحکم اور مشتعل ہو کر نیشنلزم کی حد تک پہنچنا کھیل نہیں ہے۔ اس کے لیے بہرحال ایک طویل مدت درکار ہے، اور اگر آزادی کا حصول اسی پر موقوف ہے تو ہندوستان کو کم از کم ابھی دو تین نسلوں تک اس کا انتظار کرنا پڑے گا۔

ثانیاً اگر اس راستے سے آزادی حاصل ہو بھی جائے تو جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں، اس میں خطرہ یہ ہے کہ آخرکار تمام ملک اخلاقی انحطاط کے ہاویہ میں گر جائے گا۔

ثالثاً یہ ایک یقینی امر ہے کہ جن قوموں کو اپنی انفرادیت سے کچھ بھی لگاؤ باقی ہے وہ اس نوعیت کی قوم سازی کے خلاف پوری جدوجہد کریں گی، اور اس کش مکش میں آزادیٔ وطن کے لیے کوئی متحدہ کوشش نہ کی جا سکے گی۔ لہٰذا اجنبی تسلط سے نجات حاصل کرنے کے لیے شاید یہ دُور کا راستہ بھی نہیں ہے، بجائے کہ قریب کا راستہ ہو۔ اگر اس راستہ کو اختیار کرنے پر یُوں ہی اصرار کیا جاتا رہا تو کچھ بعید نہیں کہ سیاسی آزادی کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر ہو ہی نہ سکے۔

ان وجوہ سے میرے نزدیک وہ لوگ سخت نادان ہیں جو محض مغربی قوموں کی تقلید میں یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ مُلکی آزادی کے لیے بس نیشنلزم ہی ایک کارگر آلہ ہے۔ میں پہلے بھی بارہا کہہ چکا ہوں اور اب پھر کہتا ہوں کہ ہندوستان کی آزادی اور سیاسی و معاشی ترقی کے لیے سرے سے قومی وحدت اور نیشنلزم کی حاجت ہی نہیں ہے۔ جہاں مختلف

تہذیبی قومیتیں موجود ہوں وہاں قومی وحدت قائم کرنے کی کوشش کرنا نہ صرف یہ کہ غیر ضروری ہے، نہ صرف یہ کہ اصولاً غلط ہے، بلکہ نتائج کے اعتبار سے بھی مفید ہونے کے بجائے اُلٹا نقصان دہ ہے۔ ایسی جگہ وحدت نہیں بلکہ صرف وفاق کے اصول (Federal principles) ہی چل سکتے ہیں۔ ہر قوم کی مستقل حیثیت تسلیم کی جائے، اور صرف مشترک وطنی اغراض کی حد تک تمام قوموں کے درمیان اشتراکِ عمل (Joint Action) کا معاہدہ ہو جائے۔ بس یہی ایک صورت ہے جس سے ملک کی تمام جماعتوں میں اپنی انفرادیت کے بقاء و تحفظ کا اطمینان پیدا ہو سکتا ہے، اور یہی چیز ملک کی تمام قوتوں کو سیاسی ترقی کی جدوجہد میں ایک محاذِ جنگ پر مجتمع کر سکتی ہے۔

فرنگی لباس

اب مجھے چند الفاظ مولانا سندھی کے اس آخری نقطے کے متعلق بھی عرض کرنے ہیں جس میں انہوں نے نکٹائی اور پتلون اور ہیٹ کے استعمال کا مشورہ دیا ہے۔

یہ مشرقی قوم پرست بھی کچھ عجیب قسم کی مخلوق ہیں۔ ایک طرف یہ بڑے زور شور کے ساتھ قوم پرستی کا پرچار کرتے ہیں، دوسری طرف انہیں غیر قوم اور غیر ملک کا لباس اور تمدن اختیار کرنے میں کوئی باک نہیں ہوتا۔ اور اس پر بھی بس نہیں، یہ اس اجنبی لباس و تمدن کو اپنی قوم میں رواج دینے کی اس طرح کوشش کرتے ہیں کہ گویا یہ بھی قوم پرستی کے پروگرام کا کوئی حصہ ہے، حتیٰ کہ جہاں ان کا بس چلتا ہے وہاں یہ زبردستی اُس کو لوگوں کے سر منڈھنے میں بھی دریغ نہیں کرتے۔ ہندوستان، ایران، مصر، ٹرکی ہر جگہ ان حضرات کی یہی روش ہے۔ حالانکہ قوم پرستی —— اگر اس لفظ کے مفہوم میں قومی غیرت کا بھی کچھ حصہ ہو —— اس بات کی فطری طور پر متقاضی ہے کہ آدمی خود اپنی قوم کے لباس اور طرزِ تمدن پر قائم رہے، اسی میں عزت اور شرف محسوس کرے، اور اسی پر فخر کرنا سیکھے۔ جہاں سرے سے یہ چیز بالکل ہی مفقود ہے وہاں قوم پرستی خدا جانے کہاں سے آجاتی ہے؟ غیرتِ اسلامی کا فقدان اور قوم پرستی، دونوں صریح طور پر ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ مگر ہمارے مشرقی قوم پرست اضداد کو جمع کرنے میں کمال رکھتے

ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ خیالات اور اعمال میں تناقض سے محفوظ رہنے کے لیے ذہنِ سلیم اور نظرِ سدید درکار ہے، اور یہ چیز اگر حاصل ہو تو آدمی فطرت کی سیدھی صاف راہ چھوڑ کر قوم پرستی ہی کیوں اختیار کر لے؟

اسلام اس معاملہ میں بھی ان حضرات کا ساتھ دینے سے انکار کرتا ہے۔ زندگی کے ہر معاملہ میں سیدھا صاف، معقول اور فطری راستہ جو ہو سکتا ہے اسی کا نام اسلام ہے، اور وہ جس طرح قومیت کے مبالغے اور اس کی افراط (یعنی قوم پرستی) کا ساتھ نہیں دیتا اسی طرح کسی ایسی چیز کا ساتھ بھی نہیں دیتا جو قومیت کی جائز فطری حد بندیوں کو توڑنے والی، اور قوموں کی انفرادیت (Individuality) یا ان کے امتیازی خصائص کو مٹانے اور ان کے اندر رذائلِ اخلاق پیدا کرنے والی ہو۔

قرآن مجید ہمیں یہ بتاتا ہے کہ انسان اگرچہ سب ایک ہی اصل سے ہیں مگر اللہ تعالیٰ نے ان کے درمیان دو قسم کے امتیاز رکھے ہیں۔ ایک عورت اور مرد کا امتیاز، دوسرا نسب اور قبیلہ اور قومیت کا امتیاز۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا۔ (الحجرات۔ ۱۳)

لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد و عورت سے پیدا کیا اور تمہیں قوموں اور قبیلوں میں تقسیم کر دیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔

وَاَنَّهٗ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى۔ (النجم ۴۵)

اور اللہ نے مرد اور عورت دو صنفیں پیدا کیں۔

یہ دونوں قسم کے امتیازات انسانی تمدن اور اجتماعی زندگی کی بنیاد ہیں۔ اور فطرت الٰہی کا تقاضا یہ ہے کہ ان کو صحیح حدود کے ساتھ باقی رکھا جائے۔ عورت اور مرد کا امتیاز اس لیے ہے کہ ان کے درمیان نفسیاتی کشش ہو، لہٰذا ضروری ہوا کہ تمدن و معاشرت میں دونوں کے اوصافِ امتیازی پوری طرح محفوظ رکھے جائیں۔ اور قوموں کا امتیاز اس لیے ہے کہ تمدنی اغراض کے لیے انسانوں کے ایسے اجتماعی دائرے اور حلقے بن سکیں

جن کے درمیان آسانی کے ساتھ باہمی تعاون ہو سکے، لہٰذا ضروری ہوا کہ ہر گروہ یا ہر تمدنی و
اجتماعی حلقے کے کچھ امتیازی اوصاف ہوں جن کے ذریعہ سے ایک حلقہ کے آدمی ایکدوسرے
کو پہچان سکیں، باہم مانوس ہوں، ایک دوسرے کو سمجھ سکیں، اور دوسرے حلقوں کے
آدمیوں میں فرق کر سکیں۔ اِس قسم کے امتیازی اوصاف ظاہر ہے کہ زبان، لباس، طرزِ زندگی،
اور شانِ تمدن ہی ہو سکتے ہیں۔ پس یہ عین فطرت کا تقاضا ہے کہ ان کی حفاظت کیجائے۔

اِسی بنا پر اسلام میں تشبّہ کی ممانعت کی گئی ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ نبی
صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی ہے اس عورت پر جو مرد کا سا لباس پہنے اور اس
مرد پر جو عورت کا سا لباس پہنے[1]۔ دوسری حدیث میں ہے کہ آپؐ نے ملعون قرار دیا ان
مردوں کو جو عورتوں کے مشابہ بنیں اور ان عورتوں کو جو مردوں کے مشابہ بنیں[2]۔ یہ اس لیے
کہ عورت اور مرد کے درمیان جو نفسیاتی کشش اللہ نے رکھی ہے، یہ تشبہ اس کو دباتا اور
گھٹاتا ہے، اور اسلام اس کو قائم رکھنا چاہتا ہے۔ اِسی طرح قوموں کے لباس و تمدن اور
شعائر کو بھی مٹانا اور انہیں خلط ملط کرنا، اجتماعی مفاد و مصالح کے خلاف ہے، لہٰذا
اسلام اس کی بھی مخالفت کرتا ہے۔ قومی امتیاز کو ——— جب فطری حدود سے بڑھا
کر قوم پرستی بنایا جائے گا تو اسلام اس کے خلاف جہاد کرے گا، کیونکہ اس مادّے سے
جاہلانہ حمیت، ظالمانہ تعصب، اور قیصریت کی تخلیق ہوتی ہے۔ لیکن اسلام کی دشمنی
قوم پرستی سے ہے نہ کہ قومیت سے، قوم پرستی کے برعکس قومیت کو وہ برقرار رکھنا چاہتا
ہے، اور اسے مٹانے کا بھی وہ ویسا ہی مخالف ہے جیسا کہ اس کو حد سے بڑھانے کا مخالف ہے۔
چنانچہ اس سلسلہ میں جو متوسط اور متوازن رویہ اسلام نے اختیار کیا ہے اس کو سمجھنے کے لیے حسبِ
ذیل آثار بغور ملاحظہ فرمایئے:۔

(۱) ایک صحابی نے پوچھا کہ عصبیت کیا چیز ہے؟ کیا آدمی کا اپنی قوم سے محبت کرنا

---

[1] المستدرک۔ جلد ۴۔ صفحہ ۱۹۴۔

[2] بخاری۔ کتاب اللباس۔

عصبیت ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، "نہیں، عصبیت یہ ہے کہ کوئی ظلم میں اپنی قوم کا ساتھ دے۔" (ابن ماجہ)

(۲) فرمایا: "جو شخص کسی قوم کی مشابہت اختیار کرے گا وہ اسی قوم میں شمار ہوگا۔"
(ابوداؤد)

(۳) حضرت عمرؓ نے آذربائجان کے گورنر عتبہ بن فرقد کو لکھا، کہ "خبردار اہلِ شرک (یعنی باشندگان آذربائجان) کے لباس اختیار نہ کرنا۔" (کتاب اللباس والزینۃ)

(۴) حضرت عمرؓ نے اپنے تمام گورنروں کو عام احکام دیئے تھے کہ غیر مسلم باشندوں کو اہلِ عرب کے لباس اور وضع و ہیئت اختیار کرنے سے روکیں۔ حتیٰ کہ بعض علاقوں کے باشندوں سے صلح کرتے وقت باقاعدہ معاہدہ میں ایک مستقل دفعہ اس مضمون کی داخل کر دی گئی تھی کہ تم ہمارے جیسے لباس نہ پہننا۔ (کتاب الخراج۔ امام ابو یوسف)

(۵) جو اہلِ عرب فوجی یا ملکی خدمات کے سلسلہ میں عراق و ایران وغیرہ ممالک میں مامور تھے، ان کو حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ بار بار تاکید کرتے تھے کہ اپنی زبان اور لہجہ کی حفاظت کریں اور عجمی بولیاں نہ بولنے لگیں۔ (بیہقی)

ان روایات سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ اسلام جس بین الاقوامیت کا علمبردار ہے اس کا منشا یہ ہرگز نہیں ہے کہ قوموں کی امتیازی خصوصیات کو مٹا کر انہیں خلط ملط کر دیا جائے۔ بلکہ وہ قوموں کو ان کی قومیت اور خصوصیات کے ساتھ برقرار رکھ کر ان کے درمیان تہذیب و اخلاق اور عقائد و افکار کا ایک ایسا رشتہ پیدا کرنا چاہتا ہے جس سے بین الاقوامی کشیدگیاں، رکاوٹیں، ظلم اور تعصبات دور ہو جائیں اور ان کے درمیان تعاون و برادری کے تعلقات قائم ہوں۔

تشبّہ کا ایک اور پہلو بھی ہے جس کی بنا پر اسلام اس کا سخت مخالف ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ایک قوم کے لوگ اپنی قومی خصوصیات کو صرف اسی وقت چھوڑتے ہیں جب ان کے اندر کوئی نفسی کمزوری اور اخلاقی ذلیل پیدا ہو جاتی ہے۔ جو شخص دوسروں کا اثر قبول کر کے اپنا رنگ چھوڑ دے اور ان کے رنگ میں رنگ جائے، لامحالہ اس کے اندر تلوّن،

چھچھورپن، سرعتِ انفعال اور خفیف الحرکتی کا مرض ضرور ہوگا۔ اگر اس کی روک تھام نہ کی جائے گی تو یہ مرض ترقی کرے گا۔ اگر بکثرت لوگوں میں یہ پھیل گیا تو ساری قوم نفسیاتی ضعف میں مبتلا ہو جائے گی۔ اُس کے اخلاق میں کوئی پختگی باقی نہ رہے گی۔ اس کے ذہن کی چولیں اتنی ڈھیلی ہو جائیں گی کہ ان پر اخلاق اور خصائص کی مستحکم بنیادیں قائم ہی نہ ہو سکیں گی۔ لہٰذا اسلام کسی قوم کو بھی یہ اجازت دینے کے لیے تیار نہیں ہے کہ وہ اپنے اندر اس نفسی بیماری کو پرورش کرے، مسلمانوں ہی کو نہیں، بلکہ جہاں اس کا بس چلتا ہے، وہ غیر مسلموں کو بھی اس سے بچانے کی کوشش کرتا ہے، کیونکہ وہ کسی انسان میں بھی اخلاقی کمزوری دیکھنا نہیں چاہتا۔

خصوصیت کے ساتھ مفتوح و مغلوب لوگوں میں یہ مرض زیادہ پھیلتا ہے۔ ان کے اندر محض اخلاقی ضعف ہی نہیں ہوتا بلکہ درحقیقت وہ اپنی نگاہوں میں آپ ذلیل ہو جاتے ہیں۔ اپنے آپ کو خود حقیر سمجھتے ہیں اور اپنے حکمرانوں کی نقل اُتار کر عزت اور فخر حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ عزت، شرافت، بزرگی، تہذیب، شائستگی، غرض جس چیز کا بھی وہ تصور کرتے ہیں اس کا مثالی نمونہ انہیں اپنے آقاؤں کی صورت ہی میں نظر آتا ہے۔ غلامی اُن کے جوہرِ آدمیت کو اس طرح کھا جاتی ہے کہ وہ علانیہ اپنی ذلت اور پستی کا مجسم اشتہار بننے پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور اس میں شرم محسوس کرنے کے بجائے فخر محسوس کرتے ہیں۔[1] اسلام جو انسان کو پستیوں سے اُٹھا کر بلندی کی طرف لے جانے آیا ہے، ایک لمحہ کے لیے بھی اس کو

---

[1] ہمارے اس بیان کی صداقت میں اگر کسی صاحب کو شک ہو تو وہ ہندوستان ہی میں انگریزوں اور ہندوستانیوں کے فرق کو دیکھ لیں۔ مٹھی بھر انگریز متفرق و پراگندہ، ڈھائی سو برس سے کروڑوں ہندوستانیوں کے درمیان رہتے ہیں مگر ایک انگریز بھی آپ کو ایسا نہ ملے گا جس نے ہندوستانی لباس اختیار کر لیا ہو۔ بخلاف اس کے ان ہندوستانیوں کا شمار کرنا بھی اب مشکل ہے جو سر سے پاؤں تک انگریز نما بنے پھرتے ہیں اور لباس ہی میں نہیں بلکہ اپنی بول چال، انداز و اطوار، حرکات و سکنات ہر چیز میں انگریز کا چربہ اُتارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آخر اس کی کیا توجیہ کی جائے گی؟

جائز نہیں رکھتا کہ کوئی انسانی گروہ ذلتِ نفس کے اس اسفل السافلین میں گر جائے جس سے نیچے پستی کا کوئی اور درجہ ہے ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت عمرؓ کے زمانہ میں عجمی قومیں اسلامی حکومت کے زیرنگیں آئیں تو آپ نے ان کو سختی کے ساتھ اہلِ عرب کی نقالی سے روکا۔ اسلامی جہاد کا مقصد ہی باطل ہو جاتا اگر ان قوموں میں غلامانہ خصائل پیدا ہونے دیے جاتے۔ رسول اللہؐ نے عربوں کو اسلام کا پرچم اس لیے نہیں دیا تھا کہ وہ قوموں کے آقا بنیں اور قومیں ان کے ماتحت غلامی کی مشق بہم پہنچائیں۔

ان وجوہ سے اسلام اس بات کا مخالف ہے کہ کوئی قوم دوسری قوم کا ہو بہو چربہ بننے کی کوشش کرے اور اس کے لباس و طرزِ معاشرت کی نقالی کرنے لگے۔ رہا تہذیب و تمدن کا وہ لین دین جو ایک دوسرے سے میل جول رکھنے والی قوموں میں فطری طور پر واقع ہوتا ہے تو اسلام اس کو نہ صرف جائز رکھتا ہے بلکہ فروغ دینا چاہتا ہے۔ وہ قوموں کے درمیان تعصبات کی ایسی دیواریں کھڑی کرنا نہیں چاہتا کہ اپنے تمدن میں ایک دوسرے کی کوئی چیز سرے سے لیں ہی نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شامی جُبّہ پہنا ہے جو یہودیوں کے لباس کا جزء تھا، چنانچہ حدیث میں ہے فتوضأ وعليه جبة شامية۔ آپؐ نے تنگ آستینوں والا رومی جُبّہ بھی پہنا ہے جسے رومن کیتھولک عیسائی پہنتے تھے۔ نوشیروانی قبا بھی آپؐ کے استعمال میں رہی ہے جسے حدیث میں جبة طيالسة كسروانية کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بُرنُس پہنی ہے جو ایک قسم کی اونچی ٹوپی ہوتی تھی اور عیسائی درویشوں کے لباس کا جزء تھی۔ اس قسم کی متفرق چیزوں کا استعمال تشبہ سے بالکل مختلف چیز ہے۔ تشبہ یہ ہے کہ آدمی کی پوری وضع قطع کسی دوسری قوم کے مانند ہو اور اس کو دیکھ کر یہ تمیز کرنا مشکل ہو جائے کہ وہ کس قوم سے تعلق رکھتا ہے۔ بخلاف اس کے جسے ہم "لین دین" کے لفظ سے تعبیر کر رہے ہیں وہ یہ ہے کہ ایک قوم دوسری قوم کی کوئی اچھی یا مناسب حال چیز لے کر اُسے اپنی وضع قطع کا جزء بنا لے، اور اس جزء کے شامل

ہونے پر بھی اس کی قومی وضع بحیثیت مجموعی قائم رہے[1]

(ترجمان القرآن ۵۸ھ ۔ ۳۹ء)

---

[1] اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کے لیے،
مطبوعہ اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ ۔ لاہور

اِسلامی قومیت کا حقیقی مفہوم[1]

زمانۂ حال میں مسلمانوں کی جماعت کے لیے لفظ "قوم" کا استعمال کثرت کے ساتھ کیا گیا ہے اور عموماً یہی اصطلاح ہماری اجتماعی حیثیت کو ظاہر کرنے کے لیے رائج ہو چکی ہے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے اور بعض حلقوں کی طرف سے اس کا ناجائز فائدہ اٹھانے کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ قرآن اور حدیث میں مسلمانوں کے لیے لفظ "قوم" (یا نیشن کے معنی میں کسی دوسرے لفظ کو) اصطلاح کے طور پر استعمال نہیں کیا گیا۔ میں مختصراً یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ان الفاظ میں اصلی قباحت کیا ہے جس کی وجہ سے اسلام میں ان سے پرہیز کیا گیا، اور وہ دوسرے الفاظ کون سے ہیں جن کو قرآن و حدیث میں استعمال کیا گیا ہے۔ یہ محض ایک علمی بحث نہیں ہے، بلکہ اس سے ہمارے اُن بہت سے تصورات کی غلطی واضح ہو جاتی ہے جن کی بدولت زندگی میں ہمارا رویہ بنیادی طور پر غلط ہو کر رہ گیا ہے۔

لفظ "قوم" اور اس کا ہم معنی انگریزی لفظ (Nation)، یہ دونوں دراصل

---

[1] یہ مضمون ترجمان القرآن بابت جون ۳۹ء میں شائع ہوا تھا۔ موضوع کی مناسبت سے یہاں شامل کیا جا رہا ہے۔ مرتب

جاہلیت کی اصطلاحیں ہیں۔ اہلِ جاہلیت نے "قومیت" (Nationality) کو کبھی خالص تہذیبی بنیاد (Cultural Basis) پر قائم نہیں کیا، نہ قدیم جاہلیت کے دور میں، اور نہ جدید جاہلیت کے دور میں۔ اُن کے دل و دماغ کے ریشوں میں نسلی اور وطنی علائق کی محبت کچھ اس طرح پلادی گئی ہے کہ وہ نسلی روابط اور تاریخی روایات کی وابستگی سے قومیت کے تصور کو کبھی پاک نہ کر سکے۔ جس طرح قدیم عرب میں قوم کا لفظ عموماً ایک نسل یا ایک قبیلہ کے لوگوں پر بولا جاتا تھا اُسی طرح آج بھی لفظ "نیشن" کے مفہوم میں مشترک جنسیت (Common Descent) کا تصور لازمی طور پر شامل ہے۔ اور یہ چیز چونکہ بنیادی طور پر اسلامی تصورِ اجتماع کے خلاف ہے، اس وجہ سے قرآن میں لفظ قوم اور اس کے ہم معنی دوسرے عربی الفاظ مثلاً شَعب وغیرہ کو مسلمانوں کی جماعت کے لیے اصطلاح کے طور پر استعمال نہیں کیا گیا۔ ظاہر ہے کہ ایسی اصطلاح اُس جماعت کے لیے کیونکر استعمال کی جاسکتی تھی جس کے اجتماع کی اساس میں خون اور خاک اور رنگ اور اس نوع کی دوسری چیزوں کا قطعاً کوئی دخل نہ تھا، جس کی تالیف و ترکیب محض اصول اور مسلک کی بنیاد پر کی گئی تھی، اور جس کا آغاز ہی ہجرت اور قطع نسب اور ترکِ علائقِ مادی سے ہوا تھا۔

قرآن نے جو لفظ مسلمانوں کی جماعت کے لیے استعمال کیا ہے وہ "حزب" ہے جس کے معنی پارٹی کے ہیں۔ قومیں نسل و نسب کی بنیاد پر اُٹھتی ہیں، اور پارٹیاں اصول و مسلک کی بنیاد پر۔ اس لحاظ سے مسلمان حقیقت میں قوم نہیں بلکہ ایک پارٹی ہیں۔ کیونکہ ان کو تمام دنیا سے الگ، اور ایک دوسرے سے وابستہ صرف اس بنا پر کیا گیا ہے کہ یہ ایک اصول اور مسلک کے معتقد اور پیرو ہیں۔ اور جن سے ان کا اصول و مسلک میں اشتراک نہیں وہ خواہ ان سے قریب ترین مادی رشتے ہی کیوں نہ رکھتے ہوں، ان کے ساتھ ان کا کوئی میل نہیں ہے۔ قرآن روئے زمین کی اس پوری آبادی میں صرف دو ہی پارٹیاں دیکھتا ہے۔ ایک اللہ کی پارٹی (حزب اللہ)، دوسرے شیطان کی پارٹی (حزب الشیطان)۔ شیطان کی پارٹی میں خواہ باہم اصول و مسلک کے اعتبار سے کتنے

ہی اختلاف ہوں، قرآن ان سب کو ایک سمجھتا ہے۔ کیونکہ ان کا طریقِ فکر اور طریقِ عمل بہرحال اسلام نہیں ہے اور جزئی اختلافات کے باوجود بہرحال وہ سب شیطان کے اتباع پر متفق ہیں۔ قرآن کہتا ہے :-

اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ فَاَنْسٰهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ ، اُولٰٓئِكَ حِزْبُ الشَّيْطٰنِ

شیطان اُن پر غالب آگیا اور اُس نے خدا سے اُنہیں غافل کر دیا۔ وہ شیطان کی پارٹی کے لوگ ہیں اور جان رکھو کہ شیطان کی پارٹی آخر کار نامراد ہی رہنے والی ہے۔

برعکس اس کے اللہ کی پارٹی والے خواہ نسل اور وطن اور زبان اور تاریخی روایات کے اعتبار سے باہم کتنے ہی مختلف ہوں، بلکہ چاہے ان کے آباؤ اجداد میں باہم خونی عداوتیں ہی کیوں نہ رہ چکی ہوں، جب وہ خدا کے بتائے ہوئے طریقِ فکر اور مسلکِ حیات میں متفق ہو گئے تو گویا الٰہی رشتے (حبل اللہ) سے باہم جُڑ گئے اور اس نئی پارٹی میں داخل ہوتے ہی ان کے تمام تعلقات حزب الشیطان والوں سے کٹ گئے۔

پارٹی کا یہ اختلاف باپ اور بیٹے تک کا تعلق توڑ دیتا ہے، حتیٰ کہ بیٹا باپ کی وراثت تک نہیں پا سکتا۔ حدیث کے الفاظ ہیں لا يتوارث اهل ملتين۔ دو ملتوں کے لوگ آپس میں ایک دوسرے کے وارث نہیں ہو سکتے۔

پارٹی کا یہ اختلاف بیوی کو شوہر سے جُدا کر دیتا ہے حتیٰ کہ اختلاف رونما ہوتے ہی دونوں پر ایک دوسرے کی مواصلت حرام ہو جاتی ہے، محض اس لیے کہ دونوں کی زندگی کے راستے جُدا ہو چکے۔ قرآن میں ہے۔ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ۔ نہ وہ ان کے لیے حلال، نہ یہ ان کے لیے حلال۔

پارٹی کا یہ اختلاف ایک برادری، ایک خاندان کے آدمیوں میں پورا معاشرتی مقاطعہ کرا دیتا ہے حتیٰ کہ حزب اللہ والے کے لیے خود اپنی نسلی برادری کے اُن لوگوں میں شادی بیاہ کرنا حرام ہو جاتا ہے جو حزب الشیطان سے تعلق رکھتے ہوں۔ قرآن کہتا ہے "مشرک

عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک کہ وہ ایمان نہ لائیں۔ مومن لونڈی مشرک بیگم سے بہتر ہے، خواہ وہ تمہیں کتنی ہی پسند ہو۔ اور اپنی عورتوں کے نکاح بھی مشرک مردوں سے نہ کرو جب تک کہ وہ ایمان نہ لائیں۔ مومن غلام مشرک آزاد شخص سے بہتر ہے چاہے وہ تمہیں کتنا ہی پسند ہو" (البقرہ۔ ۲۲۱)

پارٹی کا اختلاف نسلی و وطنی قومیت کا تعلق صرف کاٹ ہی نہیں دیتا بلکہ دونوں میں ایک مستقل نزاع قائم کر دیتا ہے جو دائماً قائم رہتی ہے تاوقتیکہ وہ اللہ کی پارٹی کے اصول تسلیم نہ کرلیں۔ قرآن کہتا ہے :۔

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ إِذْ قَالُوا لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَآءُ مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا حَتَّىٰ تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَحْدَهُ إِلَّا قَوْلَ إِبْرَاهِيمَ لِأَبِيهِ لَأَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ - (الممتحنہ ۴)

"تمہارے لیے بہترین نمونہ ابراہیم اور اس کے ساتھیوں میں ہے۔ ان لوگوں نے اپنی (نسلی) قوم والوں سے صاف کہہ دیا تھا کہ ہمارا تم سے اور تمہارے اِن معبودوں سے جن کی تم خدا کو چھوڑ کر بندگی کرتے ہو، کوئی واسطہ نہیں۔ ہم تم سے بے تعلق ہو چکے اور ہمارے تمہارے درمیان ہمیشہ کے لیے عداوت پڑ گئی تاوقتیکہ تم خدائے واحد پر ایمان نہ لاؤ۔ مگر تمہارے لیے ابراہیم کے اِس قول میں نمونہ نہیں ہے کہ اس نے اپنے کافر باپ سے کہا کہ میں تیرے لیے بخشش کی دُعا کروں گا"

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ إِبْرَاهِيمَ لِأَبِيهِ إِلَّا عَنْ مَوْعِدَةٍ وَعَدَهَا إِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ أَنَّهُ عَدُوٌّ لِلَّهِ تَبَرَّأَ مِنْهُ

(توبہ - ۱۱۴)

"ابراہیم کا اپنے باپ کے لیے بخشش کی دُعا کرنا محض اُس وعدے

کی بنا پر تھا جو وہ اس سے رکھتا تھا۔ مگر جب اس پر کھل گیا کہ اس کا باپ خدا کا دشمن ہے تو وہ اس سے دستبردار ہو گیا۔"

پارٹی کا یہ اختلاف ایک خاندان والوں اور قریب ترین رشتہ داروں کے درمیان بھی محبت کا تعلق حرام کر دیتا ہے، حتیٰ کہ اگر باپ اور بھائی اور بیٹے بھی حزب الشیطان میں شامل ہوں تو حزب اللہ والا اپنی پارٹی سے غداری کرے گا اگر ان سے محبت رکھے۔ قرآن میں ارشاد ہے :-

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ...... اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ (المجادلہ ۲۲)

"تم ایسا ہرگز نہ پاؤ گے کہ کوئی جماعت اللہ اور یوم آخر پر ایمان بھی رکھتی ہو اور پھر اللہ اور رسول کے دشمنوں سے دوستی بھی رکھے خواہ وہ ان کے باپ، بیٹے، بھائی یا رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ اللہ کی پارٹی کے لوگ ہیں اور جان رکھو کہ آخر کار اللہ کی پارٹی والے ہی فلاح پانے والے ہیں۔"

دوسرا لفظ جو پارٹی ہی کے معنی میں قرآن نے مسلمانوں کے لیے استعمال کیا ہے وہ لفظ "امت" ہے۔ حدیث میں بھی یہ لفظ کثرت سے مستعمل ہوا ہے۔ امت اُس جماعت کو کہتے ہیں جس کو کسی امر جامع نے مجتمع کیا ہو۔ جن افراد کے درمیان کوئی اصل مشترک ہو ان کو اسی اصل کے لحاظ سے "امت" کہا جاتا ہے۔ مثلاً ایک زمانہ کے لوگ بھی "امت" کہے جاتے ہیں۔ مسلمانوں کو جس اصلِ مشترک کی بنا پر امت کہا گیا ہے وہ نسل یا وطن یا معاشی اغراض نہیں ہیں بلکہ وہ ان کی زندگی کا مشن اور ان کی پارٹی کا اصول اور مسلک ہے۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے :-

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ۔

(آل عمران - ۱۱۰)

تم وہ بہترین امت ہو جسے نوع انسانی کے لیے نکالا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور خدا پر ایمان رکھتے ہو۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا۔

(البقرہ: ۱۴۳)

"اور اس طرح ہم نے تم کو ایک بیچ کی امت بنایا ہے تاکہ تم نوعِ انسانی پر نگران رہو اور رسول تم پر نگران ہو۔"

ان آیات پر غور کیجیے۔ "بیچ کی امت" سے مراد یہ ہے کہ "مسلمان" ایک بین الاقوامی جماعت (International Party) کا نام ہے۔ دنیا کی ساری قوموں میں سے اُن اشخاص کو چھانٹ کر نکال لایا گیا ہے جو ایک خاص اصول کو ماننے، ایک خاص پروگرام کو عمل میں لانے اور ایک خاص مشن کو انجام دینے کے لیے تیار ہوں۔ یہ لوگ چونکہ ہر قوم میں سے نکلے ہیں اور ایک پارٹی بن جانے کے بعد کسی قوم سے ان کا تعلق نہیں رہا ہے اس لیے یہ بیچ کی اُمت ہیں۔ لیکن ہر ہر قوم سے تعلق توڑنے کے بعد سب قوموں سے اُن کا ایک دوسرا تعلق قائم کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ دنیا میں خدائی فوجدار کے فرائض انجام دیں۔ "تم نوعِ انسانی پر نگران ہو" کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ مسلمان خدا کی طرف سے دنیا میں فوجدار مقرر کیا گیا ہے۔ اور "نوعِ انسانی کے لیے نکالا گیا ہے" کا فقرہ صاف کہہ رہا ہے کہ مسلمان کا مشن ایک عالمگیر مشن ہے۔ اس مشن کا خلاصہ یہ ہے کہ "حزب اللہ" کے رہبر سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو فکر و عمل کا جو ضابطہ خدا نے دیا تھا اس کو تمام ذہنی، اخلاقی اور مادی طاقتوں سے کام لے کر دنیا میں نافذ کیا جائے اور اس کے مقابلہ میں ہر دوسرے طریقہ کو مغلوب کر دیا جائے۔ یہ ہے وہ چیز جس کی بنیاد پر مسلمان ایک امت بنائے گئے ہیں۔

تیسرا اصطلاحی لفظ جو مسلمانوں کی اجتماعی حیثیت ظاہر کرنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بکثرت استعمال کیا ہے وہ لفظ "جماعت" ہے۔ اور یہ لفظ بھی "حزب"

کی طرح پارٹی کا ہم معنی ہے ۔ علیکم بالجماعۃ اور ید اللّٰہ علی الجماعۃ اور ایسی ہی بکثرت احادیث پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لفظ "قوم" یا "شعب" یا اس کے ہم معنی دوسرے الفاظ استعمال کرنے سے قصداً احتراز فرمایا اور ان کے بجائے "جماعت" ہی کی اصطلاح استعمال کی۔ آپ نے کبھی یہ نہ فرمایا کہ "ہمیشہ قوم کیساتھ رہو" یا "قوم پر خدا کا ہاتھ ہے" بلکہ ایسے تمام مواقع پر آپ جماعت ہی کا لفظ استعمال فرماتے تھے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے اور یہی ہو سکتی ہے کہ مسلمانوں کے اجتماع کی نوعیت ظاہر کرنے کے لیے "قوم" کے بجائے جماعت، حزب اور پارٹی ہی کے الفاظ ہی زیادہ مناسب ہیں۔ قوم کا لفظ جن معنوں میں عموماً مستعمل ہوتا ہے ان کے لحاظ سے ایک شخص خواہ وہ کسی مسلک اور کسی اصول کا پیرو ہو، ایک قوم میں شامل رہ سکتا ہے جب کہ وہ اس قوم میں پیدا ہوا ہو اور اپنے نام، طرزِ زندگی اور معاشرتی تعلقات کے اعتبار سے اس قوم کے ساتھ منسلک ہو۔ لیکن پارٹی، جماعت اور حزب کے الفاظ جن معنوں میں مستعمل ہوتے ہیں، ان کے لحاظ سے اصول اور مسلک ہی پر پارٹی میں شامل ہونے یا اس سے خارج ہونے کا مدار ہوتا ہے۔ آپ ایک پارٹی کے اصول و مسلک سے ہٹ جانے کے بعد ہرگز اس میں شامل نہیں رہ سکتے، نہ اس کا نام استعمال کر سکتے ہیں، نہ اس کے نمائندے بن سکتے ہیں، نہ اس کے مفاد کے محافظ بن کر نمودار ہو سکتے ہیں اور نہ پارٹی والوں سے آپ کا کسی طور پر تعاون ہو سکتا ہے۔ اگر آپ یہ کہیں کہ میں پارٹی کے اصول و مسلک سے تو متفق نہیں ہوں۔ لیکن میرے والدین اس پارٹی کے ممبر رہ چکے ہیں، اور میرا نام اس کے ممبروں سے ملتا جلتا ہے، اس لیے مجھ کو بھی ممبروں کے سے حقوق ملنے چاہئیں تو آپ کا یہ استدلال اتنا مضحکہ انگیز ہوگا کہ شاید سننے والوں کو آپ کی دماغی حالت پر شبہ ہونے لگے گا۔ لیکن پارٹی کے تصور کو قوم کے تصور سے بدل ڈالیے۔ اس کے بعد یہ سب حرکات کرنے کی گنجائش نکل آتی ہے۔

اسلام نے اپنی بین الاقوامی پارٹی کے ارکان میں یک جہتی اور ان کی معاشرت میں یکسانی پیدا کرنے کے لیے اور ان کو ایک سوسائٹی بنا دینے کے لیے حکم دیا تھا کہ آپس ہی

میں بیاہ شادی کرو۔ اس کے ساتھ ہی ان کی اولاد کے لیے تعلیم و تربیت کا ایسا انتظام تجویز کیا گیا تھا کہ وہ خود بخود پارٹی کے اصول و مسلک کے پیرو بن کر اٹھیں اور تبلیغ کے ساتھ ساتھ افزائشِ نسل سے بھی پارٹی کی قوت بڑھتی رہے۔ یہیں سے اِس پارٹی کے قوم بننے کی ابتدا ہوتی ہے۔ بعد میں مشترک معاشرت، نسلی تعلقات اور تاریخی روایات نے اس قومیت کو زیادہ مستحکم کر دیا۔

اس حد تک جو کچھ ہوا درست ہوا۔ لیکن رفتہ رفتہ مسلمان اِس حقیقت کو بھولتے چلے گئے کہ وہ دراصل ایک پارٹی ہیں، اور پارٹی ہونے کی حیثیت ہی پر ان کی قومیت کی اساس رکھی گئی ہے۔ یہ بھلاوا بڑھتے بڑھتے اب یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ پارٹی کا تصوّر قومیت کے تصوّر میں بالکل ہی گم ہو گیا۔ مسلمان اب صرف ایک قوم بن کر رہ گئے ہیں۔ اُسی طرح کی قوم جیسی کہ جرمن ایک قوم ہے یا جاپانی ایک قوم ہے یا انگریز ایک قوم ہے۔ وہ بھُول گئے ہیں کہ اصل چیز وہ اصول اور مسلک ہے جس پر اسلام نے اُن کو ایک اُمّت بنایا تھا، وہ مشن ہے جس کو پُورا کرنے کے لیے اس نے اپنے پیروؤں کو ایک پارٹی کی صورت میں منظم کیا تھا۔ اِس حقیقت کو فراموش کر کے اُنھوں نے غیر مسلم قوموں سے "قومیت" کا جاہلی تصوّر لے لیا ہے۔ یہ ایسی بنیادی غلطی ہے اور اس کے قبیح اثرات اتنے پھیل گئے ہیں کہ احیائے اسلام کے لیے کوئی قدم نہیں اُٹھ سکتا جب تک کہ اِس غلطی کو دُور نہ کر دیا جائے۔

ایک پارٹی کے ارکان میں باہمی محبت، رفاقت اور معاونت جو کچھ بھی ہوتی ہے شخصی یا خاندانی حیثیت سے نہیں ہوتی۔ بلکہ صرف اس بنا پر ہوتی ہے کہ وہ سب ایک اصول کے معتقد اور ایک مسلک کے پیرو ہوتے ہیں۔ پارٹی کا ایک رُکن اگر جماعتی اصول اور مسلک سے ہٹ کر کوئی کام کرے تو صرف یہی نہیں کہ اس کی مدد کرنا پارٹی والوں کا فرض نہیں ہوتا، بلکہ اس کے برعکس پارٹی والوں کا فرض یہ ہوتا ہے کہ اس کو ایسے غدّارانہ اور باغیانہ طرزِ عمل سے روکیں، نہ مانے تو اس کے خلاف جماعتی ضوابط کے تحت سخت کارروائی کریں، پھر بھی نہ مانے تو جماعت سے نکال باہر کریں۔ ایسی مثالیں بھی دنیا میں ناپید نہیں

ہیں کہ جو شخص پارٹی کے مسلک سے شدید انحراف کرتا ہے اُسے قتل کر دیا جاتا ہے [1]۔ لیکن ذرا مسلمانوں کا حال دیکھیے کہ اپنے آپ کو پارٹی کے بجائے قوم سمجھنے کی وجہ سے یہ کیسی شدید غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ ان میں سے جب کوئی شخص اپنے فائدے کے لیے غیر اسلامی اصولوں پر کوئی کام کرتا ہے تو دوسرے مسلمانوں سے توقع رکھتا ہے کہ اس کی مدد کریں گے۔ اگر مدد نہیں کی جاتی تو شکایت کرتا ہے کہ دیکھو، مسلمان مسلمان کے کام نہیں آتے۔ سفارش کرنے والے ان کی سفارش ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ ایک مسلمان بھائی کا بھلا ہوتا ہے، اس کی مدد کرو۔ مدد کرنے والے بھی اگر اس کی مدد کرتے ہیں تو اس فعل کو اسلامی ہمدردی سے موسوم کرتے ہیں۔ اِس سارے معاملہ میں ہر ایک کی زبان پر اسلامی ہمدردی، اسلامی برادری، اسلام کے رشتۂ دینی کا نام بار بار آتا ہے۔ حالانکہ درحقیقت اسلام کے خلاف عمل کرنے میں خود اسلام ہی کا حوالہ دینا اور اس کے نام سے ہمدردی چاہنا یا ہمدردی کرنا صریح لغو بات ہے۔ جس اسلام کا یہ لوگ نام لیتے ہیں اگر حقیقت میں وہ ان کے اندر زندہ ہو تو جوں ہی ان کے علم میں یہ بات آئے کہ اسلامی جماعت کا کوئی شخص کوئی کام اِسلامی نظریہ کے خلاف کر رہا ہے، یہ اس کی مخالفت پر کمربستہ ہو جائیں اور اس سے توبہ کرا کے چھوڑیں۔ کسی کا مدد چاہنا تو درکنار، ایک زندہ اسلامی سوسائٹی میں تو کوئی شخص اصولِ اسلام کی خلاف ورزی کا نام تک نہیں لے سکتا۔ لیکن آپ کی اِس سوسائٹی میں رات دن یہی معاملہ ہو رہا ہے اور اس کی وجہ بجز اس کے کچھ نہیں کہ آپ کے اندر جاہلی قومیت آ گئی ہے۔ جس چیز کو آپ اسلامی اخوت کہہ رہے ہیں یہ دراصل جاہلی قومیت کا رشتہ ہے جو آپ نے غیر مسلموں سے لیا ہے۔

اسی جاہلیت کا ایک کرشمہ یہ ہے کہ آپ کے اندر "قومی مفاد" کا ایک عجیب تصور پیدا ہو گیا ہے اور آپ اس کو بے تکلف "اسلامی مفاد" بھی کہہ دیا کرتے ہیں۔ یہ نام نہاد اسلامی مفاد کیا چیز ہے؟ یہ کہ جو لوگ "مسلمان" کہلاتے ہیں ان کا بھلا ہو، ان کے پاس

---

[1] اسلام میں قتل مرتد کی یہی بنا ہے۔ روسی اشتراکی بھی اشتراکیت سے مرتد ہونے کی یہی سزا دیتے ہیں۔ جس چیز کو بھی دنیا کا کوئی گروہ اپنے نقطۂ نظر سے فی الواقع ارتداد سمجھتا ہے اس کی یہی سزا دیتا ہے۔

دولت آئے، ان کی عزت بڑھے، ان کو اقتدار نصیب ہو، اور کسی نہ کسی طرح ان کی دُنیا بن جائے بلا اس لحاظ کے یہ سب فائدے اسلامی نظریہ اور اسلامی اصول کی پیروی کرتے ہوئے حاصل ہوں یا خلاف ورزی کرتے ہوئے۔ پیدائشی مسلمان یا خاندانی مسلمان کو آپ "مسلمان" کہتے ہیں، اچاہے اس کے خیالات اور اس کے طرزِ عمل میں اسلام کی صفت کہیں ڈھونڈے نہ ملتی ہو۔ گویا آپ کے نزدیک مسلمان روح کا نہیں بلکہ جسم کا نام ہے اور صفتِ اسلام سے قطع نظر کر کے بھی ایک شخص کو مسلمان کہا جا سکتا ہے۔ اس غلط تصور کے ساتھ جن جسموں کا اسمِ ذات آپ نے مسلمان رکھ چھوڑا ہے ان کی حکومت کو آپ اسلامی حکومت، ان کی ترقی کو آپ اسلامی ترقی، ان کے فائدے کو آپ اسلامی مفاد قرار دیتے ہیں، خواہ یہ حکومت اور یہ ترقی اور یہ مفاد سراسر اصولِ اسلام کے منافی ہو۔ جس طرح جرمنیت کسی اصول کا نام نہیں، محض ایک قومیت کا نام ہے، اور جس طرح ایک جرمن قوم پرست صرف جرمنوں کی سربلندی چاہتا ہے خواہ کسی طریقے سے ہو، اسی طرح آپ نے بھی "مسلمانیت" کو محض ایک قومیت بنا لیا ہے اور آپ کے مسلمان قوم پرست محض اپنی قوم کی سربلندی چاہتے ہیں خواہ یہ سربلندی اصولاً اور عملاً اسلام کے بالکل برعکس طریقوں کی پیروی کا نتیجہ ہو۔ کیا یہ جاہلیت نہیں ہے؟ کیا درحقیقت آپ اس بات کو بھول نہیں گئے ہیں کہ مسلمان صرف اس بین الاقوامی پارٹی کا نام تھا جو دنیا میں انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے ایک خاص نظریہ اور ایک عملی پروگرام لے کر اٹھی تھی؟ اس نظریہ اور پروگرام کو الگ کرنے کے بعد محض اپنی شخصی یا اجتماعی حیثیت سے جو لوگ کسی دوسرے نظریہ اور پروگرام پر کام کرتے ہیں ان کے کاموں کو آپ "اسلامی" کیسے کہہ سکتے ہیں؟ کیا آپ نے کبھی سُنا ہے کہ جو شخص سرمایہ داری کے اصول پر کام کرتا ہو اسے اشتراکی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے؟ کیا سرمایہ دار حکومت کو کبھی آپ اشتراکی حکومت کہتے ہیں؟ کیا فاشستی طرزِ ادارہ کو آپ جمہوری طرزِ ادارہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں؟ اگر کوئی شخص اس طرح اصطلاحوں کو بے جا استعمال کرے تو آپ شاید اسے جاہل اور بیوقوف کہنے میں ذرا تامل نہیں کریں گے۔ مگر یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام اور مسلمان کی اصطلاح کو بالکل بیجا استعمال کیا جا

رہا ہے اور اس میں کسی کو جاہلیت کی بُو تک محسوس نہیں ہوتی۔

مسلمان کا لفظ خود ظاہر کر رہا ہے کہ یہ "اسم ذات" نہیں بلکہ "اسم صفت" ہی ہو سکتا ہے، اور "پیرو اسلام" کے سوا اس کا کوئی دوسرا مفہوم سرے سے ہے ہی نہیں۔ یہ انسان کی اُس خاص ذہنی، اخلاقی اور عملی صفت کو ظاہر کرتا ہے جس کا نام "اسلام" ہے۔ لہٰذا آپ اس لفظ کو شخصِ مسلمان کے لیے اُس طرح استعمال نہیں کر سکتے جس طرح آپ ہندو یا جاپانی یا چینی کے الفاظ شخص ہندو، شخص جاپانی یا شخص چینی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ مسلمانوں کا سا نام رکھنے والا جونہی اصول اسلام سے ہٹا، اس سے مسلمان ہونے کی حیثیت خود بخود سلب ہو جاتی ہے۔ اب وہ جو کچھ کرتا ہے اپنی شخصی حیثیت میں کرتا ہے۔ اسلام کا نام استعمال کرنے کا اسے کوئی حق نہیں ہے۔ اسی طرح "مسلمان کا مفاد"، "مسلمان کی ترقی"، "مسلمان کی حکومت و ریاست"، "مسلمان کی وزارت"، "مسلمان کی تنظیم" اور ایسے ہی دوسرے الفاظ آپ صرف اُن مواقع پر بول سکتے ہیں جب کہ یہ چیزیں اسلامی نظریہ اور اصول کے مطابق ہوں اور اس مشن کو پورا کرنے سے متعلق ہوں جو اسلام لے کر آیا ہے۔ اگر یہ بات نہ ہو تو ان میں سے کسی چیز کے ساتھ بھی لفظ مسلمان کا استعمال درست نہیں۔ آپ ان کو جس دوسرے نام سے چاہیں موسوم کریں، بہر حال مسلمان کے نام سے موسوم نہیں کر سکتے کیونکہ صفتِ اسلام سے قطع نظر کر کے مسلمان سرے سے کوئی شے ہی نہیں ہے۔ آپ کبھی اس بات کا تصور نہیں کر سکتے کہ اشتراکیت سے قطع نظر کر کے کسی شخص یا قوم کا نام اشتراکی ہے اور اس معنی میں کسی مفاد کو اشتراکی مفاد، یا کسی حکومت یا کسی تنظیم کو اشتراکیوں کی حکومت یا تنظیم، یا کسی ترقی کو اشتراکیوں کی ترقی کہا جا سکتا ہے۔ پھر آخر مسلمان کے معاملہ میں آپ نے یہ کیوں سمجھ رکھا ہے کہ اسلام سے قطع نظر کر کے مسلمان کسی شخص یا قوم کا ذاتی نام ہے اور اس کی ہر چیز کو اسلامی کہہ دیا جا سکتا ہے۔

اس غلط فہمی نے بنیادی طور پر اپنی تہذیب، اپنے تمدن اور اپنی تاریخ کے متعلق آپ کے رویّہ کو غلط کر دیا ہے۔ جو بادشاہتیں اور حکومتیں غیر اسلامی اصولوں

پر قائم ہوئی تھیں آپ اُن کو "اسلامی حکومتیں" کہتے ہیں محض اس لیے کہ ان کے تخت نشین مسلمان تھے۔ جو تمدن قرطبہ و بغداد اور دہلی و قاہرہ کے عیش پرست درباروں میں پرورش پایا تھا، آپ اسے "اسلامی تمدن" کہتے ہیں۔ حالانکہ اسلام سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ آپ سے جب اسلامی تہذیب کے متعلق سوال کیا جاتا ہے تو آپ جھٹ سے آگرہ کے تاج محل کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں گویا یہ ہے اس تہذیب کا سب سے زیادہ نمایاں نمونہ۔ حالانکہ اسلامی تہذیب سرے سے یہ ہے ہی نہیں کہ میّت کو سپردِ خاک کرنے کے لیے ایکڑوں زمین مستقل طور پر گھیر لی جائے اور اس پر لاکھوں روپے کی عمارت تیار کی جائے۔ آپ جب اسلامی تاریخ کے مفاخر بیان کرنے پر آتے ہیں تو عباسیوں، سلجوقیوں اور مغلوں کے کارنامے بیان کرتے ہیں۔ حالانکہ حقیقی اسلامی تاریخ کے نقطۂ نظر سے ان کارناموں کا بڑا حصّہ آب زر سے نہیں بلکہ سیاہ روشنائی سے جرائم کی فہرست میں لکھے جانے کے قابل ہے۔ آپ نے مسلمان بادشاہوں کی تاریخ کا نام "اسلامی تاریخ" رکھ چھوڑا ہے۔ بلکہ آپ اسے "تاریخِ اسلام" بھی کہہ دیتے ہیں، گویا ان بادشاہوں کا نام اسلام ہے۔ آپ بجائے اس کے کہ اسلام کے مشن اور اس کے اصول و نظریات کو سامنے رکھ کر گزشتہ تاریخ کا احتساب کریں، اور پُورے انصاف کے ساتھ اسلامی حرکات کو غیر اسلامی حرکات سے ممتاز کرکے دیکھیں اور دکھائیں، اسلامی تاریخ کی خدمت آپ اس کو سمجھتے ہیں کہ مسلمان حکمرانوں کی حمایت و مدافعت کریں۔ آپ کے زاویۂ نظر میں یہ کجی صرف اس لیے پیدا ہوئی کہ آپ مسلمان کی ہر چیز کو "اسلامی" سمجھتے ہیں اور آپ کا گمان یہ ہے کہ جو شخص مسلمان کہلاتا ہے وہ اگر غیر مسلمانہ طریق پر بھی کام کرے تو اس کے کام کو مسلمان کا کام کہا جاسکتا ہے۔

یہی ٹیڑھا زاویۂ نظر آپ نے اپنی ملّی سیاست میں بھی اختیار کر رکھا ہے۔ اسلام کے اصول و نظریات اور اس کے مشن سے قطع نظر کرکے آپ ایک قوم کو "مسلم قوم" کے نام سے یاد کرتے ہیں اور اس قوم کی طرف سے، یا اس کے نام سے، یا اس کے لیے ہر شخص اور ہر گروہ من مانی کارروائیاں کرسکتا ہے۔ آپ کے نزدیک ہر وہ شخص مسلمانوں کا نمائندہ

بلکہ ان کا لیڈر بھی بن سکتا ہے جو "مسلمانوں کی قوم" سے تعلق رکھتا ہو۔ خواہ اس غریب کو اسلام کے متعلق کچھ بھی معلوم نہ ہو۔ آپ ہر اُس پارٹی کے ساتھ لگ چلنے کو تیار ہو جاتے ہیں جس کی پیروی میں آپ کو کسی نوعیت کا فائدہ نظر آئے، خواہ اس کا مشن اسلام کے مشن سے کتنا ہی مختلف ہو۔ آپ خوش ہو جاتے ہیں جب مسلمانوں کو چار روٹیاں ملنے کا کوئی انتظام ہو جائے خواہ اسلام کی نگاہ میں وہ حرام کی روٹیاں ہی کیوں نہ ہوں۔ آپ پھولے نہیں سماتے جب کسی جگہ مسلمان آپ کو اقتدار کی کرسی پر بیٹھا نظر آتا ہے، خواہ وہ اس اقتدار کو بالکل اُسی طرح غیر اسلامی مقاصد کے لیے استعمال کر رہا ہو جس طرح ایک غیر مسلم کر سکتا ہے۔ آپ اکثر اُن چیزوں کا نام اسلامی مفاد رکھتے ہیں جو حقیقتاً غیر اسلامی ہیں، ان اداروں کی حمایت و حفاظت پر اپنا زور صرف کرتے ہیں جو اصولِ اسلام کے بالکل خلاف قائم ہوتے ہیں، اور ان مقاصد کے پیچھے اپنا روپیہ اور اپنی قومی طاقت ضائع کرتے ہیں جو ہرگز اسلامی نہیں ہیں۔ یہ سب نتائج اسی ایک بنیادی غلطی کے ہیں کہ آپ نے اپنے آپ کو محض ایک "قوم" سمجھ لیا ہے اور اس حقیقت کو آپ بھول گئے ہیں کہ دراصل آپ ایک "بین الاقوامی پارٹی" ہیں جس کا کوئی مفاد اور کوئی مقصد اپنی پارٹی کے اصولوں کو دنیا میں حکمراں بنانے کے سوا نہیں ہے۔ جب تک آپ اپنے اندر قوم کے بجائے پارٹی کا تصور پیدا نہ کریں گے اور اس کو ایک زندہ تصور نہ بنائیں گے، زندگی کے کسی معاملہ میں بھی آپ کا رویّہ درست نہ ہوگا۔

(ترجمان القرآن۔ صفر ۵۸ھ (اپریل ۳۹ء)

اِستدراک

اس مضمون کی اشاعت کے بعد متعدد اصحاب نے اس شبہ کا اظہار کیا کہ "اسلامی جماعت" کو "قوم" کے بجائے "پارٹی" کہنے سے اس امر کی گنجائش نکلتی ہے کہ وہ کسی وطنی

قومیت کی جز بن کر رہے۔ جس طرح ایک قوم میں مختلف سیاسی پارٹیاں ہوتی ہیں اور اپنا الگ الگ مسلک رکھنے کے باوجود سب کی سب اُس بڑے مجموعہ میں شامل رہتی ہیں جس کو "قوم" کہا جاتا ہے، اسی طرح اگر مسلمان ایک پارٹی ہیں تو وہ بھی اپنے وطن کی قوم کا جز بن کر رہ سکتے ہیں۔

چونکہ جماعت یا پارٹی کے لفظ کو عام طور پر لوگ سیاسی یا پولیٹیکل پارٹی کے معنی میں لیتے ہیں اس وجہ سے وہ غلط فہمی پیدا ہوئی جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن یہ اس لفظ کا اصلی مفہوم نہیں ہے بلکہ ایک خاص معنی میں بکثرت استعمال ہونے سے پیدا ہو گیا ہے۔ اصلی مفہوم اس لفظ کا یہ ہے کہ جو لوگ ایک مخصوص عقیدے، نظریے، مسلک اور مقصد پر مجتمع ہوں وہ ایک جماعت ہیں۔ اسی معنی میں قرآن نے "حزب" اور "امت" کے الفاظ استعمال کیے ہیں، اور اسی معنی میں "جماعت" کا لفظ احادیث اور آثار میں مستعمل ہوا ہے اور یہی مفہوم "پارٹی" کا بھی ہے۔

اب ایک جماعت تو وہ ہوتی ہے جس کے پیشِ نظر ایک قوم یا ملک کے مخصوص حالات کے لحاظ سے سیاسی تدبیر کا ایک خاص نظریہ اور پروگرام ہوتا ہے۔ اس قسم کی جماعت محض ایک سیاسی جماعت ہوتی ہے۔ اس لیے وہ اُس قوم کا جز بن کر کام کر سکتی ہے اور کرتی ہے جس میں وہ پیدا ہو۔

دوسری جماعت وہ ہوتی ہے جو ایک کلّی نظریہ اور جہانی تصوّر (World Idea) لے کر اُٹھتی ہے۔ جس کے سامنے تمام نوعِ انسانی کے لیے (بلا لحاظ قوم و وطن) ایک عالمگیر مسلک ہوتا ہے۔ جو پوری زندگی کی تشکیل و تعمیر ایک نئے ڈھنگ پر کرنا چاہتی ہے۔ جس کا نظریہ و مسلک، عقائد و افکار اور اصولِ اخلاق سے لے کر انفرادی برتاؤ اور اجتماعی نظام کی تفصیلات تک ہر چیز کو اپنے سانچے میں ڈھالنا چاہتا ہے۔ جو ایک مستقل تہذیب اور ایک مخصوص تمدّن (Civilization) کو وجود میں لانے کا ارادہ رکھتی ہے۔ یہ جماعت بھی اگرچہ حقیقت میں ایک جماعت ہی ہوتی ہے، لیکن یہ اُس قسم کی جماعت نہیں ہوتی جو کسی قوم کا جز بن کر کام کر سکتی ہو۔ یہ محدود قومیتوں سے بالاتر ہوتی ہے۔

اس کا تومشن ہی یہ ہوتا ہے کہ اُن نسلی و روایتی تعصبات کو توڑ دے جن پر دنیا میں مختلف قومیتیں بنتی ہیں۔ پھر یہ خود اپنے آپ کو کس طرح ان قومیتوں کے ساتھ وابستہ کر سکتی ہے؟ یہ نسلی و تاریخی قومیتوں کے بجائے ایک عقلی قومیت (Rational Nationality) بناتی ہے۔ جامد قومیتوں کی جگہ ایک نامی قومیت (Expanding Nationality) بناتی ہے۔ یہ خود ایک ایسی قومیت بنتی ہے جو عقلی و تہذیبی وحدت کی بنیاد پر روئے زمین کی پوری آبادی کو اپنے دائرے میں لینے کے لیے تیار ہوتی ہے۔ لیکن ایک قومیت بننے کے باوجود حقیقت میں یہ ایک جماعت ہی رہتی ہے۔ کیونکہ اس میں شامل ہونے کا مدار پیدائش پر نہیں ہوتا بلکہ اس نظریہ و مسلک کی پیروی پر ہوتا ہے جس کی بنیاد پر یہ جماعت بنی ہے۔

مسلمان دراصل اسی دوسری قسم کی جماعت کا نام ہے۔ یہ اُس قسم کی پارٹی نہیں ہے جیسی پارٹیاں ایک قوم میں بنا کرتی ہیں۔ بلکہ یہ اس قسم کی پارٹی ہے جو ایک مستقل نظامِ تہذیب و تمدن (Civilization) بنانے کے لیے اٹھتی ہے اور چھوٹی چھوٹی قومیتوں کی تنگ سرحدوں کو توڑ کر عقلی بنیادوں پر ایک بڑی جہانی قومیت (World Nationality) بنانا چاہتی ہے۔ اس کو "قوم" کہنا اس لحاظ سے یقیناً درست ہوگا کہ یہ اپنے آپ کو دنیا کی نسلی یا تاریخی قومیتوں میں سے کسی قومیت کے ساتھ بھی باعتبار جذبات وابستہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتی بلکہ اپنے نظریۂ حیات اور فلسفۂ اجتماعی (Social Philosophy) کے مطابق خود اپنی تہذیب و مدنیت کی عمارت الگ بناتی ہے۔ لیکن اس معنی کے لحاظ سے "قوم" ہونے کے باوجود حقیقت میں "جماعت" ہی رہتی ہے۔ کیونکہ محض اتفاقی پیدائش (Mere accident — of birth) کسی شخص کو اس قوم کا ممبر نہیں بنا سکتی جب تک کہ وہ اس کے مسلک کا معتقد اور پیرو نہ ہو۔ اور اسی طرح کسی شخص کا کسی دوسری قوم میں پیدا ہونا اس کے لیے اس امر میں مانع بھی نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنی قوم سے نکل کر اس قوم میں داخل ہو جائے جب کہ وہ اس کے مسلک پر ایمان لانے کے لیے تیار ہو۔ پس جو کچھ میں نے کہا ہے

اس کا مطلب دراصل یہ ہے کہ مسلم قوم کی قومیت اس کے ایک جماعت یا پارٹی ہونے ہی کی بنا پر قائم ہے۔ جماعتی حیثیت جڑ کا حکم رکھتی ہے اور قومی حیثیت اس کی فرع ہے۔ اگر جماعتی حیثیت کو اس سے الگ کر دیا جائے اور یہ مجرد ایک قوم بن کر رہ جائے تو یہ اس کا تنزل (Degeneration) ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسانی اجتماعات کی تاریخ میں اسلامی جماعت کی حیثیت بالکل نرالی اور انوکھی واقع ہوئی ہے۔ اسلام سے پہلے بودھ مت اور مسیحیت نے قومیتوں کے حدود کو توڑ کر تمام عالمِ انسانی کو خطاب کیا اور ایک نظریہ و مسلک کی بنیاد پر عالم گیر برادری بنانے کی کوشش کی۔ مگر ان دونوں مسلکوں کے پاس چند اخلاقی اصولوں کے سوا کوئی ایسا اجتماعی فلسفہ نہ تھا جس کی بنیاد پر یہ تہذیب و تمدن کا کوئی کلی نظام بنا سکتے۔ اس لیے یہ دونوں مسلک کوئی عالمگیر قومیت نہ بنا سکے بلکہ ایک طرح کی برادری (Brotherhood) بنا کر رہ گئے۔ اسلام کے بعد مغرب کی سائنٹفک تہذیب اٹھی، جس نے اپنے خطاب کو بین الاقوامی بنانا چاہا، مگر اوّل یوم پیدائش سے اِس پر نیشنلزم کا بھوت سوار ہو گیا لہٰذا یہ بھی عالمگیر قومیت بنانے میں ناکام ہوئی۔ اب مارکسی اشتراکیت آگے بڑھی ہے اور قومیتوں کی حدوں کو توڑ کر جہانی تصور کی بنیاد پر ایک ایسی تہذیب وجود میں لانا چاہتی ہے جو عالمگیر ہو۔ لیکن چونکہ ابھی تک وہ نئی تہذیب پوری طرح وجود میں نہیں آئی ہے جو اس کے پیشِ نظر ہے، اس لیے ابھی تک مارکسیت بھی ایک عالمگیر قومیت میں تبدیل نہیں ہو سکی ہے[1]۔ اس وقت تک میدان میں تنہا اسلام

---

[1] بلکہ اب خود مارکسیت کے اندر بھی نیشنلزم کے جراثیم پہنچ گئے ہیں۔ اسٹالین اور اس کی جماعت کے طرزِ عمل میں روسی قوم پرستی کا جذبہ روز بروز نمایاں ہوتا جا رہا ہے۔ روسی اشتراکیت کے لٹریچر میں حتیٰ کہ ۳۶ء کے جدید دستورِ حکومت میں بھی جگہ جگہ "فادر لینڈ" (وطنِ آبائی) کا ذکر ملتا ہے۔ مگر اسلام کو دیکھیے یہ ہر جگہ "دار الاسلام" کا لفظ استعمال کرتا ہے نہ کہ فادر یا مادر لینڈ کا۔

ہی ایک ایسا نظریہ و مسلک ہے جو نسلی اور تاریخی قومیتوں کو توڑ کر تہذیبی بنیادوں پر ایک عالمگیر قومیت بناتا ہے۔ لہٰذا جو لوگ اسلام کی اسپرٹ سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں ان کے لیے یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ایک ہی اجتماعی ہیئت کس طرح بیک وقت قوم بھی اور پارٹی بھی ہو سکتی ہے۔ وہ دنیا کی جتنی قوموں کو جانتے ہیں اُن میں سے کوئی بھی ایسی نہیں ہے جس کے ارکان پیدا نہ ہوتے ہوں بلکہ بنتے ہوں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ جو شخص اٹالین پیدا ہوا ہے وہ اٹالین قومیت کا رکن ہے۔ اور جو اٹالین پیدا نہیں ہوا وہ کسی طرح اٹالین نہیں بن سکتا۔ ایسی کسی قومیت سے وہ واقف نہیں ہیں جس کے اندر آدمی اعتقاد اور مسلک کی بنا پر داخل ہوتا ہو، اور اعتقاد و مسلک کے بدل جانے پر اُس سے خارج ہو جاتا ہو۔ ان کے نزدیک یہ صفت ایک قوم کی نہیں بلکہ ایک پارٹی کی ہی ہو سکتی ہے۔ مگر جب وہ دیکھتے ہیں کہ یہ نرالی پارٹی اپنی الگ تہذیب بناتی ہے، اپنی مستقل قومیت کا ادعا کرتی ہے اور کسی جگہ بھی مقامی قومیت کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ کرنے پر راضی نہیں ہوتی تو ان کے لیے یہ معاملہ ایک چیستان بن کر رہ جاتا ہے۔

یہی نافہمی غیر مسلموں کی طرح مسلمانوں کو بھی پیش آ رہی ہے۔ مدتوں سے غیر اسلامی تعلیم و تربیت پاتے رہنے اور غیر اسلامی ماحول میں زندگی گزارنے کی وجہ سے ان کے اندر "تاریخی قومیت" کا جاہلی تصور پیدا ہو گیا ہے۔ یہ اس بات کو بھول گئے ہیں کہ ہماری اصل حیثیت ایک ایسی جماعت کی تھی جو دنیا میں ایک عالم گیر انقلاب برپا کرنے کے لیے وجود میں آئی تھی، جس کی زندگی کا مقصد اپنے نظریہ کو دنیا میں پھیلانا تھا، جس کا کام دنیا کے غلط اجتماعی نظامات کو توڑ پھوڑ کر اپنے فلسفہ اجتماعی کی بنیاد پر ایک اجتماعی نظام مرتب کرنا تھا۔ یہ سب کچھ بھول بھال کر انہوں نے اپنے آپ کو بس اسی قسم کی ایک قوم سمجھ لیا ہے جیسی اور بہت سی قومیں موجود ہیں۔ اب ان کی مجلسوں اور انجمنوں میں، ان کی کانفرنسوں اور جمعیتوں میں، انکے اخباروں اور رسالوں میں، کہیں بھی ان کی اجتماعی زندگی کے اُس مشن کا ذکر نہیں آتا جس کے لیے ان کو دنیا بھر کی قوموں میں سے

نکال کر ایک امت بنایا گیا تھا۔ اس مشن کے بجائے اب جو چیز ان کی تمام توجہات کا مرکز بنی ہوئی ہے وہ "مسلمانوں کا مفاد" ہے۔ مسلمانوں سے مراد وہ سب لوگ ہیں جو مسلمان ماں باپ کی نسل سے پیدا ہوتے ہیں، اور مفاد سے مراد ان نسلی مسلمانوں کا مادی و سیاسی مفاد ہے یا بدرجہ آخر اُس کلچر کا تحفظ ہے جو ان کو آبائی ورثہ میں ملی ہے۔ اس مفاد کی حفاظت و ترقی کے لیے جو تدبیر بھی کارگر ہو اس کی طرف یہ دوڑ جاتے ہیں، بالکل اسی طرح جس طرح مسولینی ہر اُس طریقہ کو اختیار کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے جو اطالویوں کے مفاد کے لیے مناسب ہو۔ کسی اصول اور نظریہ کا نہ وہ پابند ہے نہ یہ۔ وہ کہتا ہے کہ جو کچھ اطالویوں کے لیے مفید ہو وہ حق ہے، یہ کہتے ہیں کہ جو کچھ "مسلمانوں" کے لیے مفید ہو وہ حق ہے۔ یہی چیز ہے جس کو میں مسلمانوں کا تنزل کہتا ہوں۔ اور اسی تنزل کے خلاف احتجاج کرنے کے لیے مجھے یہ یاد دلانے کی ضرورت پیش آئی ہے کہ تم نسلی اور تاریخی قوموں کی طرح ایک قوم نہیں ہو بلکہ حقیقت میں ایک جماعت ہو، اور تمہاری نجات صرف اس چیز میں ہے کہ اپنے اندر جماعتی احساس (Party Sense) پیدا کرو۔

اس جماعتی احساس کے فقدان یا خود فراموشی کے بُرے نتائج اتنے زیادہ ہیں کہ اُن کا شمار کرنا مشکل ہے۔ یہ اسی بے حسی و خود فراموشی کا نتیجہ ہے کہ مسلمان ہر رہبر و کے پیچھے چلنے اور ہر نظریے اور مسلک کی پیروی کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے، خواہ وہ اسلام کے نظریے اور اس کے مقاصد اور اس کے اصولوں سے کتنا ہی ہٹا ہوا ہو۔ وہ نیشنلسٹ بھی بنتا ہے۔ کمیونسٹ بھی بن جاتا ہے۔ فاشستی اصول تسلیم کرنے میں بھی اسے کوئی تامل نہیں ہوتا۔ مغرب کے مختلف اجتماعی فلسفوں اور مابعد الطبیعی افکار اور علمی نظریات میں سے قریب قریب ہر ایک کے پیرو آپ کو مسلمانوں میں مل جائیں گے۔ دنیا کی کوئی سیاسی، اجتماعی یا تمدنی تحریک ایسی نہیں جس کے ساتھ کچھ نہ کچھ مسلمان شریک نہ ہوں۔ اور لطف یہ ہے کہ یہ سب اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، سمجھتے ہیں اور سمجھے جاتے ہیں۔ ان مختلف راہوں پر بھٹکنے اور دوڑنے والوں میں سے کسی ایک کو بھی یہ یاد نہیں آتا کہ

"مسلمان" کوئی پیدائشی لقب نہیں ہے بلکہ اسلام کی راہ پر چلنے والے کا اسم صفت ہے۔
جو شخص اسلام کی راہ سے ہٹ کر کسی دوسری راہ پر چلے اس کو مسلمان کہنا اس لفظ کا بالکل غلط
استعمال ہے مسلم نیشنلسٹ اور مسلم کمیونسٹ اور اسی قسم کی دوسری اصطلاحیں بالکل اسی
طرح کی متناقض اصطلاحیں ہیں جس طرح "کمیونسٹ مہاجن" اور "بدھسٹ قصائی" کی اصطلاحیں
متناقض ہیں۔

(ترجمان القرآن۔ ربیع الثانی ۸۵ھ / جون ۶۵ء)

جنگِ آزادی کی نوعیّت

اب ہم اپنی آخری تنقیح کی طرف توجہ کرتے ہیں، یعنی یہ کہ وطن پرستوں کی یہ جنگ جس کو "جنگِ آزادی" کہا جا رہا ہے، دراصل ہے کس نوعیت کی جنگ؟ آیا یہ خالص انقلابی جنگ ہے یا نیم انقلابی اور نیم دستوری؟ عام طور پر سیاسی معاملات سے دلچسپی رکھنے والے مسلمان اس سوال کی اہمیت کو نظر انداز کر جاتے ہیں، حالانکہ یہ سوال فیصلہ کن اہمیت رکھتا ہے۔

انقلابی جنگ کے معنی یہ ہیں کہ حکومت متسلطہ کو بالکلیہ ختم کر دینے کے لیے جنگ کی جائے اور جب تک اس کا تختہ اُلٹ نہ دیا جائے، اس وقت تک ملک کے نظم و نسق سے کوئی سروکار نہ رکھا جائے۔ اس قسم کی جنگ کی مثال ایسی ہے جیسے آپ کسی عمارت کو بالکل ناپسند کرتے ہوں اور اس میں رہ کر آہستہ آہستہ ترمیم کرنے کے قائل نہ ہوں، بلکہ اس کو قطعی طور پر منہدم کر کے دوسری عمارت بنانا چاہیں۔

نیم انقلابی نیم دستوری جنگ کے معنی یہ ہیں کہ پہلے انقلابی شورش سے حکومت متسلطہ پر دباؤ ڈال کر نظامِ حکومت میں ترمیم و اصلاح کرائی جائے، پھر اصلاح شدہ نظام کو چلا کر اتنی طاقت حاصل کی جائے کہ دوبارہ انقلابی شورش برپا کر کے کچھ مزید اختیارات

حاصل کیے جاسکیں، اور اس طرح بتدریج پُرانے نظامِ حکومت کو ہٹا کر نیا نظامِ حکومت اس کی جگہ لیتا چلا جاتے۔ اس قسم کی جنگ کی مثال ایسی ہے جیسے آپ ایک عمارت کو رفتہ رفتہ توڑتے جائیں، اور ساتھ ساتھ دوسری عمارت بناتے بھی جائیں، یہاں تک کہ پُرانی عمارت کا انہدام اور نئی عمارت کی تکمیل دونوں ساتھ ساتھ انجام کو پہنچیں۔

دونوں طرح کی لڑائیوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ پہلی قسم کی لڑائی میں دو ایسے فریق بھی مِل کر لڑ سکتے ہیں جو موجودہ نظامِ حکومت کی مخالفت میں تو متفق ہوں مگر اس امر میں اختلاف رکھتے ہوں کہ آئندہ نظامِ حکومت کس نقشہ پر بنایا جاتے۔ ان کے لیے یہ ممکن ہے کہ تعمیرِ نو کے سوال کو جنگ کے خاتمہ پر اُٹھا رکھیں۔ وہ اس امر پر اتفاق کر سکتے ہیں کہ آؤ ہم متحدہ قوت کے ساتھ پہلے اس نظامِ حکومت کو ختم کر دیں، اس کے بعد یا تو ہم باہمی مفاہمت سے کوئی بیچ کی راہ نکال لیں گے، یا پھر بدرجۂ آخر قوت آزمائی کر دیکھیں گے، اور ہم میں سے جو فریق بھی زیادہ طاقت ور ہوگا اس کی مرضی کے مطابق نیا نظامِ حکومت بن جاتے گا۔ لیکن دوسری قسم کی لڑائی میں آئندہ کے سوال کو بعد پر اُٹھا کر نہیں رکھا جا سکتا۔ اس میں فریقین کے درمیان پہلے ہی مرحلہ پر یہ تصفیہ ہونا ضروری ہے کہ تدریجی تخریب کے ساتھ تدریجی تعمیر کس نقشہ پر ہو، اس لیے کہ یہاں تخریب اور تعمیر دونوں ساتھ ساتھ ہو رہی ہیں اور ساتھ ساتھ تکمیل کو پہنچنے والی ہیں۔ اگر ایک فریق اپنے نقشہ پر تعمیر کرتا رہے، اور دوسرا فریق نقشہ کے سوال کو بعد پر چھوڑ کر اس کا ساتھ دیتا چلا جاتے، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ایک غلامی کے بند کھولنے کے ساتھ دوسری غلامی کے بند میں اپنے آپ کو خود جکڑواتا رہے، اور اپنی آزادی کے سوال کو اس وقت تک کے لیے اُٹھا رکھے جب یہ دوسری غلامی اس پر پُوری طرح مستلط ہو چکی ہو۔ اس قسم کی جنگ اُس عقلمند فریق کے لیے تو ضرور جنگِ آزادی کہی جا سکتی ہے جو آہستہ آہستہ پُرانے آقا کی جگہ لے رہا ہو، مگر اُس بیوقوف فریق کے لیے یہ دراصل جنگِ غلامی ہوگی جو ایک آقا کی جگہ محض دوسرا آقا لانے کے لیے لڑ رہا ہو۔

اگر ہندوستان میں آزادی کی جدوجہد فی الواقع خالص انقلابی نوعیت کی ہوتی تو

ہم اس کی کوئی پرواہ کرتے کہ مستقبل کا نقشہ جواہر لال اور سوباش چندر بوس کیا پیش کرتے ہیں، اور بھولا بھائی اور ستیا مورتی کیا فرماتے ہیں۔ ہم بزدل ہوتے اگر ان باتوں سے ڈر کر جنگ سے منہ موڑ جاتے۔ ہم بہادروں کی طرح ان سے کہتے کہ جو کچھ آپ حضرات کے ارادے ہیں آپ انہی پر قائم رہیں، مگر آیئے، پہلے ہم اور آپ مل کر اس بد اصل عمارت کو توڑ پھوڑ کر پھینکیں جسے باہر والوں نے ہمارے سروں پر تعمیر کر دیا ہے، اس کے بعد ہم دیکھ لیں گے کہ یہاں ایک قومی، جمہوری، لادینی اسٹیٹ بنتا ہے یا کچھ اور۔ اس صورت میں جو فریق بھی آزادی کامل (بیرون سایۂ سلطنت برطانیہ) کے لیے انقلابی لڑائی سے منہ پھیرتا وہی بزدل قرار پاتا۔

مگر یہاں صورتِ حال کچھ دوسری ہے۔ نام آزادی کامل کا لیا جاتا ہے اور منزلِ مقصود ٹھیرائی جاتی ہے کینیڈا اور آسٹریلیا کی سی آزادی (یعنی برٹش کامن ویلتھ کے اندر نہ کہ باہر)۔ کہا جاتا ہے کہ ہماری جنگ انقلابی ہے اور طریقہ اختیار کیا جاتا ہے وہی نیم انقلابی دستوری جس کا مفہوم اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ دعویٰ یہ کیا جاتا ہے کہ ہم دوسرے کے بنائے ہوئے دستور کو قبول کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہیں اور ان کے مسلط کیے ہوئے نظام کو توڑ کر ایسا دستور چاہتے ہیں جو ہندوستان کے باشندے خود اپنے لیے بنائیں، مگر دوسروں نے جو دستور بنا دیا ہے اس کو عملاً قبول کر کے حکومت کے نظم و نسق کا چارج لے لیا جاتا ہے، اور خوب دل لگا کر اسے چلایا جاتا ہے۔ اس طرح ایک عجیب پُر فریب طلسمی جال تیار کر دیا گیا ہے جس کے پھندے دن کی روشنی میں بھی ہمارے بہت سے بھائیوں کو نظر نہیں آتے۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ اس جال کے ایک ایک پھندے کو پوری طرح نمایاں کیا جائے تاکہ مادر زاد اندھوں کے سوا ہر ایک اس کو دیکھ سکے۔

۱۔ سوراج

آزادی کامل یا پورن سوراج (Complete Independence) کے الفاظ سن کر ہر ذی ہوش آدمی یہی سمجھے گا کہ اس سے مراد وہ آزادی ہے اور ویسی ہی آزادی ہونی چاہیے جو فرانس، جرمنی، اٹلی، جاپان، روس اور ایسے ہی دوسرے آزاد ملکوں کو حاصل ہے لیکن

ہندوستان میں ان الفاظ کا یہ مفہوم نہیں ہے۔ یہاں اصرار تو انہی الفاظ کے استعمال پر کیا جاتا ہے لیکن اگر ان کی تعبیر بیرون سایۂ حاطفت برطانیہ کے ساتھ کردی جائے تو یہاتما گاندھی پرانی دینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ یہاں آج بھی اس سے مراد وہی ہے جس کو آج سے دس سال پہلے نہرو رپورٹ میں مطلوب و مقصود ٹھیرایا گیا تھا یعنی برطانوی دولت مشترکہ میں خود مختار نوآبادیات کی سی حیثیت۔ مگر اس کو نہرو رپورٹ کی طرح صاف الفاظ میں بیان نہیں کیا جاتا بلکہ زیادہ تر کوشش یہ کی جاتی ہے کہ اس کی تشریح و تفسیر کی نوبت ہی نہ آنے پائے اور اگر کبھی مجبوراً کچھ کہنا پڑ جاتا ہے تو پھر یونانی زبان میں کلام کیا جاتا ہے تاکہ کوئی نہ سمجھ سکے۔ تاہم انتہائی سعی اخفا کے باوجود اصل مقاصد کسی نہ کسی طرح زبان پر آہی جاتے ہیں۔ چنانچہ اسی سال ہری پورہ کانگریس کے خطبۂ صدارت میں مسٹر سوباش چندر بوس نے فرمایا:۔

"برطانوی سلطنت اس وقت تاریخ کے دوراہوں میں سے ایک دوراہے پر کھڑی ہے۔ یا تو وہ اسی انجام سے دوچار ہوگی جو دوسری سلطنتوں کا ہو چکا ہے، یا اسے اپنے آپ کو آزاد قوموں کے ایک وفاق میں تبدیل کرنا ہوگا..... برطانیہ عظمیٰ کے لیے اپنے نظام سلطنت کے اندرونی تضاد و تباین کو ختم کرنے کی صرف ایک صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ سلطنت کو آزاد قوموں کے ایک وفاق میں تبدیل کرے۔"

ابھی حال میں پنڈت جواہر لال نہرو کا ایک مضمون یورپ کی صورت حال پر شائع ہوا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں:۔

"اگر برطانیہ جمہوریت کا اب بھی معتقد ہے تو اس کے لیے ایک ہی ممکن العمل صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ قیصریت کو جلدی سے جلدی اور بالکلیہ ترک کر کے ہندوستان اور فلسطین وغیرہ میں آزاد جمہوری ادارے قائم کر دے۔ اس سے برطانیہ کمزور نہ ہوگا بلکہ یہ ممالک اس کے طاقت ور رہن جائیں گے۔" (نیشنل ہیرالڈ بحوالہ انشیل کال مورخہ ۴ نومبر ۳۸ء)

اور اسی سال اگست میں جب پنڈت جی پراگ (Prague) تشریف لے گئے تھے تو انہوں نے ایک بیان میں فرمایا کہ:۔

"انگلستان کے دشمن ہمارے دشمن ہیں۔"

(ٹریبیون مورخہ ۱۷ اگست ۳۸ء)

ٹریبیون ہی کا بیان ہے کہ اس پر انڈیا آفس کی طرف سے پنڈت جی کا شکریہ ادا کیا گیا تھا۔

یہ کانگریس کے ان دو لیڈروں کے اقوال ہیں جو انتہا پسند کانگریسیوں کے صنم سمجھے جاتے ہیں۔ جن میں سے ایک اس وقت کانگریس کا صدر ہے اور دوسرا بھی مسلسل دو سال تک صدر رہ چکا ہے۔ ان کا مطمح نظر بھی اس سے زیادہ اونچا نہیں ہے کہ ہندوستان برطانوی دولت مشترکہ کے اندر آزاد قوموں کے اس دائرے میں جگہ پالے جس کا مرکز و محور تاج برطانیہ ہو، جس کا مفاد مرکزی سلطنت کے مفاد سے متحد ہو جائے، جس کی دفاعی، اور لازمی نتیجہ کے طور پر خارجی پالیسی بھی انگلستان کے دامن سے بندھی ہوئی ہو۔ یہی رائے قریب قریب تمام بڑے بڑے کانگریسی رہنماؤں کی ہے اور ان میں کوئی ایک شخص بھی آپ کو ایسا نہیں مل سکتا جو آزادی کامل بول کر آزادی کامل مراد لیتا ہو۔

اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ دنیا کی آزاد قوموں کے ساتھ ہمسری و مساوات حاصل کرنے کی خواہش، جو فطرتاً ہر خوددار ہندوستانی میں ہونی چاہیئے، ان کے اندر مفقود ہے۔ بلکہ دراصل اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں ایک کھلی اور بے لاگ مسابقت (Open & Fair Competition) کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں ہے۔ یہ اس کے لیے تیار نہیں ہیں کہ کھلے میدان میں گھوڑا کھڑا ہو، مقابلہ آزادانہ ہو، اور ان کا اس گھوڑے کی پیٹھ پر متمکن ہونا محض ان کی قوت و شہسواری پر موقوف ہو۔ ان کی خواہش تو یہ ہے کہ سرکار سہارا دے کر انہیں گھوڑے پر چڑھا دیں اور جب تک یہ دوسرے امکانی مدعیوں کا خاتمہ نہ کر دیں، یا جب تک وہ ان کی سیاسی قبول کرنے پر مجبور نہ ہو جائیں، اس وقت تک سرکاران کی پشتیبانی کے لیے کھڑے رہیں۔ یہ اور صرف یہی ایک وجہ ہے اس امر کی کہ ان کے

بڑے سے بڑے مدعی حریت کو بھی جب اوپر سے کھرچا جاتا ہے تو اندر سے وہ درجۂ نوآبادیات کا پرستار ہی نکلتا ہے۔

پھر جب ان کا اصل مدعا یہ ہے تو یہ آزادی کامل کا نام کیوں لیتے ہیں؟ لبرل پارٹی کی طرح صاف کیوں نہیں کہتے کہ ہم درجۂ نوآبادیات چاہتے ہیں؟ آخر اس منافقت کی ضرورت کیا ہے کہ زبان پر وہ بات لائی جائے جو دل میں نہیں ہے اور دل میں وہ بات رکھی جائے جو زبان پر لانی مناسب نہیں؟ خصوصاً وہ لوگ جن کے ایمان میں اہنسا سے بھی پہلے ستیہ (صداقت) کا مرتبہ ہے وہ اس جھوٹ کو کیوں جائز رکھتے ہیں؟ اس سوال کا جواب جو گزشتہ دس سال کی تاریخ پر غور کرنے سے مجھے ملا ہے اسے میں بغیر کسی لگ لپیٹ کے ظاہر کر دینا چاہتا ہوں۔ اس منافقت کی وجہ صرف یہ ہے کہ درجۂ نوآبادیات یا اس سے فروتر درجہ کی اصلاحات کا نام لیتے ہی فوراً ملک کی دوسری قوموں کے حقوق کا سوال پیدا ہو جاتا ہے اور اس صورت میں دوہری مشکل پیش آتی ہے۔ اگر ان حقوق کے مسائل کو انصاف کے ساتھ ابتدائی مراحل میں طے کر دیا جائے تو ہندوستان کو "ایک قوم" کا ملک بنا دینے کا خواب پریشان ہو جاتا ہے۔ اور اگر اپنے اصل ارادے بے نقاب کر دیئے جاتے ہیں تو پھر اس دام فریب کے سارے بند کھل جاتے ہیں جن میں ہندوستان کی دوسری قوموں کو پھانسنا مقصود ہے، اور کوئی توقع نہیں کی جا سکتی کہ حقیقی "بندگانِ وطن" کی قلیل تعداد کے سوا کوئی ایسا "بندۂ خدا" بھی اس کام میں تعاون کا ہاتھ بڑھائے گا جو اپنے قومی تشخص کو برقرار رکھنا ضروری سمجھتا ہو۔ اس دوگونہ اشکال کا عملی تجربہ ان حضرات کو نہرو رپورٹ کی اشاعت کے بعد اچھی طرح ہو گیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے یہ دانشمندانہ پالیسی اختیار کی کہ نہرو رپورٹ کو تو دریائے راوی میں غرق کر کے آزادی کامل کا اعلان کر دیا اور اس جھوٹ کے پردے میں اپنے اصل مقصد، یعنی تدریجی حصول اقتدار کی کوشش برابر جاری رکھی۔

اگرچہ جاننے والوں کے لیے یہ راز اس وقت بھی راز نہ تھا، اور جن کے پاس کچھ عقل تھی ان کے لیے اس کے بعد بھی بہت سے مواقع آئے جب اس کے چہرے سے

نقاب اُٹھا رہا، مثلاً جب سول نافرمانی کے بعد گاندھی جی دوسری راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں لندن تشریف لے گئے تھے تو کامل آزادی لینے کے لیے نہ گئے تھے، نہ کامل آزادی دینے کے لیے ان کو بلایا گیا تھا۔ اور جب ۱۹۳۵ء کا گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پاس کر دیا گیا تو جدید اسمبلیوں میں داخلہ کامل آزادی حاصل کرنے کا ذریعہ نہ تھا اور نہ ہو سکتا تھا۔ مگر باوجود اس کے یہ راز ہمارے بہت سے سادہ لوح بھائیوں کے لیے راز ہی رہا اور آج بھی، جب کہ برطانوی پارلیمنٹ کے دستور کو علانیہ چلایا جا رہا ہے، ان کے لیے یہ بدستور راز ہے۔ چنانچہ وہ متحدہ قومیت کے راگ یہی سمجھ کر الاپ رہے ہیں اور ماس کانٹیکٹ کے جال میں مسلمانوں کو یہی سمجھ کر پھنسوا رہے ہیں کہ کانگریس کی جنگ کامل آزادی کے لیے ہے ——— یہ فائدہ ہے اس منافقت کا جو ستیہ اور اہنسا کے معتقدین نے آٹھ نو سال سے اختیار کر رکھی ہے۔

۲۔ "کامل آزادی" کی اصل حقیقت

جب آزادیٔ کامل کا اعلان کیا گیا تھا تو ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا گیا تھا کہ ہماری جنگ انقلابی جنگ ہے، یعنی ہم اس ظالمانہ نظامِ حکومت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہتے ہیں، اور جب تک یہ جڑ سے اکھڑ نہ جائے ہم اس سے کوئی ربط و تعلق رکھنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ بات بظاہر نہایت معقول تھی۔ کیونکہ آزادیٔ کامل صرف انقلابی جنگ ہی سے ہو سکتی ہے۔ چنانچہ بہت سے لوگوں کو یقین آ گیا کہ جب یہ انقلابی جنگ کا علم بلند کر رہے ہیں تو ضرور ان کا مقصد آزادیٔ کامل ہی کا حصول ہو گا۔

اس کے بعد جب گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پاس ہو گیا اور جدید اسمبلیوں کے لیے انتخابات شروع ہوئے تو کہا گیا کہ ہم اسمبلیوں میں جائیں گے مگر اس لیے کہ اس دستور کو اندر سے توڑیں۔

پھر جب اسمبلیوں میں پہنچ گئے تو وزارتیں قبول کرنے یا نہ کرنے کا سوال پیدا ہوا۔ کچھ مدت تک عشوہ و انداز کے ساتھ ہاں اور نہیں کا سلسلہ جاری رہا اور آخر کار وزارت کے قلمدان بھی سنبھال لیے گئے۔ اور جب وزارتیں بھی قبول کر لی گئیں تو کہا گیا کہ اس

سے مقصود ہز میجسٹی کی حکومت کو چلانا نہیں ہے بلکہ دستورِ جدید کے نفاذ کو عملاً ناممکن بنا دینا ہے۔ چنانچہ عہدے قبول کرتے وقت کانگریس نے جس پالیسی کا اعلان کیا تھا وہ یہ تھی کہ:۔

"دستورِ جدید کا مقابلہ کر کے (یا اس کی مزاحمت کر کے) اسے ختم کر دیا جائے۔ ووٹروں کی بڑی اکثریت کانگریس کی اس پالیسی اور اس کے پروگرام کی توثیق کر چکی ہے۔ عوام الناس خود برطانوی حکومت ہی کے مقرر کیے ہوئے طریقہ پر آئینِ جدید کو نامنظور کرنے کا اعلان کر چکے ہیں، (یعنی انہوں نے کانگریس کے نمائندوں کو بھاری اکثریت سے نمائندہ منتخب کیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اس دستور کو قبول نہیں کرتے)۔ وہ صاف طور پر اس امر کا اعلان کر چکے ہیں کہ ہم اپنا دستورِ حکومت خود بنانا چاہتے ہیں .... لہٰذا باشندگانِ ہند کی جانب سے کانگریس اس دستور کو از اوّل تا آخر مسترد کرتی ہے ......

کانگریس اپنے تمام ارکان پر واضح کر دینا چاہتی ہے۔ کہ مجالسِ قانون ساز میں ان کا کام اس دستور کا مقابلہ کرنے اور اسے ختم کر دینے کی پالیسی پر مبنی ہونا چاہیئے .... اس پالیسی کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ حکومتِ برطانیہ کے لیے اس دستور کو نافذ کرنا غیر ممکن ہو جائے گا .... اسی پالیسی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے آل انڈیا کانگریس کمیٹی اپنے نمائندوں کو ان صوبوں میں وزارتیں قائم کرنے کی اجازت دیتی ہے جن کی مجالس قانون ساز میں ان کو اکثریت حاصل ہے"

لیکن آج عملاً کیا ہو رہا ہے؟ اور عملاً کو بھی چھوڑیئے، وہی زبانیں جو پچھلے سال کے وسط تک دستور کو توڑنے کا اعلان کر رہی تھیں، آج بلا کسی شرم و لحاظ کے کیا کہہ رہی ہیں؟ اس کا جواب ہم سے نہیں خود انہی کی زبانوں سے سن لیجئے۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل ہری پورہ کانگریس کے بھرے اجلاس میں فرماتے ہیں:۔

"چند مہینہ کی مختصر مدت میں کانگریسی وزارتوں نے اس سے زیادہ
کام کیا ہے جتنا برطانوی حکومت ڈیڑھ سو برس میں نہ کر سکی تھی"

(ٹائمز آف انڈیا۔ مورخہ ۲۲ فروری ۳۸ء)

یعنی وہی دستور جو بالکل ناکارہ تھا اس قدر کارآمد بن گیا! اور سنیئے۔ کانگریس کے
صدر مسٹر سوباش چندر بوس فرماتے ہیں:۔

"کانگریس محض تخریبی طریق کار پر اعتقاد نہیں رکھتی۔ بلکہ اندر رہ کر
تعمیری طریق کار کو انسب سمجھتی ہے"

(ٹریبیون مورخہ ۱۵ جون ۳۸ء)

اس سے بھی زیادہ کھل کر مسٹر بوس نے ابھی حال میں آسام کے قضیہ وزارت پر
تبصرہ کرتے ہوئے اس امر کی شکایت کی تھی کہ جب یورپین گروپ ملک معظم کی حکومت
چلانے کے لیے ہے تو کانگریس پارٹی کی مخالفت پر کیوں کمربستہ ہو گیا؟ درآنحالیکہ
کانگریس پارٹی بھی اس حکومت کو چلانے ہی کے لیے وزارت سنبھال رہی ہے۔

اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اب دستور کو توڑنے کے بجائے اس کو چلانے کی
پالیسی علانیہ اختیار کی جا چکی ہے۔ اور اس کا عملی ثبوت یہ ہے کہ آج ڈیڑھ سال سے
گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی حدود کا پورا پورا لحاظ رکھ کر ہز میجسٹی کی حکومت چلائی جا
رہی ہے۔ کانگریسی وزارتیں اگر حقیقت میں دستور کو توڑنا چاہتیں تو ان کے لیے بہت
آسان تھا کہ عوام الناس کی فلاح و بہبود کے لیے ایسی تدابیر اختیار کرتیں جن کی اجازت
دینے سے گورنر انکار کر دیتے، اور اس پر استعفیٰ دیکر آئینی انقباض (Deadlock)
پیدا کر دیتیں۔ مگر یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ وہ پوری وفاداری کے ساتھ اس دستور کو اسی
طرح چلا رہی ہیں جس طرح کوئی لبرل جماعت چلاتی۔ وہ پوری کوشش کر رہی ہیں کہ
گورنروں سے تصادم نہ ہونے پائے خواہ عوام الناس کی فلاح و بہبود کے وہ بہت سے
کام رہ جائیں جن کا انہوں نے وعدہ کر کے عوام سے ووٹ حاصل کیے تھے۔

انہوں نے عوام سے کہا تھا کہ ہم شرح مالگذاری میں ۵۰ فی صدی کمی کر دیں

گے۔ مگر کس صوبہ میں تخفیف کی گئی؟ یوپی میں جب اس وعدہ کو یاد دلایا گیا تو وزارت نے صاف جواب دے دیا کہ سابقہ حکومت جتنی تخفیف کر چکی ہے اس سے زیادہ نہیں کی جاسکتی[1]۔ اور یہ صرف اس لیے کہ مالگذاری کم کرنے سے بجٹ کا توازن بگڑ جاتا ہے، اور بجٹ کا توازن بگڑنا اُس سامراج کے مفاد کے خلاف ہے جس کی وفادارانہ خدمت انجام دینے کے لیے یہ حضرات ایوانِ وزارت میں تشریف لے گئے ہیں۔

انہوں نے عوام کو سبز باغ دکھایا تھا کہ ہم تمہاری غریبی کا علاج کریں گے۔ مگر کون صداقت پسند آدمی یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ احمد آباد، شولاپور، کانپور، بمبئی وغیرہ مقامات پر کانگریسی حکومتوں نے مزدوروں کے ساتھ جو برتاؤ کیا وہ سابقہ حکومت کے ظالمانہ برتاؤ سے کچھ بھی مختلف ہے؟ اور اس پر طرفہ ماجرا یہ ہے کہ غریب مزدور اپنے حقوق تسلیم کرانے کے لیے ہڑتال یا پکٹنگ کرتے ہیں تو وہی گاندھی جی جو ان سب ہتھیاروں کو برٹش گورنمنٹ کے خلاف استعمال کر چکے ہیں، ان پر تشدد کا الزام عائد کرتے ہیں اور بے تکلف فرماتے ہیں کہ "کارخانہ داروں کے خلاف پولیس کی امداد طلب کرنے میں اور کانگریسی حکومت ایسی امداد بہم پہنچانے میں بالکل حق بجانب ہیں"[2]۔ انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ ہم اُن ظالمانہ قوانین کو منسوخ کرائیں گے جو انگریزی حکومت نے نافذ کر رکھے ہیں اور باشندگانِ ہند کو ان کی کھوئی ہوئی مدنی آزادیاں (Civil Liberties) واپس دلائیں گے۔ مگر واقعات کیا ہیں؟ کیا وہ اکثر و بیشتر قوانین بدستور موجود نہیں ہیں جو انگریزی حکومت نے نافذ کیے تھے؟ کیا خود کانگریسی حکومتیں ان قوانین کو استعمال نہیں کر رہی ہیں؟ اور کیا انہیں استعمال کرنے میں ٹھیک انہی دلائل سے کام نہیں لیا جا رہا ہے جو کسی زمانے میں انگریزی حکام پیش کیا کرتے تھے؟ وہی کانگریسی حکام جو کہتے تھے کہ بغاوت ہمارا مذہب ہے، مدراس میں مسٹر باٹلی والا پر بغاوت کا مقدمہ

---

[1] ملاحظہ ہو نیشنل کال مورخہ ۳۱ جولائی ۳۸ء

[2] ہریجن مورخہ ۱۳ اگست ۳۸ء

چلاتے ہیں اور بمبئی اور سی پی میں مسٹر باپٹ اور مسٹر جگناتھ پرشاد ورما پر بغاوت کا مقدمہ چلانے کی دھمکی دیتے ہیں۔ شولاپور میں "یوم استقلال" کے موقع پر بہت سے آدمیوں کو گرفتار کیا جاتا ہے اور ایک شخص کو سزائے تازیانہ بھی دی جاتی ہے۔ حالانکہ اس سزا کے خلاف کسی زمانہ میں شور قیامت برپا کر دیا جاتا تھا۔ سیاسی ایجی ٹیشن کو روکنے کے لیے دفعہ ۱۴۴ کا نفاذ، گولیاں چلانا اور لاٹھی چارج کرنا آج بھی اسی طرح جاری ہے جس طرح پہلے تھا۔ کریمنل لا امنڈمنٹ ایکٹ، جس کے خلاف کانگریس نے سب سے زیادہ شور مچایا تھا، آج کانگریسی حکومتیں بے تکلف اس کو استعمال کر رہی ہیں۔ احمد آباد میں مزدوروں کا سر کچلنے کے لیے اُسے استعمال کیا گیا ہے، اور مدراس میں ہندی کی اشاعت کے خلاف احتجاج کرنے والوں پر آج پوری آزادی کے ساتھ اِس سے کام لیا جا رہا ہے۔ وہی سی آئی ڈی جس کی زیادتیوں پر کسی زمانہ میں ماتم کیا جاتا تھا، آج کانگریسی حکومتیں اپنے سیاسی مخالفین کے خلاف اس کی خدمات سے پورا فائدہ اُٹھا رہی ہیں اور مدراس کا وزیر اعظم صاف کہتا ہے کہ جب ہم نے حکومت کا انتظام ہاتھ میں لیا ہے، (یعنی جب ہم اس حکومت کو توڑنے کے لیے نہیں بلکہ چلانے کے لیے نکلے ہیں)، تو سی آئی ڈی سے کام لیے بغیر چارہ نہیں۔ وہی پریس کی آزادی جس کو باشندوں کے مدنی حقوق کی فہرست میں نمایاں جگہ دی جاتی تھی، آج اس کو خود پامال کیا جا رہا ہے۔ اخبارات کی ضمانتیں بھی ضبط ہوتی ہیں، نئی ضمانتیں بھی مانگی جاتی ہیں اور ایڈیٹروں پر مقدمے بھی چلائے جاتے ہیں۔ اِس سے بھی عجیب تر بات یہ ہے کہ حکومت بمبئی نے حال ہی میں پولیس کمشنر کو پورے اختیارات عطا کیے ہیں کہ جس شخص کو چاہے بغیر مقدمہ چلائے شہر بدر کر دے[1]۔

---

[1] تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس کلکتہ کی رپورٹ مندرجہ ٹائمز آف انڈیا یکم نومبر ۳۷ء نیز ٹریبیون کا مقالہ افتتاحیہ ۷ اگست ۳۸ء اور اخبار سرونٹ آف انڈیا ۱۴ جولائی ۳۸ء۔

اس پورے کارنامہ کا خلاصہ خود ایک صاف گو کانگریسی مسٹر ایم۔ این۔ رائے کی زبان میں یہ ہے کہ:۔

"اسمبلیوں میں جانے کا پروگرام اختیار کرنے کے بعد خصوصاً وزارتیں قبول کرنے کے بعد کانگریسی سیاست تیزی کے ساتھ دستوریت (Constitutionalism) کی طرف ترقی معکوس کر رہی ہے اور برطانوی امپریلزم سے لڑنے کی انقلابی ذہنیت کافور ہو گئی ہے۔[1]"

"کانگریسی وزیروں نے امپریسٹ اسٹیٹ کی مشین کو اندر سے توڑنے کی قطعاً کوئی کوشش نہیں کی۔ جو جنگی مورچے (Strategic Positions) ان کے قابو میں آئے ان کو بھی غنیم پر حملہ کرنے کے لیے انہوں نے استعمال نہیں کیا۔ وہ تو کانگریس ہائی کمانڈ کی اجازت سے، بلکہ اس کی ہدایت کے تحت، اسی امپریلسٹ اسٹیٹ کے انتظام کو چلا رہے ہیں جسے توڑنے کا ارادہ ظاہر کر کے وہ گئے تھے۔"

"ایمانداری کا تقاضا یہ ہے کہ اس امر کا صاف صاف اعتراف کر لیا جائے کہ کانگریسی وزارتیں عوام کی معاشی حالت کو درست کرنے کے لیے کچھ بھی نہ کر سکیں اور نہ موجودہ دستور کی حدود میں رہ کر وہ آئندہ کچھ کر سکیں گی۔[2]"

کانگریس کے اصل عزائم

اب یہ بات بالکل عیاں ہو چکی ہے کہ کانگریس کی "جنگ آزادی" کوئی انقلابی جنگ نہیں ہے، بلکہ جیسا میں اوپر بیان کر چکا ہوں، نیم انقلابی نیم دستوری ہے۔ اس کا نقشہ جنگ یہ نہیں ہے کہ مسلسل لڑ کر انگریزی سلطنت کے نظام کو توڑ ڈالا

---

[1] ٹریبیون مورخہ یکم مئی ۴۰ء

[2] نیشنل کال مورخہ ۲۱ جولائی ۴۰ء

جائے۔ بلکہ نقشۂ جنگ دراصل یہ ہے کہ اِسی نظامِ سلطنت کے اندر رہ کر حکمران جماعت پر دباؤ ڈالا جائے اور اس سے بتدریج اختیارات حاصل کر کے اپنا اقتدار جمایا جائے۔ پہلے انہوں نے سول نافرمانی کی تاکہ ۱۹۱۹ء کی اصلاحات کا دائرہ وسیع ہو اور زیادہ سے زیادہ اختیارات مِل سکیں۔ اس کے نتیجہ میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء حاصل ہو گیا۔ اب یہ اس ایکٹ کے مطابق صوبوں کی حکومتیں چلا رہے ہیں اور اپنے پروگرام کے مطابق ـــــــ جس کی تشریح میں آگے کروں گا ـــــــ ملک میں اپنا اقتدار حاصل کر لینا چاہتے ہیں کہ دوبارہ آئینی یا نیم انقلابی ذرائع سے برطانوی سلطنت پر دباؤ ڈال کر مرکزی حکومت میں زیادہ سے زیادہ اختیار حاصل کریں۔ چنانچہ آج کل اسی غرض کے لیے دوڑ دھوپ ہو رہی ہے۔ جواہر لال یورپ کا چکر لگا رہے ہیں۔ گاندھی جی وائسرائے اور نائب وزیرِ ہند سے راز کی ملاقاتیں فرما رہے ہیں۔ ستیہ مورتی وفاقی دستور کو قبول کرنے کی شرائط پیش کر رہے ہیں۔ اور سوباش چندر بوس دھمکیوں پر دھمکیاں دیئے چلے جاتے ہیں۔ ایک ہی ٹیم ہے جس کا ہر کھلاڑی اپنا اپنا کام خوبی کے ساتھ کر رہا ہے اور سب کی منزلِ مقصود ایک ہے، یعنی ہندو راج زیرِ سایہ برطانیہ۔

۴۔ کانگریس اور ہندو مہاسبھا

یہاں پہنچ کر ہندو مہاسبھا اور کانگریس دونوں نظری اور عملی حیثیت سے ایک ہو جاتی ہیں۔ گو ان کے نام اور کام مصلحتہً جُدا ہیں۔

نظری حیثیت سے دونوں میں نہ پہلے فرق تھا نہ آج ہے۔ دونوں وطنی قومیت کی علمبردار ہیں۔ دونوں اس مُلک میں "فرقوں" (قوموں) کے امتیازی وجود کو تسلیم کرنے سے انکار کرتی ہیں۔ دونوں علیحدگی کے رجحان (Separatist Tendency) کی دشمن ہیں۔ حتیٰ کہ کسی معاملہ میں بھی وہ مسلمانوں کے جُداگانہ مفاد کا نام تک سُننے کی روادار نہیں۔ دونوں کا آخری نصب العین یہ ہے کہ یہاں ایک قومیت پیدا ہو جائے جو تہذیب، تمدن، اخلاق، معاشرت، زبان، ادب، جذبات و حسیات،

غرض ہر لحاظ سے بالکل یک رنگ ہو۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کانگریس جہاں "ہندوستانی" کا لفظ بولتی ہے وہاں مہاسبھا "ہندو" کا لفظ استعمال کرتی ہے۔ مگر معنی دونوں کے ایک ہیں۔

عملی حیثیت سے بظاہر چند سال تک دونوں میں فرق رہا۔ مگر اب اس حیثیت سے بھی کوئی فرق باقی نہیں۔ کانگریس یہ دعویٰ کرتی تھی کہ اس کا نصب العین کامل آزادی ہے اور وہ انقلابی جدوجہد سے اُسے حاصل کرے گی۔ بخلاف اس کے ہندو مہاسبھا کہتی تھی کہ انگریزی سلطنت سے آزاد ہو جانے کے بعد "ایک قوم" بنانے کا عمل دشوار بلکہ محال ہو جائے گا۔ یہ عمل صرف اسی طرح پایۂ تکمیل کو پہنچ سکتا ہے کہ انگریزی سلطنت کے زیر سایہ رفتہ رفتہ حکومت کے اختیارات پر قبضہ کرو۔ انگریز اپنی فطرت سے مجبور ہے کہ یہاں جمہوریّت کے انہی تصوّرات کو درآمد کرے گا جو اس کے اپنے ملک میں صدیوں سے پرورش پا رہے ہیں۔ وہ چاہے لڑا کر حکومت کرنے کی پالیسی پر کتنا ہی عمل کرے اور اس غرض کے لیے یہاں مختلف قومیتوں کے وجود سے فائدہ اُٹھانے کی کتنی ہی کوشش کرے، مگر جب کبھی وہ جمہوری ادارات قائم کرنے کا ارادہ کرے گا تو اس کا ذہن کوئی ایسی صورت نہ سوچ سکے گا جو اس کے اپنے ملک کے جمہوری ادارات سے اصولاً مختلف ہو۔ لہٰذا اس پر دباؤ ڈال کر جتنی بھی آئینی اصلاحات ملیں گی وہ سب ہندوؤں ہی کو بوجہ ان کی عددی اکثریت کے سیاسی قوت و اقتدار کا مالک بنائیں گی۔ اور اس قوّت و اقتدار کو اگر ہوشیاری کے ساتھ استعمال کیا جائے تو معاشی دباؤ، تعلیمی انقلاب اور حاکمانہ نفوذ و اثر سے رفتہ رفتہ ہندوستان کی مختلف قومیتوں کو "ایک قومیت" میں تحلیل کیا جا سکتا ہے۔ یہ اور صرف یہی ایک صورت ہے جس سے یہاں "ایک قوم" بنائی جا سکتی ہے۔ لہٰذا جب تک یہ عمل پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ جائے آزادیٔ کامل کا نام بھی نہ لینا چاہیے۔ اس سے پہلے انگریزی اقتدار کو مٹانے کی کوشش کرنا بھارت ورش کے ساتھ دشمنی کرنا ہے۔

پالیسی کا یہ اختلاف چند سال تک محض ظاہری طور پر کانگریس اور مہاسبھا میں

رہا۔ مگر آج ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ کانگریس ٹھیک اسی مقام پر آگئی ہے جہاں ہندو مہا سبھا تھی اور دونوں مل کر سامراج کے تحت ناظم (Administrator) کی خدمات انجام دے رہی ہیں۔ بہار میں، سی پی میں، یو پی میں اور دوسرے صوبوں میں کھلے ہوئے بدنام مہا سبھائی کانگریس کے ذمہ دار عہدوں پر فائز ہیں۔ سی پی کی سابق کانگریسی وزارت میں ایک صاحب مسٹر ویسیکر بھی شامل تھے اور یہ وہ صاحب ہیں جو راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے موقع پر ہندو مہاسبھا کی طرف سے ایک وفد لے کر لندن پہنچے تھے۔ سی۔پی کے موجودہ وزیر اعظم مسٹر شکلا وہ صاحب ہیں جنہوں نے سوراج پارٹی کے داخلہ کونسل کے زمانہ میں مالوی جی کے زیر قیادت کانگریس سے الگ انڈی پنڈنٹ پارٹی بنائی تھی اور جنہوں نے بعد میں کمیونل ایوارڈ کے متعلق کانگریس کی پالیسی سے اختلاف کر کے اس کو انتخابات کا نزاعی مسئلہ بنایا۔ سی۔پی اسمبلی کا صدر بھی کھلا ہوا مہاسبھائی ہے۔ کانگریس کی طرف سے اسمبلی کی صدارت بھی کرتا ہے اور مسٹر ساورکر سے مل کر حیدرآباد میں ریاست کے خلاف شورش برپا کرنے کی تدبیریں بھی کرتا ہے۔ بہار میں بھاگلپور اور دوسرے مقامات پر جو فساد ہوئے ان میں کانگریس کے ذمہ دار کارکنوں نے پورا پورا مہاسبھائی پارٹ ادا کیا۔ یو۔پی میں دوری اور ٹانڈہ وغیرہ کے فسادات اُن مہاسبھائیوں نے برپا کرائے جو کانگریس کے عہدوں پر فائز تھے۔ اس قسم کی بیسیوں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں اور ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ "قومیت متحدہ" کی خدمت کرنے والے حضرات کس آسانی کے ساتھ کانگریس سے مہاسبھا میں اور مہاسبھا سے کانگریس میں آتے جاتے رہتے ہیں۔

اِن دونوں جماعتوں میں اب اگر کوئی فرق باقی ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ ایک ہندو مہاسبھا ہے اور دوسری انڈین نیشنل کانگریس۔ مہاسبھا صریح طور پر ہندوؤں کی جماعت ہے۔ کوئی مسلمان اس میں شریک نہیں ہوسکتا۔ نہ وہ مسلمانوں کو اپنی طرف دعوت دے سکتی ہے۔ نہ مسلمانوں میں جاکر پاس کا ٹکٹ کر سکتی ہے۔ نہ کسی صوبہ کی حکومت پارٹی سسٹم کی بنیاد پر قائم کر سکتی ہے۔ نہ کہیں خالص ہندو

وزارت قائم کرکے یہ دعوےٰ کر سکتی ہے کہ "یہ قومی وزارت" ہے۔ نہ مسلمانوں سے یہ کہہ سکتی ہے کہ ہمارے عہد نامہ (Pledge) پر دستخط کرو تب تمہیں وزارت میں شریک کیا جائے گا۔ نہ اس کو مولانا ابوالکلام کی خدمات حاصل ہو سکتی ہیں کہ مسلمانوں کی جماعت میں سے کمزور کیرکٹر کے آدمیوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر لائیں اور اس کے آستانہ پر جھکادیں۔ نہ اسے ڈاکٹر ذاکر حسین کی خدمات میسر آسکتی ہیں کہ واردھا اسکیم تیار کریں۔ نہ وہ خان عبدالغفار خاں سے کام لے سکتی ہے کہ ۹۵ فی صدی اکثریت رکھنے والے سرحدی صوبہ کو فیڈریشن کے قیام سے پہلے ہی اس وحدانی طرز حکومت (Unitary form of Government) کا تابع بنادیں جس کے مرکز پر ہندوؤں کا کامل اقتدار ہو۔ نہ وہ بہت سے علمار کرام کی خدمات حاصل کر سکتی ہے کہ مسلمانوں کو مذہبی اقتدار کے زور سے اس کے دائرے میں کھینچ کھینچ کر لائیں اور فتویٰ دیں کہ اس جماعت میں شریک ہونا وجوب کا درجہ رکھتا ہے۔ نہ اس کے لیے یہ دعویٰ کرنا ممکن ہے کہ اس کے لیڈر مسلمانوں کے بھی ویسے ہی نمائندے ہیں جیسے ہندوؤں کے ہیں اور جو کچھ وہ بولتے ہیں "پوری قوم" کی طرف سے بولتے ہیں۔ نہ وہ اسلامی اکثریت رکھنے والے صوبوں میں وزارتوں کی توڑ پھوڑ اس خوبی کے ساتھ کرا سکتی ہے کہ وزارت مسلمانوں ہی پر مشتمل رہے مگر اشاروں پر ہائی کمانڈ کے رقص کیا کرے۔ نہ اقلیت ہی کے صوبوں میں اس کو مسلمانوں پر یہ اقتدار حاصل ہو سکتا ہے کہ ان کے منتخب کردہ نمائندوں میں سے جسے چاہے وزارت پر سرفراز کرے اور جس کو چاہے کان سے پکڑ کر نکال دے۔ یہ سب کام کانگریس ہی سے بن آسکتے ہیں کیونکہ وہ ہندو مہاسبھا نہیں، انڈین نیشنل کانگریس ہے۔

اس فرق کے ساتھ یہ دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کر رہی ہیں۔ جو کام کانگریس کر سکتی ہے وہ مہاسبھا نہیں کر سکتی۔ اور جو کام مہاسبھا کر سکتی ہے وہ کانگریس نہیں کر سکتی۔ کانگریس پیش قدمی کرنے والی فوج ہے جو آگے بڑھ کر غنیم کے علاقہ پر قبضہ کرتی ہے اور مہاسبھا وہ محافظ دستہ ہے جو عقب میں رہتا ہے تاکہ آگے کی فوج

کو حسبِ ضرورت مدد پہنچاتا رہے۔ کانگریس پر جب کبھی مشترک وطنی جماعت ہونے کی حیثیت سے دباؤ پڑتا ہے، ہندو مہاسبھا فوراً آگے بڑھ کر پشت کو سہارا دیتی ہے، اور مسٹر ساورکر، ڈاکٹر مونجے، بھائی پرمانند وغیرہ شور مچانے لگتے ہیں کہ ہندوؤں کے نمائندے ہم ہیں، گاندھی اور جواہر لعل نہیں ہیں۔ ایسے نازک موقع پر اگر عقب میں محفوظ فوج موجود نہ ہو تو متحدہ ایجیٹیشن کر اپنی "قوم پرستی" کا دعویٰ نباہنا مشکل ہو جائے۔ اس فوج کی مدد کام بھی نکال دیتی ہے اور بات بھی بنی رہتی ہے۔

۴۔ کانگریس اور انگریزی حکومت

ہندو مہاسبھا کے ساتھ برٹش گورنمنٹ سے بھی کانگریس کا مفاد اسی نقطہ پر متحد ہوتا ہے۔ مسلمانوں میں شخصی اغراض رکھنے والی ایک قلیل جماعت کے سوا کوئی آپ کو ایسا نہ ملے گا جو برطانوی اقتدار سے کسی قسم کی مصالحت کرنے پر آمادہ ہو۔ مسلمان نہ صرف ہندوستان میں بلکہ تمام مشرقی ممالک میں اس امپیریلزم کا فوری، کلی اور قطعی زوال چاہتا ہے۔ برعکس اس کے ہندوؤں کی قومی پالیسی یہ ہے کہ انگریزی حکومت سے اچھی شرائط پر مصالحت کی جائے۔ یعنی ہندو لڑتا ہے نفع پر سودا کرنے کے لیے اور مسلمان لڑتا ہے معاملہ ختم کرنے کے لیے۔ مزید برآں مسلمان انگریزوں کے کسی کام کا نہیں کہ اس کی جیب خالی ہے۔ اور ہندو ایک سرمایہ دار قوم ہے جس کے ساتھ تجارتی معاملہ بھی کیا جا سکتا ہے اور آڑے وقت میں مالی مدد بھی اس سے مل سکتی ہے۔ لہٰذا جس طرح فلسطین میں ایک سرمایہ دار قوم کا تعاون حاصل کرنے کے لیے مسلمانوں کو بھینٹ چڑھانا مفید تھا اسی طرح ہندوستان میں بھی ایک دوسری قوم کا تعاون حاصل کرنے کے لیے ان کو بھینٹ چڑھانا فائدے سے خالی نہیں۔ اسی بنا پر یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ برٹش گورنمنٹ اور کانگریس کے درمیان سودا گرانہ معاملہ ہو رہا ہے۔ صوبوں کی حکومت میں تو سودا پٹ چکا ہے، اور اب جو کچھ کھینچ تان ہو رہی ہے صرف مرکزی اقتدار کے معاملہ میں ہے۔ یہ کچھ زیادہ مانگتے ہیں اور وہ کچھ کم پر راضی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی چونکہ معاملہ نیا نیا ہے، اس لیے کچھ بدگمانیاں بھی ہیں۔ وہ ابھی پوری طرح اعتماد بھی کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ تحفظات کی رسی انہوں

نے ان کے گلے میں باندھ رکھی ہے۔ جب یہ سلطنت برطانیہ کی محفوظ چراگاہ کی طرف بڑھتے ہیں تو وہ پوری طاقت کے ساتھ رسی کھینچ لیتے ہیں اور جب یہ کھلے میدان میں اقلیتوں کی کھیتی چرنے کے لیے بڑھتے ہیں، تو وہ اطمینان کے ساتھ رسی ڈھیلی چھوڑ دیتے ہیں۔ دستور میں اقلیتوں کی حفاظت کے لیے گورنروں کو جو مخصوص اختیارات دیے گئے ہیں ان کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ اگر کبھی خدانخواستہ کانگریسیوں نے اس سازش، گاندھی جی کے بقول "شریف آدمیوں کی سی قرارداد" (Gentlement's AGREEMENT) سے جو ان کے اور برٹش گورنمنٹ کے درمیان ہو چکی ہے، انحراف کیا اور تاج کے مفاد کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو اس وقت تاج کے بجائے اقلیتوں کے مفاد کی حفاظت کا بہانہ کر کے ان کی گوشمالی کی جاسکے۔

۵۔ کانگریس کا اصل مقصد

اس لی بھگت میں برطانیہ کا مفاد پوری طرح محفوظ ہے۔ سول سروس پر ہاتھ نہیں ڈالا جاسکتا۔ یورپین باشندوں کے حقوق سے بھی تعرض نہیں کیا جاسکتا۔ سرکار کے مالی مفاد کو بھی نہیں چھیڑا جاسکتا۔ مختصر یہ ہے کہ جن جن چیزوں سے انگریزی سلطنت کی اغراض کا تعلق ہے دستورِ حکومت میں ان سب کی حفاظت اچھی طرح کر لی گئی ہے، اور کانگریسی وزارتیں جو اس دستور کو عملاً قبول کر کے حکومت کا نظم و نسق چلا رہی ہیں، ان حدود میں نہ قدم رکھ سکتی ہیں اور نہ قدم رکھنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اب یہ ظاہر ہے کہ موجودہ دستور کی حدود میں رہ کر کسی ایسے پروگرام پر تو عمل کرنا ممکن ہی نہیں ہے جس پر حقیقت میں "جنگِ آزادی" کا اطلاق ہو سکے۔ کیونکہ "جنگِ آزادی" کو خواہ آپ کتنا ہی نیچے گرا لائیں، بہر حال اس کا منشا یہ تو ہونا چاہیے کہ جہاں باشندگانِ ہند کا مفاد سرکارِ برطانیہ کے مفاد سے متصادم ہوتا ہو وہاں سرکار کے مفاد کو گرایا جائے اور ہندوستان کی "جنتا" کے مفاد کو ابھارا جائے۔ مگر جس دستور میں سرکار کا مفاد محفوظ ہے اس کی پابندی قبول کرنے کے بعد ایسا کرنا غیر ممکن ہے۔ پھر یہ سوال خود بخود پیدا ہوتا ہے کہ جنگِ آزادی کا دعویٰ لے کر اٹھنے والی جماعت اس دستور کو کس لیے قبول کر رہی ہے اور کیوں اسے چلانے پر مصر ہے؟

اس سوال کی تحقیق اگر آپ واقعات کی روشنی میں کریں گے تو یہ حقیقت آفتاب کی طرح نمایاں ہو جائے گی کہ اس وقت کانگریس کے سامنے کوئی پروگرام اس کے سوا نہیں ہے کہ پراونشل اٹانومی سے جو اختیارات بھی حاصل ہو سکیں، انہیں سے کر جدید ہندوستانی قومیت کی تخلیق میں استعمال کیا جائے، اور اس ملک کی مختلف قلیل التعداد قوموں میں اپنے امتیازی وجود کو برقرار رکھنے کی جس قدر طاقت باقی ہے اسے حکومت کے زور سے ختم کر دیا جائے۔ نئے دستور کی بنیادی کمزوریوں کے باوجود اس کے پراونشل اٹانومی والے حصہ کو اسی بنا پر قبول کیا گیا ہے کہ اس کا یہی ایک پہلو روشن ہے اور ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اس کے فیڈریشن والے حصہ کو بھی بازاماں عشوہ و ناز آخرکار اسی روشن پہلو کی خاطر قبول کیا جائے گا تاکہ مسلم اکثریت والے صوبوں کو مرکزی اقتدار کے واسطہ سے قابو میں لایا جائے۔

اس پروگرام کی ایک ایک دفعہ کو میں الگ الگ بیان کروں گا اور تفصیل کے ساتھ بتاؤں گا کہ اس پر کس طرح عمل ہو رہا ہے اور اس کے نتائج کیا ہیں۔

۱۔ پارٹی سسٹم اور اس کے اثرات

دستورِ جدید کے مطابق حکومت کے نظام کو چلانے کے لیے کانگریس نے پارٹی سسٹم اختیار کیا ہے۔ پارٹی سسٹم کی مختصر تشریح یہ ہے کہ جس مجلسِ قانون ساز میں کسی پارٹی کی اکثریت ہو وہاں خالصتہً اسی کی حکومت قائم ہو جائے اور وہ دوسری جماعتوں کو من حیث الجماعت، حکومت میں شریک نہ کرے۔ یہ حکمران جماعت اپنی اکثریت کے زور پر جو قانون چاہے گی بنائے گی اور جس تجویز یا مسودہ قانون کو چاہے گی مسترد کر دے گی۔ پھر اپنے بنائے ہوئے قوانین کو نافذ کرنا بھی اسی پارٹی کے اختیار میں ہو گا۔ کیونکہ حکومت کا نظم و نسق کلیتہً اسی کی وزارت کے ہاتھ میں رہے گا۔ جو لوگ اس کے اندر داخل ہوں وہ صرف اسی صورت سے داخل ہو سکتے ہیں کہ پارٹی کے عہد نامہ پر دستخط کریں اور اس کے ڈسپلن میں جکڑ دیئے جائیں۔ پھر جب وہ اس طرح پارٹی ڈسپلن کے تابع فرمان ہو جائیں گے تو ان کے لیے یہ ناممکن ہو گا کہ کسی ایسی تجویز یا مسودہ قانون کی مخالفت کریں جو پارٹی کی طرف سے پیش ہو، یا خود اپنی طرف سے کوئی ایسی

چیز پیش کریں جس کی اجازت پارٹی نے نہ دی ہو یا حکومت کی پالیسی پر نکتہ چینی کریں۔ ان کو ہر حال میں پارٹی کی فرمانبرداری کرنی ہوگی اور اگر آزادیٔ رائے استعمال کرنا چاہیں گے تو انہیں پارٹی سے باہر نکل جانا ہوگا۔ نیز وہ پارٹی کے اندر رہ کر بھی اس کی پالیسی میں کوئی تبدیلی نہیں کرا سکتے جب تک کہ وہ پارٹی میں اکثریت کو اپنا حامی نہ بنا لیں۔

حکومت کا یہ سسٹم کانگریس نے ان تمام صوبوں میں اختیار کیا ہے جہاں ہندوؤں کی اکثریت ہے۔ اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ مسلمانوں کو عملاً قانون سازی اور تنفیذ قانون، دونوں سے بیدخل کر دیا گیا ہے۔ اگر مسلمان کانگریس پارٹی سے الگ رہیں تو وہ اپنی اقلیت کی وجہ سے نہ اپنے مفاد کے لیے کوئی قانون بنوا سکتے ہیں، نہ اپنے مفاد کے خلاف کسی قانون کی منظوری کو روک سکتے ہیں اور نہ قوانین کو نافذ کرنے والی مشین یعنی وزارت میں ان کا کوئی پرزہ شریک ہو سکتا ہے۔ اور اگر وہ اس پارٹی میں شامل ہو جائیں تو انہیں پارٹی ڈسپلن کے طوق و سلاسل پہننے پڑتے ہیں اور اس کا کوئی فائدہ اس کے سوا حاصل نہیں ہوتا کہ باہر رہتے ہوئے زبان کی جو آزادی وہ استعمال کر سکتے تھے وہ بھی چھن جاتی ہے۔ رہا اندر سے پارٹی کی پالیسی پر اثر ڈالنا، تو اقلیت ہونے کی وجہ سے یہاں بھی اس کا کوئی موقع نہیں۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اڑیسہ اور سی پی میں تو علانیہ وہ حکومت کے نظم و نسق سے بے دخل ہیں، اور جن صوبوں میں ایک یا دو مسلمان وزیر بنائے گئے ہیں وہاں دراصل مسلمانوں کی جماعت کو بحیثیت جماعت کے حکومت میں حصّہ نہیں دیا گیا ہے بلکہ ان کے ایک فرد یا دو افراد کو انفرادی حیثیت سے ذکر رکھا گیا ہے تاکہ محض اس بات کی نمائش کی جا سکے کہ وزارت میں مسلمان بھی شریک ہیں۔

آئینی حیثیت سے دیکھیے تو ان ملازموں کی حیثیت ذمّہ دار وزراء کی نہیں ہے، کیونکہ ذمہ دار وزیر وہ ہوتا ہے جس کو اپنی جماعت کی اکثریت کا اعتماد حاصل ہو، اور انہیں اپنی ذات کے سوا کسی کا اعتماد حاصل نہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہیں ان مسلمان ووٹروں کا اعتماد حاصل ہے جنہوں نے ان کو منتخب کیا۔ مگر کل مسلمان ووٹروں میں

ان کے ووٹروں کا تناسب شاید پانچ فیصدی سے زیادہ نہیں ہے۔ اس کے معنی یہ ہوتے کہ وزارت میں، جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، اکثریت کی نہیں بلکہ اقلیت کی حکومت ہے، اور جہاں تک ہندوؤں کا تعلق ہے، ان کی اکثریت حکمران ہے کیونکہ ہندو وزیر ہندو ووٹروں کی اکثریت کا اعتماد رکھتے ہیں۔

عملی حیثیت سے دیکھئے تو یہ بالکل بے زور ہیں۔ ان کی پشت پر کوئی طاقت نہیں جس کے بل بوتہ پر یہ کوئی بات زور کے ساتھ کہہ سکیں، بخلاف اس کے ہندو وزراء کی پشت پر مجلس قانون ساز کی اکثریت کا زور ہے۔ یہ بیچارے بعض صوبوں میں تو کانگریس پارٹی کے اندر بالکل اکیلے ہیں، اور بعض جگہ صرف دو چار مسلمان ان کی مدد پر موجود ہیں بھی تو وہ غریب خود پارٹی ڈسپلن میں جکڑے ہوئے ہیں۔

اس طرح ہندو اکثریت کے صوبوں میں مسلمان وزراء کی حیثیت ایک نوکر سے زیادہ نہیں ہے اور اس حیثیت کا کھلا ہوا مظاہرہ سی پی کے سابق مسلمان وزیر مسٹر شریف کے معاملہ میں ہو چکا ہے۔ انہوں نے جب ایک مسلمان قیدی کو اپنے اختیارات سے کام لے کر رہا کیا اور اس پر مہا سبھائی ہندوؤں نے شور مچایا تو کانگریس ہائی کمانڈ نے کان پکڑ کر ان کو ایوانِ وزارت سے باہر کر دیا، درآنحالیکہ باقاعدہ تحقیقات سے یہ ثابت ہو چکا تھا کہ انہوں نے نہ تو اس معاملہ میں مذہبی عصبیت سے کام لیا، نہ کسی قسم کی بدیانتی کی اور نہ جائز قانونی حدود سے تجاوز کیا۔[1] اس کے برعکس ابھی حال میں مسٹر شریف کے جانشین ہندو وزیر نے اسی قسم کے ایک مجرم کو جسے ہائی کورٹ سے سزا ہو چکی تھی، اپنے اختیارات سے کام لے کر رہا کر دیا اور اس سے کوئی باز پرس نہ ہوئی۔ مسٹر شکلا نے وزارت کا قلمدان سنبھالتے ہی فسادات جبل پور کے ملزموں کو جنہیں سشن سپرد کیا جا چکا تھا، بلا کسی قانونی وجہ کے رہا کر دیا اور اس پر بھی کسی تحقیقات کی ضرورت نہ سمجھی گئی۔[2] پنڈت شکلا سے پہلے ڈاکٹر

---

[1] ملاحظہ ہو مدینہ ۲۵ / جون ۳۸ء

[2] ٹریبیون مورخہ ۱۹ / جون ۳۸ء

کھرے کی وزارت پر خود کانگریسیوں نے رشوت، خیانت، غبن اور اپنے متعلقین کو ملازمتوں میں بھرنے کے سخت الزامات عائد کیے تھے، مگر ان کے معاملہ کو گاندھی جی نے یہ کہہ کر رفع دفع کر دیا تھا کہ:۔

"کانگریس بہرحال انسانوں پر مشتمل ہے اور وہ خوبیوں اور برائیوں دونوں میں اس قوم کے ساتھ برابر کے حصہ دار ہیں جس کی وہ نمائندگی کر رہے ہیں۔"[1]

اس میں شک نہیں کہ ڈاکٹر کھرے کے ساتھ بعد میں بہت سخت معاملہ کیا گیا، مگر کس وقت؟ جب کہ انہوں نے کھلم کھلا خدایانِ کانگریس کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ مسٹر شریف کی طرح اگر وہ گھٹنے ٹیک کر ناک رگڑتے تو انہیں کبھی وزارت سے نہ نکالا جاتا۔

۷۔ جُداگانہ انتخاب

پارٹی گورنمنٹ اور پارٹی ڈکٹیٹر شپ قائم کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ جُداگانہ انتخاب ہے، کیونکہ اس کی بدولت مسلمانوں کی آواز نمایاں طور پر بلند ہو سکتی ہے، اور اگر مسلمان نمائندوں کی بڑی اکثریت کانگریس پارٹی سے الگ رہے تو پارٹی گورنمنٹ قائم کرنے کی صورت میں کانگریس کی مہاسبھائیت بالکل بے پردہ ہونے لگتی ہے۔

مخلوط انتخاب کا مطالبہ اسی بدنمائی کو دُور کرنے کے لیے بار بار پیش کیا جاتا تھا۔ مگر انگریز ابھی اس "شریف آدمیوں کی سی قرارداد" پر پوری طرح اعتماد کرنے کے لیے تیار نہ تھا جو اس کے اور کانگریس کے درمیان زیر تجویز تھی۔ اس لیے مسلمانوں کے مفاد کی خاطر نہیں بلکہ اپنے مفاد کی خاطر اُس نے جُداگانہ انتخاب کو برقرار رکھا۔

اس میں ناکام ہونے کے بعد دوسری تدبیر یہ نکالی گئی کہ جُداگانہ انتخاب میں اندر سے نقب لگائی جائے۔ یعنی کانگریس براہِ راست مسلمان حلقہ ہائے انتخاب میں

---

[1] ملاحظہ ہو مدینہ ۲۱ اگست ۳۸ء

جاکر مسلمان ووٹروں کو ہموار کرے، اور ایسے مسلمانوں کو خود مسلمان رائے دہندگان ہی سے منتخب کرائے جو پارٹی ڈسپلن اور ڈکٹیٹر شپ کو بخوشی قبول کرنے والے ہوں، اپنے صوبہ کی کانگریس پارٹی کے اور پھر اس پر ہائی کمانڈ کے غلام بن کر رہیں، جس طرح یہ آقا انہیں بٹھائیں اسی طرح بیٹھیں اور جس طرح اٹھائیں اسی طرح اٹھ جائیں، جس قسم کے قوانین ہندو اکثریت پاس کرنا چاہے انہیں مسلمانوں کی طرف سے بے چون و چرا منظور کریں، اور مسلمانوں کی قومیت کو فنا کرنے کے لیے جو تدبیریں کوئی مہاتما یا کوئی پنڈت سوچے ان کو مسلمانوں میں نافذ کرنے کی زحمت خود مہاتما یا پنڈت صاحب کو نہ اٹھانی پڑے بلکہ یہ خدمت کوئی خاں صاحب یا کوئی سید صاحب انجام دیں۔ اس کا نہایت پاکیزہ نام مسلم ماس کانٹیکٹ رکھا گیا ہے۔

اگر یہ چیز کامیاب ہو جائے اور مسلمانوں کے حلقہ ہائے انتخاب اس حد تک کانگریس پارٹی کے زیر اثر آجائیں کہ وہ اپنے مطلب کے جس مسلمان کو چاہے ان سے منتخب کرالے، اور جو مسلمان اس کے مقابلہ پر کھڑا ہو وہ ناکام ہو جائے، تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اگر کبھی کسی موقعہ پر مسلمانوں کے مفاد کی شدید پامالی دیکھ کر کانگریس پارٹی کے کسی مسلمان رکن کو غیرت بھی آگئی اور وہ رکنیت سے مستعفی بھی ہو گیا تو کانگریس پارٹی خود اس کے حلقہ انتخاب میں اس کو شکست دے گی اور اس سے کم تر غیرت رکھنے والے کسی مسلمان کو مسلمان ووٹروں سے منتخب کرائے گی تاکہ وہ اس سے زیادہ بے پروائی کے ساتھ اپنی قوم کے مفاد کو پامال کرائے۔ ماس کانٹیکٹ اس انتہائی نتیجہ تک پہنچ کر رہے گا، اگر اس کی تائید میں ہمارے علمائے کرام چند سال اسی سرگرمی کے ساتھ کوشش کرتے رہے۔ پھر جب تیر ہاتھ سے نکل چکے گا، تو اس کو واپس لانے کے لیے بخاری شریف کا ختم پڑھایا جائے گا۔

۸۔ مسلمانوں کی حالت

اس کے بعد مسلم اکثریت کے صوبوں کا سوال باقی رہ جاتا ہے۔ سو ان کے لیے اجتماعی ہاہی گیری (Mass Contact) اور انفرادی صید افگنی (Individual Contact)

دونوں سے آج کل کام لیا جا رہا ہے۔

مسلمان دس پندرہ برس سے جس خوابِ غفلت میں مبتلا تھے اس کے بدترین نتائج آج ہم دیکھ رہے ہیں۔ جدید آئین کے نافذ ہونے پر جب اسمبلیوں کے لیے انتخابات ہوئے تو یہاں کوئی ایسی منظم پارٹی نہ تھی جو قوم کے مفاد کو سامنے رکھ کر کام کرتی اور مسلمان رائے دہندوں کو صحیح سیاسی تعلیم دے کر ایسے نمائندے منتخب کراتی جو بے غرض، مخلص اور ایک مرکزی نظام کے مطیع ہوتے۔ جگہ جگہ مختلف جماعتوں نے محض شخصی اغراض اور طائفہ بندی کی بنیاد پر الیکشن لڑے۔ جس شخص کو کسی قسم کا اثر حاصل تھا وہ ایک پارٹی بنا کر کھڑا ہو گیا اور دوسری پارٹی کے مقابلہ میں نبرد آزما ہوا۔ قومی پروگرام اور قومی پالیسی نہ اس کے پاس نہ اُس کے پاس۔ ہر ایک کے سامنے وزارتیں، مناصب اور عزت و جاہ۔ اس طرح یہ لوگ اسمبلیوں میں پہنچے اور ان کی بدولت مسلمانوں کی اکثریت ایک بندھے ہوئے جتھے کا زور رکھنے کے بجائے بہت سی ٹکڑیوں میں بٹ کر بے زور ہو گئی۔ ان چھوٹی چھوٹی پارٹیوں کے ساتھ ساتھ ایک اچھی خاصی تعداد میں انڈی پنڈنٹ ارکان بھی منتخب ہو کر پہنچے۔ انڈی پنڈنٹ کے معنی عام فہم زبان میں مُرغِ بادنما کے ہیں جو کوئی قومی مقصد یا قومی پروگرام لے کر نہیں جاتا بلکہ اس لیے جاتا ہے کہ شخصی حیثیت سے قسمت آزمائی کرے اور جدھر کامیابی کا مرتع دیکھے ادھر چلا جائے۔ عام مسلمان ووٹر ایسے جاہل کندۂ ناتراش تھے کہ انہوں نے نہ ان مرغانِ بادنما سے پوچھا اور نہ ان جتھے بند لیڈروں سے کہ آپ حضرات کے پاس پروگرام کیا ہے؟ آپ کس لیے اسمبلی میں جانا چاہتے ہیں؟ آپ کس کیرکٹر کے لوگ ہیں؟ آپ نے پہلے ہماری قوم کے لیے کیا کیا اور اب کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟ یہاں کسی کے ذہن میں یہ تھا ہی نہیں کہ اسمبلی کیا بلا ہوتی ہے، جدید دستور کیا ہے، اور ان اسمبلیوں میں جو کچھ ہوگا اس کے کیا اثرات ہماری زندگی پر پڑیں گے۔ یہاں تو دیکھنے والوں نے بس یہ دیکھا کہ اسمبلی کی کرسی عزت کی کرسی ہے تو کیوں نہ ہمارے قبیلہ کا آدمی اس کرسی پر پہنچے، چاہے وہ خرِ ناشناس ہی کیوں نہ ہو۔ غرض اس قومی حماقت کا جو نہایت وسیع پیمانہ پر ملک کے

کئی صوبوں میں کی گئی، یہ انجام ہوا کہ مسلم اکثریت کے صوبوں میں کوئی منظم جماعت ایسی پیدا ہی نہ ہو سکی جو ہندو اکثریت کے صوبوں کی طرح مضبوط ہاتھوں سے حکومت کے اقتدار پر قبضہ کرتی اور ایک بنیان مرصوص بن کر جم جاتی۔

ادھر کانگریس جب ہندو اکثریت کے صوبوں میں ٹھوس بنیاد پر وزارتیں قائم کر چکی تو اس نے مسلم اکثریت والے صوبوں کی طرف دیکھا اور ان کی کمزوری کو بھانپ لیا۔ ان کے لیے اس نے جو پروگرام مرتب کیا وہ یہ تھا کہ ان صوبوں میں جو پارٹیاں برسرِ پیکار ہیں ان کو ایک دوسرے کے خلاف استعمال کیا جائے، ان کے افراد کی نفسانی کمزوریوں سے فائدہ اٹھایا جائے، ان میں جو ضعیف ترین کیرکٹر کے لوگ ہوں انہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر اور چھانٹ چھانٹ کر آلۂ کار بنایا جائے، اور اس طرح مسلمانوں کی جمعیت میں سے جتنے آدمی توڑے جا سکیں انہیں کانگریسی اقلیت کے چھوٹے مگر منظم بلاک کے ساتھ ملا کر ایسی وزارتیں قائم کرادی جائیں جو کانگریس ہائی کمانڈ کی تابعِ فرمان ہوں، یا اگر اس میں کامیابی نہ ہو سکے تو کم از کم وہاں وزارت کو اس قدر کمزور اور اس قدر بے اثر بنا دیا جائے کہ وہ ادھ موئی ہو کر رہ جائے۔ ماتم کا مقام ہے کہ کانگریس کی طرف سے اس جلیل القدر خدمت کا بیڑا بھاری ہی قوم کے ایک شخص نے اٹھایا، اور اس سے بھی بڑھ کر ماتم کا مقام یہ ہے کہ یہ شخص وہ تھا جس سے ہم شیخ احمد مجدد سرہندی اور شاہ اسمٰعیل شہید کی جانشینی کے متوقع تھے۔ جو کبھی اسلامی نظامِ جماعت کا سب سے بڑا داعی تھا، جس نے برسوں مسلمانوں کو وحدت و مرکزیت کی دعوت دی، جس کی زبان سے ہم کبھی ایاکم والتفرقہ فان الشاذ من الناس للشیطان کما ان الشاذ من الغنم للذئب[1] پر درس موعظت سنا کرتے تھے، جو کسی زمانہ میں ہم کو تلقین کیا کرتا تھا کہ جماعتی زندگی کی معصیت کا تخم (یعنی نظامِ جماعت

---

[1] اثر سیدنا علی رضی اللہ عنہ:۔ تفرقہ سے بچو کیونکہ بچھڑا ہوا آدمی شیطان کا حصّہ ہے جس طرح بچھڑی ہوئی بکری بھیڑیئے کا حصّہ ہوتی ہے۔

کا نہ ہونا) ایسا تخم ہلاکت ہے جو فوراً بربادی کا پھل لاتا ہے اور پوری قوم کی قوم تباہ ہو جاتی ہے"۔ مسلمانوں کی بدقسمتی کہ یا تو خوردہ امت کے پراگندہ سروں سے چو سرکھینے نکلا اور اس نے تمام ہندوستان کو اپنی قوم کا یہ تماشا دکھایا کہ اس قوم کے چیدہ اور سرآوردہ لوگ بھی کتنے ذلیل، کتنے بودے کیرکٹر کے لوگ ہیں، کس آسانی کے ساتھ ان کو آپس میں لڑایا جا سکتا ہے، اور کس بے شرمی کے ساتھ یہ لیڈر وزارت کے پیچھے اس پارٹی سے اُس پارٹی میں اور اُس سے اِس میں منتقل ہو جاتے ہیں۔

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا جو شدتِ الم سے بے اختیارانہ قلم سے نکل گیا۔ میں بتانا یہ چاہتا تھا کہ اس وقت مسلم اکثریت کے صوبوں میں کانگریس کی پالیسی کا منتہائے مقصود یہ ہے کہ جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں وہاں بھی ان کو خود مختارانہ حکومت نہ کرنے دی جائے بلکہ ان کے مناقشات سے فائدہ اٹھا کر یا اس کا ٹکٹ کے ذریعہ سے ان کے بڑے حصے کو شدھ کر کے وہاں ایسی وزارتیں قائم کرائی جائیں جو کانگریس ہائی کمانڈ کی تابع فرمان ہوں۔ اگر اس مقصد میں کانگریس کامیاب ہو گئی (اور کیوں نہ ہو گی جب کہ آج ہماری قوم اٹھارھویں صدی سے بھی زیادہ فیاضی کے ساتھ اپنے فاتح خود مہیا کر رہی ہے) تو یوں سمجھیے کہ یہ فیڈریشن سے بھی پہلے ایک ایسے فیڈریشن کا قیام ہوگا جس میں مرکزی اقتدار تمام تر ہندو اکثریت کے ہاتھ میں رہے گا۔ اور یہ مرکز برطانوی حکومت کے تجویز کردہ وفاقی مرکز سے بدرجہا زیادہ سخت و ہمہ گیر ہوگا۔ اس میں بات بات پر وزراء کے کان کھینچے جائیں گے، ذرا ذرا سے قصور پر ان کو پکڑ بلایا جائے گا، ان پر تحقیقاتی کمیشن بٹھا دیے جائیں گے، اور اگر انہوں نے کچھ مقابلہ کی ہمت کی تو لات مار کر ان کو ایوانِ وزارت سے باہر کر دیا جائے گا۔ جب وزارتیں مرکزی اقتدار کے ہاتھ میں اس درجہ بے بس ہوں اور پھر اقتدار ہندو اکثریت کے ہاتھ میں ہو، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ مسلم اکثریت کے صوبوں میں پراونشل آٹانومی حرفِ غلط کی طرح مٹ گئی اور ہندو اس جگہ بھی مسلمانوں پر حکمران ہو گئے جہاں وہ اقلیت میں ہیں۔

صوبہ سرحد کی مثال اس نتیجہ کی توضیح کے لیے بالکل کافی ہے۔ ہم دیکھ چکے

ہیں کہ جہاں ۹۵ فی صدی مسلم اکثریت ہے وہاں بھی حکومت کی پالیسی اور وزارت کی گردن کانگریس ہائی کمانڈ کے ہاتھ میں ہے۔ وردھا اسکیم اور ودیا مندر اسکیم کو بھیجنے اور صوبہ سرحد میں نافذ کرنے کے لیے پشاور سے ماہرین تعلیم دہلی اور وردھا بھیجے جاتے ہیں۔[1] سرحد کا وزیر اعظم ہندوؤں کو خوش کرنے کے لیے وعدہ کرتا ہے کہ انجمن حمایت اسلام کی ریڈریں مسلمان بچوں کو بھی نہ پڑھائی جائیں گی، اور ایک ہندو کے معاوضہ میں قبائل کے دس مسلمانوں کو پکڑا جائے گا۔ اس نیازمندی پر بھی یہ حال ہے کہ وزیر اعظم صاحب اگر ایک مسلمان ملزم کو الزام سے بری پا کر ملازمت پر بحال کر دیتے ہیں تو ہندو مہاسبھا ان کے خلاف شور محشر برپا کر دیتی ہے اور کانگریس ہائی کمانڈ اس کی باز پرس کے لیے وزیر صاحب کو بمبئی کھینچ بلاتی ہے۔ اس کے بعد بھی جو شخص نہ دیکھ سکے کہ یہ ملک سیدھی ہندو راج کو جا رہی ہے، اس کے حق میں بس یہی دعا کرنی چاہیے کہ خدا اسے آنکھیں دے۔

یہ تمام تفصیلات جو نمبر ۹، ۱۰ اور ۱۱ میں بیان کی گئی ہیں ان پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جدید دستوری اصلاحات سے فائدہ اٹھانے کا جو طریقہ کانگریس نے اختیار کیا ہے اس کا لازمی نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ اس دستور کی بدولت جس قدر سیاسی طاقت برطانوی امپیریلزم سے ہندوستان کی طرف منتقل ہو وہ کلی طور پر ہندوؤں کے ہاتھ میں آجائے۔ جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں تو وہ براہ راست ہندو اکثریت کے محکوم ہوں گے، اور جہاں ان کی اکثریت ہے وہاں ان کی حکومت کو کانگریس ہائی کمانڈ کا مطیع بنا لیا جائے گا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ماس کانٹیکٹ کے ذریعہ سے یہ کوشش برابر جاری رکھی جائے گی کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا علیحدہ سیاسی وجود ختم ہو جائے، نہ ان کی اپنی کوئی علیحدہ سیاسی پالیسی رہے اور نہ مستقل سیاسی قیادت، بلکہ وہ اس بڑے سیاسی مجموعہ (Body Politics) میں گم ہو کر رہ جائیں جس میں اصولی

---

[1] مشعل کابل مورخہ ۲۸ جون ۳۸ء و ٹریبیون مورخہ ۲۷ جولائی ۳۸ء

جمہوریت کی بنا پر ہندو عنصر کی حیثیت بہرحال غالب اور فیصلہ کُن رہے گی۔ اس مجموعہ میں گم ہو جانے کے بعد جو مجموعہ کے لیڈر ہوں گے وہی مسلمانوں کے بھی لیڈر ہوں گے، اور ظاہر ہے کہ اکثریت کی طاقت ہندوؤں ہی کو لیڈر بنائے گی۔ اسی طرح مسلمانوں کی سیاسی پالیسی بھی وہی ہو گی جو مجموعہ کی ہو گی، اور کھلی ہوئی بات ہے کہ جہاں سر شماری پر ہر بات کا فیصلہ ہو وہاں ہر پالیسی کا ہندو پالیسی ہونا لازم ہے۔

ہندوستان کے آئندہ سیاسی ارتقاء کو ہندو لیڈر جس راستہ پر لے جانا اور جس منزل تک پہنچانا چاہتے ہیں اس کا پہلا اور ضروری مرحلہ یہی ہے۔ اگر اس مرحلہ پر وہ سیاسی ارتقاء کا رُخ اپنی منزل کی طرف پھیرنے میں کامیاب ہو جائیں تو پھر لازماً آئندہ جو قدم بھی اُٹھے گا اسی منزل کی طرف اُٹھے گا، کیونکہ اس مرحلہ پر اُن کی کامیابی کے معنی یہ ہیں کہ گھوڑے کی باگیں پوری طرح اُن کے ہاتھ میں آ جائیں۔ اسی لیے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۳۵ء کو نامنظور کرنے کا بار بار اعلان کرنے پر بھی انہوں نے اسے منظور کر لیا۔

اب ہمارے بہت سے سادہ لوح بھائی بار بار پلٹ کر ہم سے پوچھتے ہیں کہ بتاؤ اس ڈیڑھ سال کی حکومت میں کانگریسی وزارتوں نے کہاں اور کیا مسلمانوں پر ظلم کیا؟ ایک صاحب نے تو اخبارات میں چیلنج بھی چھپوایا تھا۔ ہمارا جواب یہ ہے کہ بالفرض انہوں نے کوئی ظلم نہیں کیا۔ مان لیجئے کہ بڑی ہی اچھی حکومت کی۔ مگر یہ کون سی عقلمندی ہے کہ اپنی باگیں بالکل دوسروں کے ہاتھوں میں دے دی جائیں؟ سوال اُن اشخاص کا نہیں ہے جو آج برسرِ اقتدار ہیں، بلکہ سوال ادارہ کی نوعیت کا ہے۔ جس ادارہ کی نوعیت یہ ہو کہ ایک قوم دوسری قوم پر حکمران بن جائے اور ایک قوم دوسری قوم کے قبضۂ تصرف و اختیار میں چلی جائے، ظلم ایسے ادارہ کی عین فطرت میں داخل ہوتا ہے۔ آج بالقوہ ہے تو کل بالفعل ہو گا اور بالفعل ہوئے بغیر نہ رہے گا۔

۹۔ وردھا اسکیم

مختلف قوموں اور تہذیبوں کے مُلک میں اگر سیاسی اقتدار کسی ایک قوم کے ہاتھ میں مرکوز ہو جائے اور پھر وہ تمام ملک کے لیے ایک قومیت اور ایک تہذیب و تمدن کی

تشکیل کرنا چاہے تو یہ فطری اور لازمی بات ہے کہ اس قومیت اور اس تہذیب و تمدن کی شکل اُسی برسرِ اقتدار قوم کے منشا کے مطابق ہوگی۔ دوسری قوموں کی تہذیب اور قومیت کا رنگ اس میں پھیکا ہوگا اور پھیکا ہوتا چلا جائے گا۔ یہاں تک کہ بالکل تحلیل ہو جائے گا۔ نامساوی آمیزش میں انصاف ممکن ہی نہیں، خواہ کتنی ہی نیک نیتی کے ساتھ انصاف کی کوشش کی جائے۔ کانگریس نے اقتدار حاصل کرنے کے بعد مستقبل کے ہندوستان کی تشکیل جس ڈھنگ پر شروع کی ہے، اس کو آنکھیں کھول کر دیکھیے۔ آپ کو خود نظر آ جائے گا کہ اس نقشہ میں مسلمانوں کی قومیت اور تہذیب کے لیے کوئی جگہ نہیں۔

سب سے پہلے وردھا اسکیم کو لیجیے[1] یہ اسکیم مہاتما گاندھی کی رہنمائی میں بنائی گئی ہے[2]۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اسکیم کے مطابق عام باشندگانِ ہند کے بچوں کو سات برس سے چودہ برس کی عمر تک لازمی جبری تعلیم دی جائے گی۔[3] لازمی اور جبری تعلیم کا مفہوم خوب ذہن نشین کر لیجیے۔ جس علاقے میں حکومت کے زور سے یہ اسکیم نافذ ہوگی وہاں کا کوئی باشندہ نہ تو اپنی اولاد کو اس نظامِ تعلیم میں شریک ہونے سے روک سکے گا اور نہ کوئی دوسرا نظامِ تعلیمی ایسا موجود ہوگا جس میں وہ انہیں داخل کر سکے۔ آدمی کا کیرکٹر جس عمر میں بنتا ہے یا یوں کہیے کہ جس عمر میں آدمیت کی تشکیل ہوتی ہے وہ بیشتر بلکہ تمام تر اس اسکیم کے قبض و تصرف میں آ جاتی ہے۔ انگریزوں کا بنایا ہوا نظامِ تعلیم لازمی و جبری نہ تھا۔ اس میں جبر کا عنصر صرف اس حیثیت سے تھا کہ جو اس کے دائرے سے باہر رہے گا وہ مادّی کامیابی کے مواقع سے محروم رہے گا۔ تاہم اس میں آدمی کے لیے یہ اختیار باقی تھا کہ

---

[1] میرے پیشِ نظر وردھا رپورٹ بھی ہے جو رسالہ جامعہ مورخہ جنوری ۳۸ء میں شائع ہوئی ہے اور وہ انگریزی پمفلٹ بھی ہے جو (Basic National Education) کے نام سے ہندوستانی تعلیمی سنگھ نے شائع کیا ہے۔ مگر میں زیادہ تر اردو رپورٹ ہی کا حوالہ دوں گا۔

[2] جامعہ جنوری ۳۸ء صفحہ ۱۱۱

[3] جامعہ جنوری ۳۸ء صفحہ ۱۳۱

اگر اس محرومی کو قبول کر لے تو اس نظامِ تعلیمی سے آزاد رہ کر جس نظام کو پسند کرے اس میں شریک ہو جائے۔ لیکن وردھا اسکیم میں سرے سے یہ اختیار باقی نہیں رہتا۔ یہاں آدمی مجبور ہے کہ اپنی آئندہ نسل کو اسی نوعیت کا آدمی بنانے کے لیے سپرد کر دے جس نوعیت کے آدمی یہ اسکیم بنانا چاہتی ہے۔

اچھا اب دیکھیے کہ یہ اسکیم کس نوعیت کے آدمی بنانا چاہتی ہے؟ وہ بنیادی تصورات جن پر یہ پوری اسکیم تیار کی گئی ہے حسبِ ذیل ہیں:۔

۱۔ ہندوستان کی پوری آبادی کو "ایک قوم" فرض کیا گیا ہے۔ اسکیم میں جگہ جگہ ہم کو اس قسم کے فقرے ملتے ہیں:۔

"مہاتما گاندھی نے اس کا بیڑا اُٹھایا ہے کہ تعلیم کی ایک ایسی راہ نکالیں گے جو ہندوستانیوں کی طبیعت کے مناسب ہو اور جس سے ساری قوم کی تعلیم کا کام کم سے کم وقت میں چل نکلے۔" (صفحہ ۱۱)

"اسے تعلیم کی اچھی پالیسی اور قوم کی ترقی کی ضروری تدبیر سمجھ کر قبول کر لینا چاہیے۔" (صفحہ ۱۴)

"اور قوم کے بچوں کو اس تعلیمی اسکیم کا مقصد اور اس کی قیمت سمجھا سکے۔" (صفحہ ۱۲۰)

اسکیم کا نام ہی "بنیادی قومی تعلیم" کی اسکیم ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نظامِ تعلیم کی بنیاد ہی قومیتوں کی نفی پر رکھی گئی ہے۔ اس میں کسی کی جداگانہ قومیت کا رنگ نہیں آسکتا۔ یہ بنایا ہی اس لیے گیا ہے کہ ہماری آئندہ نسل کے ذہن سے اس تخیل کو نکال دے کہ "ہندوستانی" کے سوا ان کی اور قومیت بھی ہے۔

۲۔ شدھ ہندوستانی بن جانے کے بعد سب سے پہلی اور سب سے اہم صفت جس سے بچہ کو متصف ہونا چاہیے وہ یہ ہے کہ وہ ایک اچھا کاروباری آدمی ہو۔ ہر علم اس کو اس لیے سکھایا جائے اور وہ اسی لیے اس کو سیکھے کہ روٹی پیدا کرنے میں اس سے مدد ملے۔ اسکیم کے واضعین کی نگاہ میں آدمیت اور کمانے کی قابلیت دونوں مترادف

المعنی الفاظ ہیں۔ پوری اسکیم پر تعلیم کا مادّی نقطۂ نظر اس قدر غالب ہے کہ اس کے زیرِ اثر جو نسل پرورش پائے گی وہ مادہ پرست بن کر اٹھے گی اور خوردن برائے زیستن کے بجائے زیستن برائے خوردن کی معتقد ہو گی۔ ایک طرف تعلیم دینے والی حکومت رعایا کے بچوں کی تعلیم کا انتظام اس ذہنیت کے ساتھ کرے گی کہ اس پر تعلیمی مصارف کا کم سے کم بار پڑے اور بچے کسی ایسی دستکاری کے ذریعہ سے تعلیم حاصل کریں جس کی آمدنی سے اُستادوں کی تنخواہیں اور مدرسے کا خرچ[1] نکل آئے۔ دوسری طرف پورا نظامِ تعلیم بچے میں یہ ذہنیت پیدا کرے گا کہ کما کھانا اس کی زندگی کا اوّلین بلکہ شاید ایک ہی مقصد ہے۔ تعلیم کا مرکز و محور کسی نہ کسی بنیادی دستکاری، مثلاً زراعت یا پارچہ بافی یا لکڑی یا دھات کے کام کو رکھا گیا ہے اور پورے تعلیمی کورس کو اسی محور کے گرد گھمایا گیا ہے۔ اس میں دو بنیادی مقصد واضعین کے پیشِ نظر ہیں۔ ایک یہ کہ:۔

"ہر سمجھ دار شہری کو سماج کا کام کرنے والا رکن ہونا چاہیے"

(صفحہ ۱۱۴)

"یہ اسکیم اس لیے بنائی گئی ہے کہ ملک میں کام کرنے والے پیدا ہوں جو ہر مفید کام کو چاہے وہ میلا اٹھانے ہی کا کام ہو عزت کے قابل سمجھیں، جو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہتے ہوں" (صفحہ ۱۱۴)

"ہمارا مقصد عالم فاضل پیدا کرنا نہیں بلکہ ہوشیار سمجھدار پڑھے لکھے دستکار پیدا کرنا ہے جو صحیح خیالات اور سماج کی خدمت کا شوق رکھتے ہوں" (صفحہ ۱۲۰)

دوسرا مقصد یہ ہے کہ:۔

"مہاتما جی نے صاف لفظوں میں کہا ہے کہ حکومت کو اس کا ذمہ لینا

---

[1] صفحہ ۱۱۲

چاہیئے کہ اپنے ہونے والے شہریوں کے کام کی پیداوار کو اس بھاؤ (بازار کے بھاؤ) پر خریدلے گی ۔۔۔۔۔۔۔ ہم اس رائے کی پوری طرح تائید کرتے ہیں۔ اس آمدنی سے جو مالی فائدہ ہوگا اسے چھوڑ کر یُوں بھی ہمارا خیال ہے کہ سکھانے والوں اور سیکھنے والوں کے کام کی اچھائی کو جانچنے اور ناپنے کا کوئی پیمانہ ہونا چاہیئے ۔" (صفحہ ۱۱۵)

یعنی تعلیم کی کامیابی کو جانچنے اور ناپنے کا پیمانہ یہ ہے کہ طلبہ نے کتنا کمایا اور استادوں نے ان کو کتنا کمانے کے قابل بنایا۔ اسی مادی نقطۂ نظر کی بنا پر ساڑھے پانچ گھنٹہ کے اوقات تعلیمی میں سے ۳ گھنٹہ ۲۰ منٹ دستکاری کے لیے وقف کیے گئے ہیں، اور باقی اوقات میں جو دوسرے علوم پڑھائے جائیں گے ان میں بھی بنیادی مقصد یہ رکھا گیا ہے کہ وہ کاروباری زندگی میں مددگار ہوں۔ اس پوری اسکیم پر نظر ڈالنے سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ اس کے پیشِ نظر ایک صنعتی سماج **(Industrial Society)** پیدا کرنا ہے جس کے افراد زیادہ تر مادی قدروں ہی سے واقف ہوں، مادی پیمانے ہی سے زندگی کی ہر چیز کو ناپیں، اور بلند تر اخلاقی و روحانی چیزوں کی قدر کرنے کا ذوق ہی ان میں پرورش نہ پاسکے۔ ایسی سماج کے ماحول میں ہر روحانی تہذیب خود ٹھٹھر کر رہ جائے گی[1]

۳۔ اس مادہ پرست سوسائٹی میں "شہریت" **(Citizenship)** کا جو

---

[1] کوئی شخص ہماری تنقید سے یہ نہ سمجھے کہ ہم کسبِ رزق کو غیر اہم اور غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ ہمیں اس کی اہمیت سے ہرگز انکار نہیں۔ مگر ہمارے اور وردھا اسکیم کے نقطۂ نظر میں وہی فرق ہے جو خوردن برائے زیستن اور زیستن برائے خوردن میں ہے۔ ایک نقطۂ نظر یہ ہے کہ روٹی مقصود بالذات ہو اور دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ مقصدِ حیات اس سے بلند تر ہو اور روٹی اس مقصد کی خاطر زندہ رہنے کے لیے ہو۔ پہلا نقطۂ نظر اگر کسی سوسائٹی پر چھا جائے تو اسلام اس میں زندہ نہیں رہ سکتا۔

مطمح نظر (Ideal) اختیار کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ :۔

"یہ ہونے والی بات ہے کہ نئے ہندوستان کی سماجی زندگی، سیاست، معیشت اور تہذیب میں جمہوریت کا رنگ دن بدن بڑھتا جائے گا۔" (صفحہ ۱۱۳)

جمہوریت کے رنگ کا مفہوم شاید عام لوگ نہ سمجھ سکیں۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ ہندوستان کے باشندے اپنی معاشرت اور تہذیب میں آئندہ یک رنگ ہوتے چلے جائیں گے۔ یہ دراصل اسکیم کے واضعین کا نصب العین ہے جس کو انہوں نے شدت یقین کی بنا پر پیشین گوئی کے انداز میں بیان کیا ہے۔ اس نصب العین کو سامنے رکھ کر وہ آئندہ نسل کو ایسی تعلیم دینا چاہتے ہیں جس سے :۔

"بچے کو عام طور پر انسانوں اور خاص طور پر ہندوستان کے لوگوں کی ترقی سے دلچسپی ہو جائے"

"اس کے دل میں وطن کی محبت ہو۔ وہ ہندوستان کے پچھلے زمانے کی عزت کرے اور آنے والے زمانے کے بارے میں یہ عقیدہ رکھے کہ یہ ایک ایسی سماج کا گھر ہو گا جس کی نیو مل کر کام کرنے اور محبت، سچائی اور نیاو پر رکھی جائے گی۔"

"سب کے دل میں ایک دوسرے کے مذہب کی اور دنیا کے سب مذہبوں کی عزت پیدا ہو جائے ...... دنیا کے مذہبوں کے اصول بتا کر یہ ثابت کیا جائے کہ خاص باتوں میں سب مذہب ایک ہیں۔"

"قومی تہواروں اور قومی ہفتے کا منانا ہر اسکول کی زندگی میں ایک خاص چیز ہونا چاہیے۔" (صفحہ ۱۱۰، ۱۱۹)

ان سب بیانات کا خلاصہ یہ ہے کہ اسکیم بنانے والوں کے پیش نظر مختلف مذاہب کے پیروں کو ملا کر ایک سماج، یعنی ایک ہیئت اجتماعی، یا ایک سوسائٹی بنانا ہے۔ اسی لیے وہ ہر مذہب کی ایسی تعلیمات کو بچوں کے ذہن سے خارج رکھنا ضروری سمجھتے ہیں جو

ان میں مذہبی انفرادیت پیدا کرتی ہوں۔ تمام مذاہب کے متعلق یہ نظریہ ان کے ذہن میں بٹھانا چاہتے ہیں کہ ان میں اصلاً کوئی فرق نہیں ہے سو وطن پرستی ان میں پیدا کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ مذہبیت کی بنیاد پر الگ الگ رہنے کے بجائے وطنیت کی بنیاد پر ایک دوسرے سے پیوست ہو جائیں۔ ہندوستان کے پچھلے زمانے کی عزت ان کے دل میں پیدا کرنا چاہتے ہیں تاکہ ان سب میں قومی افتخار کے جذبات ایک ہی سرچشمے یعنی ہندوستان کے زمانہ ماضی سے پیدا ہوں اور بیرونِ ہند کی تاریخ سے ان کے جذبات کا تعلق منقطع ہو جائے۔

وطنی قومیت بنانے کے لیے یہ چار عنصر ضروری ہیں، اور ہر وہ تعلیمی اسکیم جس کا بنیادی مقصد وطنی قومیت بنانا ہو اس پر مجبور ہے کہ مذاہب کے ایسے علم کو آئندہ نسل کے دل و دماغ سے دُور رکھے جو ان کے فرق اور اختلافات کو نمایاں کرنے والا ہو۔ اگر وہ شرک اور توحید، خدا پرستی اور بُت پرستی، پیغمبر اور اوتار، عقیدۂ آخرت اور عقیدۂ تناسخ کے فرق کو بچوں کے ذہن میں اُتر جانے دے گی تو اپنے عین مقصد کو نقصان پہنچائے گی۔ اس کے لیے تو ناگزیر ہے کہ بچوں کے مذہبی علم کو صرف اِس قسم کی باتوں تک محدود رکھے کہ دیکھو جھوٹ بولنا سب مذہبوں میں گناہ ہے، چوری سب میں حرام ہے، زنا کو سب منع کرتے ہیں۔ وغیر ذالک۔ اسی طرح وہ اس پر بھی مجبور ہے کہ جن قوموں کو افتخار کے جذبات بیرونِ ہند کی تاریخ سے ملتے ہیں ان کے اس سرچشمے کو بند کرے، اور پراچین سے کے ہندستان سے ان کا تعلق جوڑے۔ اگر وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور عمرؓ اور علیؓ، اور خالد رضی اللہ عنہم سے وابستگی کو یُوں ہی قائم رہنے دے گی تو اپنے اساسی مقصد پر خود ضرب لگائے گی۔ اس چیز کو مہاتما گاندھی نے صاف طور پر بیان کر دیا ہے۔

"ہم نے وَردھا کی تعلیمی اسکیم سے مذاہب کی تعلیم کو باہر رکھا ہے۔

اس لیے کہ آج مذاہب جس طرح پڑھائے جاتے ہیں اور جس طرح ان پر عمل کیا جاتا ہے وہ وحدت پیدا کرنے کے بجائے اختلافات پیدا کرنے کا موجب ہے۔ مگر میں یہ رائے رکھتا ہوں کہ جو سچائیاں تمام مذاہب میں مشترک ہیں

وہ سکھائی جاسکتی ہیں اور سکھائی جانی چاہئیں۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی عقائد کی تعلیم دینا اس پالیسی اور اس مقصد ہی کے خلاف ہے جس کے لیے یہ ساری اسکیم بنائی گئی ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب اپنے ایک بیان میں فرماتے ہیں کہ "وردھا اسکیم میں یہ تو کہیں نہیں لکھا کہ مذہبی تعلیم نہ ہونی چاہیئے۔ اس وقت جو طریقہ جاری ہے ہم نے اسی کو برقرار رکھا ہے یعنی مدرسہ کے اوقات کے ماسوا جو گروہ چاہے اپنے بچوں کی مذہبی تعلیم کا انتظام کر سکے۔" لیکن مہاتما گاندھی کا بیان اور خود ڈاکٹر ذاکر حسین کی اپنی اسکیم ان کے اس قول کی تکذیب کے لیے کافی ہے۔ جس قسم کی شہریت پیدا کرنے کو انہوں نے اپنی تعلیمی اسکیم کا مقصود ٹھیرایا ہے، اس کو یہ چیز بھی نقصان پہنچائے گی کہ مسلمان یا دوسرے مذاہب کے پیرو اپنے بچوں کو مذہبی عقائد کی تعلیم خارج از اوقات مدرسہ دیں۔ اگر وہ متضاد باتیں نہیں کرنا چاہتے تو انہیں یوں کہنا چاہیئے کہ ہماری خواہش تو یہی ہے کہ کوئی گروہ اپنے بچوں کو ایسے عقائد کی تعلیم نہ دے جو ہمارے نصابِ تعلیم کے برعکس انہیں یہ سکھاتے ہوں کہ سب مذاہب کے اصول ایک نہیں ہیں۔ لیکن اگر کوئی گروہ اوقاتِ مدرسہ کے ماسوا ایسی تعلیم دینا چاہے تو ہم مجبوراً برداشت کریں گے کیونکہ جبراً ہم اسے روک بھی نہیں سکتے۔ ڈاکٹر صاحب ایک معقول اور تعلیمیافتہ آدمی ہیں۔ وہ کم از کم اضداد میں تمیز تو کر سکتے ہیں۔ ان کے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں ہے کہ ایک نظام تعلیمی کی پالیسی یا تو یہ ہو سکتی ہے کہ بچے میں اسلامی قومیت کا شعور پیدا کیا جائے یا یہ ہو سکتی ہے کہ اس میں ہندوستانی قومیت کا (ہندوستانیت کا نہیں ——— بلکہ ہندوستانی قومیت کا) شعور پیدا کیا جائے۔ اگر ان کے تجویز کردہ نظام کی پالیسی پہلی ہے تو وہ بتائیں کہ ان کے نصاب میں کون سی چیز ہے جو کسی مسلمان بچے میں اسلامی قومیت کا شعور پیدا کرتی ہو۔ یا پیدا کرنا تو درکنار اس کو کم از کم

لہ نیشنل کال مورخہ ۸ جولائی ۳۸ء

سلہ ٹائمز ہیواؤں مورخہ ۷ جولائی ۳۸ء

باقی ہی رکھتی ہو؟ اور اگر ان کی پالیسی دوسری ہے تو وہ صاف صاف اس بات کا اقرار کیوں نہیں کرتے کہ ہم اسلامی قومیت کا شعور مٹا کر ہندوستانی قومیت کا شعور پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ یہ کیا ہے کہ وہ در حقیقت دوسری پالیسی اختیار بھی کرتے ہیں اور پھر مسلمانوں کو یہ بھی یقین دلانا چاہتے ہیں کہ ہم تمہارے بچوں میں سے اسلامی قومیت کا شعور مٹانا نہیں چاہتے۔ اگر وہ شمال کی طرف چل کر یہ سمجھتے ہیں کہ جو لوگ جنوب کی طرف جانا چاہتے ہیں ان کا مقصود بھی فوت نہ ہوگا، تو وہ ہمیں معاف فرمائیں، ہمیں ان کے ذوقِ عقل ہونے میں بھی شبہ ہے۔ اور اگر وہ ارادہ یہی رکھتے ہیں کہ جنوب کی طرف پہنچنے کی خواہش رکھنے والوں کا مقصد فوت ہو جائے مگر انہیں یقین یہ دلانا چاہتے ہیں کہ ان کا مقصد فوت نہ ہوگا، تو پھر منافقت کا شدید تر الزام ان پر عاید ہوتا ہے اور بہتر ہے کہ وہ اس سے بچنے کی کوشش فرمائیں۔

ودیا مندر اسکیم کے انگریزی ایڈیشن میں جو تفصیلی نصاب درج کیا گیا ہے افسوس کہ اس کا ترجمہ اردو میں شائع نہیں کیا گیا، ورنہ اسے دیکھنے کے بعد ہر شخص اندازہ کر سکتا تھا کہ اس نصاب میں مسلمان بچوں کے شعورِ اسلامی کو فنا کرنے کا کس قدر مکمل انتظام کیا گیا ہے۔

مادری زبان کے شعبہ میں تیسرے درجے والوں کو بدھ، عیسیٰؑ اور محمدؐ کی اور چوتھے درجے والوں کو بڑے بڑے آدمیوں، مثلاً زرتشت، سقراط، حسینؓ، ابراہام لنکن، شولا شاستری، سن یات سین اور گاندھی کی کہانیاں پڑھائی جائیں گی۔

سماج کے علم میں ویدک عہد کی کہانیوں کے ساتھ موسیٰؑ، ابراہیمؑ اور مارکس اریلیس کے حالات اور درجہ چہارم میں قدیم ہندوستان، بودھ مت، چین اور عیسائیوں کے حالات بتائے جائیں گے۔

درجہ پنجم میں خاص طور پر اسلامی دور کو رکھا گیا ہے اور اس کے خاص خاص مضامین یہ ہیں:-

۱۔ محمدؐ، عمرؓ، حسینؓ، عمرؒ ابن عبد العزیز کے حالات۔

۲۔ ہندوستان سے مسلمانوں کے تعلق کی ابتدا۔ محمد بن قاسم، خواجہ معین الدین چشتی۔

۳۔ ہندی اسلامی تہذیب کیسے ترقی کی۔

۴۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی تہذیب ایک دوسرے پر کس طرح اثرانداز ہوتے۔ اس کی توضیح۔ امیر خسرو، کبیر، گرو نانک، اکبر اور دارا شکوہ کے حالات سے۔

۵۔ مشترک تمدنی زندگی کا ارتقاء، غذا، لباس، تفریحات، مشترک تہوار، معاشرتی رسوم اور آداب و اطوار۔

۶۔ مشترک سیاسی زندگی اور ملکی نظم و نسق۔ شیر شاہ، اکبر اور ٹوڈرمل۔

۷۔ زبان و ادب میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات اور "ہندوستانی" کا ارتقاء بحیثیت مشترک زبان کے۔

۸۔ فنون لطیفہ اور موسیقی، امیر خسرو، تان سین، ہندو مسلم فن تعمیر اور اس کے نمونے۔

۹۔ حسب ذیل شخصیتوں کے حالات زندگی:۔ البیرونی، ابن بطوطہ، فیروز شاہ تغلق، بابر، چاند بی بی، نور جہاں اور چند صوفی بزرگ مثلاً داؤد، کبیر، نانک، بابا فرید۔

۱۰۔ دنیا کو اسلامی تہذیب نے کیا دیا؟ علیؓ بحیثیت انسان اور عالم۔ بلالؓ بحیثیت نمائندہ حبشی جمہوریت۔ ہارون الرشید کی علمی سرپرستی۔ صلاح الدین بحیثیت نمائندہ شجاعت مسلمین۔ عبدالرحمان الناصر اور اندلس کی اسلامی تہذیب۔ اسلامی سلطنت کی وسعت جغرافی تعلق کے ساتھ۔

اس پورے نقشہ میں دیکھیے، مسلمانوں کے پیغمبر اور مذہبی پیشوا عام مشاہیر کی صف میں بیٹھے ہیں، بلکہ کہیں کہیں ان لوگوں کو گویروں کے ساتھ بٹھایا گیا ہے۔ مسلمان بچے ان کو اس حیثیت سے نہ جانیں گے کہ وہ انکے دین کے ستون ہیں بلکہ اس حیثیت سے جانیں گے کہ دنیا کے دوسرے بڑے بڑے آدمیوں میں سے وہ بھی ہیں۔ ہندوستان میں اسلامی تہذیب کی تاریخ اس طرح انکے دماغوں میں اتاری جائے گی کہ ہندو اور مسلمانوں کے مذہب اور تہذیب کے میل جول سے جو چیز اکبر اور دارا شکوہ اور کبیر اور نانک نے پیدا کی اس کی خوبی اور معقولیت ان پر نقش ہو جائے۔

اس سے ان میں کبیر منیتھی اور برہمو سماجی شعور تو پیدا ہو سکتا ہے مگر اسلامی شعور ہرگز پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس تعلیم کے ساتھ اگر ہمارے علماء رلے ولے بیٹھ کر کچھ مذہبی تعلیم کا پیوند لگوا بھی دیا تو اس سے کیا حاصل ہوگا؟ سارا نظامِ تعلیمی جس بنیاد پر اٹھایا گیا ہے، جو مقصد اس کی اساس میں رکھ دیا گیا ہے اور جس تعلیمی پالیسی پر یہ تعمیر شروع سے آخر تک ہوئی ہے اس میں دینیات کی تعلیم کا جوڑ قطعاً بے نتیجہ ہوگا۔ اسلامی ہائی اسکولوں میں دینیات کی تعلیم سے جو کچھ نتائج حاصل کیے گئے ہیں بس ویسے ہی کچھ نتائج اس وردھا اسکیم میں بھی دینیات کی قلم لگانے سے حاصل ہو جائیں گے۔

۴۔ واحد قومیت، مادہ پرست سوسائٹی اور مخلوط سماج کی اس تشکیل میں اخلاقی رنگ بھی ضروری تھا، اس لیے کہ اخلاق کے بغیر نئی ہندی تہذیب نامکمل رہی جاتی ہے۔ مذاہب اور ان کی شریعتوں کو تو تعلیم سے خارج کر دیا گیا۔ اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ آخر ان شہریوں کی اخلاقی تربیت کس بنیاد پر ہو؟ وردھا اسکیم نے اس سوال کو اس طرح حل کیا کہ ہند جدید کے "پیغمبر" مہاتما گاندھی کی روحانی تعلیم پر ہندوستانی قوم کے اخلاق کی بنیاد رکھ دی۔

"ہندوستان کی زندگی کا راستہ الگ ہے۔ اس نے ہر طرح کی آزادی حاصل کرنے کے لیے اہنسا کا طریقہ لیا ہے، ہمارے بچوں کو یہ سکھانے کی ضرورت ہے کہ اہنسا کا طریقہ ہنسا سے اچھا ہے۔" (جامعہ صفحہ ۱۱۱)

"جن لوگوں نے قوموں کو آزاد کرایا ہے اور امن کے ذریعہ سے صلح حاصل کی ہے ان کی کہانیاں کورس کی کتابوں میں خاص طور پر ہونی چاہئیں۔ انسانوں کی زندگی سے ایسے سبق سکھانے چاہئیں جن سے اہنسا اور اس کے ساتھ کی خوبیوں کا ہنسا اور دھوکے اور دغا سے اچھا ہونا ثابت ہو۔"

(صفحہ ۱۱۹)

اس طرح تمام مذاہب کی تعلیم خارج کر کے مہاتما گاندھی کے مذہب کی تعلیم داخل کر دی گئی۔ اب جو نسل ہندوستان کی درسگاہوں سے پرورش پا کر نکلے گی اس کے اخلاق

تصورات دینِ گاندھی پر مبنی ہوں گے۔ ہندوستان کی زندگی کا راستہ ——— اور مذہب کا مفہوم اس کے سوا نہیں کہ وہ زندگی کا راستہ ہی ہے ——— یہ ہوگا کہ وہ جہاد بالسیف کو دھوکے اور دغا کا قریبی رشتہ دار سمجھے گا اور اہنسا کو عقیدۃً اس پر ترجیح دیگا۔

سات برس سے چودہ برس کی عمر تک لڑکوں اور لڑکیوں کو یہ تعلیم لازماً اور جبراً دی جائے گی۔ اِس عمر میں بچے اس نظامِ تعلیم کے سوا کسی دوسرے نظامِ تعلیم میں شامل نہ ہو سکیں گے۔ اور جو والدین خود غیر تعلیم یافتہ ہیں یا جن کے پاس مالی ذرائع مفقود ہیں وہ بطور خود بھی ان کی مذہبی تعلیم کا کوئی انتظام نہ کر سکیں گے۔ حد سے حد پانچ فی صدی آدمیوں نے اگر اپنے بچوں کی مذہبی تعلیم کا کوئی انتظام کر بھی لیا تو وہ بس موجودہ نسل تک ہے۔ دوسری نسل جو وردھا اسکیم کے مدرسوں سے تعلیم پاکر اُٹھے گی اس پر مادی نقطۂ نظر اور جدید ہندی قومیت کے تصورات کا اتنا غلبہ ضرور ہوگا کہ اُسے اپنی اولاد کو مذہبی تعلیم دینے کی زیادہ پروا نہ ہوگی۔ لہٰذا یقین رکھنا چاہیے کہ تیسری نسل تک پہنچتے پہنچتے ہندوستان "ایک قوم" بن جائے گا۔ انگریزوں نے کامل سیاسی اقتدار حاصل کرکے میکالے کی تعلیمی اسکیم نافذ کی تھی جو نہ آدھے ہندوستانیوں کو پورا انگریز بنا سکی نہ پورے ہندوستانیوں کو آدھا انگریز۔ ہندوؤں نے ابھی سیاسی اقتدار کی پہلی سیڑھی پر ہی قدم رکھا ہے اور اسی مرحلہ پر وردھا اسکیم ہماری جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شیخ سے بنوالی ہے جو انشاء اللہ سارے ہندوستانیوں کو پورا "ہندوستانی" بنا کر چھوڑے گی۔ اس کے بعد کسے شک ہو سکتا ہے کہ تاریخ میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کا مرتبہ میکالے سے بلند تر نہیں ہے اور یہ مہاتما گاندھی کی مہربانی ہے کہ انہوں نے یہ عزت خود حاصل کرنے کے بجائے ڈاکٹر صاحب کی طرف منتقل کر دیا۔

۱۰ - ودیا مندر تعلیمی اسکیم

سی پی میں ایک دوسری تعلیمی اسکیم بنائی گئی ہے جو "ودیا مندر اسکیم" کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے مصنف صوبہ کے وزیر اعظم پنڈت شکلا ہیں جو گاندھی جی کے مخلص چیلوں میں سے ہیں۔ انہوں نے یہ نام الٰہ آباد کے ودیا مندر ہائی اسکول سے لیا ہے جو نہرو خاندان کا قائم کیا ہوا ہے۔ تخیل اور نقشہ گروکل سسٹم سے ماخوذ ہے[1]۔

---

[1] نیشنل کال مورخہ ۲۲ جون ۳۸ء

گیا ہے[1] لفظ مندر سے صاف مذہبیت کی بُو آتی ہے۔ ایک عام ہندوستانی "مندر" کے معنی ہندوؤں کی عبادت گاہ ہی کے سمجھتا ہے۔ مگر سی پی کی حکومت اور مہاتما گاندھی، دونوں کو اصرار ہے کہ یہ نام قابلِ اعتراض نہیں ہے[2]۔ گویا اس امر کا فیصلہ کہ مسلمانوں کے نزدیک کیا چیز قابلِ اعتراض ہونی چاہیے اور کیا نہ ہونی چاہیے، خود مسلمانوں کے کرنے کا نہیں بلکہ ان کے حکمرانوں کے کرنے کا ہے۔ اس پر مزید فریب کاری ملاحظہ ہو۔ کہا جاتا ہے کہ مسلمان اپنے خرچ سے جو مدرسے قائم کریں ان کا نام ودیا مندر نہیں، بیت العلم رکھ لیں[3] مگر اسکیم کے تحت مدرسہ صرف اس جگہ قائم کیا جا سکتا ہے جہاں کم از کم چالیس لڑکے پڑھنے والے ہوں اور جس کے لیے کم از کم دو سو روپے سالانہ آمدنی کی جائداد وقف کی جائے[4]۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جہاں مسلمان اتنی اقلیت میں ہیں کہ ان کی آبادی سے ۴۰ لڑکے فراہم نہیں ہو سکتے، یا جہاں وہ اس قدر غریب ہیں کہ مطلوبہ زمین وقف نہیں کر سکتے، وہاں ان کے بچوں کو صبح اٹھ کر مندر جانے کی تیاری کرنی ہوگی۔ اس کا نفسیاتی اثر جو کچھ آئندہ نسل پر ہوگا اس کا اندازہ ہر شخص کر سکتا ہے۔

۲۔ اسکیم سردست اختیاری ہے، مگر آگے چل کر اس کو جبری بنا دیا جائے گا۔ یعنی ہر اس گاؤں یا مجموعہ دیہات کو جس سے چالیس لڑکے لڑکیاں فراہم ہوں ایک ودیا مندر لازماً قائم کرنا ہوگا۔ وہاں لوگوں کو مجبور کیا جائے گا کہ دو سو روپے ماہانہ آمدنی کی جائداد وقف کریں اور اس علاقہ کی تمام خیرات بھی ودیا مندر کی طرف منتقل ہوگی[5]۔ اسکیم کے آخر میں ارشاد ہوا ہے:۔

---

[1] ودیا مندر اسکیم صفحہ ۶۔

[2] ہریجن مورخہ ۱۷ اکتوبر ۱۹۳۷ء اور سی پی گورنمنٹ کا پریس کمیونک مورخہ ۱۸ ستمبر ۳۸ء

[3] سی پی گورنمنٹ کا کمیونک مورخہ ۱۸ ستمبر۔

[4] ودیا مندر اسکیم صفحہ ۶۔۸

[5] ودیا مندر اسکیم صفحہ ۶۔۸۔۹۔۱۵

> ،چھوٹے بڑے مٹھوں اور دیگر مذہبی خیراتی اداروں، مندروں، مسجدوں وغیرہ کے مالکوں کو احساس ہو جانا چاہیئے کہ ہندوستان کی تاریخ میں اب وہ وقت آگیا ہے کہ وہ از خود پیش قدمی کریں قبل اس سے پہلے کہ وقت ہاتھ سے نکل جائے اپنی خدمات پیش کر کے شہرت حاصل کریں۔"
>
> (اسکیم، صفحہ ۱۵)

اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ ایک جبری و لازمی اسکیم ہے اور مسلمانوں کے مذہبی اوقاف اور مساجد کے اوقاف بھی اس میں حصہ لینے پر مجبور کیے جائیں گے۔

۳۔ ہر مدرسہ کے لیے ایک کمیٹی بنائی جائے گی جس کے ارکان کا بیشتر حصہ حق رائے دہندگی بالغان کے اصول پر مخلوط انتخاب سے منتخب ہوگا، اور مدرسہ کی جائداد منقولہ وغیر منقولہ دیہاتی پنچایت یا ڈسٹرکٹ کونسل یا حکومت صوبہ کی ملک تصور ہوگی[1] بس کے معنی یہ ہیں کہ مسلمان انتظام سے بھی بے دخل اور ملکیت سے بھی بے دخل۔ ان کا کام صرف اپنا مال اور اپنے بچے حوالہ کر دینا ہے

۴۔ مدرسہ میں عموماً ایک ہی مدرس ہوا کرے گا جسے پانچ سال کے لیے امتحاناً مقرر کیا جائے گا۔ پھر بیس سال کے لیے مستقل کر دیا جائے گا۔ اگر کمیٹی کی رائے میں اس کا رویہ نامناسب ہو تو وہ اسے نکال دے گی۔ اس کے فرائض یہ ہوں گے کہ مقررہ نصاب کے مطابق تعلیم دے اور اس گاؤں کے تمام معاملات کو قومی رنگ "(National Outlook)" میں رنگنے کی کوشش کرے[2]۔ قومی رنگ کا مطلب صاف ہے۔ بچوں میں اور اپنے زیر اثر آبادی میں واحد قومیت کی روح پھونکنا اور ملی امتیاز کو مٹا دینا۔ یہ کام قریب قریب کلیتہً ہندو مدرسین ہی سے لیا جائے گا مسلمان کا اول تو انتخاب میں آنا مشکل۔ اور اگر کوئی قسمت کا مارا آگیا تو کمیٹی یہ کہہ کر بآسانی اسے نکال دے گی کہ یہ قومی رنگ نہیں دیتا یا مقررہ نصاب

---

[1] ودیا مندر اسکیم صفحہ ۱۰-۱۱

[2] ودیا مندر اسکیم صفحہ ۱۳-۱۴

۸۔ سی پی میں ابتدائی تعلیم لوکل بورڈوں اور میونسپل کمیٹیوں کے حدودِ عمل سے تعلق رکھتی ہے، اور چونکہ ہر جگہ اکثریت ہندوؤں کی ہے اس لیے یہ جماعتیں اردو مدرسوں کو بند کر رہی ہیں اور ان کی جگہ ودیا مندر قائم کرنے پر تُلی ہوئی ہیں۔ مسلمان اپنی اقلیت کے باعث کسی طرح اس ظلم کو روک نہیں سکتے۔ آگے چل کر آپ دیکھیں گے کہ ان مجلسوں کی پوری طاقت ودیا مندر قائم کرنے میں صرف ہوگی۔ جو ٹیکس مسلمانوں سے لیا جائے گا وہ ان کی مرضی اور ان کے مفاد کے خلاف صرف کیا جائے گا۔ اور مسلمانوں کے احتجاج کو استحقار کے ساتھ ٹھکرا دیا جائے گا۔ حال ہی میں ضلع امراوتی کی ورود میونسپل کمیٹی نے اردو اسکول کو اردو ودیا مندر بنا دیا۔ مسلمانوں نے احتجاج کیا مگر پرکاہ کے برابر بھی اس کی پروا نہ کی گئی[1] سچ فرمایا پنڈت نہرو نے، جمہوریت کے معنی یہی ہیں کہ اکثریت اقلیت کو دبا کر رکھے۔

۹۔ وردھا میں ودیا مندروں کے لیے اساتذہ تیار کرنے کا انتظام کیا گیا ہے اور ایک ٹریننگ اسکول قائم کر دیا گیا ہے۔ اس میں ۱۶۲ ہندو اور ۸ مسلمان تعلیم و تربیت حاصل کر رہے ہیں اور حکومت صوبہ متوسط نے اپنے احسانات کی جو فہرست گنائی ہے اس میں ہمیں یہ بھی بتلایا ہے کہ تمام ہندوؤں اور مسلمانوں کو اُردو کی تعلیم دی جاتی ہے تاکہ وہ ودیا مندروں میں جا کر بچوں کو اردو اور ہندی دونوں سکھا سکیں[2]۔ مگر اصل حالات کیا ہیں؟ اسی صوبہ کے قوم پرست مسلمانوں تک نے اپنی کانفرنس میں شکایت کی ہے کہ سارا زور صرف ہندی تعلیم پر صرف کیا جاتا ہے اور اُردو کی محض شُد بُد پیدا کر کے چھوڑ دیا جاتا ہے تاکہ یہ ودیا مندروں میں اردو تعلیم کے انچارج ہوں۔ جن بے چاروں کا املا و تلفظ تک درست نہیں، جو اُردو کی معمولی عبارت تک صحیح نہیں پڑھ سکتے وہ بچارے بچوں کو اس زبان کی تعلیم دیتے جائیں گے[3]۔

---

[1] سی پی اسمبلی میں سوال نمبر ۱۹۶ کا جواب مورخہ ۸ مارچ ۳۸ء

[2] حکومت سی پی کا پریس کمیونک مورخہ ۱۲ ستمبر ۳۸ء

[3] مدینہ بجنور مورخہ ۲۸ جولائی ۳۸ء

۱۰۔ سی پی اسمبلی کے ممبر مولوی عبدالرحمان خاں صاحب جب اس ٹریننگ اسکول کا معائنہ کرنے گئے تو انہوں نے دیکھا کہ ہندو مسلمان سب کے سب دھوتیاں باندھے ہوئے تھے۔ یہ تمیز کرنا مشکل تھا کہ ان میں مسلمان کون ہے۔ تمام مضامین ہندی اور مرہٹی میں پڑھائے جاتے ہیں بعض نام وو رسم الخط سکھانے کے لیے ایک مسلمان استاد نوکر رکھا گیا ہے۔ مسلمان طلبہ اچھوتوں کی طرح رہتے ہیں۔ مانگ کھاتے ہیں۔ پانی پینے کے برتنوں تک کو ہاتھ نہیں لگا سکتے۔ روزانہ بندے ماترم سے مدرسہ شروع ہوتا ہے اور مسلمان طلبہ کو مجبور کیا جاتا ہے (یا اگر مجبور نہیں تو تربیت سے ایسا بنایا جاتا ہے) کہ پرارتھنا کے انداز میں ہاتھ جوڑ کر اور سر جھکا کر کھڑے ہوں۔[1] یہ ہے وہ مدرسہ جس میں "قومی تہذیب" کے نشوونما پر جناب مولانا ابوالکلام آزاد مدظلہ نے اظہارِ مسرت فرمایا ہے اور جس کا افتتاح مہاتما گاندھی کی "برکتوں" کے ساتھ ہوا ہے؟[2]

---

[1] مولوی عبدالرحمان خاں صاحب کا مضمون مندرجہ انقلاب ۲۲ اگست ۳۸ء

[2] وردھا اسکیم اور ودیا مندر اسکیم پر مسلمانوں کی طرف سے جو اعتراضات کیے گئے ہیں ان کے جواب میں منجملہ اور باتوں کے ایک بات یہ بھی بار بار دہرائی جارہی ہے کہ جس ملک میں بہت سے مذاہب کے پیرو رہتے ہیں وہاں سب کی مذہبی تعلیم کا انتظام حکومت کیسے کر سکتی ہے۔ ایسی جگہ تو حکومت کی طرف سے عام دنیوی تعلیم ہی کا انتظام کیا جا سکتا ہے۔ اور تعلیم کو عام کرنے کے لیے اس کے سوا کوئی تدبیر نہیں کہ وسیع پیمانہ پر لازمی جبری اور غیر مذہبی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ لیکن عام ناظرین کی معلومات کے لیے میں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ یورپ کے سخت "مہذب" ممالک میں بھی جہاں مذہب کی کوئی اہمیت نہیں ہے، فرانس، چیکوسلواکیا، روس اور دو چار دوسرے ملکوں کے سوا کسی ملک نے وہ پوزیشن اختیار نہیں کی جو یہاں ہندوستان میں اختیار کی جارہی ہے۔ جرمنی میں باشندوں کی تعلیم کا انتظام کرنا حکومت کے فرائض میں سے ہے اور یہ نظریہ اختیار کیا گیا ہے کہ سب کی تعلیم کا نظام ایک ہونا چاہیے۔ اس بنا پر وہاں پرائیویٹ مدارس قائم کرنے کی اجازت بھی کم دی جاتی ہے۔ لیکن دستورِ سلطنت میں ہر شخص کو یہ مطالبہ کرنے کا حق دیا گیا ہے کہ اس کے بچے کو اس کے عقیدہ کے مطابق مذہبی تعلیم دی جائے اور (باقی حاشیہ صفحہ ۴۴۶ پر)

۱۱۔ زبان کا مسئلہ

بالا تفصیلات سے اچھی طرح اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جنگ آزادی ملک کے نام سے علاقی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۲۵ سے) حکومت کا یہ فرض قرار دیا گیا ہے کہ وہ ہر ابتدائی مدرسے میں اس تعلیم کا انتظام کرے۔ نیز اگر ایک مذہبی عقیدہ کے لوگ کسی جگہ کافی تعداد میں ہوں اور مطالبہ کریں کہ ان کے لیے الگ مدرسہ قائم کیا جائے جہاں مذہبی تعلیم کا انتظام ان کی خواہش کے مطابق ہو تو حکومت کا فرض ہے کہ اس کا انتظام کر دے۔ انگلستان میں مذہبی تنظیمات کو خود اپنے مدارس قائم کرنے اور چلانے کا حق ہے اور حکومت کا محکمہ تعلیم صرف ان کی نگرانی کرتا ہے۔ ایسے مدارس کو حکومت امداد بھی دیتی ہے۔ یوگوسلاویا میں ہر تسلیم شدہ مذہب کی تعلیم کا انتظام سرکاری مدارس میں کیا جاتا ہے اور ہر بچے کے والدین پر اس کا فیصلہ چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ اس کے لیے کس نوعیت کی مذہبی تعلیم چاہتے ہیں۔ نیز وہاں تسلیم شدہ مذاہب کو اپنے تعلیمی نظام خود چلانے کا بھی حق ہے اور حکومت کے خزانہ سے ان کی اعانت کی جاتی ہے۔ لتھوانیا کے سرکاری مدارس میں بچوں کے لیے مذہبی تعلیم لازمی رکھی گئی ہے اور صرف وہ بچے اس سے مستثنیٰ کیے گئے ہیں جن کے والدین مذہبی تعلیم نہ دلوانا چاہتے ہوں۔ اس کے علاوہ وہاں بھی مذہبی تنظیمات کو اپنے مدارس خود قائم کرنے کا حق ہے اور حکومت ان کو اس شرط کے ساتھ امداد دیتی ہے کہ ان میں دنیوی تعلیم کا انتظام سرکاری تعلیمی پالیسی کے مطابق کیا جائیگا۔ پولینڈ کے تمام سرکاری اور امدادی مدارس میں مذہبی تعلیم لازمی ہے اور یہ کام مختلف مذاہب کی تسلیم شدہ انجمنوں کے سپرد کیا گیا ہے کہ وہ اپنے اپنے مذہب کے پیروؤں کے لیے خود نصاب تجویز کریں اور مدارس میں ان کی مذہبی تعلیم کی نگرانی کریں۔ اسٹونیا میں بچے کے والدین کی درخواست پر سرکاری مدارس میں مذہبی تعلیم کا انتظام کرنا حکومت کے لیے لازم ہے۔ ملاحظہ ہو:

The New Democratic Constitutions of Europe, by A. H. Morley, P. 53-57.

بلجیم میں جہاں تک ابتدائی تعلیم کا تعلق ہے سرکاری اور غیر سرکاری دونوں قسم کے مدارس میں مذہبی تعلیم لازمی ہے اور تسلیم شدہ مذہب کے کلیساؤں کو حق دیا گیا ہے کہ مذہبی تعلیم کی نگرانی کے لیے اپنے انسپکٹر مقرر کریں۔ ناروے میں ابتدائی تعلیم تمام تر مذہبی تنظیمات کے ہاتھ میں دی گئی ہے۔ اٹلی میں مذہبی تعلیم لازمی

(باقی صفحہ ۴۲۷ پر)

حکومت کے زیر سایہ تہذیبی یا سیاسی طاقت حاصل کرنے کی جو کوششیں اختیار کی گئی ہے وہ کس
طرح مسلمانوں کی تربیت اور ان کی طاقت کو فنا کرنے کے چھپے مقاصد کی حامل رہی ہے اور کس
طرح ہمارے ہمسایہ ملک میں قومی اسپرٹ کے مقابلے میں [illegible] اختیار کرتے جا رہے ہیں جن
کو انہوں نے اپنے انگریز استادوں سے سیکھا ہے لیکن یہ بیان نامکمل رہ جائے گا اگر اسی
سلسلے میں ان کارروائیوں کا بھی ذکر نہ کیا جائے جو زبان کے باب میں کی جا رہی ہیں۔

ایک قوم کی زبان اور اس کا رسم الخط اس کی تہذیب اور اس کی قومیت کے بقا و فنا
میں فیصلہ کن اہمیت رکھتا ہے۔ کسی قوم کو اگر آپ دوسری قوم میں تبدیل کر دینا چاہیں تو اس کی
زبان اور رسم الخط کو بدل دیجئے۔ رفتہ رفتہ وہ خود بخود دوسرے سانچے میں ڈھلتی چلی جائے
گی۔ اس کی آنے والی نسلوں کا تعلق اپنے اسلاف سے منقطع ہو جائے گا اور وہ بالکل نئی
ذہنیت، نئے افکار اور نئی صورت قومی لے کر اٹھیں گی۔ جن جن لوگوں نے قومیتوں کے
بنانے اور بگاڑنے کا کھیل کھیلا ہے ان سب نے یہ ہتھیار ضرور استعمال کیا ہے۔ زار روس
کی حکومت نے اپنے امپیریلزم کی بنا مستحکم کرنے کے لیے روسی زبان اور رسم الخط کو تمام
غیر روسی قوموں پر مسلط کرنے کی کوشش کی تھی تاکہ یہ سب قومیں روسی ہو جائیں اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۲۶) سے ہے اور کوئی بچہ اس سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کے والدین استثنا کا مطالبہ
نہ کریں۔ ہالینڈ میں مذہبی تنظیمات اپنے اپنے پیروؤں کی تعلیم کا انتظام خود کرتی ہیں اور حکومت اس کا
خرچ ادا کرتی ہے۔ سوئٹزرلینڈ میں سرکاری طور پر صرف اس مذہب کی تعلیم کا انتظام کیا جاتا ہے جس کے
پیروؤں کی تعداد مدرسے میں زیادہ ہو۔ لیکن جن اقلیتوں کی کافی تعداد موجود ہو ان کے لیے علیحدہ انتظام
بھی کیا جاتا ہے۔ (ملاحظہ ہو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا چودھواں ایڈیشن مضمون ایجوکیشن)

اس کے بعد یہ کہنے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی کہ پبلک مدارس میں مذہبی تعلیم کا انتظام
ممکن نہیں ہے۔ صاف کیوں نہیں کہا جاتا کہ قومیتوں کو فنا کرنے اور قوموں کے احساس خودی
کو مٹانے کے لیے ہم اس چیز کو قصداً نہیں رکھنا چاہتے۔

اس کی مملکت میں کوئی قوم ایسی نہ رہ جائے جو اپنی زبان بولنے والی اور اپنے مذہب کا اتباع کرنے والی اور اپنے صوم پر چلنے والی ہو۔ اصطلاح میں اس کو (Russification) یعنی "روسی بنانے" کی پالیسی کہا جاتا ہے۔ بعد میں اسی پالیسی کی پیروی اشتراکی جماعت نے بھی کی۔ لینن نے انقلاب کے بعد ہی مشرقی قوموں کو نئے سانچے میں ڈھالنے کے لیے ان کے رسم الخط کو لاطینی رسم الخط سے بدل دیا اور اب تازہ اطلاع ہے کہ روس کی ۲۹ قوموں کا رسم الخط لاطینی کے بجائے روسی کر دیا گیا ہے تاکہ اس علیحدگی کے احساس کو بالکل مٹا دیا جائے جو ان کے روسی بن جانے میں مزاحم ہوتا ہے۔ ازبک، ترکمان، تاجیک، کرغیز اور داغستانی مسلمان، جن کو عربی رسم الخط نے اسلامی روایات سے وابستہ کر رکھا تھا، اس ضرب کے اثرات کو ابھی سے محسوس کر رہے ہیں۔ ابھی ایک چوتھائی صدی بھی اس انقلاب پر نہیں گذری ہے اور وہ دیکھتے ہیں کہ ان کی قومیت تحلیل ہو کر اشتراکی سوسائٹی میں تبدیل ہوتی چلی جا رہی ہے۔ یہی پالیسی فرانس نے شمالی افریقہ میں اختیار کی ہے۔ وہاں عربوں اور بربریوں کو فرانسیسی قومیت میں ڈھالنے کے لیے ساری طاقت اس پر صرف کی جا رہی ہے کہ عربی زبان اور رسم الخط کو مٹا دیا جائے۔ اسی پالیسی کا تختہ مشق ہندوستان میں ہم کو بنایا جا رہا ہے۔

پنڈت جواہر لال کے بقول ہندوستان میں "نیشنلسٹ" جماعت کی خواہش اور کوشش یہ ہے کہ یہاں "ایک متحد قوم پیدا ہو"[1] اس غرض کے لیے زبان کی وحدت ناگزیر ہے۔ زبانیں الگ ہوں گی تو الگ قومیں بھی رہیں گی۔ الگ قوموں کو فنا کر کے ایک قوم میں تبدیل کرنا ہو تو الگ زبانوں کو مٹا کر دولت، تنظیم اور حکومت کی طاقت سے ایک زبان تمام ملک میں پھیلانی ہی پڑے گی۔ یہاں تک تو بات کھلم کھلا ہے۔ اس کے بعد کام تقسیم ہو جاتا ہے۔ کچھ باتیں دکھانے کے لیے ہیں، اور کچھ کرنے کے لیے۔ دکھانے کے لیے تو یہ ہے کہ "قومی" زبان "ہندوستانی" ہے جس کا اطلاق اردو، ہندی دونوں پر ہوتا ہے۔ فارسی اور

---

[1] ۔ "مدعا، اکتوبر ۳۶ء

دیوناگری دونوں رسم الخط مسلّم ہیں اور دونوں کو نشو و نما کا پورا موقع ملنا چاہیئے لیکن فی الواقع کیا کیا جارہا ہے ؟ اس کے لیے ذیل کی تفصیلات ملاحظہ ہوں :

۱۔ فارسی اور عربی کے وہ عام فہم الفاظ بھی جو "ہندوستانی" کے مشترک سرمایہ میں مدتوں سے داخل ہو چکے ہیں ، جن کو ہر ہندو اور مسلمان بولتا اور سمجھتا ہے ، قصداً ترک کیے جا رہے ہیں ، اور ان کی جگہ ٹھیٹھ سنسکرت اصل کے ، یا بالکل نامانوس ہندی زبان کے الفاظ پھیلائے جا رہے ہیں ۔ مثال کے طور پر

سے	بجائے	وقت	انتی	بجائے	ترقی
پرسدھ	٫٫	مشہور	اتھ	٫٫	حاکم
جُگت پرانت	٫٫	صوبہ متحدہ	پرتی	٫٫	مسل
سنگھ	٫٫	شیر	لاگو	٫٫	نافذ
اوتسک	٫٫	ضروری	پرستاو	٫٫	تجویز
سبھاپتی	٫٫	صدر	سدھانت	٫٫	اصول
متر تا	٫٫	دوستی	اگوا	٫٫	لیڈر یا رہنما
پرانت	٫٫	صوبہ	گرہن	٫٫	منظور
شکشا	٫٫	تعلیم	پرانت کونسل	٫٫	صوبہ متوسط
جنش یا پرش	٫٫	آدمی	مت بھید	٫٫	اختلاف
نگر	٫٫	شہر	جھگڑا پیٹرو	٫٫	مدعی
ٹنٹا	٫٫	مقدمہ	ودویا	٫٫	برابر
وانر	٫٫	بندر	سنشودھن	٫٫	ترمیم
سوتنترتا	٫٫	آزادی	گھوشن	٫٫	اعلان
بھارت ورش	٫٫	ہندستان	جھگڑا ادرجے	٫٫	مدعا علیہ

یہ صرف چند مثالیں ہیں ۔ اس فہرست کو بہت زیادہ طویل کیا جا سکتا ہے ۔ مگر اتنی ہی مثالیں یہ اندازہ کر لینے کے لیے کافی ہیں کہ یہاں "ہندوستانی" کے پردے میں دراصل

ہندی زبان کو قومی زبان بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ "ہندستانی قوم" کے بجائے دراصل "ہندو قوم" میں اس مُلک کی قوموں کو جذب کرنا مقصود ہے۔
ہندوستانی زبان وادب میں سے ہمارے حصّہ کو اس طرح نکال پھینکنے کی کوشش کی جا رہی ہے جس طرح کوئی قوم کسی ظالم قوم کی حکومت سے آزاد ہونے کے بعد جوشِ انتقام میں اس کے باقی ماندہ آثار کو مٹایا کرتی ہے۔

۲۔ متحدہ قومیّت کے علمبردار جو زبان اپنی تقریروں اور تحریروں میں استعمال کر رہے ہیں اس کے چند نمونے ملاحظہ ہوں۔ گاندھی جی بھارتیہ ساہتیہ پریشد کے اجلاس ناگپور میں فرماتے ہیں:

"اس سبھا پتیتو مجھے دینے کا کارن جب میں ڈھونڈتا ہوں تو دو ہی پرتیت ہوتے ہیں۔ ایک میرا ساہتیہ کا رسنہ ہونا اور اس لیے کم سے کم ودیش کا کارن ہونا۔ تتھا دوسرا میرا ہندوستان کی سب بھاشاؤں کا پریم۔ جو کچھ ہو میں آشا کرتا ہوں کہ ہم کچھ نہ کچھ سیوا کریں گے اور بھوشیہ میں اپنا سیوا کشیتر بڑھائیں گے یدی ہم سری نگر سے لے کر کنیا کماری تک اور کراچی سے لے کر ڈبروگڈھ تک جو پردیش ہے اسے ایک مانتے ہیں اور اس کے لوگوں کو ایک پرجا سمجھتے ہیں، تو اس پردیش کے پرتیک بھاگ کے ساہتیہ کار بھاشا شاستری اتیادی آپس میں کیوں نہ ملیں اور بھن بھن بھاشاؤں دوارا ہندوستان کی پتا یوگیہ سیوا کیوں نہ کریں[1]"

آنرایبل مسٹر سمپورنانند وزیر تعلیم صوبۂ متحدہ کی ایک تقریر کا اقتباس یوپی کے محکمۂ اطلاعات کی رپورٹ سے:

آدھنک کال جس میں کہ ہم رہ رہے ہیں اس کی یہ بھی ایک شبستا ہے کہ سنکشنز شمسیا کے پرت لوگوں کا اگرشٹر بہت وشدھ اور بیاپک ہو گیا

---

[1] "جامعہ" مئی ۳۶ء۔

ہے۔ یہ بات ادھکانش سبھئے سنسار پر گوٹ ہوتی ہے اور زبن سار ہم اپنے
دیش میں بھی اس بشیو بیانی اندولن کے بھن بھن پہلوؤں کو دیکھ رہے ہیں
اور ان کاان بھو کر رہے ہیں۔ آج کل ہم اپنے کو جس مانسک اور پدھار
تک پرستھت میں پاتے ہیں، اور ہماری اس استھت کا جو سماجک
راج نیتک اور آرتھک آدھار ہے، اور ساتھ ہی ساتھ ہم نے اپنے
پوروجوں سے جو سنسکرت پائی ہے، اس سے اس ڈشیو ویاپی پرگت
کو ہمارے سنکرنش سند یہ ایک بشیس روپ میں استھت کیا ہے
اور ایک وشیس بھارتیہ شمسیہ بنا دیا ہے [1]

بابو موہن لال سکسینہ صدر صوبہ کانگریس کمیٹی کے خیر مقدم میں پیلی بھیت کی
کانگریس کمیٹی حسب ذیل اعلان شائع کرتی ہے:

"بھارت صوبہ کے پر سد نیتا شری یت موہن لال سکسینہ ایم۔ ایل۔
اے (سینٹرل) جو پرانتی کانگریس کمیٹی کے پردھان ہیں۔ ۲۷ر مئی
۱۹۳۸ کو پرات کال ۵ بجے کی گاڑی سے پدھار رہے ہیں۔ جنتا کو
چاہیئے کہ اس شہر سے اور سر سے لابھ اُٹھانے کے لیے پورب دیش کے
پرت اپنے سچے کرتو کو جاننے کے لیے ۲۶ تاریخ کی شام کو ادھکادھک
سنکھیا میں راشٹر سا کاؤں کے ساتھ میں آجانا چاہیئے اور ۲۷ر مئی
۳۸ء کی صبح کو ۵ بجے ان کے سواگت کے جلوس کی رونق بڑھایئے۔

پروگرام ۲۷ر مئی کا

پرت کال	۷ بجے سے ۹ بجے تک جلوس
	جل پان ۹ ,, ,, ۱۰ ,, ,,

---

[1] مدینہ ۱۳ر ستمبر ۳۲ء۔

مدھان ۹ بجے سے ۲ بجے تک بھوجن وشرام
۲ ، ، ۵ ، ،کاریہ کارتاؤں کی بیٹھک

نویدک

دستخط پریزیڈنٹ دستخط ادپ منتری

شہر منڈل کانگریس کمیٹی ۔ "پیلی بھیت"

اس حمام میں سوشلسٹ ہندو بھی بے تکلف کپڑے اُتار دیتے ہیں۔ حال میں آگرہ کی سوشلسٹ جماعت کی طرف سے ایک جلسہ کا اعلان بدیں الفاظ ہوا ہے:

"آگرہ میں سماج وادی بھاشنتر۔ لگاتار چھ دن تک۔ اکیل بھارتیہ سماج وادی نیتاؤں کے دوارا۔" ہمیں جنتا کو یہ سوچنا دیتے ہوئے پرسنتا ہوتی ہے کہ تاریخ ۱۱ اکتوبر سے برابر چھ دن تک اکیل بھارتیہ سوشلسٹ نیتا راج نیتی کے انیک وشئوں پر اپنے ساگر بہت اور دو تا پورن بھاشنتر دیں گے۔ آگرہ کی جنتا کے لیے یہ اپورو اوسر ہے کی وے دیش کے ورگ سوشلسٹوں کے سمپرک میں آکر یہ سمجھ لیں کہ برٹش سامراج واد کو کس پرکار اکھاڑ پھینکنا چاہیے۔ بھاشنتروں کے وشئے کیوزم، سوشلزم، پونجی واد، درگ بندھ، سامراجیہ واد، فیسزم، نرم وگرم دل فیڈریشن، کسان، کرانتی، وشو شانتی کی سمیا ودیارتھی اندولن۔ کسان مزدور اندولن، روس کی کرانتی۔ سماج وادی روس۔ امتر راشٹریہ۔ تمر سبتنت آدی۔ آدی بھاشنتر میں پرویش چار آنہ کے ٹکٹ سے ہوگا۔ آپ کو ٹکٹ ہر پڑمکھ کانگریس ودیارتھی کاریہ کرتا۔ تتھا وارڈ شہر کانگریس کمیٹی کے دفتر دوارا مل سکتا ہے۔ جن نیتاؤں کے آنے کی آشا ہے ان کے نام اس پرکار ہیں:۔

۱۔ ڈاکٹر اشرف۔ کے ایم آبھا گا کانگریس کمیٹی کے راج نیتا و بھاگ کے پردھان۔ اچاریہ نریندر دیو اکیل بھارتیہ کانگریس سوشلسٹ پارٹی کی کاریکارنی کے پڑمکھ سدسے تتھا کانگریس کارشمتی کے بھوت پورو سدسے۔

ڈاکٹر زیڈ۔ اے احمد اکھل بھارتیہ کانگریس سوشلسٹ پارٹی کی کاریکارنی کے سدسے تھا آجاگا کانگریس کمیٹی کے آرتھک ویباگ کے بھوت پورو۔ ڈاکٹر رام منوہر لوہیہ اکھل بھارتیہ کانگریس کمیٹی کے ویدیشک ویبھاگ کے منتری تھا اجاگا سوشلسٹ پارٹی کے کاریکارنی کے سدسے کا سجاد ظہیر بار ایٹ لا آجاگا سوشلسٹ پارٹی کی کاریکارنی کے سدسے۔ کا ہریش دیو مالوی یوپی کسان سبھا کی کارکارنی کے پرمکھ سدسے ؟

دھیان رہے یہ بھاشن ۱۱ اکتوبر سے شام کو ۸ بجے سے ۱۰ بجے تک ہوں گے۔ استھان کی سوچنا شکروی جائے گی۔ یہ بھاشن شہر کانگریس کمیٹی سوشلسٹ پارٹی اور آگرہ ودیارتھی سنگھ کے سنکیٹ پلیٹ فارم پر ہوں گے۔

مہادیو نرائن ٹنڈن

پردھان منتری کانگریس سوشلسٹ پارٹی۔ آگرہ ؟

یہ محض چند نمونے ہیں۔ ورنہ یہ زبان جس طرح ذمہ دار لیڈروں اور ذمہ دار "قومی مجلسوں" سے لے کر اخبارات، رسائل اور سینماؤں تک ہر آلہ نشر و اشاعت کے ذریعہ سے پھیلائی جا رہی ہے، اس کا مشاہدہ ہر آنکھوں والا کر رہا ہے اور اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر حکومت کی باگیں ان لوگوں کے ہاتھ میں پوری طرح آگئیں تو یہ کیسی "ہندستانی" زبان بنائیں گے۔

۳۔ اگرچہ ابھی سیاسی اقتدار پوری طرح ان کے ہاتھ میں نہیں آیا ہے، لیکن جس قدر بھی اقتدار انہیں مل چکا ہے اس کو انہوں نے عملاً اس کام میں استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ اقتدار تو حاصل کرتے ہیں یہ کہہ کر کہ ہم مشترک وطنی اغراض کے لیے آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ مگر اقتدار کو استعمال کیا جاتا ہے اس کام میں کہ وطن کی ایک جماعت پر دوسری جماعت کی زبان کو بزور مسلط کر دیا جائے۔ صوبۂ بہار میں ۲۵ ہزار سے زیادہ مسلمان بچے ہندی مدرسوں (پاٹھ شالاؤں) میں جانے پر مجبور ہیں کیونکہ ان کے لیے تعلیم کا کوئی دوسرا

انتظام ہی نہیں۔ پٹنہ ڈویژن میں ۵۰ فی صدی، چھوٹا ناگپور ڈویژن میں ۸۰ فی صدی، بھاگلپور ڈویژن میں ۱۷ فیصدی اور ترہٹ ڈویژن میں ۵۵ فی صدی مسلمان طلبہ ہندی زبان میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ مجموعی طور پر جو مسلمان بچے صرف ایک صوبہ میں ہندی اللسان بنائے جا رہے ہیں ان کی تعداد ۲۵ ہزار کے قریب ہے، یعنی کل مسلمان طلبہ کا ۷۰ فی صدی حصہ۔ اور ان کو پڑھایا کیا جاتا ہے؟ متعدد کتب نصاب میں یہ چیز آپ کو ملے گی کہ "نبی" کے معنی "رام اوتار" کے ہیں[1]۔ ایک چاول سے اندازہ کر لیجئے کہ پوری دیگ میں کیا ہے۔ پروفیسر عبدالحق سکرٹری انجمن ترقی اردو نے رسالہ "اردو" کی ایک قریبی اشاعت میں اپنے ایک دوست کا خط نقل کیا ہے جو یو۔ پی میں ڈپٹی کلکٹر ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس سال مجھے ڈسٹرکٹ بورڈ کے بہت سے مدرسوں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا اور ان میں عموماً میں نے دیکھا کہ اردو پڑھانے والے مدرسوں کی بہت کمی ہے۔ مسلمان بچوں کو مجبوراً ہندی پڑھنی پڑتی ہے، اور وہاں زبان کے واسطہ سے ان پر ہندو دیت کا گہرا رنگ چڑھ رہا ہے۔ مثلاً ایک ابتدائی مدرسہ میں بچے کو پکار یئے تو وہ "حاضر جناب" کہنے کے بجائے "اپستھت شریمان" کہے گا۔ یہ اس صوبہ کا حال ہے جو صدیوں سے ہماری قومی تہذیب کا گہوارہ رہا ہے۔ ان سب سے زیادہ بدتر حالت صوبہ متوسط کی ہے ضلع بیتول کی ڈسٹرکٹ کونسل نے پورے ضلع میں جبری تعلیم نافذ کرنے کی جو سکیم بنائی ہے اس میں تعلیم کی زبان لازمی ہندی رکھی گئی ہے۔ اور حکومت نے اس شرط کے ساتھ اس کو مالی امداد دی ہے کہ تمام تعلیم ہندی میں ہو۔ اس جدید اسکیم کے ماتحت ۷۰ ہندی اسکول قائم کیے گئے اور پورے ضلع میں اردو کا صرف ایک اسکول تھا سو وہ بھی بند کر دیا گیا[2]۔ یہ صرف ابتدا ہے۔

---

[1] عبدالغنی صاحب ایم اے سنٹرل کا مراسلہ مندرجہ اسٹار آف انڈیا یکم مارچ ۳۸ء۔

[2] "ہتواد" مورخہ ۲۵ر فروری ۳۸ء۔ خود سی پی کے وزیر اعظم نے اپنے سرکاری کمیونک میں اس واقعہ کا اعتراف کیا ہے کہ ضلع کا واحد اردو اسکول بند کر دیا گیا ہے (ملاحظہ ہو سٹار آف انڈیا مورخہ ۲۰ر جون ۳۸ء۔)

ودیا مندر اسکیم جب نافذ ہوگی تو آپ دیکھیں گے کہ دیہات کی مسلمان آبادی کو ۲۵ سال کے اندر
قریب قریب کلیۃً ہندی اللسان بنا دیا جائے گا۔ ابتدائی تعلیم تمامتر لوکل بورڈوں کے قبضہ میں
ہے اور وہاں حال یہ ہے کہ ۱۵۰ انتخابی حلقوں سے نصف درجن مسلمان بھی منتخب نہ ہو
سکے۔ یہ عصبیت جہاں کام کر رہی ہو، وہاں کیا توقع کی جا سکتی ہے کہ پبلک کے خزانہ سے
کہیں اُردو ودیا مندر، یا "بیت العلم" بھی قائم کیا جائے گا۔ لوکل بورڈوں میں تو پھر بھی محدود
نظر اور پست ذہنیت کے لوگ جاتے ہیں۔ صوبہ کی حکومت جن اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ذمہ دار
کانگریسی لیڈروں کے ہاتھ میں ہے خود وہی کانگریس کے اس زبانی دعوے کو جھوٹا اور منافقانہ
دعوے ثابت کر رہے ہیں کہ "ہندوستانی" زبان اُردو اور دیوناگری دونوں رسم الخطوں
کے ساتھ تسلیم شدہ سرکاری زبان ہے۔ سی پی اسمبلی میں خود صدر مجلس کے زیر ہدایت رولز
کمیٹی نے جو قواعد بنائے ہیں ان میں ۸ لاکھ مسلمانوں کی زبان کا نام تسلیم شدہ زبانوں کی فہرست
میں کہیں نظر ہی نہیں آتا۔ عبدالرحمان خاں صاحب ایم ایل اے نے جب اپنے سوالات
اردو زبان میں لکھ کر بھیجے تو اسمبلی کے سکرٹری نے انہیں واپس کر دیا اور ہدایت کی کہ انگریزی
زبان میں سوالات بھیجئے[1]۔ اسمبلی کی کاروائی قلم بند کرنے کے لیے ہندی رپورٹر تو رکھا جا سکتا
ہے مگر اُردو رپورٹر رکھنے اور اردو میں کاروائی شائع کرنے کے لیے بجٹ میں گنجائش نہیں
نکلتی۔ اسمبلی میں کانگریس کے کراچی ریزولیوشن کا حوالہ دے کر مطالبہ کیا جاتا ہے کہ کاروائی
ہندی اور اردو دونوں میں لکھی جائے تو کانگریسی حکومت کا وزیر عدل و انصاف جواب
دیتا ہے کہ:

> "جو لوگ کانگریس کو ایک قومی جماعت تسلیم نہیں کرتے، انہیں کانگریس
> کی کراچی والی تجویز پر ہماری توجہ مبذول کرانے کا کوئی حق نہیں ہے۔ انہیں
> کیا حق ہے کہ اس تجویز کا حوالہ دے کر وہ ہم پر نکتہ چینی کریں۔ ہم اقلیتوں
> کے معقول مطالبے ماننے کو تیار ہو سکتے ہیں لیکن اس ترمیم میں مسلمانوں

---

[1] عبدالرحمان خاں کا مراسلہ (اسٹار آف انڈیا مورخہ ۲۰ ستمبر ۳۸ء)

کی طرف سے جو مطالبہ کیا گیا ہے وہ نہ تو معقول ہے اور نہ قابلِ عمل۔ کسی اقلیت کو یہ حق حاصل نہیں ہو سکتا کہ وہ ایوان کی اکثریت سے نامعقول مطالبے منوانے کی کوشش کرے۔ مسلمان ممبروں کو اس وقت بھی یہ رعایت حاصل ہے کہ وہ چاہیں تو اردو میں تقریر کریں۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ اردو خط صوبہ کی سرکاری عدالتوں اور دفتروں میں رائج نہیں۔ اسمبلی میں بھی اسے رائج نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے بے انتہا مصارف بڑھ جائیں گے[1]۔"

۴۔ عمل کے ساتھ زبانوں پر بھی علانیہ یہ بات آگئی ہے کہ "قومی" زبان حقیقت میں "ہندی" ہے نہ کہ وہ "ہندوستانی" جو یوگوسلیویا کی "سرکوکروٹ سلافینی" زبان کی طرح محض ایک دھوکے کی ٹٹی بنائی گئی ہے۔ اس تخیلی زبان کے متعلق تو ابھی حال میں گاندھی جی نے خود فرمایا ہے کہ خارج میں اس کا وجود کہیں نہیں ہے، بلکہ وہ آئندہ پیدا کی جانے والی ہے[2]۔ اب مقابلہ رہ جاتا ہے اردو اور ہندی میں، تو اس کے متعلق "متحدہ ہندوستانی قوم" کے لیڈر کا فیصلہ یہ ہے کہ ہندی زبان ہی ہندوستان کی قومی زبان ہے اور دیوناگری رسم الخط ہی ہندوستان کا رسم الخط ہونا چاہیے[3]۔ ہری پورہ کانگریس کے موقع پر "راشٹر بھاشا سمیلن" (قومی زبان کی کانفرنس) کا ساتواں اجلاس مسٹر جمنالال بزاز کے زیرِ صدارت ہوتا ہے اور کانگریس کا صدر اس کو پیغام بھیجتا ہے کہ:۔

"صوبوں کے باہمی تعلقات کی ترقی کے لیے ایک مشترک زبان کی ضرورت ہے اور وہ زبان ہندی ہندوستانی ہی ہو سکتی ہے۔ جن لوگوں

---

[1] "مدینہ" مورخہ ۱۳ اکتوبر ۳۸ء۔

[2] Hindustani of the Congress conception has yet to be crystallised into shape (Harijon, 29, Oct., 1938).

[3] ہریجن بحوالہ ٹریبیون مورخہ ۸ جولائی ۳۷ء۔

نے ابھی تک ہندی نہیں سیکھی انہیں سیکھنی چاہیئے کہ یہ ہندوستانی قوم کی
تعمیر میں مددگار ہوگی۔[1]"
یوپی کا وزیر تعلیم ۱۷ اگست ۳۷ء کو ناگری پرچارنی سبھا، بنارس کے ایڈریس کا
جواب دیتے ہوئے کہتا ہے:۔
"اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہندی کو جسے ہندوستانی بھی کہا جاتا ہے،
ہمارے جنوبی ہند کے ہم وطن آسانی سے سیکھ لیں تو لازم ہے کہ ہم ہندوستانی
زبان میں سنسکرت کے کافی الفاظ استعمال کریں۔"
اسی صوبہ کی اسمبلی کا صدر اسی وزیر تعلیم کے پاس وفد لے جاتا ہے اور اس سے درخواست
کرتا ہے کہ ہندی کو ذریعۂ تعلیم بنانے سے پہلے اس کو سرکاری زبان قرار دیا جائے اور محکموں
اور خصوصاً عدالتوں میں سارا کام ہندی کے ذریعہ سے ہو۔ (مدینہ یکم ستمبر ۱۹۳۸ء)
یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے متحدہ ہندوستان کے نام سے سیاسی طاقت حاصل
کی ہے، اور اب یہ اس طاقت کو ہندوستان کی ایک قوم کی زبان سارے ملک پر مسلّط
کر دینے میں استعمال کر رہے ہیں۔

خلاصۂ مباحث

یہ ساری روداد آپ کے سامنے ہے۔ اسے آنکھیں کھول کر پڑھئے اور اندازہ
کیجیے کہ اس "جنگ آزادی" کی حقیقی نوعیت کیا ہے۔ اس کی نوعیت یہ نہیں ہے کہ میرا
قید خانہ کا رفیق مجھ سے کہتا ہو کہ آؤ میں اور تم دونوں مل کر لڑیں اور ہم دونوں اپنی بیڑیاں
اور ہتھکڑیاں کاٹ پھینکیں۔ اگر معاملہ یہی ہوتا تو مجھ سے بڑھ کر کون احمق ہوتا کہ ایسے
کارِ خیر میں اس کا ہاتھ بٹانے سے انکار کرتا؟ لیکن یہاں صورت معاملہ کچھ اور ہی ہے۔
میرا رفیق زنداں اس تدبیر میں ہے کہ جیلر کو ہٹا کر خود اس کی جگہ لے لے اور اپنے ہاتھ
پاؤں کی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں بھی میرے ہاتھ پاؤں میں ڈال کر مجھے اپنا قیدی بنا لے۔ وہ

---

[1] ٹائمز آف انڈیا مورخہ ۲۲ فروری ۳۸ء۔

مجھ سے تو کہتا ہے کہ آؤ اس قید و بند سے آزادی حاصل کرنے کے لیے جیلر سے لڑیں ۔ مگر جیلر کے ساتھ یہ معاملہ طے کرتا ہے کہ حضور مجھے برقنداز بنا دیں، جیل کا انتظام حضور کے حسب منشا ہو گا اور قیدیوں کو میں قابو میں رکھوں گا ۔ اس طرح جو کچھ اختیارات اسے جیلر سے ملتے جاتے ہیں ان سے کام لے کر وہ اپنی قید کے طوق و سلاسل اتار کر مجھے کستا چلا جاتا ہے، اور مزید غضب یہ ہے کہ جیلر صاحب تو نرے جیلر تھے، مگر یہ ہمارے رفیق صاحب جو اب برقنداز بنے ہیں، ان کو مردم خوری کا لپکا بھی ہے ۔ یہ مجھے فقط اپنا قیدی ہی نہیں بنانا چاہتے بلکہ میرے گوشت اور خون کو آہستہ آہستہ اپنا جزو بدن بھی بنا لینے کی فکر میں ہیں ۔ اب میری عقل ماری گئی ہے تو میں ان کے ساتھ ضرور تعاون کروں گا، تاکہ یہ میری مدد سے جیلر پر دباؤ ڈال کر اور زیادہ اختیارات حاصل کریں اور زیادہ آسانی سے مجھے نوش جان فرما سکیں ۔ اور اگر میری جیسے کی آنکھیں پھوٹ چکی ہیں تو میں جیل کی کوٹھری میں بے فکر ہو بیٹھا ان برقنداز صاحب کی ترقی کو دیکھتا رہوں گا ۔ اور اگر جیل کی زندگی نے مجھے پست ہمت اور ذلیل بنا دیا ہے تو میں بوڑھے جیلر کی خدمت میں دوڑا ہوا جاؤں گا اور ہاتھ جوڑ کر عرض کروں گا کہ حضور کا دم سلامت رہے، جب تک آپ جیتے ہیں اس وقت تک تو آپ ہی جیل کا انتظام فرمائیں، جب خدانخواستہ آپ کا وقت آن پورا ہوگا، اس وقت دیکھی جائے گی، جس کی قید بھی قسمت میں لکھی ہو گی بھگت لیں گے۔ لیکن اگر میں عقل و خرد سے کچھ بھی بہرہ رکھتا ہوں اور میری رگوں میں ابھی شرافت کا بھی کچھ خون باقی ہے تو میں ہمت کر کے اٹھوں گا اور جیل کی دیواریں اپنے ہاتھ سے توڑنے کی کوشش کروں گا ۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا ہے کہ اس کوشش میں جیلر یا برقنداز کی گولی کا نشانہ بن جاؤں گا ۔ تو بہت اچھا مجھے اس کو گوارا کر لینا چاہیے ۔ قید کی زندگی سے اور برقنداز کی غذا بننے سے لاکھ درجہ بہتر ہے کہ لڑ کر مر جاؤں ۔ اس مردانہ کام میں گو مرنا ہی کا ہی مگر یہ امکان بھی ہے کہ مجھے اپنی کوشش میں کامیابی نصیب ہو جائے اور میں اپنے مکار رفیق زنداں سے کہہ سکوں کہ برادرم! جیل کی ہوا بھول جاؤ اور سیدھی طرح شریف ہمسایہ بن کر رہو ۔

استدراک

اس باب کو ختم کرنے سے پہلے ایک چیز قابلِ ذکر ہے۔ ۱۹ نومبر ۳۸ء کے "زمزم" میں جناب مولانا ابوالکلام آزاد کا ایک بیان شائع ہوا ہے جس میں مولانا نے سی پی کے متعلق بعض شکایات کی تردید فرمائی ہے اور بعض کے متعلق بیان فرمایا ہے کہ جب وہ ان کے علم میں آئیں تو انہوں نے کانگریس پارلیمنٹری کمیٹی کو توجہ دلائی اور اس نے اس کی تحقیقات یا تلافی کرنے کی کوشش کی۔ یہاں اس بیان پر تفصیلی تبصرہ کی گنجائش نہیں۔ مگر مختصراً میں یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ جن باتوں سے مولانا خود اطمینان حاصل فرما رہے ہیں اور جن پر مسلمانوں کو مطمئن کرنے کی کوشش فرما رہے ہیں وہ درحقیقت قابلِ اطمینان نہیں ہیں۔ خود ان کے اپنے بیان سے یہ حقیقت واضح ہو رہی ہے کہ اس سراسر غلط جمہوری نظام میں طاقت تو سمٹ سمٹا کر اکثریت کے ہاتھ میں آگئی ہے اور ہماری اصلی حیثیت اب یہ ہے کہ اگر وہ ہم پر ظلم کریں تو ہمارا کوئی نمائندہ جا کر سردار پٹیل کی خدمت میں یا کسی اور سرکار کی خدمت میں عرض معروض کر دے، اور اس ظلم کی تلافی صرف اس وقت ہو سکے جب کہ وہ بربنائے عنایت و مہربانی یا بربنائے مصلحتِ وقت تلافی کرنا چاہیں۔ یہ پوزیشن کسی طرح بھی اس غلامی کی پوزیشن سے مختلف نہیں جو اب تک انگریزی سلطنت میں ہمیں حاصل رہی ہے۔ یہاں بھی کوئی مصیبت مسلمانوں پر پیش آتی ہے تو کوئی فضل حسین یا کوئی شفیع خود اس کا تدارک نہیں کر سکتا بلکہ جا کر وائسرائے بہادر سے عرض کرتا ہے یا کسی صوبہ کے گورنر صاحب کو توجہ دلاتا ہے۔ اور اگر وہ مہربان ہوں یا مصلحتاً اس کی ضرورت سمجھیں تو تدارک ہو جاتا ہے، ورنہ اگزیکٹو کونسل کے ممبر صاحب اپنا سا منہ لے کر رہ جاتے ہیں اور بدستور اس امید میں رکنیت کی کرسی سے چپکے رہتے ہیں کہ شاید کسی دوسرے موقع پر یہ منصب کام آجائے۔ ہمارا اصلی اعتراض دراصل اسی پوزیشن پر ہے۔ مان لیا کہ کانگریسی صوبوں میں اس وقت بڑی حق پسندی اور غایت درجہ کے عدل و انصاف کے ساتھ حکومت ہو رہی ہے، اور یہ بھی تسلیم کر لیا کہ جتنی شکایات اب تک مسلمان اخبارات میں شائع ہوئی ہیں سب کی سب جھوٹی ہیں۔ مگر سوال یہ

ہے کہ دستوری نوعیت کیا ہے اور آئندہ کی لڑائی کس نوعیت کے دستوری انعقاد کے لیے ہو رہی ہے ؟ اگر اس کی نوعیت یہی ہے کہ ہم اس جھوٹے جمہوری نظام میں محض اپنے سروں کی تعداد کم ہونے کی وجہ سے محکوم ہوں اور ہندو صرف اس لیے ہم پر حاکم ہوں کہ ان کے سر ہم سے زیادہ ہیں ، تو ظلم اس نظام کی عین فطرت میں پوشیدہ ہے - آج اگر مولانا ابوالکلام کی اس لیے سُن لی جاتی ہے کہ ان سے کچھ زیادہ بڑا کام لینا ہے تو کل کسی ابوالکلام کی نہ سُنی جائے گی ، اور کسی ابوالکلام میں یہ طاقت نہ ہو گی کہ جب اس کی نہ سُنی جائے تو وہ کچھ کر سکے - ہمارا اصل جھگڑا اسی باطل اصول سے ہے اور مولانا یہ سمجھ رہے ہیں کہ بس تمام شکایت بیتول کے مدرسے اور ودیا مندر کے نام اور ایسی چند چھوٹی چھوٹی چیزوں کے متعلق ہے - جو لوگ مولانا کے علم اور ان کی دانائی کے معترف ہیں وہ اس سے کچھ زیادہ دانش مندی و بصیرت کی توقع ان سے رکھتے تھے -

---

کانگریس اور مُسلمان

گذشتہ صفحات میں نیشنلزم اور آزادیٔ ہند کی وطن پرستانہ تحریک کا جو علمی اور واقعاتی تجزیہ کیا گیا ہے اس سے یہ بات آفتاب نصف النہار کی طرح روشن ہو جاتی ہے کہ ہمارے اور اس تحریک کے درمیان کوئی قدر مشترک نہیں ہے۔ ہماری موت اس کی زندگی ہے اور اس کی موت ہماری زندگی۔ ہمارے اور اس کے درمیان اصول میں، مقاصد میں اور طریق کار میں نہ صرف یہ کہ کسی قسم کا اتحاد نہیں ہے، بلکہ درحقیقت کلی اختلاف ہے۔ ایسا شدید اختلاف، کہ کہیں کسی ایک نقطہ پر بھی ہم اور وہ جمع نہیں ہوتے۔ ہمارا اور اس کا تباین اس نوعیت کا ہے جیسے مشرق اور مغرب کا تباین ہے کہ جو شخص مغرب کی طرف جانا چاہتا ہو اس کے لیے بجز اس کے کوئی چارہ ہی نہیں کہ مشرق سے منہ موڑ لے۔

اب جو شخص اس تحریک کے ساتھ چلتا ہے اور اپنے آپ کو مسلمان بھی کہتا ہے وہ لامحالہ دو حالتوں میں سے کسی ایک حالت میں مبتلا ہے۔ یا تو وہ اس تحریک کی حقیقت اور اس کے منطقی اور واقعی نتائج کا پورا شعور رکھتا ہے اور اس شعور کے ساتھ اس نے اپنے لیے یہ راستہ منتخب کیا ہے۔ یا پھر وہ کسی غلطی کا شکار ہے۔

پہلے شخص سے ہمارا کوئی جھگڑا اس کے سوا نہیں ہے کہ ہمیں اس کی منافقت پسند

نہیں۔ ہم اس سے صاف کہتے ہیں کہ جب تم اسلامی قومیت کی نفی کرنے کے لیے بالارادہ تیار ہو اور اس جمہوری نظام میں صرف ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے شریک ہونا چاہتے ہو جس کو واحد وطنی قومیت کی بنیاد پر تعمیر کیا جا رہا ہے تو تمہیں آخر کس نے مجبور کیا ہے کہ اپنے آپ کو نام چارے کے لیے مسلم سوسائٹی سے بھی وابستہ رکھو؟ یہ تو صرف منافقانہ حرکت ہے بلکہ اس میں تمہارا اپنا سراسر نقصان ہے۔ "مسلمان" کا ٹھپہ جب تک تمہارے اوپر لگا رہے گا اس وقت تک اکثریت کی حکومت میں تمہارے ساتھ امتیازی برتاؤ بہرحال ہوگا۔ خواہ تم ایک سو ایک فی صدی نیشنلسٹ بن جاؤ، تمہارا نام ہر جگہ تمہاری راہ میں حائل ہوگا۔ ہر ذمہ داری کا منصب تمہیں دیتے ہوئے اکثریت جھجکے گی۔ صدارت کی کرسی، وزارت عظمیٰ، پارٹی لیڈرشپ، مالی اعانت، غرض ہر اہم چیز کو دینے میں فطری طور پر بخل سے کام لیا جائے گا۔ اس معاملہ میں اگر تم ایثار کے لیے تیار ہو تب بھی تو تمہیں سمجھ لینا چاہیے کہ "ایک علیٰحدگی پسند" قوم سے ظاہری وابستگی برقرار رکھ کر تم اپنے مقصد —— واحد قومیت کی تعمیر —— کو نقصان پہنچا رہے ہو۔ جب کہ ایک قوم اپنی جداگانہ ہستی قائم رکھنے پر اصرار کر رہی ہے تو تمہارے اوپر یہ فرض عاید ہو جاتا ہے کہ اس سے علیٰحدگی اختیار کرو بشرطیکہ تم اپنے مقصد کے سچے وفادار ہو۔

اب رہ جاتا ہے وہ شخص جو اپنی قومیت کی نفی نہیں کرنا چاہتا، بلکہ دل سے اس کے بقا اور نشوونما کا آرزومند ہے، اور اس امر کی حقیقی خواہش رکھتا ہے کہ آزاد ہندوستان میں اس کی قومیت کو آزادی، خود اختیاری اور ترقی کا پورا موقع ملے، مگر اس کے باوجود کسی غلطی یا غلط فہمی کی وجہ سے اس تحریک میں شامل ہو گیا ہے جو اس کے قومی نصب العین سے اصولی، مقصدی، اور فعلی مخالفت رکھتی ہے۔ ایسے شخص کی حالت کا ہمیں تجزیہ کر کے دیکھنا ہوگا کہ وہ کس نوعیت کی غلطی یا غلط فہمی میں مبتلا ہے۔

اس کے مرض کا ایک سبب یہ ہو سکتا ہے کہ وہ اس تحریک کی حقیقت سے واقف نہ ہو، بلکہ چند سطحی باتیں اپنے حسبِ منشا پا کر اس کے ساتھ لگ گیا ہو۔ گذشتہ

صفحات اس بیماری کا علاج کرنے کے لیے کافی ہیں۔ آنکھیں کھول کر انہیں پڑھے گا تو انشاء اللہ شفایاب ہو جائے گا۔

دوسرا سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اس تحریک کی حقیقت اور اس کے نتائج کو سمجھتا ہو، مگر علم و واقفیت کی کمی نے اسے اس غلط فہمی میں مبتلا کر دیا ہو کہ ہندوستان میں آزاد حکومت کا نشوونما ان جمہوری اصولوں کے سوا کسی دوسری صورت سے ممکن ہی نہیں ہے جن کو یہاں رواج دیا جا رہا ہے، لہٰذا وطنی آزادی کی خواہش رکھنے والے کو چار و ناچار انہیں قبول کرنا ہی پڑے گا، ورنہ پھر دوسرا راستہ اور ایک ہی راستہ انگریز کی غلامی کا ہے۔ جو لوگ اس غلطی کے شکار ہوتے ہیں انہیں اس کتاب کا آخری باب کھلے دل سے پڑھنا چاہیے۔ ہمیں اُمید ہے کہ ان کی پوری تشفی ہو جائے گی۔

تیسرا سبب یہ ہو سکتا ہے کہ علمی و نظری حیثیت سے تو ایک شخص کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہے، مگر یاس، بزدلی اور کم ہمتی نے اس کے دل پر قابو پا لیا ہے۔ وہ اس بات سے تو بے خبر نہیں ہے کہ ہندوستان کے مسئلہ کو حل کرنے کی دوسری صحیح صورتیں بھی موجود ہیں، مگر وہ ایک طرف اپنی قوم کی بیچارگی کو دیکھتا ہے اور دوسری طرف یہ دیکھ کر ہیبت زدہ ہو جاتا ہے کہ وطنی قومیت اور جمہوریت کی پُشت پر زبردست طاقتیں ہیں جن کا مقابلہ یا تو کیا ہی نہیں جا سکتا، یا اگر کیا جا سکتا ہے تو اپنے آپ کو بربادی و ہلاکت کے خطرے میں ڈالنا پڑے گا اور پھر بھی کامیابی کی اُمید کم ہی ہے۔ ایسے شخص کے لیے ہم خدا سے دُعا کریں گے کہ اس کے دل میں ایمان کی طاقت پیدا ہو۔ اور خود اس شخص کو بھی مشورہ دیں گے کہ بندۂ خدا، اگر تجھ میں تائیدِ حق کا بل بوتا نہیں ہے تو باطل کی تائید کر کے اپنی قبر میں آگ کیوں بھرتا ہے؟ جا، اور گوشے میں بیٹھ کر اللہ اللہ کر۔ یہ فتنہ کا وقت ہے۔ جو مردِ میدان بن کر نہیں نکل سکتا۔ اس کے لیے سلامتیِ ایمان کی راہ صرف یہی ہے کہ اپنے گھر کا دروازہ بند کر کے بیٹھ جائے۔

چوتھا سبب یہ بھی ممکن ہے کہ آدمی پر جذبۂ انتقام مستولی ہو گیا ہو۔ اسے انگریز کے ہاتھوں سے اتنی تکلیفیں پہنچی ہوں کہ وہ جوشِ غضب میں اندھا ہو گیا ہو اور کہتا ہو کہ

اگر حق کی تلوار نہیں ملتی تو پروا نہیں، میں باطل ہی کی تلوار سے اس دشمن کا سر اڑاؤں گا، چاہے ساتھ ہی ساتھ میری اپنی ملت کی بھی رگ جان کٹ کے رہ جائے۔ ایسے شخص کی بیماریٔ دل کا علاج خداوند عالم کے سوا اور کسی کے پاس نہیں۔ اللہ اس کو توبہ کی توفیق عطا فرمائے، ورنہ ڈر ہے کہ جس راہ پر وہ اس جذبہ کے ساتھ چل رہا ہے اس میں اپنی عمر بھر کی کمائی ضائع کر دے گا اور قیامت کے روز اس حال میں خدا کے سامنے حاضر ہوگا کہ ساری عبادتیں اور نیکیاں اس کے نامۂ اعمال سے غائب ہوں گی اور ایک قوم کی قوم کو گمراہی و ارتداد میں مبتلا کرنے کا مظلمۂ عظیم اس کی گردن پر ہوگا۔ یَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ وَ اَوْزَارَ الَّذِیْنَ یُضِلُّوْنَهُمْ۔

پانچواں سبب یہ ہے کہ ایک شخص اس فعل کو کارِ ثواب سمجھ کر کر رہا ہو۔ وہ اس خیال میں مبتلا ہو کہ دنیائے اسلام کو انگریزی امپیریلزم کے پنجے سے چھڑانے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ آزادیٔ ہند کی اس تحریک کا ساتھ دیا جائے۔ اب اگر اس میں ہندوستان کی مسلمان قوم ختم ہو جائے تو پروا نہیں۔ ہندوستان سے باہر کے مسلمان تو اس بلا سے نجات پا جائیں گے۔ اس خیالِ خام نے جس شخص پر قابو پا لیا ہے اس سے ہم تین باتیں عرض کریں گے۔

۱۔ انگریزی امپیریلزم کو اگر کوئی چیز ختم کر سکتی ہے تو وہ آزادیٔ کامل کی خالص انقلابی تحریک ہی ہے۔ اس کے بغیر نہ یہ بلا دور ہوگی نہ آپ کا مقصد حاصل ہوگا۔ لیکن یہ تحریک جس کا ساتھ آپ دے رہے ہیں نہ آزادیٔ کامل کی تحریک ہے اور نہ خالص انقلابی تحریک۔ اس کی جو حقیقت ہم پچھلے صفحات میں بیان کر چکے ہیں اس کی تردید میں اگر آپ کے پاس کانگریسی لیڈروں کے بعض دعووں کے سوا کوئی ثبوت ہو تو بسم اللہ، اسے سامنے لے آئیے۔ ورنہ صریح واقعات کے خلاف آپ کا اپنی جگہ یہ سمجھ بیٹھنا کہ اس تحریک کی حمایت سے آپ دنیائے اسلام کو آزاد کرا لیں گے محض بے معنی ہے اور بلادتِ ذہن کے سوا کسی دوسری چیز پر دلالت نہیں کرتا۔

۲۔ پھر اگر بالفرض اس وطنی قومیت کی تحریک سے آپ کو فی الواقع دنیائے اسلام

کی آزادی حاصل بھی ہو سکتی ہو تو ہم کہیں گے کہ اس پاک مقصد کے لیے یہ ناپاک ذریعہ اختیار کرنا ہرگز جائز نہیں۔ خوب سمجھ لیجئے کہ اس تحریک کی کامیابی اور ہندوستان کی مسلمان قوم کا ارتداد دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ اس کا مآل یہ ہے کہ آٹھ کروڑ مسلمانوں کی عظیم الشان قوم رفتہ رفتہ مرتد ہو جائے اور اس کی آئندہ نسل سے مادہ پرست دہریئے پیدا ہوں، جن کے عقائد، اخلاق اور عمل میں اسلامیت کا شائبہ تک نہ پایا جائے۔ کیا اس نتیجہ کو سامنے رکھ کر کوئی شخص جو علم دین سے ذرہ برابر بھی بہرہ رکھتا ہو، یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ دُنیائے اسلام کی آزادی کے لیے یہ قربانی دینا بھی جائز ہے؟ اگر محض جان اور مال کی قربانی کا سوال ہوتا تو پروا نہ تھی، ہم کھلے دل کے ساتھ کہتے کہ اس سرزمین کا ایک ایک مسلمان اس مقصد کے لیے کٹ مرے، حتیٰ کہ ایک بچہ بھی زندہ نہ رہے۔ لیکن یہاں سوال دین و اخلاق کی قربانی کا ہے۔ یہاں یہ قربانی دینی پڑتی ہے کہ ہماری نسلیں باقی رہیں مگر مسلمان نہ رہیں۔ تو یہ قربانی دنیا کی کسی بڑی سے بڑی اور مقدس سے مقدس چیز حتیٰ کہ بیت اللہ اور گنبدِ خضرا کے لیے بھی نہیں دی جا سکتی۔

۳۔ وطن پرستی کی یہ تحریک اگر کامیاب ہو جائے تو دنیائے اسلام کے لیے انگریزی امپیریلزم کے بجائے ہندوستانی امپیریلزم کا خطرہ پیدا کر دے گی۔ نیشنلزم تاریخ کے دوران میں اکثر امپیریلزم کی شکل اختیار کرتا رہا ہے اور آج بھی اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ شترمرغ کی طرح ریت میں منہ چھپا لینے سے کچھ حاصل نہیں۔ آپ کو اچھی طرح جان لینا چاہیے کہ نیشنلزم کا نشہ جب کامیابی سے ہمکنار ہو گا تو امپیریلزم کا جنون بن جائے گا اور اس وقت دنیائے اسلام کے قلب میں ایک دوسرا جاپان پیدا ہو گا۔ آپ کی نسل نے تو محض پیٹ کی خاطر ارضِ حرب میں دادِ مردانگی دی ہے[1] لیکن آپ کی آئندہ نسل جو وردھا اسکیم اور ودیا مندر اسکیم سے تیار ہو گی، وہ اعتقاد کی

---

[1] اشارہ ہے ان مسلمان فوجیوں کی طرف جنہوں نے عراق، فلسطین اور سرزمین عرب کے دوسرے حصوں، حتیٰ کہ حجاز تک میں انگریز کے جھنڈے تلے جنگ کی تھی۔ مرتب

قوت کیساتھ یہ خدمت انجام دے گی۔ اس کا ضمیر اس فعل پر ملامت نہ کرے گا بلکہ الٹا فخر کرے گا کہ اس نے ہندوستان کا نام اونچا کیا اور اپنی "قوم" کے آگے دُور و نزدیک کی قوموں کے سر جھکا دیئے۔ پس درحقیقت ہندوستان کے مسلمان پر نیشنلزم کے شیطان کو مسلط کر دینا دنیائے اسلام کی کوئی بڑی خدمت نہیں ہے۔

غلط فہمی کا ازالہ

اب ایک غلط فہمی اور رہ جاتی ہے جسے دُور کر دینا ضروری ہے۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس ملک میں کانگریس ایک طاقت بن چکی ہے اور ایسی طاقت بن گئی ہے جس نے سیاسی قوت و اقتدار کے تمام سرچشموں پر قابو پا لیا ہے۔ اس سے الگ رہنا یہ معنی رکھتا ہے کہ ہم ان سرچشموں سے خود دستبردار ہو گئے اور دوسرے لوگوں کو آپ سے آپ ان کا قبضہ دے دیا۔ زیادہ صحیح تدبیر یہ ہے کہ اس جماعت کے اندر گھس جاؤ اور وہاں طاقت پیدا کرو۔ اس کا کم سے کم فائدہ یہ ہے کہ ہندو راج کے حامیوں کا زور ٹوٹ جائے گا اور مسلمان سیاسی طاقت میں حصہ دار بن جائیں گے اور اس میں زیادہ سے زیادہ فائدوں کے بھی امکانات ہیں۔ مثلاً یہ کہ مسلمان سوشلسٹ گروہ کے ساتھ مل کر مہاسبھائی عنصر کو شکست دے دیں، اور یہ کہ مسلمان اپنی بالاتر تہذیب سے ہندوؤں کو متاثر کریں اور آگ کی طرح ان کی تہذیب ہندوؤں میں پھیلتی چلی جائے۔

یہ بڑی دل خوش کن باتیں ہیں۔ مگر ہمیں تنقید کر کے دیکھنا چاہیئے کہ اس میں حقیقت کتنی ہے اور جنت الحمقاء کی ہوائیں کس قدر شامل ہو گئی ہیں۔

بلاشبہ کانگریس کا نظام جمہوری ہے اور اس کے آئین میں اتنی گنجائش موجود ہے کہ جو گروہ چاہے اس میں شریک ہو کر اقتدار کے مرکز پر قبضہ کرنے کی جدوجہد کر سکتا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح انگلستان کے آئین میں اس امر کی گنجائش موجود ہے کہ لبرل، کنزرویٹو، سوشلسٹ، کمیونسٹ، جو چاہے پارلیمنٹ میں جانے اور وزارت پر قبضہ کرنے کی کوشش کر سکتا ہے۔ نظری حیثیت سے یہ بھی ممکن ہے کہ دو یا تین چھوٹی جماعتیں مل کر ہر دوسری جماعت سے زیادہ طاقت ور ہو جائیں اور مرکزی اقتدار حاصل کر لیں۔

لیکن یہاں سوال آئین اور اس کی نظری گنجائشوں کا نہیں بلکہ امور واقعیہ کا ہے۔ جو جماعت خالص جمہوری اصولوں پر مبنی ہو اس میں کسی ایسی پارٹی کے برسر اقتدار ہونے کا ہرگز کوئی امکان نہیں جس کی حیثیت دراصل قومی اقلیت (National Minority) کی ہو، اور کثیر التعداد قوم کی تمام پارٹیوں میں جس کے خلاف قومی امتیاز اور قومی امپیریلزم کا جذبہ بطور ایک قدرِ مشترک کے پایا جاتا ہو۔ ایسی اقلیت نہ تو کبھی اکثریت بن سکتی ہے، اور نہ یہ امید کر سکتی ہے کہ کثیر التعداد قوم کی کوئی پارٹی اس کو برسر اقتدار آنے میں مدد دے گی۔

ہمارے سامنے آئرلینڈ کی مثال موجود ہے۔ ۱۸۰۰ء میں انگلینڈ اور آئرلینڈ کی یونین (وحدت) عمل میں آئی اور دونوں قوموں کو ایک قوم قرار دے کر ایک جمہوری نظام میں شریک کر دیا گیا۔ دونوں کی ایک ہی پارلیمنٹ تھی۔ ایک ہی طریقِ انتخاب سے دونوں اپنے اپنے نمائندے منتخب کر کے اس جمہوری ادارہ میں بھیجتے تھے۔ اور جہاں تک نظریہ کا تعلق ہے، آئین میں کوئی ایسی رکاوٹ موجود نہ تھی کہ آئرش کے نمائندے پارلیمنٹ میں اکثریت حاصل کر کے گورنمنٹ پر قابض نہ ہو سکیں یا کسی دوسری پارٹی کے ساتھ مل کر وزارت نہ بنا سکیں۔ لیکن فی الواقع ہوا کیا؟ اوکانل (O' Connel) جیسے آتش بیان خطیب اور ہوشیار قانون دان کی تدبیریں اور پارنل (Parnal) جیسے قابل پارلیمنٹری لیڈر کی چالیں بھی کچھ نہ کر سکیں۔ ایک سو بیس سال کی پوری تاریخ شاہد ہے کہ ایک دن کے لیے بھی آئرش نمائندوں کو برطانوی پارلیمنٹ میں اقتدار نصیب نہ ہوا۔ اور اقتدار تو درکنار وہ غریب کسی آئینی تدبیر سے ان مصائب کو بھی دور نہ کر سکے جو انگریزی حکومت کے ہاتھوں ان پر نازل ہوئے تھے۔ حتیٰ کہ آخرکار ان کو باہر سے لڑنا پڑا۔ اور آج کی آئرستانی حکومت کسی آئینی جدوجہد، کسی اندرونی تعاون کا نہیں بلکہ بیرونی جنگ کا نتیجہ ہے۔ یہی سبق ہم کو چیکوسلواکیا کے جمہوری نظام سے ملتا ہے جہاں جرمن اور سلاوک اقلیتیں چیک اکثریت کے مقابلہ میں پارلیمنٹری طریقوں سے کچھ نہ کر سکیں۔ یہی سبق ہمیں یوگوسلیویا سے ملتا ہے جہاں کروٹس اور سلافینی آج تک کبھی کسی آئینی چال سے حکومت

کے نظام پر قابض نہ ہو سکے۔ یہی سبق ہمیں امریکہ سے ملتا ہے جہاں ہر پارٹی حکومت پر قبضہ کر سکتی ہے مگر حبشی قوم کے لیے اس کا قطعاً کوئی امکان نہیں۔ لہٰذا جو لوگ اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ دراصل ہندوستان میں ہماری حیثیت محض ایک سیاسی پارٹی کی نہیں بلکہ ایک قومی اقلیت کی ہے، وہ کانگریس پر قبضہ کرنے کے خواب جس قدر چاہیں دیکھتے رہیں، اگر عقل سے نہیں سمجھتے تو تجربہ ہمیں بتا دے گا کہ یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکیں گے۔

بھول نہ جانا چاہیے کہ کانگریس کا اور ہمارا اختلاف محض ذرائع اور طریقوں (Means & Methods) کے اختلاف کی حیثیت نہیں رکھتا۔ یہ اصول و مقاصد اور پالیسی کا بنیادی اختلاف ہے۔ اس کے اصول قومیت و جمہوریت کو ہم بالکل بدل ڈالنا چاہتے ہیں۔ اس کے مقصد یعنی ایک قومی جمہوری لادینی اسٹیٹ کے قیام کو بھی ہم قبول نہیں کر سکتے۔ اس کی پالیسی یعنی بتدریج سیاسی اختیارات حاصل کرنے اور ان کی مدد سے ہندوؤں کی بالادستی عملاً قائم کر دینے کو بھی ہم گوارا نہیں کر سکتے۔ یہ تینوں بنیادی چیزیں جب تک بدل نہ جائیں، کانگریس کے ساتھ ہمارا تعاون اسلامی اغراض کے لیے ذرہ برابر مفید نہیں۔ اب یہ دیکھنا چاہیے کہ آیا کانگریس کے اندر جا کر ہم انہیں بدل سکتے ہیں؟

داخلی مقاومت یا تعاون سے کسی جمہوری تنظیم کے اصول، مقاصد اور پالیسی میں تغیر پیدا کرنے کی تین ہی صورتیں ممکن ہیں:۔

یا تو تغیر چاہنے والوں کی تعداد اتنی زیادہ ہو کہ وہ اس جماعت پر چھا جائیں۔ اس صورت میں کلی تغیر بھی ہو سکتا ہے۔

یا اس جماعت کے اندر ان کا نظام اتنا زبردست ہو کہ وہ اپنی منظم مقاومت سے اس جماعت کو پریشان کر دیں۔ اس صورت میں کلی تغیر تو نہیں، البتہ کسی حد تک تغیر ضرور ممکن ہے۔

یا پھر تغیر چاہنے والے اپنے اخلاقی اثر اور اپنے دلائل کی قوت سے اس

جماعت کی رائے کو متاثر کریں، اور اس طرح وہ جماعت خود ہی حق اور عدل کی طرف مائل ہو جائے۔ اس طریقہ کی کامیابی تمامتر اس جماعت کی انصاف پسندی و حق آگاہی پر منحصر ہے۔

ان میں سے پہلی صورت تو یہاں ناقابلِ عمل ہے۔ کسی حسابی معجزے کے بغیر یہ ممکن نہیں ہے کہ کانگریس میں مسلمانوں کے ووٹ ہندوؤں کے ووٹوں سے زیادہ ہو جائیں۔ لہٰذا جو لوگ مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ کثرت سے کانگریس میں داخل ہو اور اس پر قابض ہو جاؤ، ان کی بات اتنی ہی قابلِ التفات ہے جتنی اُس شیرخوار بچے کی بات قابلِ التفات ہو سکتی ہے جو بیچارا ایک اور چار کی نسبت سے بھی واقف نہیں۔

رہی دوسری صورت تو داخل میں منظم جدوجہد اور مقاومت صرف اس طرح ممکن ہے کہ کانگریس میں جتنے مسلمان شریک ہیں، اور آئندہ شریک ہوں، وہ سب کے سب، یا ان کی ایک بہت بڑی اکثریت ایک پارٹی، بلکہ ایک ٹیم بن کر رہیں، ان کی قیادت ایک ایسے دیندار گروہ کے ہاتھ میں ہو جو اسلامی مفاد کا صحیح احساس و شعور رکھتا ہو، اور وہ اس گروہ کی ایسی کامل اطاعت کریں کہ ان کا کانگریس میں رہنا یا نکل آنا اس کے حکم پر موقوف ہو۔ مگر کیا بحالت موجودہ کانگریس میں ایک مسلم پارٹی کی تنظیم اس طرز پر ہو سکتی ہے؟ واقعات سے اس کا جواب نفی میں ملتا ہے۔ وہاں جو مسلمان شریک ہیں بظاہر ان سب پر لفظ مسلمان کا اطلاق ہوتا ہے، اور آزادئ ہند کے مسئلے میں وہ ہم آہنگ بھی ہیں، لیکن اسلامی نقطۂ نظر سے ان کے خیالات اس قدر متضاد ہیں کہ ان کو ایک پارٹی میں منسلک کرنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں سے ایک گروہ تو قطعی طور پر اسلام سے منحرف ہو چکا ہے اور حتماً یہ رائے رکھتا ہے کہ ہندستان کے آئندہ نظام اجتماعی میں مذہب کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ دوسرا گروہ نہ منحرف ہے اور نہ معتقد۔ اس گروہ میں اتنی مختلف اقسام پائی جاتی ہیں جتنی سانپوں کی اقسام ہیں۔ ان میں سے بعض اسلام کے متعلق خود اپنے کچھ تصورات رکھتے ہیں جن کے لیے کتاب و سنت کی سند غیر ضروری ہے۔ بعض کو مسلمانوں کے سیاسی و معاشی مفاد سے تو فی الجملہ

دلچسپی ہے مگر اسلام سے کوئی دلچسپی نہیں۔ بعض ایسے ہیں جو مسلمان کے مفاد کو کسی حد تک اہمیت ضرور دیتے ہیں، مگر اتنی نہیں کہ "ملک" کے مفاد کا جو تصور ان کے دماغ میں ہے اس پر مسلمانوں کے مفاد کو قربان کرنے میں انہیں کوئی تامل ہو۔ تیسرا گروہ ایسے لوگوں پر مشتمل ہے جو دیندار، اہلِ علم اور نیک نیت ہیں۔ کانگریس میں جب کبھی ہندوستان کے مشترک مفاد کا کوئی مسئلہ اُٹھے گا یہ تینوں گروہ ایک آواز بلند کریں گے۔ مگر جب اسلام اور مسلمانوں کے مفاد کا سوال آئے گا تو یہ اس قدر بھانت بھانت کی بولیاں بولیں گے کہ اسلام اور مسلمان، دونوں غیر مسلموں کے لیے مضحکہ بن کر رہ جائیں گے، اور یہ متعین کرنا بھی مشکل ہو جائے گا کہ حقیقت میں اسلام کیا چیز ہے اور مسلمانوں کا مفاد کس چڑیا کا نام ہے۔

ماس کانٹیکٹ کے ذریعہ سے یہ تینوں گروہ مسلمانوں کو کانگریس میں بھرتی کر رہے ہیں اور اب علمائے کرام کے صدقے میں کانگریس کے ہندو ارکان بھی بھرتی کا کام کرنے کے قابل ہو گئے ہیں۔ اس طرح جو مسلمان کانگریس میں جا رہے ہیں وہ تینوں گروہوں اور ان کی بے شمار شاخوں میں تقسیم ہوتے چلے جاتے ہیں۔ کانگریس کے ہندو ارکان کی ہمدردیاں تمامتر پہلے گروہ سے وابستہ ہیں۔ خواہ وہ گاندھی جی ہوں یا جواہر لال یا کوئی سخت مہا سبھائی، بہرحال فطرتًا ان سب کا میلان اُن نام نہاد مسلمانوں کی طرف ہے جو اسلام سے اعتقادًا اور عملًا منحرف ہو چکے ہیں اور اس وقت ہندوستان میں اسلام اور مسلم قومیت کی جڑیں کاٹنے کے لیے بدترین منافقوں کا پارٹ ادا کر رہے ہیں۔ کانگریس کے ذمّہ دار عہدے اور کانگریسی حکومتوں کے تحت عزت اور منفعت اور اثر و اقتدار کے مناصب تمامتر انہی منافقین کے لیے وقف ہیں اور رہیں گے۔ ان کے بعد کانگریسی لیڈروں کے نزدیک اگر کوئی گروہ قابلِ ترجیح ہے تو وہ دوسرا گروہ ہے، اور اس گروہ میں سے خصوصیت کے ساتھ وہ طبقہ جو منافقین کے مقام سے اقرب ہے۔ باقی رہا تیسرا گروہ اور اس سے قریب تر تعلق رکھنے والے طبقے تو ان کو محض آلۂ کار کی حیثیت سے استعمال کیا جا رہا ہے جب تک یہ وفادار

خدام کی حیثیت سے صرف رنگروٹ بھرتی کرتے رہیں گے، ان سے مداہنت برتی جائے گی۔ جہاں انہوں نے کچھ زور پکڑا اور اسلامی مفاد کا نام لیا، ان پر منافقین کی اس فوج کو چھٹکار دیا جائے گا جو اسی دن کے لیے پرورش کی جارہی ہے۔ ایسے موقع پر ہندو لیڈروں کو خود سامنے آنے کی تکلیف بھی نہ اٹھانی پڑے گی۔ ہماری اپنی قوم کے منافقین ہی ہمارے دین داروں کو جھنجوڑ کھائیں گے۔ کیا ایسی حالت میں کانگریس کے اندر رہ کر اسلامی مفاد کے لیے کوئی منظم جدوجہد کی جاسکتی ہے؟

اس کے بعد تیسری صورت باقی رہ جاتی ہے۔ جہاں تک اخلاقی اثر اور دلیل و حجت کا تعلق ہے اس کے لیے کثرتِ تعداد کی کوئی حاجت نہیں۔ اگر کوئی جماعت واقعی حق پسند اور انصاف شعار ہے تو اس کو ایک تنہا شخص بھی حق کا اعتراف کرنے اور انصاف سے کام لینے پر آمادہ کرسکتا ہے۔ اب ہم پوچھتے ہیں کہ گذشتہ چند مہینوں میں کانگریسی حکومتوں نے مسلمانوں کے ساتھ جو صریح اور ناقابلِ انکار بے انصافیاں کی ہیں، ان میں سے کس کی تلافی ہمارے دیندار کانگریسی بھائیوں نے اپنے اخلاقی اثر اور زورِ استدلال سے کرائی؟ کیا وردھا اسکیم اور ودیا مندر اسکیم میں ایک شوشے کا بھی تغیر کرالیا؟ کیا گائے کی قربانی کو دفعہ ۱۴۴ کی زد سے بچالیا؟ کیا اُس صریح بے انصافی کا کوئی تدارک کرالیا جو بہار اور سی پی کے ڈسٹرکٹ بورڈوں اور میونسپلٹیوں کے مسلمانوں کے ساتھ روا رکھی گئی؟ جگہ جگہ مدرسوں اور پبلک جلسوں میں مسلمانوں کو بندے ماترم کے لیے قیامِ تعظیمی پر جو مجبور کیا جا رہا ہے۔ کیا اس کا کوئی تدارک کرالیا؟ اور اگر یہ نہیں تو یہی ارشاد ہو کہ صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ و سلام بھیجنے ہی کے لیے قیامِ تعظیمی ممنوع ہے، اور صرف اسی پر رسالے تصنیف کرنے اور فتوے شائع کرنے کی بھی ضرورت ہے؟ باقی رہا بندے ماترم تو وہ اس سے بالاتر ہے کہ اس کے لیے قیامِ تعظیمی کرنے یا نہ کرنے کا سوال معرضِ بحث میں لایا جاسکے؟ سی۔ پی کانگریس ورکنگ کمیٹی نے ہندو وزراء اور ایک مسلمان وزیر کے ساتھ جو مختلف قسم کے طرزِ عمل اختیار کیے، کیا اس پر کوئی نتیجہ خیز باز پرس کرلی؟ حکومت کی طاقت سے اُردو کو دبانے اور ہندی کو اُبھارنے کی جو کوششیں ہو رہی ہیں، کیا اُن کو رکوا دیا؟ کانگریسی

حکومتوں میں نہایت متعصب اور بدنام ہما سبھائیوں کو جو ذمہ دار عہدے دیے گئے ہیں۔
کیا ان پر کوئی مؤثر احتجاج کر لیا؟ اگر کوئی کانگریسی مسلمان حق پروری کے ساتھ نہیں بلکہ دیانت
اور صداقت کیساتھ ان امور کے متعلق اپنا کوئی کارنامہ پیش کر سکتا ہے تو سامنے آئے اور ضرور
آئے۔ اور اگر اس کے پاس ہمارے ان سوالات کا کوئی جواب اس کے سوا نہیں ہے کہ "ہماری
پشت پر دین دار مسلمانوں کی اتنی طاقت ہی نہیں جس سے ہم ان بے انصافیوں کا تدارک کر
سکیں" تو ہمارا مدعا خود اس کے اپنے اعتراف سے ثابت ہو گیا۔ ہم بھی اس سے یہی اعتراف
کرانا چاہتے ہیں کہ وہ ایک ایسی جماعت سے تعاون کر رہا ہے جو حق کو حق اور انصاف
کو انصاف کی حیثیت سے قبول کرنے والی نہیں، بلکہ صرف زور اور طاقت کے آگے سر
جھکانے والی ہے، لہٰذا اس کے ساتھ تعاون کر کے محض اخلاقی طاقت سے وہ کوئی فائدہ
حاصل نہیں کر سکتا۔

حصّہ چہارم

ہندوستان کے سیاسی مسئلہ
کے
حل کی راہیں

تین تجاویز

کانگریس اور قومی تحریک پر شدید تنقید اور متحدہ قومیت کی کلی نفی کے بعد فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ مسلمانوں کے لیے صحیح لائحہ عمل کیا ہے؟ مولانا مودودی صاحب نے اصولی طور پر سب سے پہلے یہ بات واضح کی کہ مسلمان کسی ایسی تحریک سے وابستہ نہیں ہو سکتے جو ہندوستانی قومیت کی داعی ہو۔ مسلمانوں کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ وہ اپنی جداگانہ قومیت کے تصور کو ایک سیاسی حقیقت کے طور پر منوائیں اور اسی نقطہ پر اپنی ساری توجہ مرکوز کر دیں۔ پھر آپ نے ہندوستان کے سیاسی مسئلہ کے حل کے لیے تین تجاویز پیش کیں۔ یعنی:

۱۔ تہذیبی بنیادوں پر بین الاقوامی وفاق کا قیام

۲۔ تہذیبی منطقوں کا تعین اور تبدیلی آبادی ــــ اور

۳۔ تقسیم ملک۔

یہ تجاویز ترجمان القرآن کی اکتوبر، نومبر اور دسمبر ۱۹۳۸ء کی اشاعت میں شائع ہوئی تھیں ــــ (مرتب)

مسلمان کیا کریں؟

تین تجاویز

یہ تمام بحث جو اس تفصیل کے ساتھ پچھلے صفحات میں کی گئی ہے اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ہم مسلمانوں کو ان کے غیر مسلم ہمسایوں سے لڑانا چاہتے ہیں، یا یہ بات ان کے دل میں بٹھانا چاہتے ہیں کہ اپنے ہموطنوں کے ساتھ ان کے اشتراکِ عمل کی کوئی صورت نہیں ہے، یا یہ کہ ہم ان کو نفسِ آزادیِ ہند کا مخالف بنانے کی فکر میں ہیں محض اس خوف سے کہ ہندو یہاں کثیر التعداد ہیں اور وہ ہم کو کھا جائیں گے۔ کچھ لوگ سمجھ بوجھ کی کمی کے سبب سے، اور کچھ دوسرے لوگ ہوشیاری کی زیادتی کے باعث ہمارے دلائل سن کر بے صبری کے ساتھ اسی نوعیت کے شبہات پیش کرنے لگتے ہیں۔ لیکن ہمارا مدعا دراصل کچھ اور ہے جس کی طرف اپنے مقدمہ میں ہم پہلے ہی اشارہ کر چکے ہیں اور اب ذرا زیادہ تفصیلی صورت میں اسے پیش کرتے ہیں۔

اصل مسئلہ

اس وقت ہندوستان میں ہمارے سامنے اصل سوال یہ نہیں ہے کہ ہمیں اپنی ہمسایہ قوم کے ساتھ اشتراکِ عمل کرنا چاہیے یا نہیں۔ ہم آزادیِ وطن کے لیے جدوجہد کریں

یا معطل ہو کر بیٹھے رہیں۔ ہمسایہ قوموں کے ساتھ مل کر چلیں یا لڑ کر گزر کریں۔ اس باب میں ظاہر ہے کہ دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ کم از کم کوئی ذی ہوش آدمی تو یہ نہیں کہہ سکتا کہ مسلمان یہاں تمام دوسری قوموں سے قطع تعلق کر کے بھی رہ سکتے ہیں، یا یہ کہ انہیں آزادی کی ضرورت نہیں ہے، یا یہ کہ ہمسایوں کے درمیان تعلقات کی تلخی اور آئے دن کی سر پھٹول اور اجنبی حکمرانوں کا اس سے فائدہ اٹھانا کوئی مرغوب چیز ہے۔ اسی طرح ہمارے سامنے اصل سوال یہ بھی نہیں ہے کہ اس ملک کے نظام حکومت کا ارتقاء جمہوریت کے راستہ پر ہو یا کسی دوسرے راستہ پر۔ کوئی خردمند نفس جمہوریت کی مخالفت نہیں کر سکتا اور نہ یہ کہہ سکتا ہے کہ یہاں بادشاہی، یا امراء گردی (ارسٹاکریسی)، یا اور کسی طرز کی حکومت ہونی چاہیے۔ درحقیقت جو سوال ہمارے لیے ایک مدت سے پریشان کن بنا ہوا ہے اور روز بروز زیادہ پریشان کن بنتا جا رہا ہے وہ یہ ہے کہ گزشتہ ستر اسی سال سے ہندوستان میں انگریزوں کی غلط رہنمائی و فرمانروائی اور ہندوؤں کی خوش نصیبی و خود غرضی کے سبب سے نظام حکومت کا نشوو ارتقاء واحد قومیت کے مفروضے پر جمہوری طرز ادارہ کی صورت میں ہو رہا ہے ——— نفس جمہوریت کو اور اس جمہوری طرز ادارہ کو جو واحد قومیت کے مفروضہ پر مبنی ہو، ایک دوسرے سے خلط ملط نہ کرنا چاہیے۔ دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے اور ایک سے اختلاف کرنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم دوسرے سے اختلاف کر رہے ہیں۔ اب حقیقت نفس الامری تو یہ ہے کہ یہاں واحد قومیت موجود نہیں ہے اور واحد قومیت جن بنیادوں پر تعمیر ہو سکتی ہے وہ بھی موجود نہیں ہیں۔ لیکن یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ ہم ہندو، مسلمان، اچھوت، سکھ، عیسائی وغیرہ، سب ایک جغرافی نام اور ایک سیاسی نظام رکھنے والے ملک میں پیدا ہونے اور رہنے بسنے کی وجہ سے ایک قوم ہیں لہٰذا ہمارے درمیان جمہوریت کا یہ قاعدہ جاری ہو سکتا ہے اور ہونا چاہیے کہ ہم میں سے جو جماعت کثیر التعداد ہو اسی کی مرضی کے مطابق حکومت چلے۔ اسی نظریہ کی بنا پر دستور حکومت بنایا گیا ہے اور آئندہ جو دستوری ارتقاء ہونے والا ہے اس کے لیے یہی راستہ متعین کر دیا گیا ہے۔ انگریز اپنے نزدیک،

اس کو صحیح سمجھتا ہے اور اس کے پاس طاقت ہے جس کے بل پر وہ ہندوستان کو اس راستہ پر لیے جا رہا ہے۔ ہندو اپنے لیے اس کو سراسر مفید پاتا ہے اور وہ قوم پرستانہ جوش کے ساتھ اس پر جانے کے لیے آمادہ ہے۔ اس صورتِ حال نے اس کے لیے ہندو قوم پرستی اور ہندوستانی وطن پرستی، دونوں کو ایک کر دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وطن کی سچی محبت کا تقاضا یہی ہے کہ اس کو آزادی اور خود مختاری ایسے ہی جمہوری نظام کی شکل میں حاصل ہو۔ ہندو قوم پرستی کے جتنے حوصلے اس کے سینے میں فطری طور پر پیدا ہوتے ہیں وہ بھی سب کے سب اسی ایک چیز میں پورے ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا وہ اس میں نہ تو کوئی قباحت محسوس کرتا ہے، نہ اس امر کی کوئی وجہ ہے کہ وہ کوئی قباحت محسوس کرے، اور نہ اس کے لیے یا اس کے سرپرست کے لیے اُن لوگوں کے احساسات کو سمجھنا آسان ہے جو اس میں قباحت پاتے ہیں۔ اپنے سرپرست کے ساتھ اس کی کشاکش جو کچھ بھی ہے صرف اس امر میں ہے کہ یہ اس راستہ پر جلدی بڑھنا چاہتا ہے اور دُور تک پہنچ جانا چاہتا ہے، اور وہ اس کی خواہش کو پورا کر دینے میں تامل کر رہا ہے۔ مگر ہمارا معاملہ بالکل برعکس ہے۔ ہمارے لیے اس نظام میں قباحت ہے اور اس کی مزید ترقی میں مضرت ہے اور اس کی تکمیل میں ہلاکت ہے۔ ہندو کے برخلاف ہمارا حال یہ ہے کہ اس نظام میں ہمارے قومی حوصلے پورے نہیں ہوتے بلکہ ان کا گلا گھٹ جاتا ہے، ان کی جڑ کٹ جاتی ہے، اس لیے کہ ہم شمار میں کم ہیں اور یہ نظام جو کچھ دیتا ہے اُن کو دیتا ہے جو شمار میں زیادہ ہوں۔ جو کچھ یہ دیتا ہے اگر ہم اسے لینا چاہیں تو لازم آتا ہے کہ اپنی قومی خودی کو خود مٹا دیں، اور اگر ہم اپنی خودی کو باقی رکھنا چاہیں تو یہ ہمیں کچھ نہیں دیتا، جس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دستوری ارتقار کے ساتھ ساتھ تمام طاقت دوسروں کے ہاتھ میں چلی جائے اور وہ بزور ہماری خودی کو مٹائیں۔ اس صورتِ حال نے ہم کو ایسی جگہ لا کھڑا کر دیا ہے جہاں ہمیں صرف یہ اختیار دیا جاتا ہے کہ خودکشی اور سزائے موت میں سے کسی چیز کو منتخب کر لیں۔ ہمارے سامنے زندگی اور آزادی پیش ہی نہیں کی جاتی بلکہ صرف یہ چیز پیش کی جاتی ہے کہ یا تو اپنے وجود کی خود نفی کر دو، یا پھر اپنے آپ

کو سپرد کردو تاکہ نفی کرنے کی یہ خدمت دوسرے انجام دیں۔ پس جو سوال ہم کو حل کرنا ہے وہ یہ ہے کہ یہ چکر جس میں لاکر ہم پھنسا دیئے گئے ہیں، اس سے نکلنے کی بھی کوئی صورت ہے یا نہیں؟

مسلمان ایک قوم

دوسری قلیل التعداد قوموں کی پوزیشن کیا ہے؟ اس کا فیصلہ ہم نہیں کر سکتے۔ یہ ان کا اپنا کام ہے کہ اس کو سمجھیں اور رائے قائم کریں کہ واحد قومیت پر جمہوری نظام کی تعمیر کے منطقی اور واقعی نتائج انہیں قبول ہیں یا نہیں۔ ہم صرف اپنی پوزیشن کو پوری طرح سمجھ سکتے ہیں اور اسی کے متعلق ٹھیک طور پر کہہ سکتے ہیں۔ ہم ایک مستقل قوم ہیں جس کی اجتماعی زندگی ایک مخصوص اخلاقی و تمدنی قانون پر مبنی ہے۔ اکثریت کی قوم میں اور ہم میں اساسی اور اصولی اختلافات ہیں۔ اُس کے اخلاقی و تمدنی اصول ہمارے اصولوں سے مختلف ہیں۔ جب تک یہ اختلاف باقی ہے، یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ ہم اور وہ من کل الوجوہ ایک ہو جائیں۔ جن امور کو مشترک کہا جاتا ہے ان میں بھی تفصیلات پر پہنچ کر ہمارے اور ان کے درمیان نقطۂ نظر کا، مقاصد اور ضروریات کا، اصولوں اور طریقوں کا اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً تعلیم کو لیجئے۔ جہالت کو دور کرنا اور تعلیم کو عام کرنا اور کار آمد تعلیم دینا ہم بھی چاہتے ہیں اور وہ بھی۔ اِس حد تک ہمارے اور ان کے درمیان اشتراک ہے اور ہم بڑی خوشی کے ساتھ اِس کارِ خیر میں ان کے ساتھ مل کر جدّ و جہد کر سکتے ہیں۔ مگر تعلیم کا مسئلہ تخلیقِ مقصدِ حیات، تعمیرِ ذہنیت، تشکیلِ اخلاق، تصویرِ عادات اور فی الجملہ اُس نیشنل ٹائپ کی پرورش کے ساتھ لازمی طور پر جُڑا ہوا ہے جسے ایک قوم اپنے اسلاف سے پاتی ہے اور اپنی آئندہ نسلوں میں ترقی کے ساتھ برقرار رکھنا چاہتی ہے۔ تعلیم کی اِس تفصیلی صورت میں ہمارے اور اُن کے درمیان اتفاق نہیں ہے۔ ہم یہ ضرور چاہیں گے کہ ہماری اور اُن کی آئندہ نسلوں میں حُسنِ سلوک ہو، شریفانہ ہمسائیگی کے تعلقات ہوں اور یہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ہندوستان کی بھلائی کے لیے کام کریں۔ مگر یہ سب کچھ ہم اپنے نیشنل ٹائپ کا تسلسل

"قائم رکھنے کے ساتھ چاہیں گے، نہ یہ کہ ہماری نیشنل ٹائپ ان کے ٹائپ میں گم ہو جائے، یا دونوں گڈمڈ ہو کر کسی بے ہودہ [illegible] یا غیر متعین وضع کے ٹائپ میں تبدیل ہو جائیں۔ لہٰذا تعلیم عمومی کے مسئلہ میں ہمارے اور ان کے درمیان کوئی اشتراکِ عمل ممکن نہیں، نہ یہ ممکن ہے کہ ہم میں سے کوئی ایک اپنی آئندہ نسل کو اطمینان کے ساتھ دوسرے کے حوالہ کر دے اور اُسے اختیار دے دے کہ ان کچی لکڑیوں کو جس صورت کا چاہے بنائے۔ ایسا ہی حال زندگی کے دوسرے اہم مسائل کا بھی ہے۔ خوش حالی ہم بھی چاہتے ہیں، مگر ہمارے اور ان کے معاشی اصول، مناہج، مسائل بالکل یکساں نہیں ہیں۔ اصلاحِ معاشرت کے ہم بھی خواہاں ہیں، مگر اصلاح کے مفہوم و معیار اور معاشرت کے اصول و قوانین میں ہم اور وہ بالکل متفق نہیں ہیں۔ تمدنی ترقی ہمیں بھی مطلوب ہے۔ مگر تمدن کے قالب میں جو روح کام کرتی ہے، اور جو روح اس کی ترقی کا راستہ متعین کرتی ہے، وہ ہمارے اور ان کے درمیان بالکل ایک نہیں ہے۔ پنڈت جواہر لال اور ان کی طرح کے سطح بین لوگوں کے لیے یہ کہہ دینا آسان ہے کہ اس سائنٹفک تمدن کے دور میں ریل، ہوائی جہاز، ریڈیو اور کثیر پیداآوری (Mass Production) نے قوموں کے حدود و امتیاز کو توڑ دیا ہے اور اب قومی تمدن کا زمانہ ختم ہو گیا۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ اس وقت جو تمدن پھیل رہا ہے اس کی یہ خاص صورت مغربی تہذیب نے بنائی ہے اور اس تہذیب کو دنیا پر چھا جانے کا موقع اس لیے مل گیا ہے کہ یہ سائنس کے طاقتور وسائل سے کام لے رہی ہے۔ یہی وسائل ہماری تہذیب کے ہاتھ آجائیں تو وہ اس سے زیادہ صالح اور زیادہ درخشاں تمدن پیدا کرے گی اور وہ بھی اسی طرح قوموں کی حدود و امتیاز کو توڑ کر ان کے گھروں تک گھستا چلا جائے گا۔ لہٰذا پنڈت جی جیسے حضرات کی زبان سے بس یہ خبر سُن کر کہ اب قومی تمدنوں کا زمانہ لد گیا ہے، ہم ہتھیار نہ ڈال دیں گے اور نہ اس بات کے لیے راضی ہوں گے کہ جو تمدن پھیل رہا ہے اسی میں اپنے آپ کو گم کر دیں۔ خلاصہ یہ کہ ہماری اور ان کی راہیں متوازی (Parallel) تو چل سکتی ہیں اور کہیں کہیں مل بھی سکتی ہیں۔ لیکن از اوّل تا آخر ایک ہو جائیں، یہ کسی طرح ممکن نہیں۔

جب صورتِ حال یہ ہے تو ہمیں اور ان کو ملا کر ایک ایسا نظامِ حکومت کیونکر بنایا جا سکتا

ہے جس میں جمہوریت کا قاعدہ نافذ ہو؟ ہم اس بات پر کیسے راضی ہو سکتے ہیں کہ زندگی کے کسی معاملہ کا جو فیصلہ چار ہندو کر دیں اسے ایک مسلمان بھی مانے اور صرف اس لیے مان لے کہ یہ ایک ہے اور وہ چار ہیں۔ خصوصاً اس زمانہ میں جب کہ حکومت کا دائرہ غیر محدود ہے اور پرانے نظریہ سیاست نے جتنے حرم بنائے تھے ان سب کو توڑ کر وہ شخصی زندگی تک گھس گیا ہے، ہم اس اصول کو کس طرح مان سکتے ہیں؟ اس کو مان لینے کے بعد تو لامحالہ دو ہی صورتیں پیش آسکتی ہیں۔

۱۔ اگر ہم حکومت میں عملاً حصہ دار بننا چاہیں تو اپنے امتیازی وجود کو مٹا دیں۔

۲۔ اور اگر اپنے امتیازی وجود کو قائم رکھنا چاہیں تو حکومت سے عملاً بے دخل ہو جائیں۔

یہ ممکن ہے کہ اکثریت فیاضی سے کام لے کر ہمیں ان دونوں مشکلوں سے بچا لے۔ لیکن یہ تو اس کے رحم و کرم کی بات ہے اور کوئی قوم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کسی دوسری قوم کے رحم و کرم پر نہ زندہ رہی ہے نہ رہ سکتی ہے۔ یہاں سوال فیاضی کا نہیں ہے بلکہ اس امر کا ہے کہ اس قسم کے جمہوری نظام کی فطرت کیا ہے۔ ایسا جمہوری نظام جب ایک چھوٹی اور ایک بڑی قوم کو ملا کر بنایا جائے گا تو عملاً وہ چھوٹی قوم کو بڑی قوم کا محکوم بنا دے گا۔ اس میں بڑی قوم کو خود اختیاری ملے گی اور چھوٹی قوم کو بے اختیاری۔ اس میں عمومی حاکمیت کا جمہوری نظریہ قطعی باطل ہو جائے گا۔ بڑی قوم کو بہر حال حاکمیت حاصل ہوگی چاہے وہ اپنی جداگانہ قومیت پر اصرار کرے یا نہ کرے۔ مگر چھوٹی قوم حاکمیت میں حصہ دار نہیں ہو سکتی جب تک وہ اپنی قومیت سے دست بردار نہ ہو جائے۔ بڑی قوم اپنے تمام اصولوں پر قائم رہ سکتی ہے اور ان کو نہ صرف اپنے اوپر بلکہ دوسروں پر بھی نافذ کر سکتی ہے۔ مگر چھوٹی قوم کے لیے رفتہ رفتہ اپنے تمام اصولوں کو قربان کر دینا لازم آجاتا ہے۔ وہ دوسروں پر نافذ کرنا تو درکنار خود اپنے اوپر بھی ان کو نافذ نہیں کر سکتی۔ اس کو اپنے اصولِ تہذیب پر رہ کر ترقی کرنے، بلکہ زندہ رہنے کا بھی موقع نہیں مل سکتا۔ اس کے اپنے ہاتھ میں کوئی ایسی طاقت ہی نہیں آتی جس سے وہ اپنی خودی کو آپ برقرار رکھ سکے۔ اس کی خودی

دوسروں کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے کہ چاہیں اسے برقرار رہنے دیں یا اپنی خودی میں جذب کر لیں۔ کیا اس کا نام آزادی ہے؟ کیا اسے جمہوریت کہتے ہیں؟ کیا یہ عمومی حاکمیت ہے؟ کیا اس کے لیے ہم لڑیں اور جانفشانی دکھائیں؟ ہمیں آزادی کے لیے لڑنے سے انکار نہیں، مگر ہم یہ پوچھتے ہیں کہ اس نوعیت کے نظام میں ہمارے لیے آزادی ہے کہاں؟ ہم جمہوریت کے مخالف نہیں۔ مگر ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ جس عمومی حاکمیت کو جمہوریت کہتے ہیں، اس کے اندر ہمارا حصّہ کہاں ہے؟ ہم اپنی ہمسایہ قوم کے ساتھ اشتراکِ عمل کرنے سے انکار نہیں کرتے۔ مگر سوال یہ ہے کہ اشتراکِ عمل کی صورت کیا ہے؟ اس کی بنیاد کیا ہے؟ مشترک زندگی کے لیے تو اشتراکِ عمل کرنے سے ہمیں انکار نہیں۔ مگر یہاں ہم سے کہا جاتا ہے کہ اپنی قبر کھودنے کے کام میں گورکنوں کے ساتھ اشتراکِ عمل کرو۔ ہمارا جھگڑا اس پر ہے کہ اشتراکِ عمل کی یہ کون سی بنیاد ہے؟ ہم نے تو یہ کبھی نہیں کہا کہ ہم اپنی ہمسایہ قوم سے ملنا نہیں چاہتے، لڑ کر گزر کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ملنے کی صورت کیا ہے؟ ہم اس کے ساتھ اس صورت میں مل کر چلنے کے لیے راضی ہیں کہ ہم بھی زندہ رہیں اور وہ بھی۔ مگر وہاں قومی استعلاء و استکبار (National Imperialism) کا بھوت سوار ہے اور مردم خوری کا چسکا لگ گیا ہے۔ کیا ہمیں اس بھوت سے ملنے کے لیے کہا جا رہا ہے؟ کیا اس سے بھی صلح اور دوستی ہو سکتی ہے؟

یہ باتیں ہیں جن پر ہمارے اُن بھائیوں کو ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیے جو ہمارے خیالات کو سنتے ہی آپے سے باہر ہو جاتے ہیں اور چیخنا شروع کر دیتے ہیں کہ تم آزادی کے مخالف ہو، اور متحدہ جدوجہد کا دروازہ بند کرتے ہو، اور انگریزی امپیریلزم کو تقویت پہنچاتے ہو۔ ہم ان سے عرض کرتے ہیں کہ بات کی پچ کرنے کی ضرورت نہیں، یہ معاملہ کسی شخصی جائداد یا کسی پارٹی کے گرنے یا اُٹھنے کا نہیں، بلکہ اُس قوم کی زندگی کا ہے جس کی فلاح و بہبود کے لیے ہم اور آپ سب خدا کے سامنے جوابدہ ہیں۔ ضد اور ہٹ دھرمی شاید دنیا میں بات بنا دے مگر آخرت میں تو نہ بنا سکے گی۔ لہٰذا لاطائل بلند آہنگی اور بے اصل سخن پروری کو چھوڑیئے اور ایمان و احتساب نفس کے ساتھ سوچئے کہ

جو کچھ ان صفحات میں عرض کیا جا رہا ہے وہ حق ہے یا نہیں۔

اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ فی الواقع یہ سوال ہندوستان میں امتِ مسلمہ کی زندگی و موت کا ہے اور اس کو حل کرنے کا یہی وقت ہے، اور اس کو آزادیِ ہند کا مسئلہ حل ہونے تک اٹھا کر رکھنا موجودہ سیاسی حالات میں صحیح نہیں ہے، تو بات آسان ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد صرف یہ سوال رہ جاتا ہے کہ اس چکر سے مسلمانوں کو نکالنے کی معقول صورت کیا ہے؟ اس سوال کا جواب دینا ہمارا فرض ہے اور ہم اس فرض کو کما حقہٗ ادا کرنے کی کوشش کریں گے۔

سب سے پہلے ہمیں یہ طے کرنا چاہیئے کہ ہم چاہتے کیا ہیں۔ پھر یہ معلوم کرنے کی ضرورت ہو گی کہ اس مقصد تک پہنچنے کا صحیح راستہ کون سا ہے۔

۱۔ ہمارے پچھلے بیان سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ واحد قومیت کا مفروضہ اور اس پر جمہوریت کی تعمیر ہی دراصل خرابی کی جڑ اور بس کی گانٹھ ہے۔ اب تک ہماری سیاسی پالیسی یہ رہی ہے کہ وطنی قومیت کے اصول کو ہم نے جُوں کا توں رہنے دیا، اُن جمہوری ادارات کو بھی قبول کر لیا جو اس غلط قاعدے پر بنائے جاتے رہے، اور اپنا تمام زور صرف اس بات پر صَرف کیا کہ اس بد اصل دستور کے اندر کسی طرح اپنے تحفّظ کا سامان کریں۔ یہ بُنیادی غلطی تھی اور اب اس کے تلخ نتائج واضح طور پر ہمارے سامنے آ گئے ہیں۔ اب ضرورت ہے کہ ہم سرے سے اپنی اِس پُوری سیاست پر نظرِ ثانی کریں۔ ہمیں جان لینا چاہیئے کہ جس دستورِ حکومت کی بنیاد اِن اصولوں پر ہو اس میں کسی قلیل التعداد قوم کا تحفّظ کسی طرح نہیں ہو سکتا۔ جداگانہ انتخاب، پاسنگ (Weightage)، نشستوں کا تعیّن، عہدوں اور مناصب میں حصّہ کی تخصیص، یہ سب قطعی بیکار ہیں جب کہ قلیل و کثیر کو ایک مجموعہ فرض کر کے کثیر کی رائے کو قوّتِ نافذہ عطا کر دی جاتی۔ خرابی کی اِس جڑ کو پا لینے کے بعد ہمیں شاخوں کو چھوڑ کر اپنا پورا زور اسی کے استیصال پر صَرف کرنا چاہیئے۔ ہماری قومی سیاست کا اوّلین نصب العین اب یہ ہونا چاہیئے کہ اس واحد قومیت کے مفروضہ کی دھجیاں بکھیر دیں اور اپنی مستقل قومیت تسلیم کرائے بغیر ایک قدم آگے نہ چلنے

دیں۔

۲۔ واحد قومیت کا مفروضہ ٹوٹنے کے ساتھ ہی جمہوریت کا وہ غلط نظریہ بھی آپ سے آپ پاش پاش ہو جاتا ہے جس پر ہندوستان کے موجودہ دستور کی بنا رکھی گئی ہے اور جس کو انہی خطوط پر آگے بڑھانے کے لیے کانگریس اور ہندو سبھا کوشش کر رہی ہیں۔ اگر ہندوستان ایک قوم کا نہیں بلکہ کم از کم دو یا اس سے زائد قوموں کا ملک ہے تو یہاں خالص جمہوریت کے وہ اصول ہرگز نہیں چل سکتے جو صرف ایک قوم کے لیے موزون ہیں۔ دو الگ قوموں کی ایک ڈیموکریسی اصولاً غلط ہے، عین اصولِ جمہوریت کی نفی ہے، عملاً دنیا کے کسی ملک میں کامیاب نہیں ہو سکی ہے، اور یہ قطعی طور پر ثابت ہو چکا ہے کہ ایسی جمہوریت دراصل ایک قوم پر دوسری قوم کی قیصریت مسلط کرنے کا مجرب نسخہ ہے۔ ہم اس کے لیے ہرگز تیار نہیں ہیں کہ اس نسخہ کو یہاں آزمایا جائے۔

۳۔ دو یا زاید قوموں کے ملک میں عمومی حاکمیت کی یہ تفسیر بھی قطعاً غلط ہے کہ ہر باشندۂ ملک کو محض باشندۂ ملک ہونے کی حیثیت سے حاکمیت حاصل ہو۔ محض ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے دولتِ مشترکہ میں حصہ دار ہونا اور حاکمیت سے متمتع ہونا ہمارے لیے بالکل بے معنی اور بیکار ہو گا۔ ہماری ہندوستانیت ہماری مسلمانیت سے نہ تو منفک ہو سکتی ہے اور نہ ان دونوں کو الگ الگ خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ مسلمان کسی حال اور کسی حیثیت میں بھی غیر مسلم نہیں ہے۔ وہ اپنے بچے کا باپ، اپنی بیوی کا شوہر، اپنے باپ کا بیٹا اور اپنے بھائی کا بھائی بھی مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہے، اور اسلام ہی کا قانون اسے بتاتا ہے کہ ان سب کے ساتھ اس کے تعلق کی نوعیت کیا ہونی چاہیے۔ وہ اپنے اہلِ محلہ کا ہمسایہ، اپنے شہر والوں کا رفیق، اپنے وطن والوں کا معاون اور اپنے بنی نوع کا بھائی بھی مسلمان ہونے کی حیثیت ہی سے ہے، اور اسلام ہی اسے ہمسائیگی، رفاقت، تعاون اور برادری کے اصول و حدود بتاتا ہے۔ انسانی تہذیب و تمدن، معیشت و معاشرت اور نظمِ اجتماعی کے جملہ معاملات میں وہ جیسا اور جس قدر حصہ لے گا، مسلمان ہی کی حیثیت سے لے گا، اس لیے کہ اس کے

عین مسلمان ہونے ہی کا اقتضاء یہ ہے کہ ان سب معاملات میں وہ اسلام کا نقطۂ نظر اختیار کرے اور اسلام کے اصول پر چلے ۔ اُس سے یہ کہنا کہ تو ہندوستان کی اجتماعی زندگی میں اپنی مسلمان ہونے کی حیثیت کو الگ کر کے ہی حصّہ لے سکتا ہے ، دراصل اس سے یہ کہنا ہے کہ تو ہندوستان میں مسلمان بن کر نہیں رہ سکتا ۔ دوسری قوموں کے متعلق تو ہمیں کچھ کہنے کا منصب نہیں ، مگر مسلمانوں کے متعلق ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ ان کے لیے یہ پوزیشن کسی طرح قابلِ قبول نہیں ہے ۔ علاوہ بریں اگر جمہوری حاکمیت کی تفسیر یہ کی جائے کہ ملک کی حکومت میں ہمارا حصّہ صرف ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے ہے تو اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ ہماری زندگی جدا الگ الگ خانوں میں تقسیم ہو جاتی ہے ۔ ایک خانہ ہندوستانیت کا ہے جس میں ہم حکومت کے حصّہ دار ہیں ، اور دوسرا خانہ مسلمان ہونے کی حیثیت کا ہے جس میں ہم حکومت کی طاقت اور اس کے اختیارات سے محروم ہیں ۔ بالفرض یہ تقسیم صحیح بھی ہو تو سوال یہ ہے کہ اپنی زندگی کے اس دوسرے خانے کو درست کرنے اور درست رکھنے کے لیے جن وسائل و ذرائع ، جن اختیارات و اقتدارات کی ہمیں ضرورت ہے وہ ہم کہاں سے لائیں گے ؟ وطنی حکومت میں سے تو یہ چیزیں ہم کو نہیں مل سکتیں کیونکہ اس میں ہمارا حصّہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے نہیں ہے ۔ کہیں باہر سے بھی ہم اسے نہیں لا سکتے ، اور خود اپنے اندر سے بھی اسے پیدا نہیں کر سکتے ۔ کیونکہ ان دونوں صورتوں میں وطنی حکومت سے تصادم ہوتا ہے ۔ پس لامحالہ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم کو آزادیٔ وطن کے بعد بھی آزادی میسّر نہ ہو ، اور ہماری تہذیب کا نظام جس طرح انگریز کی غلامی میں زندگی کے اسباب اور ترقی کے وسائل نہ پانے کے سبب سے مضمحل ہو رہا ہے اسی طرح آزادیٔ ہند کے دَور میں بھی مضمحل ہوتا چلا جائے ——— کوئی شخص جو دستوری مسائل کا ذرّہ برابر بھی فہم رکھتا ہو اس نتیجہ کا انکار نہیں کر سکتا ۔ اور کوئی شخص جس کے دل میں اسلام کی ذرّہ برابر بھی وقعت اور مسلمان رہنے کی کچھ بھی خواہش موجود ہو ، اس نتیجہ کو قبول کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہو سکتا ۔ لہٰذا ہمارے لیے اس امر پر اصرار کرنا قطعاً ناگزیر ہے

کہ آزاد ہندوستان کے جمہوری نظام میں ہمارا حصّہ "مسلم ہندوستانی" ہونے کی حیثیت سے ہونا چاہیئے نہ کہ محض ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے۔

یہ تین اہم ترین نکات ہیں جنہیں آئندہ کے لیے مسلمانوں کی قومی پالیسی اور ان کے سیاسی نصب العین کا سنگِ بنیاد قرار دینا چاہیئے ـــــ ان میں یک سر مو بھی کسی ترمیم کی گنجائش نہیں ہے۔ اس لیے کہ ان نکات سے ہٹنا دراصل موت کے گڑھے میں جانا ہے ـــــ اب یہ ظاہر بات ہے کہ برٹش گورنمنٹ کا بنایا ہوا دستورِ حکومت اور کانگریس اور مہاسبھا دونوں کا نصب العین ہمارے اِن نکات سے اصولاً متصادم ہوتا ہے اور ہمارے لیے لازم ہو جاتا ہے کہ اس کو بالکلیہ رد کریں۔ لیکن محض رد کر دینا کافی نہیں ہے یہ محض سلبی چیز ہے جس پر کسی عمارت کی تاسیس نہیں ہوتی۔ ہمیں ایجابی طور پر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتانا چاہیئے کہ ہمارے نکات کی بنیاد پر کون سا دستورِ حکومت بنایا جا سکتا ہے جو ممکن العمل بھی ہو، ملک کی دوسری قوموں کے لیے قابلِ قبول بھی ہو اور جس میں ہمارے قومی حوصلے بھی ٹھیک ٹھیک پورے ہو سکتے ہوں۔

اس سلسلہ میں ہمارے سامنے مستقبل ہند کی تعمیر کے لیے تین خاکے آتے ہیں جنہیں ہم الگ الگ پیش کریں گے۔

پہلا خاکہ

دو یا زائد قوموں کے ملک میں ایک جمہوری ریاست بنانے کی صحیح اور منصفانہ صورت یہ ہے:-

اولاً وہ بین الاقوامی وفاق (International Federation) کے اصول پر مبنی ہو، یا دوسرے الفاظ میں وہ ایک قوم کی ریاست نہیں بلکہ متوافق قوموں کی ایک ریاست (A State of Federated Nations) ہو۔

ثانیاً اس وفاق میں شریک ہونے والی ہر قوم کو تہذیبی خود اختیاری (Cultural Autonomy) حاصل ہو۔ یعنی ہر قوم اپنے مخصوص دائرۂ زندگی میں

اپنے گھر کی تنظیم و اصلاح کے لیے حکومت کے اختیارات استعمال کر سکے۔
ثالثاً مشترک وطنی معاملات کے لیے اس کا نظامِ عمل مساویانہ حصہ داری (Equal Partnership) پر تعمیر کیا جاتا ہے۔

ہندوستان کے حالات کو سیاسی نقطۂ نظر سے سمجھنے اور حل کرنے کی جن لوگوں نے کوشش کی ہے انہوں نے یہ بات تو تسلیم کر لی ہے کہ اس ملک کے لیے وحدانی (Unitary) طرز کی حکومت موزوں نہیں ہے، بلکہ یہاں ایک اسٹیٹ اگر بن سکتا ہے تو وہ صرف وفاقی اصول پر بن سکتا ہے۔ مگر افسوس یہ ہے کہ وہ حالات کے صرف ایک پہلو کو دیکھ کر اس نتیجہ پر پہنچے ہیں، دوسرا پہلو ان کی نگاہوں سے اوجھل رہ گیا ہے۔ انہوں نے صرف اس حد تک واقعات کو دیکھا اور سمجھا کہ یہاں دیسی ریاستیں اور برٹش انڈیا کے صوبے ایک دوسرے سے مختلف ہیں، اور خود صوبوں کی زبان، روایات، معاشرت اور عمرانی مسائل میں کافی تفاوت ہے۔ اس لیے وہ صرف اس نتیجہ تک پہنچ سکے کہ ان سب کو ایک مرکزی اقتدار کا بالکلیہ تابع بنا دینا درست نہیں ہے بلکہ ان کی اندرونی خود مختاری کو برقرار رکھ کر ان کے درمیانی وفاقی تعلق قائم کرنا چاہیے۔ لیکن واقعات کے اس پہلو پر ان کی نگاہ نہیں پہنچی کہ یہاں ریاستوں اور صوبوں کی طرح قوموں کے درمیان بھی اصول تہذیب، طرزِ زندگی، روایاتِ قومی اور ضروریاتِ اجتماعی میں کافی تفاوت ہے۔ اس حقیقت کو نظر انداز کر دینے کی وجہ سے انہوں نے مختلف قوموں کو ایک وحدانی طرز کی حکومت میں باندھ کر رکھ دیا۔ درانحالیکہ جو وجوہ ریاستوں کے معاملہ میں وفاقی اصول اختیار کرنے کے مقتضی ہوتے ہیں، ان سے زیادہ قوی وجوہ قوموں کے معاملہ میں وفاقی اصول اختیار کرنے کے مقتضی ہیں۔

وفاق کی روح کیا ہے؟ مختصراً اس کو یوں سمجھ لیجئے کہ جو جماعتیں کچھ ایسے مشترک اغراض و مفاد رکھتی ہوں کہ ایک دوسرے سے علیحدہ زندگی بسر کرنا ان کے لیے ممکن نہ ہو، اور اس کے ساتھ ان کے کچھ مخصوص حالات بھی ہوں جن کی بنا پر وہ بالکل ایک دوسرے میں مدغم ہو جانا بھی گوارا نہ کر سکتی ہوں، وہ آپس میں مل کر ایک طرح کی مصالحت (Compromise) کر لیتی ہیں کہ اپنے مخصوص معاملات میں ان کی خود مختاری بھی برقرار

رہے اور مشترک معاملات میں اشتراکِ عمل بھی ہو سکے۔ اس قسم کے وفاق میں مرکز اور وفاقی اجزاء کے درمیان حاکمیت منقسم ہو جاتی ہے۔ مرکز اور ہر ایک وفاقی جزو اپنے اپنے دائرۂ عمل میں مختار ہوتا ہے، نہ ایک کو دوسرے کے دائرے میں گھس آنے کا اختیار ہوتا ہے اور نہ آئینی حیثیت سے کسی ایک کو یہ اقتدار حاصل ہوتا ہے کہ دوسرے کو مٹا دے۔ اس طرح کی مصالحت یہ موقع بہم پہنچا دیتی ہے کہ مختلف النوع جماعتیں مشترک ضروریات کے لیے مل کر ایک اسٹیٹ بنا سکیں۔

وفاق کی اس رُوح کو سمجھ لینے کے بعد کسی سیاسی فہم و بصیرت رکھنے والے شخص کے لیے اس حقیقت کا ادراک کر لینا مشکل نہیں ہے کہ اس نوعیت کا وفاق جس طرح ریاستوں (یعنی الگ الگ جغرافی خطے رکھنے والی جماعتوں) کے درمیان ہو سکتا ہے، اسی طرح قوموں (یعنی ایک ہی جغرافی خطہ میں رہنے والی مختلف المذہب یا مختلف التمدن جماعتوں) کے درمیان بھی ہو سکتا ہے۔ البتہ اصولِ وفاق کا انطباق (Application) دونوں صورتوں میں مختلف طرز پر ہوگا۔ متوافق ریاستوں اور مرکز کے درمیان اختیارات کی تقسیم جس طرح پر کی جاتی ہے، متوافق قوموں کے درمیان وہ اس سے مختلف طریقہ پر ہوگی۔ پہلی چیز کو ہندوستان میں صوبائی خود اختیاری سے تعبیر کیا گیا ہے۔ دوسری چیز کو ہم تہذیبی خود اختیاری (Cultural Autonomy) سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کے بنیادی اصول حسب ذیل ہونے چاہئیں:۔

۱۔ وفاقی اسٹیٹ بنانے والی ہر قوم صاحبِ حاکمیت قوم (Sovereign Nation) ہو۔ یعنی وہ اپنے دائرۂ عمل میں خود حکومت کے اختیارات استعمال کرے۔

۲۔ تعلیم، مذہبی معاملات (مثلاً عبادت گاہوں اور اوقاف کا نظم و نسق اور مذہبی احکام کو اپنے افرادِ قوم پر نافذ کرنا اور ان احکام کے خلاف اُن کی سرکشی کو روکنا) اور مخصوص تمدنی و معاشرتی مسائل (مثلاً نکاح، طلاق، وراثت اور قومی طرزِ معاشرت (National Social System)) میں ہر قوم کو پُوری حکومتِ خود اختیاری حاصل ہو اور مرکز کو اس میں دخل دینے کا حق نہ ہو۔

۳۔ ان اغراض کے لیے ہر قوم کی الگ الگ ضلع وار اور صوبہ وار کونسلیں ہوں اور ان پر ایک سپریم کونسل ہو، مذکورۂ بالا معاملات انہی کونسلوں میں پیش ہوں اور وہیں سے ان کے لیے توانین منظور کیے جائیں۔ ان توانین کا مرتبہ عام ملکی توانین سے کسی طرح کم نہ ہو۔ ان کو نافذ کرنے کے لیے ایک مستقل ہیئت انتظامیہ (Executive) ہو اور وہ قومی کونسل کے سامنے جواب دہ ہو۔ مصارف نظم و نسق کے لیے ٹیکس عائد کرنے اور وصول کرنے کے پورے اختیارات اس قومی نظام کو حاصل ہوں اور ملکی خزانہ میں سے ایک مخصوص حصہ ہر قوم کے لیے مقرر کر دیا جائے، جس طرح وفاقی ریاستوں اور وفاقی مرکز کے درمیان مالیات کی تقسیم ہوا کرتی ہے۔

۴۔ متوافق قوموں کے درمیان، یا کسی وفاقی جز اور مرکز کے درمیان جو آئینی اختلافات پیدا ہوں ان کا تصفیہ وفاقی عدالت (Federal Court) کرے۔

۵۔ اپنے مخصوص توانین کے مطابق فصل خصومات کرنے کے لیے ہر قوم کا مستقل عدالتی نظام بھی ہو جسے عام ملکی عدالتوں کی طرح پورے عدالتی اختیارات حاصل ہوں۔

اس مرحلہ پر تہذیبی خود اختیاری کے صرف اصول بیان کیے جا سکتے ہیں، اگر ان پر اتفاق ہو جائے تو ان کا تفصیلی نقشہ ایک بین الاقوامی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس یا آئین ساز مجلس (Constituent Assembly) میں بنایا جا سکتا ہے[1]۔

---

[1] بعض لوگ اس موقع پر فوراً بول اٹھتے ہیں کہ اسلام میں زانی اور سارق اور قاذف کے لیے جو حدیں مقرر ہیں، یا ہندو شاستر میں جو مخصوص توانین ہیں، کیا ان کو بجنسہٖ کانون نافذ کیا جائے گا؟ یہ سوال سراسر نا واقفیت پر مبنی ہے۔ حاصل یہ ہے کہ ابتدائی مرحلہ میں بین الاقوامی تعلقات کا تناسب قائم کرنے کے لیے ہم صرف ان توانین کے نفاذ پر زور دیں گے جو عام ملکی توانین سے متصادم نہ ہوتے ہوں۔ اس کے بعد ہر قوم اپنی تہذیب کے اصولوں کا مظاہرہ کر کے اور ان کے حق میں علمی و عقلی دلائل پیش کر کے رائے عام کو ہموار کرنے کی کوشش کرتی رہے گی اور جس کی تہذیب کے اصول زیادہ طاقتور ہوں گے وہ عام ملکی توانین کو متاثر کرنے میں کامیاب ہو جائے گی۔

اس کے بعد مرکزی حکومت کا سوال سامنے آتا ہے۔ مرکزی حکومت سے یہاں ہماری مراد ریاستوں کے وفاق کا مرکز نہیں ہے، بلکہ قوموں کے وفاق کا مرکز ہے، یعنی وہ نظامِ حکومت جسے متوافق قومیں اپنی مشترک اغراض کے لیے بنائیں۔ اس معنی میں صوبوں اور ریاستوں کی حکومت بھی اُسی طرح مرکزی ہے جس طرح وفاقی مرکز (Federal CENTRE)۔ یہ مشترک نظامِ حکومت لامحالہ "مساویانہ حصہ داری" کے اصول پر مبنی ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ یہ صاحبِ حاکمیت قوموں کا وفاق ہے نہ کہ ایک قوم کا وحدانی نظامِ حکومت۔ یہاں پوری احتیاط کے ساتھ اس امر کا انتظام کرنا پڑے گا کہ اصولِ جمہوریت کے لحاظ سے ایک وفاقی جزو کو جو حاکمیت حاصل ہے دوسرا وفاقی جزو اسے سلب نہ کر لے۔ تہذیبی خود اختیاری کی طرح اس کا بھی ایک ڈھانچہ بنا کر ہم یہاں پیش کرتے ہیں جس کی تفصیلی صورت بعد میں ایک آئین ساز مجلس بنا سکتی ہے۔

١۔ اسٹیٹ کے تشریعی، انتظامی، عدلی اور دفاعی، چاروں شعبوں میں ہر قوم کا حصہ اس کی آبادی کے تناسب سے مقرر کر دیا جائے جو تناسب کے تغیرات کے ساتھ ساتھ متغیر ہو سکتا ہو۔[1] پاسنگ (Weightage) کا طریقہ بالکل اُڑا دیا جائے۔

٢۔ موجودہ طریقِ انتخاب کو بھی بالکل بدل دیا جائے۔ چھوٹے چھوٹے حلقہائے انتخاب بنانے کے بجائے ایک ریاست کے پورے حدودِ ارضی کو ایک حلقۂ انتخاب قرار دیا جائے جس میں ایک ایک نشست کے لیے الگ الگ امیدوار کھڑے نہ ہوں، بلکہ تسلیم شدہ

---

[1] خود غرض لوگ یہاں یہ اعتراض پیدا کر دیتے ہیں کہ اس طرح حصے کرنے سے مناصبِ حکومت کی اہلیت (Efficiency) متاثر ہو جاتی ہے۔ مگر یہ محض ایک فریب ہے اور اس کا مقصد بجز اس کے کچھ نہیں کہ اپنے حق سے زیادہ جو لوگ لے چکے ہیں وہ اس کو چھوڑنا نہیں چاہتے۔ ورنہ کھلی ہوئی بات ہے کہ کسی قوم میں اہل آدمیوں کی اتنی کمی نہیں ہے کہ نظامِ حکومت کو چلانے کے لیے اپنے تناسب آبادی کے مطابق کام کے آدمی وہ نہ دے سکتی ہو۔ حصے کے سوال کو یہ معنی پہنانا کہ ہم اہلیت کے بجائے محض قومیت کو مدارِ انتخاب قرار دینا چاہتے ہیں؟ ایک ذلیل قسم کی چالاکی ہے۔

سیاسی جماعتیں (Recognised Political Parties) اپنے اپنے اُمیدواروں کی فہرستیں پیش کریں اور ان کو کامیاب کرنے کے لیے جدوجہد کریں۔ اِس صورت میں (اور یاد رکھیے کہ صرف اِسی صورت میں) جُداگانہ انتخاب کے طریقہ کو موقوف کر دینا چاہیئے۔ اِس لیے کہ پھر بند قلعوں میں رہنا ہر قوم کے لیے مضر ہوگا۔ جُداگانہ طریق انتخاب کی ضرورت صرف اُسی وقت تک ہے جب تک یہاں انگلستان کی بوسیدہ ڈیمو کریسی کے نمونہ پر چھوٹے چھوٹے یک نشستی حلقہائے انتخاب بنائے جاتے ہیں۔ یورپ کی جدید جمہوریتوں میں متناسب نمائندگی (Proportional Representation) کے جو تجربات کیے گئے ہیں اگر ان سے استفادہ کر کے ایک صحیح جمہوری طریق انتخاب کر لیا جائے تو پھر جُداگانہ انتخاب کو اُڑا دینا ہوگا تاکہ اوّلاً آبادی کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا حصّہ بھی نمائندگی سے محروم نہ رہ سکے، ثانیاً مقابلہ اشخاص سے اشخاص کا نہ ہو بلکہ پارٹیوں کے اصول اور پروگرام ایک دوسرے کے مقابلہ میں آئیں، اور ثالثاً ہر پارٹی اپنے اصول اور پروگرام کو لے کر سب قوموں کے پاس جا سکے۔ بہت ممکن ہے کہ ابتداءً ہم اپنے نظم کی کمزوری کے باعث کسی زیادہ منظم جماعت کے مقابلہ میں شکست کھا جائیں، لیکن تہذیبی خود اختیاری کے بعد یہ شکست ہمارے لیے کچھ زیادہ مضر نہ ہوگی، اور مزید برآں کھُلے مقابلہ ہی میں زور آزمائی کرنے سے ہم سیاسی تنظیم کا سبق سیکھ سکیں گے۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ مقابلہ آزادانہ اور مساویانہ ہو۔ اس کے بعد اگر ہم اپنے نظم کی کمزوری یا اپنے اصول اور پروگرام کی کمزوری کے باعث شکست کھائیں گے تو اس شکست کے مستحق ہوں گے۔

۴۔ جمہوریت کو مؤثر بنانے کے لیے استصواب عام (Referendum) کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ نیز رائے دہندوں کو یہ حق بھی دیا جائے کہ جن نمائندوں پر ان کو اعتماد نہ رہا ہو ان کو واپس بُلا لیں۔ یہ بھی انگلستان کی دقیانوسی جمہوریت کا سراسر غیر جمہوری طریقہ ہے کہ نمائندوں کو منتخب کرنے کے بعد رائے دہندے ایک معین مدّت تک اپنے ہاتھ کٹوا بیٹھتے ہیں۔ روسو کے بقول انگریز صرف اس وقت آزاد ہوتے ہیں جب وہ پارلیمنٹ کے ارکان کا انتخاب کرتے ہیں۔ اور جب وہ انہیں منتخب کر لیتے ہیں تو پھر اپنے ہی منتخب کردہ

نمائندوں کے غلام بن جاتے ہیں۔

۴۔ استصواب عام کے ساتھ یہ اصول مقرر کر دیا جائے کہ جس چیز کی مخالفت ایک قوم کے ووٹر بالاتفاق یا عظیم اکثریت کے ساتھ کریں وہ مجلسِ قانون ساز میں پاس نہ ہو سکے۔ کیونکہ یہ مخالفت اس بات کی دلیل ہوگی کہ جمہوری نظام کے حصہ داروں میں سے ایک حصہ دار اُس کو اپنے لیے مضر پاتا ہے اور دُوسرا حصہ دار صرف اِس لیے اس کا مؤید ہے کہ وہ اُس کے لیے مفید ہے۔ اس قسم کے کسی قانون یا ریزولیوشن کا پاس ہونا عین اصولِ جمہوریت کی نفی ہوگا۔

۵۔ استصواب عام کے لیے یہ اصول بھی مقرر کرنا پڑے گا کہ اگر کسی قوم کے ووٹروں کی کم از کم اِس قدر فی صدی تعداد استصواب کا مطالبہ کرے تو اس کا انعقاد ضروری ہوگا۔

۶۔ دستور کی ترمیم پر بھی سخت پابندیاں عائد کرنی ہوں گی جن کے لیے امریکہ، سوئٹزرلینڈ، آسٹریلیا، اور دوسرے جمہوری ممالک کے دساتیر سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

دُوسرا خاکہ

اگر بین الاقوامی وفاق کی یہ صورت قبول نہ کی جائے تو دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ مختلف قوموں کے الگ الگ حدودِ ارضی مقرر کر دیے جائیں جہاں وہ اپنے جمہوری اسٹیٹ بنا سکیں۔ پچیس سال یا اس سے کچھ کم و بیش مدت تبادلۂ آبادی کے لیے مقرر کر دی جائے۔ ہر اسٹیٹ کو زیادہ سے زیادہ اندرونی خود مختاری دی جائے، اور وفاقی مرکز کے اختیارات کم از کم رکھے جائیں۔ اس صورت میں ہم غیر مسلم ریاستوں کے ساتھ مل کر ایک وفاقی اسٹیٹ بنانے پر نہ صرف راضی ہو جائیں گے، بلکہ اس کو ترجیح دیں گے۔

میرے دوست ڈاکٹر عبد اللطیف صاحب نے حال میں ہندوستان کے تہذیبی مستقبل (Cultural Future of India) پر جو مقالہ حیدر آباد سے شائع کیا ہے وہ ہندوستان کی مستقل قوموں کے درمیان ارضی حدود کی تقسیم کا بہترین نقشہ پیش کرتا ہے، یہ ایک منصفانہ تقسیم ہے جس کی رُو سے مشرقی بنگال، حیدر آباد، بھوپال، جوناگڑھ،

جاورہ، ٹونک، اجمیر، دہلی و اردو، شمالی و مغربی پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان کے حلقے مسلمانوں کے لیے مخصوص ہو جاتے ہیں۔ اِس طرح یہ ممکن ہے کہ پچیس سال کی مدت میں ہندوستان کے دوسرے خطوں سے ہجرت کر کے مسلمان ان حلقوں کے اندر سمٹ جائیں اور ہندو قریب کے علاقوں میں چلے جائیں۔ بقیہ ہندوستان میں اگر اچھوت اپنی الگ قومیت بنانا چاہیں تو ان کے لیے بلحاظ ان کی آبادی کے مستقل رقبے مخصوص کیے جا سکتے ہیں بشرطیکہ گاندھی جی خودکشی کی دھمکی دے کر ان کی آزادیٔ رائے کو پھر نہ سلب فرمالیں۔ اِسی طرح سکھوں کو بھی ان کی آبادی کے لحاظ سے ایک رقبہ دیا جا سکتا ہے۔

تیسرا خاکہ

اگر یہ صورت بھی منظور نہ ہو تو پھر بطورِ آخر ہم یہ مطالبہ کریں گے کہ ہماری قومی ریاستیں الگ بنائی جائیں اور ان کا علیحدہ وفاق ہو، اسی طرح ہندو ریاستوں کا بھی ایک جُداگانہ وفاق ہو، اور پھران دو یا زائد وفاقی مملکتوں کے درمیان ایک طرح کا تحالف (Confederacy) ہو جائے جس میں مخصوص اغراض، مثلاً دفاع اور مواصلات (Communications) اور تجارتی تعلقات کے لیے مقرر شرائط پر تعاون ہو سکے۔

یہ تین خاکے جو ہم نے تجویز کیے ہیں، ان میں سے جس کو بھی قبول کر لیا جائے اس پر ہم مفاہمت کر سکتے ہیں۔ اگر کوئی چوتھی یا پانچویں صورت پیش کی جائے تو اس پر بھی غور کر سکتے ہیں۔ مگر ہمارے ہندو ہمسایوں اور ان کے انگریز سرپرستوں کو یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ موجودہ کانسٹی ٹیوشن اور ہر وہ نظامِ حکومت جو واحد قومیت کی بنا پر جمہوری ادارات قائم کرتا ہو، کسی حال میں ہمارے لیے قابلِ قبول نہیں ہے۔ اِس بنیادی غلطی سے پاک کر کے جو دستور بھی پیش کیا جائے اس کو اور صرف اسی کو زیرِ غور لایا جا سکتا ہے۔

آخری سوال

اپنے قومی نصب العین کی اِس تشریح کے بعد ہمارے لیے آخری سوال یہ رہ جاتا ہے کہ اس کو حاصل کرنے کا ذریعہ کیا ہے؟ یہاں اِس سوال کی تفصیلات پر بحث کرنے

کا موقع نہیں۔ مختصراً ایک بات میں صاف صاف کہہ دینا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ حالات جس حد تک پہنچ گئے ہیں ان میں ہمارے لیے انقلابی ذرائع اختیار کرنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں رہا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے قومی رہنماؤں اور سیاسی اداروں نے گزشتہ دس پندرہ سال کی مدت میں انتہا درجہ کی بے بصیرتی اور ناعاقبت اندیشی سے کام لیا ہے اور اس کے برعکس ہماری ہمسایہ قوم کو اعلیٰ درجہ کے دانش مند اور مدبر رہنما میسر آگئے ہیں۔ اِس نامساوی مقابلہ کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ آج ہم اس ملک کے سیاسی ترازو میں بہت بے وزن ہیں اور ان کا پلڑا بہت جھک چکا ہے۔ اب وہ اپنی کامیابی کی منزل سے بہت قریب پہنچ چکے ہیں اور متعدد اسباب سے، جن کی طرف میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں، انگریز بھی دانستہ یا نادانستہ وہی طریق دستور سازی اختیار کرنے پر اصرار کر رہا ہے جو سراسر انہی کے لیے مفید ہے۔ ایسی حالت میں یہ توقع کرنا انتہا درجہ کی خام خیالی ہوگی کہ محض زورِ استدلال یا افہام و تفہیم یا آئینی چالوں سے ہم ہندوؤں اور انگریزوں کو ان کے وہ اصول اور مقاصد یکسر بدل ڈالنے پر آمادہ کر سکیں گے جو نہ صرف ان کے عقیدے میں درست ہیں بلکہ ان کی اغراض کے لیے مفید بھی ہیں۔ اب آئینی تدبیروں کے لیے کامیابی کا کوئی موقع باقی نہیں رہا ہے۔ اب کوئی پارٹی اور کوئی وکیل ہماری لڑائی نہیں جیت سکتا۔ اب صرف جان و مال کی قربانیوں ہی سے واقعات کی رفتار بدلی جا سکتی ہے۔ جب تک ہم ثابت نہ کر دیں گے کہ یہ کانسٹی ٹیوشن ہمارے زندہ جسموں پر نہیں بلکہ قبروں پر ہی نافذ کیا جا سکتا ہے، اور جب تک ہم اپنے عمل سے یہ نہ بتا دیں گے کہ مسلمان اپنی قومی زندگی کے لیے مرنے کی طاقت رکھتا ہے اس وقت تک اس کانسٹی ٹیوشن کا ایک شوشہ بھی اپنی جگہ سے نہ ٹلے گا، اور نہ قومی جمہوری لادینی اسٹیٹ ہم پر مسلط ہونے سے باز رہے گا جس کے لانے پر انگریز، ہندو اور ہمارے منافقین اور بہت سے صم بکم عمی فھم لا یعقلون مل جل کر کوشش کر رہے ہیں۔ مسلمان انتہا درجہ کے نادان ہوں گے اگر وہ اب بھی حالات کی نزاکت کو ٹھیک ٹھیک نہ سمجھیں گے۔ وہ ابھی تک اس دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں کہ ان کو یہ نمائشی جلسے اور جلوس اور کھوکھلے مظاہرے قومی ہلاکت سے بچا لیں گے۔ وہ ان لوگوں کی لیڈری پر اعتماد کر رہے ہیں جن کے سامنے

اپنی وزارت اور وجاہت کے سوا کوئی چیز نہیں، جو اپنی قوم کے لیے اپنا بال تک بیکا ہونا
گوارا نہیں کرسکتے، جو مسلمانوں کے مفاد کا نام صرف اس لیے بلند آہنگیوں کے ساتھ لیتے
ہیں کہ ایوانِ وزارت پر ان کا قبضہ رہے، جن کی بزدلی پر دشمنوں تک کو پورا پورا اعتماد
ہے، جنہیں چیلنج کیا جاتا ہے کہ اگر تم ہمارے ساتھ جیل میں جانے اور لاٹھیاں کھانے کو
تیار ہو تو ہم تمہاری بات ماننے کے لیے تیار ہیں اور وہ اس چیلنج کو قبول کرنے کے بجائے
کنی کاٹ جاتے ہیں، جن کا حال یہ ہے کہ یورپ میں سرکارِ برطانیہ کو جنگ کا خطرہ پیش
آتا ہے تو یہ سب سے پہلے آگے بڑھ کر اپنی وفادارانہ خدمات پیش کرتے ہیں۔ ایسے
لیڈروں سے اگر مسلمان یہ توقع باندھے بیٹھے ہیں کہ یہ ان کی کشتی کو بھنور سے نکال لیں
گے تو میں پیشین گوئی کرتا ہوں کہ ان کی کشتی ڈوب کر رہے گی۔ یہ تقریروں کا نہیں بلکہ
جان جوکھوں کا کام ہے۔ اگر مسلمان جینا چاہتے ہیں تو ان کو اور خصوصاً ان کے نوجوانوں
کو اپنا گرم خون زندگی کے لیے بھینٹ چڑھانے پر تیار ہونا چاہیئے۔

پوچھا جاتا ہے کہ انقلابی ذرائع سے تمہاری مراد کیا ہے۔ میں حیران ہوں کہ اس
کا کیا جواب دوں۔ جب تک کہ قوم کی ایک بڑی تعداد ایک نصب العین پر متحد نہ ہو جائے
اور ہر قیمت پر اسے حاصل کرنے کا عزمِ صمیم اس میں پیدا نہ ہو جائے، انقلابی ذرائع کی ایک
فہرست پیش کر دینا کسی یاوہ گو ہی کا کام ہو سکتا ہے، اور میں یاوہ گوئی سے خدا کی پناہ
مانگتا ہوں۔